JANUARY 2011

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

سال نو مبارک







انگلش فیئرنس سنو سے

چاندنی سے گورے پن کے لئے۔

MelaFree

Olinza

Result Perfect
No Side Effects

For Home Delivery in Karachi
Contact: 021-344200…

آمنہ ریاض
رضیہ جمیل
امت الصبور
بلقیس بھٹی
سائرہ غلام نبی
عدنان
خالد جیلانی

خواتین ڈائجسٹ
خط وکتابت کا پتہ
خواتین ڈائجسٹ
37- اردو بازار کراچی



جنوری 2011
جلد 38 شمارہ 9
قیمت 40 روپے

MEMBER APNS CPNE

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)	500 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ	4000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا	5000 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آذر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام اشاعت: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: khawateendigest@hotmail.com , info@khawateendigest.com

خواتین ڈائجسٹ کا جنوری کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

ہر آن متحرک وقت کے تند و تیز دھارے میں بہتا ایک اور سال لاکھوں سال پر پھیلی انسانی تاریخ کا حصہ بن گیا۔ دنیا کچھ اور آگے بڑھ گئی، انسان نے ترقی کی کچھ اور منازل طے کر لیں۔

نئے سال کا سورج طلوع ہو رہا ہے۔

قارئین کو نیا سال مبارک۔

سال گزشتہ وطن عزیز کے لیے کوئی خوشگوار تبدیلی نہ لا سکا۔ امن، انصاف، خوشحالی اور تحفظ کو ترسے عوام اس سال بھی اچھے دنوں کی راہ دیکھتے رہے۔ پھر سیلاب کے تند و تیز ریلے نے لوگوں کے سر سے چھت اور قدموں تلے سے زمین بھی چھین لی۔ مہنگائی اور بے روزگاری سے پریشان لوگوں کو آسائشیں تو کیا میسر آتیں، زندگی کی بقا بھی مسئلہ بن گئی۔

اب بھی حالات کہیں سے سازگار نظر نہیں آتے لیکن امید کی کرنیں تسلی بخشتی ہیں کہ وہ روشن صبحیں ضرور طلوع ہوں گی جو اندھیروں کو شکست دے دیں گی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ نیا سال آپ کے لیے، ہمارے لیے، ہمارے ملک کے لیے کامیابیوں، کامرانیوں کا سال ہو اور ہم سب کے لیے خیر اور سلامتی لے کر آئے۔ آمین۔

انشاء جی کی برسی،

ہر چاند کی اپنی چمک تھی، ہر چہرے کا اپنا روپ۔ لیکن ایسا روشن روشن، ہنستا، ماتم کرتا چاند۔ انشاء جی کے ایک چہرے میں کئی انشاء جی آج بھی ہمارے دلوں میں بستے ہیں۔ انشاء جی کی تحریروں میں ظرافت کا ایک منفرد انداز ہے۔ ان کی شخصیت کثیر الجہت تھی۔ مزاح نگار، جس پہلو سے بھی دیکھیں تابندہ اور روشن نظر آتے ہیں۔

اپنی شاعری میں وہ ایسی فضا کی تشکیل کرتے ہیں جہاں مجبوری ہے، دکھ ہے، درد ہے۔ ان کی نظموں میں انسانیت کا کرب نمایاں ہے۔ جس آفاقی اور انسانی مسائل کو موضوع بنایا وہ آج کے دور کی آواز نظر آتے ہیں۔ دوسری طرف مزاح اور کالم نگاری ہے جو منفرد اور خداداد ہے جہاں فطری زندگی نظر آتی ہے۔ آگہی اور سیاسی شعور ہے لیکن طنز کی تلخی نہیں۔ وہ بڑے لطیف انداز میں بڑی سادگی کے ساتھ ان حقائق کو زیر قلم لاتے ہیں لیکن اسے مزاج پر حاوی نہیں ہونے دیتے۔ بلاشبہ ان کے کالموں میں ان کے عہد کی تاریخ نظر آتی ہے۔ ان کے سفرنامے آج بھی شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔

11 جنوری کو انشاء جی اس جہاں سے رخصت ہوئے تھے۔ ان کی برسی کے موقع پر قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں،

- امرت اور پیالہ۔ راحت جبیں کا مکمل ناول،
- روشنی سی چار سو ہے۔ نایاب جیلانی کا مکمل ناول،
- بشریٰ سعید اور نفیسہ سعید کے ناولٹ،
- رفعت ناہید سجاد اور رخسانہ نگار عدنان کے ناول،
- عفت سحر طاہر، فیضہ عامر، ام ثمامہ، ام مریم اور صبا اسلام کے افسانے،
- منتظر حسین تارڑ سے آمنہ مفتی کی ملاقات،
- کیا یہ ہو سکتا ہے؟۔ معروف شخصیات سے سروے،
- باتیں کتابوں کی۔ نئی کتابوں پر تبصرہ،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی کا سلسلہ،
- قارئین سے سروے، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر دلچسپ سلسلے شامل ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ کے بارے میں آپ کی رائے جاننے کے لیے آپ کے خطوط اور ای میلز کے منتظر رہیں گے۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے۔ اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

کلمہ توحید کا اقرار کرنے والے کے جان و مال کی حفاظت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے جنگ کروں حتیٰ کہ وہ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کر لیں۔ جب وہ یہ کلمہ پڑھ لیں تو انہوں نے اپنے خون اور مال مجھ سے محفوظ کر لیے، سوائے اس کے کہ اس (اقرار یعنی کلمے اور اسلام) کا کوئی حق ہو (تو پھر لوگوں کے جان و مال میں تصرف کرنا جائز ہو گا) اور (دل کے معاملات میں) ان کا حساب اللہ عزوجل کے ذمے ہے۔"

فوائد و مسائل: کلمہ توحید کا اقرار کرنے والے پر دنیا میں مسلمانوں کے احکام جاری ہوتے ہیں۔ اگر دل میں ایمان نہیں ہو گا تو اس کی سزا آخرت میں ملے گی۔ ○ خون اور مال محفوظ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان سے جنگ کر کے انہیں قتل نہیں کیا جائے گا، نہ ان کے مالوں پر بطور غنیمت یا فے قبضہ کیا جائے گا۔ ○ جان میں حق کے ساتھ تصرف سے مراد اس سے سرزد ہونے والے جرم کی سزا دینا ہے، مثلاً" چوری کی صورت میں ہاتھ کاٹنا، پاک دامن پر بدکاری کا الزام لگانے پر کوڑے مارنا، قتل کی صورت میں قصاص کے طور پر قتل کرنا وغیرہ اور مال میں جائز تصرف، زکوٰۃ اور لازمی خرچ وصول کرنا، قتل عمد میں مقتول کے وارثوں کی رضامندی سے اور قتل خطا میں وارثوں کے مطالبے پر قاتل یا اس کے قبیلے سے دیت (خون بہا) وصول کرنا وغیرہ ○ اگر دنیا میں کسی وجہ سے گناہ کی سزا نہ ملے تو آخرت میں سزا ملے گی، البتہ کسی بڑے نیک کام کی وجہ سے معافی بھی مل سکتی ہے۔

حضرت اوس بن ابو اوس حذیفہ ثقفی رضی اللہ

عنہ سے روایت ہے "انھوں نے فرمایا" ہم لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے اور آپ ہمیں وعظ و نصیحت فرما رہے تھے کہ ایک آدمی آیا اور اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے چپکے چپکے بات کی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اسے لے جاؤ اور قتل کر دو۔"

جب وہ آدمی اٹھ کر چلا تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلایا اور فرمایا۔

"کیا تو گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں؟"

اس نے کہا "جی ہاں۔"

آپ نے فرمایا۔ "جاؤ اسے آزاد کر دو۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے جنگ کروں حتیٰ کہ وہ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کر لیں۔ جب وہ ایسا کریں تو ان کی جانیں اور مال مجھ پر حرام ہیں۔"

فوائد و مسائل: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سرگوشی کرنے والے کی بات سے یہ سمجھا کہ یہ شخص دل سے مسلمان نہیں بعد میں اس کے ظاہری اسلام پر اعتماد کرتے ہوئے اسے چھوڑ دیا۔ امام سیوطی رحمۃ اللہ اس کی بات کہتے ہیں۔ "زیادہ صحیح توجیہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اجازت تھی کہ کسی سے اس کی دلی کیفیات کے مطابق سلوک کریں، چنانچہ اس کے مطابق عمل کرنے کا ارادہ فرمایا (کفر کی بنا پر قتل کرنا چاہا) پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات بہتر محسوس ہوئی کہ ظاہر پر عمل کیا جائے (اس کے ظاہری اسلام کی وجہ سے مسلمان والا سلوک کیا جائے) کیونکہ یہ قانون نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور امت سب کے لیے ہے، اس لیے آپ اس طرف مائل ہو گئے اور باطن (کی حقیقی کیفیت) کے مطابق عمل سے اجتناب فرمایا۔" ○ سنن نسائی کے اس باب میں حضرت اوس رضی اللہ عنہ سے اسی طرح کا ایک اور واقعہ بھی مروی ہے۔ حضرت اوس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، میں قبیلہ ثقیف کے وفد میں شامل ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں خیمے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا۔ میرے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا خیمے کے سب افراد سو گئے۔ (اس تنہائی کے وقت)

ایک آدمی نے آ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے چپکے سے بات کی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جا اسے قتل کر دے۔" پھر فرمایا۔ "کیا وہ لا الٰہ الا اللہ کی اور میری رسالت کی گواہی نہیں دیتا؟" اس نے کہا۔ "گواہی دیتا ہے۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اسے چھوڑ دے۔" پھر آپ نے فرمایا "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے جنگ کروں حتیٰ کہ وہ لا الٰہ الا اللہ کہیں۔ جب وہ اس کا اقرار کر لیں تو ان کے خون اور ان کے مال (مسلمانوں پر) حرام ہو گئے مگر اس کے حق کے ساتھ۔"

مسلمان کو ہلاک کرنا

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے ہے، انھوں نے فرمایا۔

"نافع بن ازرق اور اس کے ساتھی آئے" انھوں نے کہا "عمران! آپ ہلاک ہو گئے۔" انھوں نے فرمایا۔ "میں ہلاک نہیں ہوا۔" انھوں نے کہا "کیوں نہیں آپ ضرور تباہ ہو گئے ہیں۔"

ان لوگوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "وقاتلوھم حتی لاتکون کلمہ توحید کا اقرار کرنے والے کو قتل کرنے کی ممانعت کا بیان فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ" ان سے جنگ کرو حتیٰ کہ فتنہ باقی نہ رہے اور مکمل طور پر اللہ کا دین غالب ہو جائے۔"

انھوں نے فرمایا۔ "ہم نے ان (کفار) سے جنگ کی حتیٰ کہ انھیں ملک (عرب) سے نکال دیا اور اللہ کا دین مکمل طور پر غالب ہو گیا۔ اگر تم چاہو تو تمہیں ایک حدیث سناؤں جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے؟" انھوں نے کہا۔ "آپ نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے؟" فرمایا "ہاں" میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

پاس موجود تھا (جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین سے جنگ کرنے کے لیے مسلمانوں کا ایک لشکر روانہ فرمایا۔ جب ان (مسلمانوں) کا ان (مشرکوں) سے سامنا ہوا تو ان سے شدید جنگ ہوئی۔ آخر وہ لوگ مسلمانوں سے مغلوب ہو گئے۔ میرے رشتے داروں میں سے ایک آدمی نے ایک مشرک پر نیزے سے حملہ کیا۔ جب وہ اس کے سر پر پہنچ گیا تو (دشمن فوج کے) اس شخص نے کہا۔ "میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں مسلمان ہوں۔" اس (صحابی) نے (اس کے کلمہ شہادت پر یقین نہ کرتے ہوئے) اسے نیزہ مار کر قتل کر دیا۔ پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا۔

"اللہ کے رسول! میں تباہ ہو گیا۔"

آپ نے ایک بار یا دو بار فرمایا "تو نے کیا کیا ہے؟"

اس نے جو کیا تھا بتا دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا۔

"تو نے اس کا پیٹ کیوں نہ چیر لیا کہ تجھے معلوم ہو جاتا کہ اس کے دل میں کیا ہے؟"

اس نے کہا۔ "اللہ کے رسول! اگر میں اس کا پیٹ چیرتا تو کیا مجھے معلوم ہو جاتا کہ اس کلمہ توحید کا اقرار کرنے والے کو قتل کرنے کی ممانعت کا بیان کے دل میں کیا ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"پھر تو نے نہ تو اس کی زبان کے الفاظ کو قبول کیا نہ تو اس کے دل کی کیفیت سے واقف ہے۔"

راوی بیان کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے (اس کا عذر قبول نہیں فرمایا۔) کچھ عرصہ بعد وہ فوت ہو گیا ہم نے اسے دفن کیا۔ صبح ہوئی تو وہ زمین کی سطح پر تھا۔ لوگوں نے کہا شاید کسی دشمن نے اسے قبر سے کھود نکالا ہے۔ پھر ہم نے اسے دفن کیا اور اپنے لڑکوں کو حکم دیا کہ اس کا پہرہ دیں۔ (اس کے باوجود) وہ (اس کی لاش) صبح کو (قبر سے باہر) زمین پر (پڑی) تھی۔ ہم نے کہا "شاید لڑکوں کو اونگھ آ گئی" (ان کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر کسی نے میت نکال لی)

ہم نے اسے (پھر) دفن کیا اور خود پہرہ دیا۔ (اس کے باوجود) صبح کو اس کی لاش (قبر سے باہر) زمین پر تھی۔ چنانچہ ہم نے اسے کسی گھاٹی میں پھینک دیا۔ (اور دفن نہ کیا۔)

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے (ایک) روایت (اس طرح) ہے "انھوں نے فرمایا" ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنگی مہم پر روانہ فرمایا۔ ایک مسلمان نے ایک مشرک پر حملہ کیا اور آخر تک واقعہ بیان فرمایا۔ اس کے آخر میں یہ اضافہ ہے اسے زمین نے باہر نکال دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی گئی تو آپ نے فرمایا۔

"زمین اس کو بھی قبول کر لیتی ہے جو اس سے زیادہ برا ہوتا ہے لیکن اللہ نے تمہیں یہ دکھانا چاہا ہے کہ لا الٰہ الا اللہ کا احترام کتنا (عظیم اور اہمیت کا حامل) ہے۔"

فوائد و مسائل: ○ خوارج وغیرہ جیسے فرقے دین کو صحیح انداز سے نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ ○ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا فہم دین اور علم صحیح اور کامل تھا اس لیے اختلافی مسائل میں خاص طور پر عقائد میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فہم کو اہمیت دینی چاہیے اور مسائل کو ان کے فرامین کی روشنی میں سمجھنا چاہیے۔ ○ خوارج نے مسلمان خلفاء کے خلاف بغاوت کی۔ یہ غلط قدم تھا اس سے فتنہ و فساد پیدا ہوا۔ ○ جو شخص مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہو اسے مسلمان سمجھنا چاہیے اور اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا سلوک کرنا چاہیے۔ اگر اس سے کوئی ایسی چیز ظاہر ہو جس سے اس کا کافر ہونا ثابت ہو جائے تو اسے مرتد قرار دے کر سزا دی جا سکتی ہے لیکن محض شک و شبہ کی بنا پر کسی کو کافر قرار دینا بہت بڑی غلطی ہے۔ ○ اللہ تعالیٰ کسی غلطی کی سزا دنیا میں بھی دے دیتا ہے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔

مومن کی جان و مال کی حرمت کا بیان

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں فرمایا۔

"سنو! سب سے زیادہ احترام والا دن تمہارا یہ دن ہے۔ سنو! سب سے زیادہ احترام والا مہینہ تمہارا یہ مہینہ ہے۔ سنو! سب سے زیادہ احترام والا شہر تمہارا یہ شہر ہے۔ سنو! تمہارے خون اور تمہارے مال تمہارے لیے (ایک دوسرے کے لیے) اسی طرح قابل احترام ہیں جس طرح تمہارے اس شہر میں اس مہینے میں یہ دن۔ سنو! کیا میں نے (اللہ کا حکم کما حقہ) پہنچا دیا ہے؟"

حاضرین نے کہا۔

"جی ہاں" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "یا اللہ! گواہ رہ۔"

فوائد و مسائل : ○ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد 9 ذوالحجہ کو عرفات میں بھی فرمایا تھا اور 10 ذوالحجہ کو منیٰ میں جمرات کے قریب کھڑے ہو کر بھی۔ ○ اس شہر سے مراد مکہ مکرمہ ہے جو سب سے زیادہ عظمت والا شہر ہے۔ ○ مسلمان کی جان و مال قابل احترام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسے قتل کرنا، زخمی کرنا، اس کا مال چھیننا اور دھوکے سے اس کا مال لے لینا بہت بڑے جرم ہیں۔

فائدہ : کسی کو ذلیل کرنا، اس کی غیبت کرنا، اس پر کسی قسم کا جھوٹا الزام لگانا اور اس کی غلطیوں کی تشہیر کرنا سب کبیرہ گناہ ہیں۔

حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مومن وہ ہے جس سے لوگوں کو اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے بارے میں خطرہ نہ ہو اور مہاجر وہ ہے جو غلطیاں اور گناہ ترک کر دے۔"

فوائد و مسائل : ○ ایمان امن سے ہے اس لیے مومن کی شان یہ ہے کہ اس سے لوگوں کو امن ملے کسی قسم کا خوف و خطرہ نہ ہو۔ مومن بد دیانت نہیں ہوتا ورنہ کسی کے مال و جان کو نقصان پہنچاتا ہے۔ ○ "ہجرت" اللہ کی رضا کے لیے وطن چھوڑنے کو کہتے ہیں اس لیے جو شخص اللہ کے لیے وطن چھوڑ دیتا ہے اسے چاہیے کہ اسی اللہ کی رضا کے لیے گناہ بھی ترک کر دے تاکہ اللہ کے ہاں مہاجر والا بلند مقام حاصل کر سکے۔

زبردستی مال چھیننے (لوٹنے) کی ممانعت کا بیان

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس نے سرعام (کسی کا مال وغیرہ) چھینا وہ ہم میں سے نہیں۔"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب زانی زنا کر رہا ہوتا ہے تو وہ مومن نہیں ہوتا۔ جب شرابی شراب پی رہا ہوتا ہے تو وہ مومن نہیں ہوتا۔ جب چور چوری کر رہا ہوتا ہے تو وہ مومن نہیں ہوتا۔ جب ڈاکو ڈاکہ ڈال رہا ہوتا ہے، لوگ اس کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھتے ہیں (کہ کتنا ظالم ہے، اسے اللہ کا خوف بالکل نہیں) تو وہ مومن نہیں ہوتا۔"

فوائد و مسائل : ○ کبیرہ گناہوں کا ارتکاب ایمان کے منافی ہے۔ ○ کبیرہ گناہوں سے آدمی مرتد نہیں ہوتا، تاہم ان کا ارتکاب یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کا ایمان انتہائی کمزور ہو چکا ہے۔ ○ ایمان کا مطلب یقین ہے۔ اگر کسی کو یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس جرم کی سزا دے گا اور وہ سزا دنیا کی سزا سے بے انتہا زیادہ ہوگی تو اس یقین کی موجودگی میں وہ جرم کر ہی نہیں سکتا۔ گناہ اسی وقت ہوتا ہے جب انسان پر وقتی لذت اور دنیوی فائدے کا احساس اس طرح مسلط ہو جاتا ہے کہ وہ آخرت کو فراموش کر دیتا ہے۔ ○ کبیرہ گناہ سے جلد از جلد توبہ کرنا ضروری ہے ورنہ خطرہ ہے ایمان بالکل ہی سلب ہو جائے۔

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص لوٹ مار کرتا ہے وہ ہم میں سے نہیں۔"

حضرت ثعلبہ بن حکم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا "دشمن کی کچھ بکریاں ہمارے ہاتھ لگیں، وہ ہم نے لوٹ لیں اور ہانڈیاں چڑھا دیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہانڈیوں کے پاس سے گزرے تو انہیں الٹ دینے کا حکم دیا، چنانچہ وہ الٹا دی گئیں۔ پھر آپ نے فرمایا۔ "لوٹ حلال نہیں۔"

فوائد و مسائل : ○ غنیمت کا مال تقسیم ہونے سے پہلے استعمال کرنا جائز نہیں۔ ○ کسی جرم کی مالی سزا دینا جائز ہے۔

"لگ جاؤ" کا بیان

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"لوگوں کو خاموش کراؤ۔" (جب لوگ خاموش ہو گئے) تو آپ نے فرمایا۔

"میرے بعد دوبارہ کافر نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کے گلے کاٹنے لگ جاؤ۔"

فوائد و مسائل : بزرگ شخصیت کی بات سننے کے لیے خاموشی اختیار کرنا اور بات کرنے والوں کو خاموش کرانا احترام کا تقاضا بھی ہے اور اس کی نصیحت سے مستفید ہونے کے لیے شرط بھی۔ ○ مسلمانوں کا آپس کے اختلافات افہام و تفہیم سے طے کرنے چاہئیں، اسلحے کے زور پر نہیں۔ ○ مسلمانوں کا باہمی اتفاق اللہ کا عظیم احسان ہے جیسے کہ ارشاد ہے۔

"تم پر اللہ کی جو نعمت ہوئی اسے یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، پھر اللہ نے تمہارے دلوں میں محبت ڈال دی اور تم اس کے احسان سے بھائی (بھائی) بن گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے، پھر اس نے تمہیں اس میں گرنے سے بچا لیا۔" (آل عمران-103) ○ مسلمانوں کو چاہیے کہ آپس میں محبت پیدا کرنے والی چیزوں کو اختیار کریں، مثلاً "ایک دوسرے کو سلام کرنا، نماز باجماعت میں ایک دوسرے سے مل کر کھڑے ہونا اور صفیں سیدھی رکھنا وغیرہ اور ایسے کاموں سے پرہیز کریں جو اختلاف اور دشمنی پیدا کرنے والے ہیں، مثلاً "کسی کی بے عزتی کرنا، ظلم، زیادتی، چغلی اور غیبت وغیرہ۔ ○ قتل و غارت بہت بڑا جرم ہے جو مسلمانوں کو زیب نہیں دیتا۔

حضرت صنابح بن اعسر احمسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"سنو! بلاشبہ میں حوض پر تمہارا پیش رو ہوں گا اور بلاشبہ میں دوسری امتوں کے مقابلے میں تمہاری کثرت پر فخر کروں گا، لہٰذا میرے (فوت ہونے کے) بعد آپس میں لڑائی نہ کرنا۔"

فوائد و مسائل : ○ فرط کے معنی "پیش رو" یا "میر سامان" کے ہیں، یعنی وہ شخص جو قافلے سے پہلے منزل پر پہنچ کر ان کے پڑاؤ ڈالنے کے لیے مناسب جگہ متعین کرتا ہے اور ان کے لیے اور ان کے جانوروں کے لیے پانی وغیرہ کا بندوبست کرتا ہے۔ ○ قیامت کے دن میدان حشر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم حوض کوثر سے اپنی امت کو پانی پلائیں گے۔ اس حوض میں جنت کی نہر "کوثر" سے پانی آئے گا۔ ○ امت کی تعداد کی کثرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خوشی اور فخر کا باعث ہے، لہٰذا خاندانی منصوبہ بندی کے نام سے مسلمانوں کی آبادی محدود رکھنے کی کافرانہ سازش کو سمجھنا اور ان کے جال میں پھنسنے سے اپنے آپ کو دوسرے مسلمانوں کو بچانا فرض ہے۔ ○ اولاد کی تربیت اسلام کے دینی اور اخلاقی اصولوں کے مطابق کرنا ضروری ہے تاکہ وہ امت محمدیہ کے مفید افراد

☼



رو میں ہے رخشِ عمر

ضمیر جعفری

ابن انشاء چل بسے۔ چاند نگر کی روشنی 'دوستوں سے روٹھ گئی اور اردو ادب کو ویران کر گئی۔ اردو نظم کا عظیم بنجارہ 'اپنی عمر کی پونجی لٹا کر کوچ کر گیا اور نثر میں شگفتگی کا سدا بہار آبشار تھم گیا۔ وہ جس کی باتوں میں گلوں کی خوشبو تھی۔ وہ جس کے لفظوں میں موتیے کی کلیاں کھل اٹھتی تھیں۔ افق کی دھند میں کھو گیا۔ وہ سورج جو صرف اسی کے قلم سے طلوع ہوتا تھا 'ایوانِ اردو میں پھر کبھی نہ چمکے گا۔ ابن انشاء کی موت سے اردو مزاح نگاری کی مانگ میں جلتا ہوا اسیندور بجھ گیا۔

اس قبیلے کا سردار رخصت ہو گیا۔ کل جب وہ ہم میں موجود تھا۔ ہم کتنے تونگر تھے۔ آج جب وہ ہم میں موجود نہیں ہم کتنے نادار ہو گئے ہیں۔ ابن انشاء ایک بے بہا قومی متاع تھے۔

ابن انشا کی وفات کا رنج سارے ملک میں وسیع پیمانے پر محسوس کیا گیا۔ اس کی موت سے ایک نئی روایت پیدا ہوئی اور وہ یہ کہ سربراہ حکومت 'چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق صاحب مرحوم کے گھر گئے تاکہ ان کی بیوہ اور دیگر رشتہ داروں سے

تعزیت کر سکیں اور مرحوم کے معصوم بچوں کو دیکھ سکیں 'ان کے ہمراہ زون سی کے مارشل لا ایڈمنسٹریٹر لیفٹیننٹ جنرل جہاں زیب ارباب کے علاوہ لیفٹیننٹ کرنل صدیق سالک بھی تھے۔ موخر الذکر کا وہاں جانا اس لیے بھی ضروری تھا کہ وہ ابن انشاء کا ذاتی دوست اور ایک ساتھی قلم کار ہے۔ اگرچہ وہاں وہ باوردی گئے مگر وہ کسی لباس اور کسی رنگ میں بھی وہاں جاتے ادبیہ کا رشتہ غالب ہی رہتا۔

میں نے انشا جی کی زندگی میں ان کے بارے میں اپنے تاثرات لکھنے کا بارہا ارادہ کیا۔ خود مرحوم سے بھی اپنی اس خواہش کا ذکر کرتا رہا۔ مگر اس کے قدموں کے لیے اس کی عظمت کے شایان شان موتی تراشنے کے واسطے میں 'فرصت کا سنگ میل ہی ڈھونڈتا رہا اور اس بار تیز رو نے منزل کو بھی جا لیا۔ آج اس کی یاد میں ایک سوگوار قلم سے 'یہ چند سطور لکھتے ہوئے میں خود کو اپنے سامنے جس قدر نادم و شرمسار محسوس کر رہا [illegible]

ابن انشاء نے اردو ادب و شعر کو انسانی ذہن و زندگی کو جو کچھ دیا ہے 'اس کے چرچے مدتوں رہیں گے۔ یہ روشنی تاریخ کی امانت 'تہذیب کا جھومر بن چکی ہے۔ میں تو اس وقت اپنے سامنے اس کا چہرہ دیکھ رہا ہوں۔ میں تو اس کی باتیں سن رہا ہوں۔ ہنستا ہوا چہرہ۔ مسکراتی ہوئی باتیں 'اس کی یاد 'اس کی باتوں سے تاب دار ساعتوں کے بے شمار موتی 'اس وقت ذہن میں چمک رہے ہیں۔ میں اس تحریر میں مرحوم سے صرف اپنی آخری ملاقات کا ذکر کروں گا۔

گزشتہ برس ستمبر اور اکتوبر کے مہینوں میں مجھے انگلستان کی سیاحت کا موقع ملا تو میں نے لندن میں اپنے ڈیرے پر اترتے ہی انشا جی کے گھر فون کیا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ وہ سو رہے تھے۔ مجھے ان کی علالت کا علم تھا۔ میں نے ان کو جگانا مناسب نہ سمجھا۔ اپنی آمد کی رپورٹ لکھوا دی۔ رات کو گھوم پھر کر گھر واپس آیا تو معلوم ہوا کہ انشا جی کئی مرتبہ ٹیلی فون کر چکے ہیں۔ باتوں میں وہی شگفتگی 'لہجے میں وہی کھنک تھی۔ کہنے لگے۔

"ارے آپ تو واقعی ہیں 'آپ کا فون میرے بھتیجے نے سنا تھا۔ آپ کا نام سنا تو یقین نہ آیا کہ واقعی آپ ہوں گے۔ جو شخص تیس برس میں راولپنڈی سے نہیں نکلا وہ آخری عمر میں خاک مسلمان ہو گا۔ میں سمجھا سید سعید جعفری ہوں گے کہ وہ بھی اپنے مخدوم ہیں۔ بہر حال خوش آمدید 'قدم اگر مبہم نہ شود..... بھتیجی 'آپ بوریا بستر اٹھا کر یہیں اٹھ آئیے۔ گھر میں بھی گنجائش ہے۔ دل میں اس سے زیادہ گنجائش ہے۔"

ملاقات اگلے روز ہوئی 'طے ہوا تھا کہ میں سفارت خانے پہنچ جاؤں۔ سفارت خانے پہنچا تو استقبالیہ میں (اردو کی نامور شاعرہ) محترمہ سحاب قزلباش مل گئیں۔ ان کو سفارت خانے کے اندر کی سب خبر تھی۔ انشا جی تو دفتر نہیں آئے تھے البتہ ان کے پرسنل سیکریٹری [illegible] منتظر تھے۔ جو ہمیں موٹر میں بٹھا کر انشا جی کے گھر لے گئے۔

انشا جی بلغراڈ اسکوائر کے فیشن ایبل علاقے میں واقع عالی شان فلیٹوں کے سلسلے کے ایک فلیٹ میں مقیم تھے۔ آس پاس سب عرب شیوخ 'امرا و روسا' مکانوں کے اس پورے سلسلے میں صرف "ابن انشاء" ہی کے نام کی تختی نصب دیکھی۔ خط نسخ میں لکھا ہوا "ابن انشا" کسی عرب کا نام معلوم ہوتا تھا۔ انشا جی گاؤن پہنے 'ڈرائنگ روم میں میرا انتظار کر رہے تھے۔ سامنے میز پر تازہ ڈاک سے آئے ہوئے 'اردو کے اخبارات و رسائل رکھے تھے۔ نہایت تپاک سے ملے۔

صحت بہتر پائی۔ چہرے پہ بشاشت کھیل رہی تھی اور گود میں دونوں بیٹے سعدی اور رومی کھیل رہے تھے۔ تین چار گھنٹے کی بیٹھک رہی۔ پہلا سوال یہ کیا '

کوئی تازہ کتاب یا رسالہ بھی لاسکو۔ ہم یہاں اردو کتابوں کے لیے ترس جاتے ہیں۔ فردا" فردا" ہر دوست کی خیروعافیت دریافت کرتے رہے کہ۔

کس حال میں ہیں یاران وطن

اپنی صحت کے بارے میں کہا کہ اب پہلے سے بہت بہتر ہوں۔ ہفتے میں ایک دن معائنہ کرانے ہسپتال جاتا ہوں۔ اس روز ہسپتال کا دن تھا۔ اسی لیے سفارت خانے میں نہ آسکے۔ بھابھی نے کھانے پر بہت تکلف کر رکھا تھا۔ انشاجی نے ایک پرہیزی قاب میں سے کھچڑی کے چند نوالے کھائے۔

میرے پاس وقت کم تھا اور میں دیکھنا بہت کچھ چاہتا تھا۔ مشورہ دیا۔ برطانیہ ضرور دیکھیے مگر یہ بھی دیکھیے گا کہ لندن کا کوئی عجائب خانہ یا کتب خانہ کوئی پارک یا تاریخی مقام یا کوئی ممتاز دانش گاہ نہ رہ جائے۔ انگلستان میں جو کچھ ہے 'لندن میں پڑا ہے۔ بلکہ ساری دنیا لندن میں پڑی ہے۔ ہم خود جتنے لندن میں پائے جاتے ہیں اتنے اپنے ہاں بھی کہیں ملتے۔ وہ موتی قلم کے [illegible] ہوا ہو گی۔

باتوں میں بھی ظرافت کی رس ملائی نمایاں تھی۔ ایک موقع پر کہا بھئی ہم تو لندن میں آکر انگریزی بھولتے جارہے ہیں۔ سفارت خانے میں ہم لوگ اردو بولتے ہیں۔ جہاں ہم رہتے ہیں۔ پاس پڑوس میں دور دور تک عرب 'شیوخ نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ بازار میں اشیاء کا بھاؤ تاؤ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

روز مرہ کی زندگی میں کسی انگریز سے ہمارا ٹکراؤ نہیں ہوتا ہمیں تو کراچی واپس جاکر انگریزی کی کلاس میں دوبارہ داخلہ لینا پڑے گا۔

برطانیہ کے سب شہروں میں دلدادگان اردو نے اپنی مجلسیں قائم کر رکھی ہیں۔ ابن انشاء کی لندن آمد کا غلغلہ تو مچا ہوا تھا۔ مگران کے پرستار ابھی ان کے راستے میں آنکھیں ہی بچھائے بیٹھے تھے کہ انشاجی علالت طبع کے باعث ادبی استقبالیوں میں شرکت نہیں کرتے تھے

بریڈ فورڈ میں (اردو کے ممتاز افسانہ نگار) مقصود الٰہی شیخ اور جاوید اختر بیدل 'اور بعض دوسرے ادیبوں نے اپنے اپنے حلقے کی طرف سے ان کے اعزاز میں ایک ایک ہفتے کے پروگرام تشکیل دے رکھے تھے۔ میں گھوم پھر کر لندن آیا تو میں نے ان سے کہا۔

"آپ اپنے پرستاروں کو ترسا رہے ہیں۔" کہنے لگے۔

"فی الحال ڈاکٹر اس کی اجازت نہیں دیتے۔ یوں بھی میں ہنگاموں سے گھبراتا کتراتا ہوں۔"

ٹیلی فون پر تو ان سے کئی مرتبہ بات ہوئی مگر ملاقات صرف دو مرتبہ ہو سکی۔ ایک مرتبہ خود ان کے گھر پر' دوسری مرتبہ لندن کے مشہور مشرقی ریستوران گندن میں۔ جہاں جناب آئی ایچ برنی نے دوپہر کے کھانے پر' چند دوستوں کی تقریب ملاقات کا اہتمام کیا تھا۔ انشاجی کی پھلجھڑیوں نے محفل کو شروع سے آخر تک کشت زعفران بنائے رکھا۔ ایک مرتبہ درمیان میں اٹھ کر کسی کا ٹیلی فون سننے لگے۔ آکر بتایا پاکستان سے کوئی معائنہ ٹیم آئی ہوئی ہے۔ سوچتا ہوں کھانے کے بعد سفارت خانے سے ہوتا ہوا گھر جاؤں اور کھانے کے بعد میں ہی انہیں 'برنی صاحب کی موٹر میں سفارت خانے تک چھوڑنے گیا۔ جہاں سفارت خانے کے دروازے کے سامنے ہم نے ایک الوداعی معانقہ کیا کہ اگلی صبح میں وطن واپس جا رہا تھا۔ کیا معلوم تھا" وہ ہماری آخری ملاقات تھی۔

انگریزی پڑھنے کے سلسلے میں جب کراچی کا ذکر آیا تو انشاجی نے یہ بھی کہا تھا کہ ہر آدمی کسی نہ کسی شہر سے منسوب ہو جاتا ہے۔ مولانا چراغ تڑپتے رہے۔ آپ کو اسلام آباد ہو گیا ہے۔ ہمیں کراچی پسند ہے پایان کار 'شعروادب کا یہ آفتاب' کراچی ہی کی خاک میں آسودہ ہوا۔





مصنف 'اداکار 'کمپیئر

مستنصر حسین تارڑ سے ملاقات

آمنہ مفتی

مستنصر حسین تارڑ کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں کہیں وہ سخت کوش سیاح ہیں 'کہیں اپنی ذات کی نفی کرکے کسی اور نام کی شناخت لیے کھڑے ہوتے ہیں یعنی اداکاری کر رہے ہوتے ہیں' کہیں بچوں سے مخاطب ہیں تو ان کے چاچا جی بنے ہوئے ہیں 'جب ناول لکھتے ہیں تو رنگ رنگ کے کرداروں سے زمان و مکان کو اجاگر کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ اپنی ہر حیثیت میں مستحکم ہیں' مقبول ہیں۔ خواص و عوام میں پہچانے جاتے ہیں۔ لوگ انہیں جانتے ہیں اور مزید جاننے کی خواہش رکھتے ہیں پچھلے دنوں ان کا ضخیم ناول 'خس وخاشاک زمانے' منظر عام پر آیا ہے۔ ہم نے بطور خاص اس ناول کے حوالے سے کچھ غیر رسمی گفتگو کی 'جو پیش خدمت ہے۔

س: اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیں؟

ج: "بیٹا بھئی پچھلے دنوں ایک خاتون میرے پاس' تشریف لائیں اور انہوں نے کہا کہ اپنی زندگی کے بارے میں ذرا تفصیل سے بتائیں۔ میں نے کہا میری زندگی اکہتر برس ہے۔ اسے بیان کرنے کے لیے بھی اکہتر برس ہی لگیں گے۔ میرے پاس تو سنانے کے لیے اکہتر سال ہیں کیا آپ کے پاس بھی ہیں؟ تو چلیں میں مختصرا" بتاتا ہوں۔ میں لاہور میں پیدا ہوا مسجد میں پڑھا 'ہم لڑکے لڑکیاں پڑھتے تھے 'استاد بہت مار پیٹ

کرتے تھے جس کی وجہ سے میں مذہب سے تھوڑا خائف رہا۔ پھر میں مشن ہائی اسکول رنگ محل میں داخل ہو گیا۔ اس کے بعد میرے والد نے گکھڑ منڈی میں سیڈ پروڈکشن کا فارم بنایا تو میں گکھڑ منڈی چلا گیا۔ پھر واپس لاہور، مشن ہائی اسکول رنگ محل، اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھا۔ سولہ سال کی عمر میں پڑھنے کے لیے باہر چلا گیا۔ وہاں میری تعلیم۔ بس کچھ غیر رسمی ہی رہی، مطالعہ کیا، بہت مطالعہ کیا، فلمیں دیکھیں، آرٹ گیلریز، کیمپنگ، شاید میں خود کو explore (دریافت) کر رہا تھا اور یہی تجربہ میرے کام آیا۔"

س: "مطالعہ؟ کوئی خاص ادیب پڑھا؟"

ج: "مطالعہ میں نے ہر طرح کا کیا، ہر چیز پڑھی حتیٰ کہ ابن صفی اور تیرتھ رام فیروز پوری کے ناول بھی پڑھے اور ابن صفی کا تو میں یہ کہوں گا کہ پڑھنے کے لیے ان کی کتاب موجود تو ہوتی تھی لیکن ان کی شخصیت [illegible] تھے تو مطالعہ میں نے بہت کیا۔"

س: "پہلی مطبوعہ چیز افسانہ، سفر نامہ؟"

ج: "افسانہ نہیں کہہ سکتے، میں نے پہلے بھی ذکر کیا تھا، میں برٹش ڈیلی گیشن کے ساتھ ماسکو گیا، یوتھ فیسٹیول میں۔ تو فیک پاسپورٹ اور ڈاکومنٹس ہوتے تھے، خیر روس اس وقت ایک بڑا پاور والا ملک تھا اور اس فیسٹیول کے مقاصد تھے، ظاہر ہے اپنے نظریے کا پروپیگنڈہ وغیرہ تو تھے۔ حمید نظامی صاحب نے مجھے کہا کہ آپ پاکستانی ہیں اور وہاں گئے ہیں تو اپنے سفر کا کچھ حال لکھیں۔ میں نے "لندن سے ماسکو تک" لکھا جو "قندیل" میں شائع ہوا۔ پھر فاختہ نو برس کے وقفے کے بعد میں نے سترہ یورپی ممالک کے سفر کیے اور ان کا سفر نامہ "نکلے تری تلاش میں" لکھا۔ اندلس بھی اس سفر میں تھا، لیکن میں نے فیصلہ کیا کہ اندلس کو الگ ٹریٹ کیا جائے اور اس کا ذکر پھر "اندلس میں اجنبی" میں ہے اسے آپ ابتدا کہہ سکتے ہیں۔ اردو بازار سے اس وقت ڈھائی روپے کا رجسٹر آتا تھا، تو وہ لیا اور ڈائریاں سامنے رکھ کے لکھنا شروع کیا۔ ہاں میری ایک عادت تھی میں ڈائری لکھتا تھا، بہت باقاعدگی سے اور انگریزی میں۔ پچھلے دنوں میں نے ڈائریاں دیکھیں، چالیس، پینتالیس سال کی ڈائریاں تھیں۔

اور I war shocked کہ ان میں ایسے لوگوں کا ذکر تھا جنہیں میں نہیں جانتا یا بھول چکا ہوں تو میں نے چند ایک ڈائریاں چھوڑ کے باقی تلف کر دیں کہ کبھی یہ تو ان لوگوں کا ذکر کرتی ہیں جن سے میں نہیں ملا تو پھر۔ خیر تو وہ ڈائریاں وغیرہ رکھ کے یہ سفر نامہ لکھا اور اسلوب میرا، چونکہ میں انگریزی میں سوچتا تھا اور ایک برٹش قسم کی حس مزاح تھی۔ شاید میرے انگلینڈ کے قیام یا میرے مزاج کا حصہ تھی تو جب اسے لکھا تو کیونکہ نیا اور منفرد انداز تھا تو لوگوں نے بہت پسند کیا۔"

س: "آپ کے بچوں نے ماشاء اللہ اچھی تعلیم پائی۔"

ج: "ہاں، بچے ماشاء اللہ اچھے ہیں۔ ہم مال پہ رہتے تھے تو بچے کیتھڈرل میں پڑھے، پھر دونوں بیٹے NCA میں گئے، آرکیٹیکٹ بنے، سول سروسز میں گئے، پڑھائی میں اچھے ہی تھے۔

سلجوق پانچویں میں تھا تو میں نے اس سے کہا۔ "یار نمبر کم ہیں۔"

تو بڑا شرمندہ ہوا کہ "بس ابو اب آپ کا نام روشن کروں گا۔"

میں نے کہا "میرا نام تو پہلے ہی ضرورت سے زیادہ روشن ہو گیا ہے، آپ اپنی فکر کریں۔"

ایک بیٹا فارن سروس میں ہے، دوسرا سسٹم میں، اے سی ہے۔ بیٹی کیتھڈرل میں گئی پھر کنگ ایڈورڈ سے پڑھا۔ بچوں نے اپنے پروفیشن خود چنے، بچوں کو لکھنے کا شوق نہیں۔ ہاں میرا [illegible] انٹرویو وغیرہ [illegible] مشرق میں شائع ہوئے، مگر باقاعدہ کوئی اس طرف نہیں آیا۔"

س: "پاکستان میں کمرشل رائٹنگ کا کیا اسکوپ ہے؟"

ج: "بے شمار، بھئی اتنے چینل اور ان پہ اتنے ڈرامے تو پروفیشنل رائٹنگ کا بڑا اسکوپ ہے۔"

س: "[illegible] پروفیشنل رائٹر آپ کا تجربہ کیا رہا؟"

ج: "الحمدللہ بہت اچھا رہا۔ میری ہر کتاب [illegible] سلسلہ ہے کہ میں گھر کا بڑا بچہ تھا اور [illegible] والد اس وقت بہت اسٹیبلش تھے۔ اس زمانے میں انہوں نے مجھے اپنے خرچ پہ باہر پڑھایا اور میں نے اتنا عرصہ بغیر کوئی جاب وغیرہ کیے باہر گزارا تو میرا معاملہ تھا چاندی کا چمچہ یا جو کہتے ہیں۔"

س: "تو آپ کی فیملی فورچون نے آپ کو سپورٹ کیا؟"

ج: "نہیں، ایسا نہیں۔ ایسٹ پاکستان کے سانحے نے والد صاحب کا کاروبار بہت متاثر کیا اور مجھ پہ ایک وقت ایسا آیا کہ میرے پاس دو راستے تھے، میں اپنا بزنس چلاؤں یا لکھوں۔

"سنگ میل" والوں نے کہا "جی آپ لکھیں، آپ لکھیں تو ہم آپ کو ماہانہ بھی Pay کر سکتے ہیں۔"

تو یہ اللہ کا بڑا کرم رہا۔ کتابوں کی رائلٹی وغیرہ پھر اس وقت کمرشل رائٹنگ تھی۔ اے حمید نے دو سو کتابیں لکھیں، بچوں کے لیے، اور ویسی کتابیں، مطلب بچوں کے لیے جیسی کتابیں لکھی جاتی تھیں وہ میں ایک ہفتے میں لکھ لیتا، لیکن یہاں میری بیوی نے مجھے روک دیا کہ نہیں آپ وہی لکھیں جو آپ لکھنا چاہتے ہیں اور اس نے مجھے کبھی مالی طور پہ نہیں ستایا۔ زیور، کپڑا وغیرہ خود لا دیا تو ٹھیک ورنہ مطالبہ نہیں کیا۔"

س: "تو گویا آپ کے پیچھے بھی ایک عورت کا ہاتھ ہے؟"

ج: "(ہنستے ہوئے) ایک عورت کا نہیں کئی عورتوں کا ہاتھ ہے۔ جن کے نام میں یہاں لینا نہیں چاہتا اور مجھے اس myth سے بھی اختلاف ہے۔ برگد اور چھوٹے پودوں والی، نہیں ادیب کوئی برگد نہیں ہوتا کہ اس کے بچے اس کے سائے میں نہیں پنپ سکتے۔ بس ادیب اپنے بچوں کو اتنا ٹائم نہیں دیتا جتنا وہ ڈیزرو کرتے ہیں۔ میرے بچے میرے دوست رہے ہیں۔ میں اپنے بچوں کو اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ ایک دن کشور ناہید نے کہا تم ان کی نانی ہو جو انہیں لیے پھرتے ہو تو میں نے کہا بھئی میرا ان کے بغیر دل نہیں لگتا، میں اداس ہو جاتا ہوں۔"

س: "پیار کا پہلا شہر؟"

ج: "جی یہ ناول، اس کے قریب "تیس" کے قریب ایڈیشن نکل گئے ہیں۔ بہت پڑھا جاتا ہے، میں نے اسے دوبارہ پڑھا تو کئی جگہ کچا پن نظر آیا۔"

س: "کچا پن یا تازگی؟"

ج: "تازگی یا کچا پن، لیکن یہ کچھ ہے تو لوگوں کو بڑا پسند ہے۔ میں شادی آن لائن کر رہا تھا تو تین لڑکیاں آئیں، نچلا دھڑ مفلوج، آپس میں کچھ بات کر کے آئی تھیں، میں نے نام پوچھا تو کہا ہم تینوں پاسکل ہیں تو لوگ بڑا پڑھتے ہیں اسے۔"

س: "تینوں زبانوں، اردو، پنجابی، انگریزی، کس میں لکھنا زیادہ پسند ہے یا کس زبان میں زیادہ آسانی محسوس کرتے ہیں؟"

ج: "تینوں میں یکساں آسانی، لیکن اردو، اور یہ میں کوئی اردو کی خدمت نہیں کر رہا، کمیونیکیشن کی وجہ سے، اردو میں کمیونیکیشن کیا جا سکتا ہے۔ "پکھیرو" کے علاوہ میں نے کوئی کتاب پنجابی میں نہیں لکھی۔ ڈرامے بہت لکھے پنجابی میں، پھر وہی بات کہ مسئلہ کمیونیکیشن کا ہو جاتا ہے۔ انگریزی میں لکھنا بھی ویسا ہی ہے، بس ذرا ٹائم زیادہ لگے گا تو لکھا میں نے اردو میں،

لیکن کمبلر نہیں تینوں زبانوں میں ہوں۔"

س: "ڈرامہ کیسا لکھا جا رہا ہے؟"

ج: "ڈرامہ اچھا لکھا جا رہا ہے۔ دیکھیں ہر مصنف کا اس کے پڑھنے والوں کا ایک دور ہوتا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں شفقت صاحب کا "ایک محبت سو افسانے" دوبارہ کیا گیا تو میں نے دیکھا، خاص طور پر وہ چیزیں جن میں میں نے کام کیا تھا لیکن اب وہ بات بنی نہیں۔ کیونکہ وہ ڈرامہ اس وقت لکھا گیا تھا۔ اس وقت کے ڈائریکٹر کے لیے "اسٹیج ڈرامے کی بات دوسری ہے۔"

س: "آپ کے خیال میں خواتین اور مرد حضرات کا ادب الگ الگ ہے؟"

ج: "نہیں! ایسا نہیں ہے۔ ہاں البتہ کچھ ادب ذرا زیادہ پختہ ہوتا ہے کیونکہ اگر یہ تخصیص ہوتی تو بانو قدسیہ، قرۃ العین حیدر ان سب کو تسلیم نہ کیا جاتا۔"

س: "اچھا اب آپ کے ناول "خس و خاشاک زمانے" کی طرف آتے ہیں۔ ناول کا ہیرو بخت جہان، جسے آپ نے بہت مارجن دیا کیا یہ مارجن سرو ساسی کو نہیں ملنا چاہیے تھا؟ بخت جہان اپنی تمام تر بدی اور برائیوں کے باوجود بیچارا آدمی ہے، اس سے کوئی نفرت نہیں کر سکتا۔"

ج: "ہاں وہ ہے، وہ ایسا ہی ہے اور یہاں آپ غلطی کر رہی ہیں سرو ساسی کو بڑا مارجن دیا ہے۔ وہ آخر تک اپنی حالت میں susvive کر رہا ہے۔"

س: "پھر یہ کہ موجو اگر سید بن جاتا ہے تو اسے معاف نہیں کیا جاتا؟ کیا اسے یہ مارجن نہیں مل سکتا تھا؟"

ج: "کیوں نہیں، موجو کہتا ہے کہ لوگ بدل کے کچھ سے کچھ بن گئے تو اگر میں سید ہو گیا تو کیا؟ تو مارجن تو اسے ملا ہے۔"

س: "اچھا، ماہلو کا کردار، کیا یہ واقعی پنجاب کی کوئی myth ہے یا؟"

ج: "ماہلو، یہ میں آپ کو بتاتا ہوں، ہم چھ بہن بھائی ہیں، تین کو مجھ سمیت افریقہ کے کسی ملک کا باشندہ سمجھا جاسکتا ہے، ایک کو چلو انڈین کہہ لیں لیکن باقی بڑی آسانی سے جرمن یا کوئی خوب صورت یورپی نسل سمجھے جاسکتے ہیں۔ وہ اباجی پہ گئے ہیں۔ میرا چھوٹا بھائی اور بہن شاہدہ۔

تو ایک دفعہ بچپن میں ہم شاہدہ کے ساتھ ننھیال کی گلی میں سے گزر رہے تھے تو ایک بوڑھی خاتون نے روک کے پوچھا کہ "یہ ماہلو کی کیا لگتی ہے؟"

تب ہمیں خالہ ماہلو کے وجود کا پتا چلا۔ ماہلو میری خالہ تھی۔ بے حد حسین، اور اسی طرح اسے زہر دے کر مار دیا گیا۔ خالہ کے بعد میری بہن شاہدہ بے حد حسین اور پھر اب میری بیٹی وہ بھی خالہ ماہلو کی طرح ہے تو پھر اس تسلسل کو ذرا افسانوی کا رنگ دیا کہ اس خاندان کی ہر نسل میں ایک ماہلو جنم لیتی ہے جو بڑی حسین ہوتی ہے مگر بد نصیب۔ اسی طرح امیر بخش میں آپ کو اباجی کی جھلک ملے گی۔"

س: "سرو ساسی کون ہے؟"

ج: "سرو قطعاً" فکشن ہے۔ ہاں میں نے ایسے کردار دیکھے ہیں۔ مگر سرو فکشن ہے۔ وہ میرے گرد و نواح میں نہیں تھا۔ البتہ کچھ چیزیں تھیں۔ ہماری ایک مٹھائی والی [illegible] کی بیٹی پہ آئی تو ایک روز ہم ناشتا کر رہے تھے تو میری بیوی نے کہا کہ "ماں! تو مسلمان کیوں نہیں ہو جاتی؟"

اس نے کہا "پتر جے میں مسلمان ہو جاواں، تے تو مجھے اپنے ساتھ والی کرسی پہ بٹھا کے انڈے کھلائے گی؟ نہیں نا! تو میں اپنا ایمان کیوں خراب کروں؟"

یہ چیز مجھے بہت فیسی نیٹ ـــــ کی اور سرو ساسی کے عقیدے میں آپ کو یہی جھلک ملے گی۔"

س: "آپ کی ہیروئنز اکثر تھوڑی بہت پیدائشی جسمانی معذور ہی ـــــ ہیں، جیسے پاگل، فاختہ اور پھر صاحباں؟"

ج: "صاحباں ہیروئن نہیں۔

She was one of those characters

تو یہ کردار اس دنیا کے ہی ہیں۔ میں نے جان بوجھ کر ایسے نہیں لکھے بلکہ وہ ایسے ہیں۔ فاختہ تو اس کا [illegible] اور اسی طرح صاحباں، یہ ایک [illegible] جسمانی طور پہ معذور تھی۔ [illegible] ایسے بہت سے مواقع آتے ہیں۔ اب میں نے سوچا کہ جو کچھ مجھے مل رہا ہے میں [illegible] نہیں کرتا۔ اس بچی کا پیار بھی ایسا ہی تھا۔

شروع میں مجھے اس کی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ پھر جب سمجھ میں آئی تو اس کی ماں نے بتایا کہ یہ آپ کی کتابیں پڑھتی ہے مگر مذہب سے دور ہے۔ میں نے بات کی تو اس نے کہا کہ میں نے کیا گناہ کیا تھا مجھے [illegible] اور میں کیوں شکر گزار ہوں۔ اس [illegible] صاحباں کی شکل میں [illegible]

س: "جہان آباد دوبارہ آباد ہو جاتا ہے مگر بخت جہان کا دنیا پور اجڑ جاتا ہے تو یہ کینیڈا میں کیوں بسا؟ اور کیا وہاں بھی دوبارہ دنیا پور والے حالات ہوں گے؟"

ج: "نہیں، وہاں نہیں ہوں گے، دنیا پور نہیں بس سکتا، بس اس کی میعاد پوری ہو گئی۔ ہاں کینیڈا میں وہ سب لوگ رہ سکتے ہیں۔ وہاں یہ روزگار کی تلاش میں ہیں تو وہاں کے حالات اور ہیں۔"

س: "شباہت اور انعام کیا آخر میں وہ بھی دو نئے آدم اور حوا ہیں۔ جو ذات پات، مذہب، نسب نظاموں کو چھوڑتے ہیں، شباہت جو ایک بنگالی اور ساسی کی اولاد ہے۔ pure daughter of soil وہ ایک بے نسب آدمی کے ساتھ بھاگ جاتی ہے؟"

ج: "جی ہاں! نئے آدم اور حوا۔ انعام ایک سیکولر دماغ ہے اس کا کوئی نسب نہیں تو اب اگر سروبا شروع کرتا ہے تو اس کی صورت ہے انعام اور میں امید کا پہلو رکھتا ہوں۔ "راکھ" میں بھی آپ نے یہ دیکھا ہوگا۔"

س: "ناول کا آخر، شباہت اور انعام کا سفر مختلف وادیوں میں سے گزرنا؟"

ج: "ہاں شروع میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ یہ ناول "عطار کے پرندوں کے نام" ہے۔ فرید الدین عطار کے یہ پرندے مسلسل میرے ساتھ ہیں۔ "فاختہ" میں، "پکھیرو" میں، پھر "راکھ" میں کلغندی پرندہ (چار مرغابیاں جن کا تعلق خوشی سے نہیں ہے اور وہ مور جو ہوتا ہے) تو وہی پرندے، فرید الدین عطار کے پرندے ہیں جن کے نام یہ کتاب ہے۔ ناول کے آخر میں جب شباہت اور انعام ان وادیوں سے گزر رہے ہیں تو یہ وہی وادیاں ہیں جن کا سفر عطار کے پرندوں نے کیا اور آخر میں پچھلے کیٹروں میں دور سے آنے والے یہ مسافر وہی پرندے ہیں۔"

س: "آپ ڈائجسٹ وغیرہ تو نہیں پڑھتے ہوں گے، پھر بھی خواتین ڈائجسٹ کے بارے میں کیا رائے ہے؟"

ج: "نہیں۔ نہیں۔ یہ ڈائجسٹ بہت پڑھے جاتے ہیں اور ایک شعاع ڈائجسٹ بھی بہت مقبول ہے۔ میرا ایک انٹرویو جو شعاع میں ری پرنٹ ہوا، اس کے پہلے رسالے کا تو زیادہ ذکر نہیں سنا جس میں سے اسے لیا گیا، لیکن شعاع کا بہت لوگوں نے کہا تو یہ ڈائجسٹ پڑھے جاتے ہیں، اچھے ہیں۔"

انٹرویو کے آخر میں تارڑ صاحب نے اپنے صحن میں اگائے گئے امپورٹڈ [illegible] اور رونمائی دکھائے۔ تارڑ صاحب کی اسٹڈی خاص طور سے بڑی نفاست سے سجی ہوئی ہے اور ان کی شخصیت کی عکاسی کرتی ہے۔ میں ادارہ خواتین اور قارئین کی طرف سے ان کا بہت شکریہ ادا کرتی ہوں کہ اپنے وقت میں سے ہمیں اتنا قیمتی وقت دیا۔

آپ نے بہت سی کہانیاں پڑھی ہوں گی۔ کسی کہانی میں رومان کی چھیڑ چھاڑ ہوتی ہے تو کہیں گرمزی کی نوک جھونک نظر آتی ہے۔ کسی کہانی میں ساس بہو کی چپقلش اور دیورانی جٹھانی کی سازشوں کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ کہانی کے مرکزی کردار' ہیرو اور ہیروئن ہی ہوتے ہیں؟ ہم نے اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے قارئین سے کچھ سوال کیے' ہمارے سوال یہ تھے۔

1۔ آپ کو کس طرح کے ہیرو پسند ہیں' شوخ و شنگ' لائق فائق' غصیلے اور اکھڑ مزاج' من مانی کرنے والے جاگیردار' لاابالی اور ڈھشنگیا۔

2۔ ہیروئن کس طرح کی اچھی لگتی ہے؟ "بگڑی ہوئی امیرزادی" الھڑ لاابالی' بدتمیز اور کم عقل' کم رو لیکن سگھڑ اور سلیقہ مند یا۔

3۔ کس مصنف کے ہیرو' ہیروئن کو پڑھ کر مزہ آتا ہے؟

کہانیاں اور کردار

ادارہ

شائلہ سہیل جاوید۔۔۔ کراچی

اس دفعہ کا سال نو نمبر کچھ انوکھی طرز کے سوالات پر مبنی ہے۔ اس سروے میں دیے گئے سوالات کچھ منفرد لگے لہٰذا انگلیوں میں کھجلی شروع ہوئی کہ اٹھالو قلم' تھوڑا رکھو بھرم' مگر نہ شرم' لکھو جوابات کر کے گرم۔

1۔ ٹین ایج خوابوں کی نگری' جس میں لڑکیاں خاص طور سے اپنے ذہن کے کینوس پر اپنی من پسند تصاویر بناتی رہتی ہیں۔ اس وقت تو ہر طرف راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔ نہ مہنگائی' لوڈشیڈنگ' بچوں کی فیسوں' بجلی کے بل' اور سسرالی ذمہ داریوں جیسے بکھیڑوں سے دور دور کا واسطہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اس دور میں ہر الھڑ لڑکیوں کی طرح مجھے بھی ایسے ہی ہیرو پسند آتے تھے' جو ڈھشنگ پرسنالٹی والے ہوں۔ لمبی سی کار میں سوار' جس کے کندھوں پر نہ ہو ذمہ داریوں کا بار' جو کرے ہماری تعریف بار بار' جو پہنائے ڈائمنڈ کی رنگ اور خوب صورت سا ہار' اور صرف کرے ہم سے ہی پیار۔

مگر جب عملی زندگی میں انسان اور خاص طور سے لڑکیاں قدم رکھتی ہیں تو پتا چلتا ہے کہ یہ تو صرف کتابی باتیں ہیں' جو ان خوب صورت صفحوں والے ایڈیشن میں ہی اچھی لگتی ہیں اور جب وہ معصوم سی لڑکیاں اماں جان بھی بن جاتی ہیں تو سب ہیرو زیرو بن جاتے ہیں' پھر اس ماں کی سوچ کا محور صرف اولاد کی پرورش' ان کی تربیت ان کے خرچے' ان کے کھانے پینے اور ان کی تعلیم کے گرد ہی گھومتا ہے اور وہ ہیرو بھی اباجی بن کر اپنی محبوبہ کو صرف اور صرف ایک باوفا مشرقی بیوی اور ذمہ دار ماں اور فرماں بردار بہو کے روپ میں پسند کرتا ہے۔

2۔ میرے خیال سے اب آگے تو کسی بھی لڑکی کو کوئی ہیروئن اچھی لگتی ہی نہیں۔ کیونکہ آج کل کے دور میں تو ہر لڑکی اپنے آپ کو ہی ہیروئن سمجھتی ہے۔ جب میں لڑکی تھی تو اس وقت تو خیر الھڑ لاابالی لڑکیاں اچھی لگتی تھیں۔ مگر اب شادی کے اٹھارہ سال



بعد جب میری بیٹی ٹین ایج میں ہے تو مجھے کم رو' سگھڑ اور سلیقہ مند لڑکیاں ہیروئن اچھی لگتی ہیں۔

مانا کہ مائیں لیکن ہر دور میں لڑکیوں کا سگھڑاپا ان کی شخصیت میں چار چاند لگا دیتا ہے۔ زبان چلاتی' تیز مزاج بولتی اور کم عقل لڑکیاں کسی بھی دور میں نہ لڑکوں کو اچھی لگتی ہیں' نہ ہی ان کی اماؤں کو' معصوم لڑکیاں' ذہین اور سلیقہ مند ہیروئن میری اولین ترجیح ہو گی۔ یہی دعا ہے خدا میرے بیٹیوں سمیت تمام لڑکیوں کو اپنے والدین اور شوہروں کا فرماں بردار بنائے۔

3۔ یوں تمام مصنفائیں اپنی اپنی ہیروئن کو ایک مثال کے طور پر پیش کرتی ہیں۔ مگر مجھے نبیلہ ناز' آسیہ رزاقی اور کچھ کچھ نمو بخاری صاحبہ کی ہیروئنیں اچھی لگتی ہیں۔ رخسانہ نگار عدنان کی ہیروئن ہر محاذ پر فٹ ہوتی ہے۔ وہ مشکلات کو اللہ کی دین سمجھ کر قبول کرتی ہے اور پھر اس کا مقابلہ احسن طریقے سے کرتی ہے۔ عمیرہ احمد کی ہیروئن کو تو صبر و برداشت کی [illegible] اس قدر گزارا جاتا ہے کہ وہ تپ کر کندن بن [illegible] "مومن عورتیں"۔ کاش! میرے اندر بھی عمیرہ کی ہیروئن جیسا صبر اور برداشت آ جائے۔

سورٹھ سانند۔۔۔ روحل والی گاؤں

پہلے تو قارئین' اسٹاف اور سب بہنوں کو میری طرف سے نیا سال بہت مبارک ہو' خدا کرے یہ نیا سال آپ کے لیے ڈھیروں خوشیاں لائے۔

اس بار خواتین نے ہم سے سروے میں اچھوتے اور مختلف سوال کر کے دل خوش کر دیا۔ یہی ان کتابوں نے ہم کو مذہب سے بہت قریب کیا۔

1۔ ہم جب کہانی پڑھ رہے ہوتے ہیں تو ہمیں اس وقت جس طرح کا بھی ہیرو بس اچھا لگتا ہے' چاہے اکھڑ مزاج ہو' اپنی من مانی کرنے والا یا لائق فائق اور ڈھشنگ ہو تو کیا کہنے' مجھے ذاتی طور پر من مانی کرنے والا جاگیردار بہت پسند ہے۔" جو پہلے تو جاں سے



گزر گئے" میں عالم شاہ اور "ظار لاہوتی" میں منہاج حسین پاشا اور بہت زیادہ محبت کرنے والا ڈیشنگ خوب صورت اور کاش ریئل لائف میں مل جائے مسرت ان خیمجوں پر ہے جو بن کھلے مرجھا گئے مگر خوابوں پر تو پابندی نہیں نا!

2۔ اور مجھے ہیروئن ڈرپوک سی کم رو اور سگھڑ اچھی لگتی ہے ہیرو سے ڈرنے والی۔

3۔ کئی مصنفہ کی ہیرو ہیروئن پڑھ کر مزہ آتا ہے جس میں رفعت سراج اور نبیلہ ابر راجہ کے ہیرو ہیروئن پڑھ کر اچھا لگتا ہے مجھے نبیلہ عزیز کے بھی ہیرو ہیروئن بہت اچھے لگتے ہیں مگر نبیلہ ابر راجہ کا ہیرو مجھے بہت بہت اچھا لگتا ہے اور فرحت اشتیاق کا شعر حسین اتنا اچھا لگا کہ بس۔ اور آخر میں مجھے مریم عزیز کی کہانی "دل کو رو کا تھا مگر" میں آفاق نعیم کا کردار مجھے اتنا اچھا لگا جسے میں کبھی بھی نہ بھولوں گی کیوں کہ وہ میری زندگی تھا اور عمیرہ احمد کا ناول "امر بیل" کا ہیرو عمر جہانگیر کی پرسنالٹی غضب کی تھی مجھے بہت اچھا لگا۔

حنا سلیم اعوان تھگوں آخوان بانڈی تحصیل و ضلع ہری پور ہزارہ

1۔ کیا مزے دار سوال نامہ تیار کیا ہے آپ نے۔ الف۔ پہلا سوال تو ٹھاہ کر کے دل پہ لگا۔ کیا پوچھا آپ نے ہمیں...... یعنی کہ ہمیں کس طرح کے ہیرو پسند ہیں۔ جناب وہ ہیرو ہی کیا جو پسند نہ آئے۔ ہیرو تو پھر ہیرو ہے وہ کیونکر پسند نہ آنے لگا۔ سوچ بچار کے بعد جو ہیرو ہم نے سلیکٹ کیے ہیں ذرا ملاحظہ ہوں۔ غصیل اور اکھڑ مزاج ہیرو بالکل پسند نہیں۔ خواہ مخواہ ہر کسی پر رعب جمانے کو تیار رہتے ہیں۔ اور تو اور کبھی کبھار ہاتھ جمانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ لاابالی ہیرو بھی کچھ خاص اچھے نہیں لگتے۔ ان کے بارے میں بس پڑھ لیتے ہیں۔ ہمیں شوخ و شنگ "لائق فائق" ویل ایجوکیٹڈ ویل مینرڈ ڈیشنگ ٹونگ اور۔ چند تم ہیرو پسند ہیں۔ یہ والے ہیرو تو ہر کسی کو ہی پسند ہوں گے۔ کیوں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟



بلکہ خوب صورت، سگھڑ اور سلیقہ مند ہو۔ کیونکہ ہیرو اپ سیٹ ہوتی ہیں کیونکہ وہ ہوتی ہی ایسی ہیں کہ کوئی مائی کی لال انہیں ناپسند نہیں کر سکتی۔ ہیرو کو چھوڑیں نا۔ اسے پسند آتی ہے تب ہی تو وہ ہیروئن کے منصب پر فائز ہوتی ہے۔ مجھے ویل ایجوکیٹڈ اور با اعتماد ہیروئن زیادہ اچھی لگتی ہے۔

3۔ ویسے تو ہر اس مصنفہ کے ہیرو ہیروئن کو پڑھ کر مزہ آتا ہے جن میں مندرجہ بالا خوبیاں موجود ہوں۔ فرحت اشتیاق، عمیرہ احمد، نگہت عبداللہ، رخسانہ نگار عدنان، عالیہ بخاری اور مریم عزیز کے ہیرو ہیروئن کو پڑھ کر مزہ آتا ہے۔ نمرہ کے ہیرو اور ہیروئن (پریشے، افق ارسلان) کو پڑھ کر بے حد مزہ آیا اور بھی بہت سی مصنفین کے کچھ ہیرو ہیروئن کو پڑھ کر بے حد مزہ آیا تھا۔

صباء شفیق۔۔۔ جہلم

تمام پڑھنے والوں کو نیا سال مبارک ہو خدا کرے یہ سال میرے پاکستان اور یہاں رہنے والے ہر پاکستانی کے لیے امن اور عافیت کا سال ہو (آمین)

1۔ ہم نے ہیرو یا ہیروئن ان کے خاکے کچھ اس طرح کے بنائے ہیں کہ ہیرو خوب ڈیشنگ پرسنالٹی والا جس کے پاس لمبی سی گاڑی ہو، نہایت خوب صورت اور دولت مند بلاشبہ ایسے ہیرو موضوع کے حساب سے کہانیوں کا حصہ ہوتے ہیں اور کہانیاں اچھی بھی ہوتی ہیں مگر کہانیوں میں ایسے ہیروز زیادہ پسند کرتی ہوں جو مٹی سے پیار کرنے والے ہوتے ہیں۔ سادہ مگر محبت سے بھرپور اور سب سے بڑھ کر جو بہادر ہوتے ہیں۔ بزدل ہیرو تو ذرا اچھے نہیں لگتے "نسیم حجازی" کے ناولز کے ہیرو جو اصل میں قوم کے ہیرو ہوتے ہیں اب کہانیوں میں ایسے ہیروز نہیں ملتے اور رائٹرز بھی کیا کریں ایسے ہیروز تو حقیقت میں بھی نہیں نظر آتے تو کہانیوں میں کیسے نظر آئیں گے کیونکہ وہی لکھا جاتا ہے جو ہمارے آس پاس ہوتا ہے ان میں تو مجھے سوٹڈ بوٹڈ ہیرو کی بجائے سادہ اور رف



لف ہیروز یادہ اچھا لگتا ہے۔

2۔ عمیرہ احمد کی ہر کہانی کی ہیروئن مجھے پسند ہے جو کہ مضبوط کردار کی مالک ہوتی ہے' باحوصلہ' اللہ سے بہت پیار کرنے والی اور ساری خوب صورتی اس کی پرسنالٹی میں چھپی ہوتی ہے۔

3۔ آپ مجھ سے اتفاق کریں گی کہ فرحت اشتیاق کی کہانیوں کے ہیرو ہیروئن کو پڑھ کر بہت مزہ آتا ہے بلکہ ان پر بے حد پیار آتا ہے اور ایسا کیوں نہ ہو فرحت آپی خود اپنے کرداروں کو بہت محبت سے لکھتی ہیں۔ ان کے ہیرو ہیروئن کے ساتھ رونا بھی اچھا لگتا ہے اور ہنسنا بھی' فرحت آپی کے کردار انمول ہوتے ہیں۔ تب ہی شاید ان سے کہا بھی جاتا ہے کہ ان کے یہ کردار اس سیارے کے نہیں لگتے مجھے فرحت آپی کے ہیرو اور ہیروئن کی خاص بات یہ لگتی ہے کہ وہ بے تحاشا خوب صورت نہیں ہوتے' بلکہ وہ خوبیوں کے مالک ہوتے ہیں اُن سے صرف محبت اور محبت پھوٹتی ہے اس لیے انہیں پڑھ کر مزہ آتا ہے' کیونکہ اس کائنات کا وسرا نام ہی محبت ہے۔

حنا زین۔۔۔ واہ کینٹ

1۔ واہ کیا سوال ہے شوخ و شنگ ہیرو کے پسند نہیں مگر آخر میں آکر وہ مدبر و سنجیدہ کیوں ہو جاتے ہیں۔ لائق فائق کی کیا بات ہے۔ آخر کتابی کیڑوں کا بھی دل ہے۔ غصیل اکھڑ مزاج شروع میں تو در و دیوار ہلا دیتے ہیں مگر جیسے ہی ہیروئن کا انکار سنا فوراً "تھرمو پور کی دیوار" ثابت ہوتے ہیں۔

من مانی کرنے والے جاگیردار' ہیروئن کے لیے اصول کچھ اور' باقیوں کے لیے اصول کچھ اور لاابالی ہیرو ہر مسئلے کا حل چٹکیوں میں پیش لیکن جیسے ہی اپنی ہیروئن نے اکڑ دکھائی۔ سائیڈ ہیرو میدان میں کود پڑا۔ اور جہاں تک پسند کرنے کی بات ہے تو شوخ و شنگ ہیرو پسند آتے ہیں کہ مزاح کہانی میں ان ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔

2۔ بگڑی امیرزادی کے ہیرو پر ترس آتا ہے' الھڑ و لاابالی کے بچپنے پر پیار' بدتمیز و کم عقل پر افسوس اور زیادہ افسوس بے چارے ہیرو پر ہوتا ہے۔ لیکن پسند آخر کار کم رو سلیقہ مندی آتی ہے۔ آخر کو سیکھنے کا موقع بھی تو اسی ہیروئن سے ملتا ہے۔

3۔ تیسرے سوال کا جواب تو سوچنا ہی نہیں پڑا' صرف اور صرف فرحت اشتیاق کے ہیرو ہیروئن کو پڑھنا اچھا لگتا ہے۔

حمیرا رضا۔۔۔ لاہور

1۔ بھئی آپ کے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں بالکل جمود پسند نہیں ہوں۔ ایک مزاج رکھ ہی نہیں پائی تو ہیرو کیسے ایک طرح کے پسند کرلوں۔ ہر لڑکی کی طرح بلکہ اب لڑکی کہنا بالکل فضول لگ رہا ہے کیوں کہ میں ایک عدد بچی کی امی جان جو ہوں' مجھے بھی ڈیشنگ ہیروز بہت اٹریکٹ کرتے ہیں' جب اللہ نے کائنات کی تخلیق میں حسن و رعنائی کو پیچھے نہیں چھوڑا تو ہم کون ہوتے ہیں' جو حسن و خوب صورتی کو پسند نہ کریں لاابالی ہیروز کی کیا بات ہی ہے اظہار نہ تو ... سمجھتے ہیں ... اور ... صرف کہانی کی دلچسپی برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں بلکہ میرے جیسی بندی جو کہ جلد غصے میں آجائے اسے اپنی ہنسانے کی کوالٹی سے ٹھنڈا رکھتے ہیں یہ ہیرو مجھے اس لیے بھی اچھے لگتے ہیں کہ یہ بنتے کھیلتے اظہار بڑے بڑے اور نہ حل ہونے والے مسائل کو چٹکیوں میں ایسے حل کرتے ہیں کہ دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ لائق فائق ہیرو ہر لڑکی کا مقدر کہاں؟

اس کے باوجود یہ اپنے اندر خطرناک حد تک متاثر کرنے کی صلاحیت ضرور رکھتے ہیں اور ہر دم ہماری دعاؤں میں شامل رہتے ہیں کہ کاش! کسی طرح ہمیں مل جائیں۔ غصیل اکھڑ مزاج اور من مانی کرنے والے ہیرو بس اس وقت تک ہی اچھے لگتے ہیں جب تک الف کی طرح سیدھے ہو جائیں' ورنہ پھر بے شک جہنم میں جائیں' ہمیں پروا نہیں اور بزدل ہیرو تو بہت ہی برے لگتے ہیں' دل چاہتا ہے کہ پشاوری اسپیشل چپل سے ان کی پٹائی لگواؤں' تاکہ ناک کے رستے ساری بزدلی باہر آجائے۔

3۔ دوسرے سوال کا سیدھا جواب یہ ہے کہ مجھے ایسی ہیروئن' بہت ہی زیادہ متاثر کرتی ہے' جو کہ باہمت پُرخلوص ہو اور ہر طرح کے حالات کا انتہائی بہادری اور صبر سے مقابلہ کر سکتی ہو۔ دراصل اس طرح کی ہیروئن ہمارے معاشرے میں موجود ان لڑکیوں کے لیے رہنما کا درجہ رکھتی ہیں' جو کہ حالات کی ستائی ہوئی اور ڈری سہمی ہوئی ہیں اور مایوسی کی انتہاؤں کو پہنچ کر غلط فیصلے کر بیٹھتی ہیں' یہ ہیروئنز انہیں بھٹکنے سے بچاتی ہیں اور بہادری کا سبق دیتی ہیں۔ آپ کے دیے ہوئے آپشنز میں سے الھڑ اور لاابالی ہیروئنز بھی بہت پیاری لگتی ہیں' جب انہیں ایک عقل مند اور سوجھ بوجھ والا ہیرو مل جاتا ہے اور انہیں تمام بے وقوفیوں' نادانیوں سمیت اپنا لیتا ہے' تب دل بہت خوش ہوتا ہے کہ چلو اب یہ مزید بے وقوفیوں سے پرہیز کرنا سیکھ ہی جائیں گی۔

3۔ یہ کیا سوال پوچھ لیا بھئی مجھے' سمیرا بخاری' فرحت اشتیاق' نازیہ کنول' راحت جبیں' عالیہ بخاری' رخسانہ نگار' نبیلہ ابر راجہ' راشدہ رفعت' تنزیلہ' آسیہ رزاقی' عمیرہ احمد اور نہ جانے کتنے ہی نام ہیں کہ جن کے ہیرو ہیروئن کو پڑھ کر مزہ آتا ہے۔ یہ تمام رائٹرز ہمیں ہر مزاج کے مرد و زن سے متعارف کراتی ہیں' لگتا ہی نہیں کہ یہ مرد و زن خیالی دنیا کا حصہ ہیں' بلکہ یہ کردار اکثر و بیشتر تو ہمارے ہی ارد گرد لگتے ہیں۔

شہلا ربانی۔۔۔ ساہیوال

ہم مہینے میں کئی دفعہ تصوراتی دنیا کا چکر لگا کر آتے ہیں' بہت مزہ آتا ہے۔ بندہ کچھ دیر کے لیے زندگی کی تلخیوں سے نکل کر اپنی پسندیدہ دنیا میں آجاتا ہے جہاں راوی ہر طرف چین ہی چین لکھ رہا ہوتا ہے۔

1۔ ہیروز کا لفظ ذہن میں آتے ہی ایک خاکہ سا ابھرتا ہے۔ ڈیشنگ' ہینڈسم' لاابالی' شوخ و شنگ' فرماں

برداشت دنیا جہان کی تمام خوبیاں ہمارے ہیرو صاحب میں موجود ہوتی ہیں۔ خامی تو گویا الیکٹرو مائکرو اسکوپ سے ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملتی۔ آخر ہمارے ہیرو جو ٹھہرے ویسے مجھے ایسے ہیرو پسند ہیں جو ڈیشنگ ہونے کے ساتھ ساتھ اینگری ینگ مین بھی ہوں۔ ویسے کمبینیشن تو اچھا ہے۔ ہینڈسم بھی اور مغرور بھی۔

2۔ ہیروئن میرے خیال سے ہمارے اینگری ینگ مین کے ساتھ کوئی پیاری فرینڈلی اور محبت کرنے والی ہی سوٹ کر سکتی ہے جو مسٹر کا مزاج وقفے وقفے سے درست کر سکے۔

3۔ ہر مصنف اپنے ہیروئن ہیرو کو الگ طریقے سے ڈیفائن کرتی ہے لیکن چند رائٹرز کے ہیرو اور ہیروئنز کو پڑھنے میں بہت مزا آتا ہے۔ فرحت اشتیاق، نمرہ احمد، سعدیہ عزیز آفریدی اور اب تو اس صف میں نایاب جیلانی بھی شامل ہو گئی ہیں۔ نایاب کی ہیروئن بہت اچھی ہوتی ہے۔ معصوم سی پیاری اور اپنے ارادے پر قائم رہنے والی اور سعدیہ آپی آپ کی ایک تحریر (رنگ خوشبو ہوا بادل) پڑھی ہے لیکن بہت زیادہ بہت ہی۔ اس کو پڑھتے ہوئے جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اگر میں وہ بیان کرنے لگ جاؤں تو شاید یہ صفحات ختم ہو جائیں مگر میری داستان غم ختم نہ ہو۔

شائستہ اکبر۔ ڈگری کالج گدو

1۔ آپ یہ پوچھ رہی ہیں کہ ہمیں کس طرح کے ہیرو پسند ہے۔ تو جناب ہمیں تو سب ہی ہیرو پسند ہیں۔ ان کے رویے جیسے بھی ہوں پر وہ ہوتے تو ہیرو ہی ہیں نا! مجھے کیا میری سب دوستوں اور کزنز کو من مانی کرنے والے جاگیردار اور غصیلی طبیعت کے ہیرو پسند ہیں۔ کیونکہ اپنے آپ کو منوانا چھوٹی چھوٹی باتوں پر غصہ کرنا جاگیرداروں کو ہی سوٹ کرتا ہے۔

2۔ ہیروئن مجھے الھڑ و لاابالی پسند ہے کیونکہ ایسے شوخ اور معصوم بھولی بھالی ہیروئن کی زندگی میں آگے چل کر طوفان ہی طوفان لکھے ہوتے ہے جو کہ انہیں بعد

میں سلیقہ مند بنا دیتے ہیں۔

3۔ آپ کس کس مصنفہ کا نام لوں سب کو پڑھ کر مزہ آتا ہے پر مجھے فرحت اشتیاق کے معصوم اور ڈیشنگ ہیرو اور ہیروئن کو پڑھ کر بہت مزا آتا ہے۔

نور العین شاہ۔ سکرنڈ

1۔ ہیرو مجھے خوددار، غصیل، اکھڑ مزاج اور جھگڑالو بہت پسند ہیں۔ کچھ جاگیردار ٹائپ ایسے کردار پڑھ کر بچ میں مزہ آجاتا ہے۔ اگر ہینڈسم اور پڑھا لکھا بھی ہو تو کیا ہی بات ہے۔

ہیروئن بھی کچھ ہیرو سے ملتی جلتی پسند ہے۔ لڑتی جھگڑتی غصہ کرتی ہر کسی سے پنگا لینے والی "آج کل وہ سی ساوتری ٹائپ ہیروئنز کسی کو پسند نہیں" جو دوپٹے کا کونہ منہ میں دبائے شرماتی جائے "بلکہ وہ دو ہاتھ کرنے والی کوئی ایک سنائے تو وہ آگے سے چار سنائے گی" لگی لپٹی رکھے بغیر ہر بات منہ پر کہہ دینے والی بدتمیز ہیروئن آج کل ان ہیں تو مجھے بھی ایسی ہی ہیروئن پسند ہیں۔

2۔ مجھے تو فرحت اشتیاق کے ہیرو بہت پسند ہیں پڑھے لکھے ڈیل ڈول ہینڈسم ٹوٹ کر محبت کرنے والے اور اتنے امیر... جو کھڑے کھڑے ہیروئن کو کیا کیا گفٹ کر دیں اور اگر مر بھی جائیں تو پیچھے ہیروئن کے لیے لمبی سی جائیداد چھوڑ کر جائیں اور ایک عدد بیسٹ فرینڈ بھی۔

3۔ ہیروئن میں سر فہرست عمیرہ احمد کی ہیروئن ہیں صوم و صلوٰۃ کی پابند "نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق کرنے والی جو کہ اڑیل سے اڑیل ہیرو کو بھی سیدھے راستے پہ لے آئے۔



رفعت ناہید سجاد

پروفیسر عباس رشید کا گھرانہ علمی و تہذیبی اعتبار سے مڈل کلاس روایات کا امین ہے۔ پروفیسر صاحب کی قابلیت اور نیک نامی مثالی ہے۔ وہ تاریخ کے مضمون کے استاد رہ چکے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ ان کا دروازہ ہر طالب علم اور خاص و عام کے لیے کھلا رہتا ہے۔ شاگرد ان کے علمی خزینے سے فیض حاصل کرنے آتے رہتے ہیں۔ گھر کا تمام نظم و نسق پرانی گھریلو ملازمہ کریم بی کے ذمے ہے جو بڑی جانفشانی سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان کی بیگم نے ساتھ اولادوں کو بھی آزادیٔ اظہار کی مکمل اجازت ہے۔ ان کی تین اولادیں ہیں۔ تنویر، عثمان اور عبیر۔

بڑی بیٹی تنویر ماں کی لاڈلی ہے۔ دورانِ تعلیم غیر نصابی سرگرمیوں میں خاصی سرگرم رہی۔ وہ مقامی کالج میں پڑھاتی۔ شادی کے بعد اس کی صلاحیتیں جیسے گہنا گئی ہیں۔ سسرال میں علم اور تہذیب دونوں کی کمی ہے۔ ساس گھر پر حاوی ہیں اپنے آگے وہ شوہر سمیت کسی کی چلنے نہیں دیتیں۔ تنویر کا شوہر نعیم روایتی ہے۔ وہ ایک مقامی روزنامے میں صحافی ہے لیکن ایک پڑھی لکھی بیوی کے ساتھ اس کا رویہ انتہائی بے حسی لیے ہوئے ہے۔ ایک بیٹی گڑیا ہے جس کی نگرانی کریم بی کے سپرد ہے۔ پسند کی شادی اور نوکری کرنے کے باوجود سسرال میں اس پر پابندی کا اصول سختی سے لاگو ہے۔

عثمان عباس کا شمار ان نوجوانوں میں ہوتا ہے جو قابلیت اور ڈگری کے باوجود معقول نوکری حاصل نہیں کر پاتے۔ گھر کے ماحول اور [illegible] اعتماد [illegible] کے لیے [illegible] میں [illegible] کر لیا ہے۔ وہ مختلف آفس [illegible] اتنا کما لیتا ہے کہ گزر اوقات اچھی ہو جائے۔

عبیر آج کے دور کی لڑکی ہے جو اپنے ذہن سے فیصلہ کرنا جانتی ہے۔ گھر میں باپ سے قریب ہونے کے باعث ان کی علمی تجربے سے فیض اٹھانے کا موقع اسے زیادہ ملا ہے۔ وہ ماسٹرز کی طالبہ ہے۔ وہ حالات کو حساس انداز میں لیتی ہے۔



عبیر دا اپنی بڑی بہن سے زیادہ وہ بچپن کی سہیلی حمیرا کے قریب ہے۔ اونچے طبقے کی پروردہ ثریا بھی عبیر کی دوست ہے لیکن وہ صرف عثمان کی وجہ سے اس گھر میں آتی جاتی ہے۔ عبیر اسے خاص وجہ سے عزیز رکھتی ہے۔
گھر میں چچا عبدالعزیز اور ماموں کریم بخش اپنے اصرار کے ساتھ بہ وجوہ رہائش پذیر ہیں۔ بڑی تائی بے اولاد ہیں اور بیوگی کے بعد سے کچھ دن قیام کے لیے پروفیسر صاحب کے یہاں آتی ہیں۔ جہاں ان کی ساس بھی رہتی ہیں۔
عبیر کا گروپ یوم پاکستان کے حوالے سے اسٹیج شو کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ وہ لوگ وطن سے محبت قوم کے دل میں اجاگر کرنے کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ناکامیوں سے عبیر دل برداشتہ ہوتی ہے تو وہ کچھ دیر کے لیے حمیرا اور رضا کے یہاں چلی آتی ہے، جہاں ان دونوں کی والدہ آپا جی اپنے خلوص اور ڈھیر ساری محبت سے ان کا سواگت کرتی ہیں۔ یہ محبتیں اسے روح تک سرشار کر دیتی ہیں۔
ان کے گروپ میں ان کی کوششیں رنگ لاتی ہیں اور شو کا صرف اسپانسر مل جاتا ہے بلکہ ڈراما آڈینس میں بے حد پسند کیا جاتا ہے۔ عبیر کو سب سے زیادہ شو میں کزن شہریار کی موجودگی مسرور کرتی ہے، جو محض عبیر کی خاطر طویل سفر طے کر کے شو دیکھنے آتا ہے۔ دونوں میں لفظوں سے زیادہ دل کا رشتہ ہے، اس لیے ایک دوسرے کی بات فوری سمجھ لیتے ہیں۔
عثمان شہریار کے لیے عبیر کے جذبات سے آگاہ ہے۔
ان ہی دنوں بابا جان کی عدم موجودگی میں ایک واقف کار سے عبیر کی ملاقات ہوتی ہے، جن کی مختلف سی شخصیت اسے کچھ الجھا دیتی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

16
سولہویں قسط

رات بڑی تکلیف دہ تھی۔ یا جانے اس کا بستر ہی بے آرام کر رہا تھا۔ ایک مدت ہوئی وہ چین کی نیند نہیں سو سکا۔ رات بھر میں کسی ایک جگہ ٹک کر بھی اسے سکون نہیں آتا تھا۔ آدھی رات میں وہ دری بچھا کر فرش پر آجاتا۔ وہاں سے اٹھتا تو کسی تخت پر جا لیٹتا۔ ورنہ کتنی دیر دیوار سے ٹیک لگائے چپ چاپ سامنے کلاک کو گھورتا رہتا۔ کسی پل اسے قرار کی نیند نہیں آتی تھی۔ وہ جب پاؤں پھیلا کر سونا چاہتا اسے لگتا "وہ مجرم ہے اور اسے پاؤں پسار کر سونے کا کوئی حق نہیں۔ اس کا ہیولا ایک کال کوٹھری میں قید تھا۔ جہاں چوہے مینڈک پھدکتے پھرتے۔ فضا میں سیلن اور غلاظت کی بو تھی اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ آنے والا کل اس پر گزرے گی یا اس کے بغیر گزر جائے گی۔

ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ وہ ہڑبڑا کر جاگ گیا۔ پنکھا بہت آہستہ آہستہ ہوا دے رہا تھا۔ وہ ایک بے حد بھیانک خواب سے بیدار ہوا تھا۔ اسے لگا کوئی اس کے سینے پر بیٹھا اس کا گلا دبا رہا ہے۔ سانس اٹک کر آ گئی ہے۔ وہ اپنے بچاؤ کے لیے چیخنا چاہتا ہے لیکن ظالم ہاتھوں کی اس کے نرخرے پر گرفت اتنی مضبوط ہے کہ حلق سے گھٹی گھٹی بے معنی آوازوں کے سوا کچھ برآمد نہیں ہوتا۔ ایسی ہی کسی ایسی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ پسینے میں شرابور تھا۔ سانس اکھڑا ہوا اور گردن پر ہاتھوں کا شکنجہ ابھی تک کسا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ خواب سے باہر آنے کے بعد بھی خوف کی کیفیت ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس کا شدت سے جی چاہتا کاش! اس کو بھی یہ اختیار ہو کہ وہ ظالم کو دبوچ کر مار ڈالے۔ لیکن بے بسی کی یہ انتہا تھی کہ خواب بھی اس کے اختیار میں نہیں تھا اور یہ پہلی رات نہیں تھی کہ اس نے خود پر چپ چاپ یہ ظلم سہا تھا۔ قید کے زمانے میں قلعے میں گزارے جانے والے دنوں کے دوران اسے ہر

خواب چپ چاپ سہتا رہا تھا اور وہیں پہلی مرتبہ اس نے یہ خواب دیکھا تھا اور جب سے اس خواب نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔



"ابا! جہاں دیکھو لوگ ناخوش ہیں۔ کیا حکمران اس لیے آتے ہیں کہ ہماری راتوں کی نیندیں اڑا دیں اور خود چین سے پاؤں پھیلا کر سوئیں۔"
عباس رشید نے اپنی جوان خون بیٹی کی طرف دیکھا۔ وہ ان کی کھڑکی کے پردے سرکا کر بکھری چیزیں سمیٹتی طیش میں مبتلا لگتی تھی۔
"کچھ نیا ہوا ہے۔ مگر کیا ہوا ہو گا۔" انہوں نے کتاب بند کر کے چپ چاپ اس کی طرف دیکھا۔
"مارشل لاء صرف ظلم ڈھانے کے لیے آتا ہے۔ اس کو دیکھو کس سہولت سے بیٹھا اپنے لوگوں کو بیچ رہا ہے۔ جیسے کوئی سبزی کی ریڑھی لگائے آلو پیاز کا کاروبار کرتا ہو۔ ہم عوام ہیں یا گاجر مولی۔ آپ کے زمانے میں کم از کم کولڈ بلڈڈ ایسل تو نہیں آیا ہو گا۔ میں گمشدہ لوگوں کی فائل دیکھ رہی تھی۔ وہ لوگ کہاں گئے پتا نہیں۔ ان کے گھر والوں پر کیا گزری۔ پروا نہیں۔"
کاغذ کی چھوٹی سی تھیلی میں آج کے دن کے لیے استعمال ہونے والی دوائیں گن کر گراتے اس کا اشتعال کم نہیں ہو رہا تھا۔
"یہ کیوں آتے ہیں؟ کوئی ان کو لاتا ہے یا خود آجاتے ہیں۔ شاید یہ اس عہد کا آخری سنگین زمانہ ہو۔ آپ کو کیا لگتا ہے۔ اب الیکشن ہو گا؟ سب حالات بدل جائیں گے۔ لوگ کہتے ہیں نیا سورج طلوع ہونے کو ہے۔ لیکن شاید اسے بھاگنا نہ... نہیں۔ میڈیا کا زمانہ ہے۔ آپ کی میڈیسن ختم ہو رہی ہے۔ میں جاتے ہوئے چچا عبدالعزیز کو بتا جاؤں گی۔"
شاید "شاید ہر مارشل لاء کے جانے کے بعد ایسی ہی ایک "شاید" لوگوں کو گھیر لیتی ہے۔" انہوں نے اس کو دروازے سے باہر نکلتے دیکھا۔
ہر نسل امید پر زندہ رہی ہے۔ آج جو ہوا ہے کل نہیں ہو گا۔ کیا واقعی کل نہیں ہو گا۔ اس کا جواب تو ان کی لکھی ہوئی ضخیم کتاب میں بھی نہیں تھا۔



صحن میں ایک قطار اور ترتیب سے بچھے پلنگ جن پر چوخانی چھینٹ کی رنگ برنگی چادروں پہ سفید تکیوں پر رکھے لگتے ہی سر صحن میں بکھرے ہوئے تھے۔ دائیں سے بائیں کسی ماہر مقرر کی طرح سر گھماتا پیڈسٹل فین سب سونے والوں کو برابر کی توجہ دے رہا تھا۔ گو ہر ایک کے حصے میں ہوا کا ایک اچھا سا جھونکا ہی آتا تھا کہ پنکھا پھر کسی اور طرف متوجہ ہو جاتا۔ ایک ہی کروٹ سے پڑے پسینے کی دھاریں سر سے پھوٹتی گردن میں جذب ہوتی اور کان میں بھنبھناتے مچھر رات بھر کی ڈیوٹی کے بعد صبح کے آغاز سے کم ہونے لگے تھے۔
آج تک صحن میں سونے کا کلچر ختم نہیں ہوا تھا۔ لیکن عباس رشید کو صحن میں پھیلی ستاروں کی روشنی سے کوفت ہوتی تھی۔ نہ وہ سونے دیتی تھی نہ اس میں کوئی کام کیا جاتا تھا۔ وہ صحرا میں بھی نہیں تھا کہ ستاروں کی مدد سے اپنا راستہ تلاش کرتا۔ نہ اس کو یہ علم آتا تھا اس سے تو چاندنی راتیں اچھی تھیں۔ وہ چاند کو آسمان کے ایک سرے سے اپنا سفر شروع کر کے دوسری حد تک جاتے دیکھتا اور شکر ادا کرتا کہ کسی نے تو اپنا سفر مکمل کیا۔ وہ خود تو



ابھی راہ گزر میں تھا۔

بستر کا یہ کونا بہترین لائبریری تھی۔ جہاں وہ چاندنی راتوں میں ایک کتاب مکمل پڑھ کر ڈال دیتا' برسات کی شدید حبس والی راتیں کمروں میں گزارنا ناممکن تھا۔ خاص طور پر اس وقت جب دروازہ بند کر کے بیٹھنا پڑتا کہ صحن میں سونے والے اس روشنی سے تنگ پڑتے۔ حالانکہ ان کے سر پر تا نہیں کتنے دولت کا چاند جگمگا رہا ہوتا تھا۔ لیکن وہ انہیں کچھ نہیں کہتا تھا۔ بلب جلتے ہی ہر قسم کا بھنگا پتنگا پرانی چھت سے ایک تار کے ذریعے لٹکے روشن بلب پر لپک کر آتا دیوانہ وار رقص کرتے نیچے بیٹھے عباس رشید پر حملہ کرنے سے بھی باز نہ آتا۔ اس جیسے کم سونے والوں کے لیے رات وقت کا زیاں ہی تھی۔

جب ہی بھر کے نیند آنا شروع ہوتی تو پتا چلتا اس ساری کشمکش میں رات ختم ہو چکی ہے۔

گلی سے گزرتے تیز تیز پیڈل مارتے حافظ صاحب بڑی مہارت سے اخبار ایسے تاک کر صحن میں اچھالتے کہ سیدھا جب نیند سے الجھنے کی کوشش میں مصروف عباس کے پلنگ پر لینڈ کرتا۔

"اخبار... آج کا تازہ اخبار۔"

اطلاع نہ بھی دیتے تو اسے خبر ہو جاتی تھی لیکن یہ حافظ صاحب کا روز مرہ تھا۔ دوسرے ہی لمحے دیوار کے پار اگلے صحن میں کاغذی جہاز کی طرح رول ہوا اخبار فضا میں اڑتا نظر آتا۔ یہ بھی ان کی مہارت تھی۔ ورق ورق بکھرنے کے بجائے تہہ شدہ حالت میں ہر صبح بستر پہ ملتا نہ کیاریوں میں کھڑے آتشی گلابی گل عباس کے گچھوں میں الجھتا۔ نہ پاس کھڑی گھڑونچی کے گلاسوں اور کٹوروں سے ٹکراتا۔ جیسے صحیح جگہ اور مقام کا تعین کرتا۔ (حالانکہ ابھی گائیڈڈ میزائل ایجاد نہیں ہوئے تھے۔) پلنگ سے پاؤں لٹکا کر اس نے چپلوں کو ٹٹولا۔ جب بھائی نیند میں رات میں کسی وقت پانی پینے کے لیے اٹھتا تو اس کے پلنگ کی پٹی سے ٹکرا ابھی اور دو پٹیوں کے درمیان کی راہداری سے گزرتے بھرپور طریقے سے ٹھوکروں سے اس کے جوتے کہیں سے کہیں پہنچا دیتا تھا۔ وہ وہاں نہیں تھے جہاں اس نے اتارے تھے۔ بڑے بھائی صحن کے دوسرے کونے میں ہاتھوں میں وہ ڈنڈا اور چھڑا اٹھائے کسرت کر رہے تھے۔

صحن کے ایک طرف بنے چبوترے پر گیس کے نیلے بھڑ بھڑ کرتے شعلوں پر پانی کی کیتلی چڑھی تھی۔ گیس ابھی نئی نئی آئی تھی۔ ساری زندگی آگ کو نارنجی رنگ میں دیکھتے دیکھتے نیلوں شعلوں میں دیکھنا ابھی تک نامانوس لگتا تھا۔ چٹخ چٹخ سلگتے اور لکڑیوں کے چٹخنے کے بجائے وہ شور کرتی بھڑ بھڑ جلتی تھی۔ زمانے زمانے کا فرق اندر ہی اندر سلگنے کا زمانہ ختم ہو رہا تھا۔ مظلوم طبقہ بھی جاگ گیا تھا۔ اماں گیس کے آنے سے بہت آسودہ تھیں۔ ہر صبح پھونکنی میں پھونکتے پھونکتے ان کا حلق خشک ہوا چلا تھا اور آنکھوں کے کثیف دھوئیں نے آنسو بہا بہا کر ناس مار دیا تھا۔

اماں کے سامنے ضرورت کی ہر چیز کا انبار لگا تھا۔ وہ ہر صبح باورچی خانے سے چیزیں لالا کر اس چار اینٹ اونچے چبوترے پر سجا لیتی تھیں۔ یہ موسم گرما کا باورچی خانہ کہلاتا تھا۔ سردی میں وہ واپس اصل باورچی خانے میں شفٹ ہو جاتے جیسے انگریز نے گرمی سردی کے علیحدہ علیحدہ صدر مقام بنا رکھے تھے۔ ہماری اماں کی سلطنت بھی موسموں کے حساب سے تبدیل ہوتی رہتی۔ اماں اپنی اس سلطنت میں کسی کی دخل اندازی بھی برداشت نہیں کرتی تھیں۔ گھر والے گروپ کی شکل میں آتے اور وہ ان کو نمٹاتی جاتیں۔ سامان حکومت ان کے سامنے تھا۔ ٹرے میں ترتیب سے پرچوں پر اوندھی پڑی کپ پیالیاں جن کو مکھی کی دسترس سے دور رکھنے کے لیے اماں کا جالی کا ہلکا گلابی ڈوپٹہ اوڑھا رہتا۔ گندھا آٹا' خشک آٹے کی تھالی' دودھ کی دیگچی' چینی اور پتی کے ڈبے وہ جیسے دو کان لگائے بیٹھی تھیں۔

چینی ایک بہت بڑے بحران سے گزر رہی تھی۔ پاکستان میں اس سے پہلے چینی کا ایسا بحران نہیں آیا تھا۔ پہلے راشن ڈپو سے ملنے والی چینی غائب ہوئی۔ پھر بازار میں، جو بلیک پر دستیاب تھی۔ اس کا بھی خاتمہ ہوا۔ ابتدا" لوگوں نے چائے میں بتاشے گھول کر پینا شروع کیے۔ وہ ختم ہوئے تو گڑ کی شکر پر آگئے اور آہستہ آہستہ ہر طرح کا اسٹاک ختم ہو گیا۔ نہیں معلوم یہ چیزیں ختم ہو کے کہاں چلی جاتی ہیں۔ پھر کیسے واپس آجاتی ہیں۔

وہ جانتا تھا دوسرا چکر بیکری والا لگائے گا۔ سائیکل کیریئر سے رسی سے بندھی ٹین کی چھوٹی سی صندوقچی میں انگریزی اور دیسی دونوں ناشتے موجود تھے۔ نان، کلچے، انڈے، مکھن، ڈبل روٹی۔ مگر وہ ان کے گھر کے آگے سے بے صدا گزرتا۔ وہاں اس ناشتے کا رواج نہیں تھا۔ اماں گھی میں تر بہ تر پرتوں والے پراٹھوں کے لیے گندھے آٹے کی رسیاں بٹ رہی تھیں۔ جب لمبی سی ٹکی تیار ہو جاتی تو وہ کنڈلی مارے سانپ کی طرح بل دے کر تھپک دیتیں۔ پتا نہیں پراٹھوں کے لیے یہی طریقہ کار ضروری تھا۔ لیکن وہ بڑی دلچسپی سے ہر پراٹھے کو سانپ سے آرٹ کی اس فارم میں آتا دیکھتا رہتا۔ جاگ جانے کے باوجود پلنگ پر پڑے رہنا سستی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ لہٰذا اس سے قبل کہ ان کا ہنکارا آئے لازم تھا کہ اٹھ جایا جائے۔

اماں اس کے دفتر جانے سے پہلے اس کے سارے کام نمٹا دیتی تھیں۔ کوئلوں سے استری دہکا کر فیتے سے کھنچی ہوئی شان دار سیدھی لکیر جیسی پتلون کی کریز بھی وہ خود بناتی تھیں۔ ان کی بہوئیں اور پوتے پوتیاں اپنی اپنی زندگی میں اس قدر مصروف تھے کہ گھر کے کاموں کی نہ ان کو فرصت تھی۔ نہ وہ کہتی تھیں۔ ان ہی دنوں نئی نئی ایک بیوہ کام کی تلاش میں ان کی طرف آئیں۔ ایک چھت کے سہارے کے عوض وہ ہر کام مفت کرنے پر تیار تھیں۔

انھوں نے اپنا نام کریم بتایا اور کہا کہ انھیں کریم بی کہلوانا پسند ہے۔

پاکستان کو بنے 23 سال ہوئے تھے۔ یہ ایک سنگ میل زمانہ تھا۔ ناکام جمہوریت، نکمی سیاست، فوجی اقتدار پاکستان ہر تجربے سے گزر آیا تھا۔ لیکن ابھی تک لوگوں نے پاکستان کی باتیں بنانا بند نہیں کیا تھا۔ ہر حکمراں پاکستان سے کسی شے ایک سے مخلص نہیں تھا۔ ایک Escape Goat تھا۔ ہر الزام اس پر ڈال کر وہ بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔ ہر طرح اس سے لگاتے ہیں۔ پاکستان کیا ہے؟ گھر کا بڑا بچہ؟ ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر صرف ہماری فرمائش پوری کرے۔ ہر ذمے داری اس کی ہے۔

کیا ہے پاکستان؟ بائیس خاندانوں کی جاگیر؟ جاگیرداروں اور صنعت کاروں کے درمیان نہ ختم ہونے والی چپقلش، مارشل لاء کی ٹھیکے داری؟

ایوب خان کی حکومت کے آخری سال میں جب جوش و خروش سے دس سالہ ترقی کا جشن منایا جا رہا تھا، اچانک لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ جاننے کے لیے کہ پاکستان کیا ہے۔ ایوب خان کے زوال کے بعد دوسرا جنرل آکر بیٹھ گیا تھا۔ ہر جنرل جب آتا ہے۔ اس کے آنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اسے کون لاتا ہے؟ یہ بھی نہیں پتا چلتا لیکن وہ آجانے کے بعد یقین دلا دیتا ہے کہ اس نے پاکستان کو ڈوبنے سے بچا لیا ہے۔ لوگ اس نجات دہندہ کے گن گانے لگتے ہیں۔ آئین اور قانون نام کی کوئی چیز نہیں رہتی۔ بادشاہوں کا سنہری زمانہ واپس آجاتا ہے۔ شاہ کے منہ سے نکلا ہر لفظ قانون کا درجہ رکھتا ہے اور قانون بس ایک۔ غیر دیکھتے ہی گولی مار دینے کا حکم۔

مارشل لاء کا اپنا آئین ہے اور اس آئین کی پہلی شق ہے، مارشل لاء کو تحریری، زبانی یا اشارے سے بھی غلط قرار دیا تو وہی گولی۔ آئین، قاعدہ، قانون سب صندوق ہے۔

لوگ خوش تھے یا ناخوش، اس بات کا بہت کم پتا چلتا تھا۔ کیونکہ لوگ اہم نہیں تھے۔ نہ ان کی رائے کوئی حیثیت رکھتی تھی۔ ایسے میں جب نشے میں دھت جمہوریہ پاکستان کے بدکردار حکمران نے اپنے ذمہ الیکشن

کروانے کا ٹھیکہ لیا تو کچھ دیر لوگ دم بخود رہ گئے۔ ایک نئی سیاسی کروٹ آئی۔ پھر پچھلے دس بارہ سال کے مارشل لاء میں جو سیاسی پارٹیاں نیم جاں سی نڈھال بیٹھی تھیں، تازہ دم ہو گئیں۔ کچھ نئی کونپلیں پھوٹیں۔ مسلم لیگ کی شاخیں۔ پی پی پی، تحریک استقلال، مذہبی جماعتیں۔ ادھر عوامی لیگ تھی۔ مردہ نکات بھی زندہ ہو گئے تھے۔ بھاشانی نے پہلی دفعہ پاکستان کو گھیراؤ جلاؤ سے متعارف کرایا تھا۔ شیخ مجیب کالی نہرو واسکٹ میں بپھرے ہوئے مشرقی پاکستانیوں کے آگے آکر کھڑے ہو گئے۔

زندگی ایک بل کھائے پراٹھے کی طرح کنڈلی مار کر بیٹھ رہی تھی۔ اس پٹاری سے اب کیا برآمد ہوگا؟ کون جانے؟ لیکن کچھ نیا ہونے جا رہا تھا۔ تاریخ کا پہلا الیکشن۔ جس میں ایک آدمی ایک ووٹ ہوتا۔

اماں کو پراٹھوں کا ڈھیر چنگیر میں لگاتے دیکھ کر بڑے بھیا کسرت چھوڑ کر اماں کے برابر پیڑھی پر آکر بیٹھ رہے۔

"بیس روپے من آٹا اور اس پر یہ سناٹا۔ صدر ایوب زندہ باد۔"

"چلا گیا وہ غریب۔" اماں نے آہ بھری۔ "چھوڑو اب اس کا پیچھا اور شکر کرو روٹی ملتی ہے۔ اس دن اخبار میں تصویر دیکھی تھی ہندوستان میں بچے کوڑے کے ڈھیر سے روٹی چن کر کھا رہے تھے۔"

انھوں نے عباس کا لنچ جو پراٹھوں اور پیاز سے بھرے سنہری خستہ آملیٹ پر مشتمل تھا ٹفن کے ڈبوں میں بند کر کے بک برابر کر دیا۔

"عباس میاں! ناشتہ تیار ہے۔"

عباس میاں نے تارپین کے تیل سے ٹائروں کے تار چمکاتے ایک نظر اماں اور ان کے خود ساختہ تخت پر ڈالی۔ سب اہل خانہ ان کے گرد جمع تھے۔ اپنے آس پاس ہوں تو انھیں بے شمار چیزوں کی پروا نہیں رہتی تھی۔ آٹے دال کا بھاؤ، الیکشن، سیاست، جو جی چاہے آئے۔ جو مرضی جائے۔

اس نے گھر سے نکلنے سے پہلے ٹائر پر ہوا چیک کی۔ پیڈل گھما کر دیکھا۔ کھٹی کھٹی سی بحالی۔ کریم بی کی پوزیشن درست کرتے اس نے پلٹ کر گھر کی طرف دیکھا اور گھر ان سب کے گھر میں آجاتے۔ ان کے بزرگوار آج کل کن چکروں میں ہیں۔ جہاں ان کی نوکری ہی نہیں خود ان کی آزادی داؤ پر لگی ہے تو شاید وہ اس کو بھی گھر سے نکلنے کی اجازت نہ دیں۔

"جاؤ بیٹا اللہ کو سونپا۔"

"بیٹا تمہیں یہ موٹر سائیکل کیوں نہیں لے لیتا۔" بڑے بھائی بڑبڑائے۔ "یونی ورسٹی سائیکل پر جاتا بھلا انسان اچھا لگتا ہے۔ جتنے کی کتابیں خریدتا ہے اتنے میں دو موٹر سائیکل آجائیں۔"

"اپنے اپنے شوق ہیں۔" اماں بے دھیانی میں اس کا ساتھ دے کر پھنس جاتی تھیں۔

"یہ آج کل نئی ہوا چلی ہے اماں!" چھوٹا والا مسخرے پن سے ہنسا۔

"سوشلزم آرہا ہے۔ موٹا کھدر پہنتے ہیں۔ پاؤں میں چپل گھسیٹے گھس گھس کرتے پھرتے ہیں۔ مزدور کے حق کے لیے جنگ لڑتے ہیں۔"

"تو اس میں کیا برائی ہے؟" اماں نے حیرت سے پوچھا۔

اماں کو اس کا کیا جواب ملا اس کو پتہ نہیں چل سکا۔ اس کے پاؤں پیڈل پر تھے اور ٹانگیں ایک تواتر سے انگریزی کا آٹھ بنا رہی تھیں۔ وہ موج میں سیٹی بجاتا درختوں کے جھنڈ سے پرے پورچ سے نکل کر گیٹ سے باہر جا چکا تھا۔

سائیکل عزت دار سواری تھی۔ قاعدے قانون سے چلتی تھی۔ ڈبل سواری کا چالان ہوتا بغیر بتی اور گھنٹی کے سائیکل چلانا جرم تھا۔ صبح صبح بابو لوگوں کا قافلہ سائیکلوں کا ہجوم لیے سر جھکائے اپنے آپ میں مگن اپنے اپنے روزگار کی طرف نکلتا۔ سڑکیں تنگ تھیں لیکن بھیڑ نہیں ہوتی تھی۔ اومنی بس سروس کی ڈبل ڈیکروں اور لمبی والی ٹائیلر بس کے درمیان سے جگہ بناتے۔ تانگے والوں کے چابک کی زد سے بچتے۔ کیریر میں ٹفن اٹکائے اپنے کوئنڈا کی طرف رواں دواں لوگوں میں ایک عباس رشید بھی ہوتا تھا۔

فیروز پور روڈ دونوں طرف نئی پختہ، نیم پختہ، خستہ حال کوتاہ قد دکانوں کے درمیان شکستہ حالت میں چپ چاپ پڑی رہتی۔ ٹریفک آہستہ گام تھی۔ اسے سڑکوں پر بنے جا بہ جا گڑھوں سے بچ بچ کر چلنا ہوتا تھا۔ رش صرف چھٹی کے [illegible] وقت [illegible] کالے [illegible] لوگ سڑکوں کو گھیر لیتے [illegible] اپنی مقبول تھیں [illegible] ایک [illegible] ہوا تھا۔ فلمیں زندگی [illegible] انداز میں بال بناتے۔ اس کے لہجے میں باتیں کرتے۔ پوری پوری کہانیاں مع مکالمہ زبانی یاد ہوتی تھیں۔

سب سے بڑا پروڈیوسر بھی جو یہ فلمیں بناتا تھا۔ لوگ اس حد تک نقالی سے ناواقف تھے کہ وہ جانتے بھی نہیں تھے اگر اشوک کمار نے دوسری سیڑھی پر پاؤں رکھ کر مکالمہ بولا ہے تو محمد علی کو بھی اسی سیڑھی پر اسی طرح پاؤں رکھ کر وہی مکالمہ بولنا پڑتا تھا۔

"آپا۔ کون بجا رہا ہے۔ یہ ریڈیو بند کروائیے۔"

نہیں معلوم کس کالج کا یونی فارم ہے لیکن گریجویشن میں پڑھنے والی ہیروئن جوڑا باندھ کر، ٹیکا جھومر گلوبند اٹکائے سلمیٰ ستارے کا کام والا غرارہ یا لنگا پہنے پھرتی تھی اور ہیرو اپنی ماں کے سامنے اس کی سادگی کے قصیدے پڑھتا نہیں تھکتا تھا۔ مگر لوگ خوش ہیں۔ اصلی دنیا دکھی کرتی تھی یوں بہروپ بدل کر آپ کسی کی بھی زندگی میں ڈھل جاتے ہیں۔

وہ اپنی سائیکل اسٹینڈ پر کھڑا کر کے ٹوکن لاپروائی سے جیب میں اڑس کر سیمینار لائبریری کی طرف نکل جاتا۔ کلاس میں جانے سے قبل کتابوں میں گم وہ لیکچر کی دوبارہ تیاری ضرور کرتا تھا۔ دوسرے پیریڈ کے لیے اسے وافر وقت مل جاتا۔ وہ چونکہ جونیئر تھا اس لیے اس کو دن میں دو پیریڈ پڑھانے ہوتے۔ ورنہ سینئرز کو ایک ہی کلاس لینی ہوتی تھی اور کسی کسی دن وہ ایک کلاس بھی نہیں ہوتی تھی۔ وہ بڑی باقاعدگی سے فیکلٹی کی ایسوسی ایشن اور ان کی سرگرمیوں میں بھی شریک ہوتا۔ طلبہ یونین اسے سخت ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتی تھی۔ ہر روز اسے اپنے

دروازے پر ایک گھٹیا سی دھمکی Tape کی ہوئی ملتی۔

صبح کا تقاضا وہ اس کو پھاڑ کر ڈسٹ بن میں ڈال دیتے۔ مسکراتے ہوئے چپڑاسی رمضان کے غیر مقدس کلمات کے جواب سے کرتا۔ وہ جتنا اپنے طالب علموں میں مقبول تھا۔ یونین کے لیے اتنا ہی بڑا خطرہ تھا۔ ان کے بقول اس کے خیالات اشتراکی تھے۔ وہ فلسفہ کا لسٹ تھا اور اپنے کمیونسٹ نظریات کی بنا پر نئی نسل کو مذہب سے گمراہ کر رہا تھا۔ لہٰذا قابل گردن زدنی تھا۔

ہم کسی پر الزام لگاتے یا اس کا یقین کرتے ہر دو حالتوں میں تحقیق کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ یہاں سے فارغ ہوتا تو پیدل مارتا سید حا پارٹی کے نیو زپیپر والے آفس چلا جاتا۔

لوگ سیاست میں تبدیلی کے لیے طالب علموں سے توقع لگائے تھے۔ طالب علموں کی بڑی اہمیت تھی۔ مگر علم بے کار چیز تھی۔ ادارے بند ہو جاتے تو مہینوں بند رہتے۔ پڑھنا لکھنا کوئی ایسا ضروری عمل نہیں تھا۔ بچے سرکاری اسکولوں میں پڑھتے تھے اور پڑھ لکھ کر حد سے حد کلرک بھرتی ہو جاتے۔ 63ء تک تاریخ کی کتابوں میں لارڈ وارن ہیسٹنگز کے کارنامے اور کلائیو کی دو عملی پڑھائی جاتی۔ پاکستان بننے کے سولہ سال بعد تک انہیں یہ یاد ہی نہیں آیا کہ پاکستان بن گیا ہے اور یہ نصاب انگریز دے گیا تھا۔ وہ جس سے آزادی حاصل کی تھی اس کا عہد کارنامے بنا کر پیش کیا جا رہا تھا۔ تعلیم کی طرف اتنی سی بھی توجہ نہیں تھی۔ حکمرانوں کا سارا دھیان حکمرانی کے جوڑ توڑ پر تھا۔ اب کچھ نیا ہونے جا رہا تھا۔ پہلا الیکشن ہوگا۔ ووٹ ہوگا۔ جس نسل نے پاکستان بنایا اپنی اگلی نسل کو لاپروائی سے پاکستان برباد کرتے دیکھ کر دکھی ہوتی تھی۔ جی اٹھی تھی۔ اس الیکشن کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب اچھا ہوگا۔ پاکستان ترقی کرے گا۔ سر اٹھا کر جئے گا۔

ہر پارٹی اپنا اپنا موٹو Moto لے کر آئی تھی۔ معاہدہ تاشقند سے دکھی لوگوں کو روٹی کپڑا اور مکان کا نیا نعرہ نصیب ہوا۔ نیا نعرہ جیسے پہلے ہی مہذب کی لہر پھیل ہوئی تھی۔

کچھ پارٹیاں کہتی تھیں پاکستان میں اسلام کا نفاذ ہوگا۔ قائد اعظم بھی یہی چاہتے تھے۔ کچھ کہتی تھیں۔ نہیں 11 اگست کی تقریر میں قائد اعظم نے کہا تھا......

قائد اعظم کو ہم بھولے رہتے ہیں۔ جب ضرورت پڑے اٹھا بھی لاتے ہیں۔ اور جو بیان جی چاہے ان سے منسوب کر دیتے ہیں۔ قائد اعظم کا استعمال بھی محض ذاتی مفادات کے لیے ہو رہا ہے۔

چھ سے دس تک ٹی وی کی نشریات ہوتیں جس میں ویت نام اور لاؤس کی جنگ بندی کا غم دانش وروں کو کھائے جا رہا تھا۔ پاکستان کی سیاست پر بات کرنے کا رواج ابھی نہیں آیا تھا۔ ہم نے ہیرو بھی مانگ کر رکھے ہیں۔ ماؤ، مسولینی، چی گویرا، فیڈرل کاسترو، نیلسن منڈیلا۔

اپنا بڑے سے بڑا ہیرو بھی دانش وروں کو بونا لگتا۔

نیا سورج طلوع ہونے کو تھا۔ یحییٰ خان نے عام الیکشن کا اعلان کر دیا تھا۔ استحصالی طبقہ دم واپسی پر تھا اور بہت سی چیزوں کی طرح لفظ استحصال بھی نیا نیا رائج ہوا تھا۔ جاگیرداری نظام کا سورج بس غروب ہونے کو تھا۔ نئی نسل پر امید تھی۔ پاکستان بننے کے بعد سے اب تک کچھ نہیں بدلا تھا۔ اب سب کچھ بدل جائے گا۔

بے حساب لوگ اپنے نظریات کے ہاتھوں نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ جو روزگار پر بحال تھے وہ معطل ہونے والوں کو نصیحت کرتے۔

"انقلاب کی خاطر قربانیاں تو دینی پڑتی ہیں کل کی آس پر فاقے جھیلتے کل جو بہت دور نہیں ہے۔"

مزارع چپکے چپکے سر اٹھانے لگے تھے۔ کل ان سب زمینوں پر ان کا قبضہ ہوگا۔ زمین اس کی ہے جو اس پر ہل چلاتا ہے۔ کارخانے ان کے ہیں جو مشین چلاتے ہیں۔

اتنا اہم الیکشن کی مہم کے دوران ان کو کچھ سمجھ میں آیا تھا۔

جب پہلی دفعہ مظلوم اپنی سیلف ریسپیکٹ (عزت نفس) کی خاطر ظالم کے سامنے تن گیا۔ تو لوگوں نے جانا انقلاب کی پہلی اینٹ لگ گئی۔

انقلاب کی دوسری اینٹ الیکشن کے نتائج نے لگائی۔ پہلی دفعہ سیاست ایوانوں سے نکل کر گھروں میں داخل ہوئی اور گھر سیاسی اکھاڑے بن گئے۔ نئی نسل مزدور کی حامی تھی۔ حسن ناصر کا گمشدہ نام ابھر کر اوپر آیا۔ پرانی نسل نے اپنے اپنے عقیدوں کے مطابق خود کو مختلف مذہبی جماعتوں سے منسلک کر رکھا تھا۔ تمام تر مذہبی اختلافات کے باوجود کچھ وہ جو داڑھی لمبی اور بے ترتیب رکھتے ہیں۔ کچھ وہ جو مٹھی میں داڑھی رکھ کر باقی تراش دیتے ہیں۔

کچھ اذان سے پہلے درود پڑھتے ہیں اور کچھ لوگ اذان سے پہلے درود آئے تو بڑبڑاتے ہوئے خفا ہو کر مسجد چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔

کچھ قبروں پر جاتے ہیں۔ باقی پوچھتے ہیں قبروں میں کیا رکھا ہے؟

دوسرے کے نظریے کو برداشت کرنے کا کلچر پیدا نہیں ہوا۔ اختلافات اتنے شدید ہیں کہ ہمارے سوا سب کے سب کروڑہا سال جہنم میں جلیں گے۔ جنت دوزخ میں بھیجنے کے اختیارات بھی ہم اپنے پاس رکھتے ہیں۔

مشرقی پاکستان دور دراز تھا۔ وہاں کے لوگ یہاں سے اور یہاں کے لوگ وہاں سے بے خبر تھے۔ مشرقی پاکستان جیسے ولایت تھا۔ خبر کا ذریعہ صرف سرکاری تھا۔ سرکار جو خبر دینا چاہتی وہی پہنچتی تھی۔ ایک ہزار میل پرے پھیلے دشمن کے علاقے کو پار سے خبر بھی آتی تھی اور تردید بھی۔ وہ ناراض تھے۔

وہ کس سے ناراض تھے مغربی پاکستان کی زمین سے اس کے اوپر پھیلے آسمان سے لوگوں سے اگر حکومت سے ناراض تھے تو اس سے خوش کون تھا۔



گدھوں کی طرح منڈلاتے جہاز آسمان پر پہنچے۔ فضا ان کے شور سے لرز اٹھتی تھی۔ جہاز سے لٹکے تیلوں جیسی شکل کے بم سورج کی روشنی میں silver چمک پیدا کر کے کہیں غائب ہو جاتے۔ دھم دھم کی آواز کہیں دور سے سنائی دیتی۔ اس دھمک سے آپ گن سکتے تھے کہ کتنے بم گرائے گئے۔

یہ دشمن کے جہاز تھے۔ لیکن جیسے اپنے گھر کے باغ میں چہل قدمی کرنے آتے تھے اور اطمینان سے واپس ہو جاتے۔ جب آسمان پر جہازوں کی آوازیں غائب ہو جاتیں تو خطرے سے آگاہ کرنے کے سائرن بجتے۔ ابتدائی دو چار دنوں کے علاوہ کوئی جہاز ان کے تعاقب میں اڑتا نظر بھی نہیں آیا۔ وہ ان کو آسمانوں میں من مانی کرنے کا موقع دے کر غالباً "ریڈار" بھی بند کر بیٹھے تھے۔ ان کی پروازیں اتنی نیچے تھیں کہ صحنوں میں بیٹھے لوگ اس تو کل پر جیتے کہ شاید بم ان کا سر بچا کر دیوار سے پار گرے۔ یہ جو مسلسل دھم دھم کی آوازیں آتی تھیں۔ یہ کس کے سر پر برسے۔ اخبارات سنسر میں تھے اس لیے کوئی خبر نہیں ملی۔ ریڈیو صبح سے شام تک ایک گانا بجاتا تھا۔

"ساڈے بیالیس فوجی جواناں نے 540 مارے نیں۔"

بلیک آؤٹ میں سردیوں کی تاریک راتیں۔ اوپر چنگھاڑتی ہوئی موت۔ نہتے شہروں پر برستے بم اور دفاع میں بے بس نظر آتا پاکستان۔ خبر کا کوئی ذریعہ نہیں تھا سوائے افواہوں کے۔

ساتواں بحری بیڑا پاکستان کی مدد کے لیے چل پڑا ہے۔ (گو وہ جوں کی رفتار سے رینگتا تب تک نہیں پہنچا کہ شکست کا آغاز ہو گیا)

چین، مشرقی پاکستان کے قریب ایک محاذ کھول رہا ہے۔



مشرقی پاکستانی انڈین فوج کے خلاف دست بہ دست جنگ کر رہے ہیں۔

مایوسی کی ایک لہر تھی۔ لوگ مارک ٹیلی اور ڈیوڈ شاک کے بلیٹن کا انتظار کرتے اور اپنا خون جلاتے تھے۔ پاکستان کی بربادی کی خبریں سناتے ان کی آواز میں عجیب سی سرشاری ہوتی۔ وہ مزے لے لے کر سناتے کہ پاکستان کا خاتمہ اب کتنا قریب ہے۔ اتنا چھوٹا سا ملک جس کی کوئی حیثیت نہ نام و نشان' نہ عالمی برادری میں کوئی مرتبہ نہ کوئی آئین نہ کوئی سیاسی نظام اور بڑی بڑی طاقتیں کے مل جل کر اسے ڈھانے پر تل گئیں۔

بی بی سی مشرقی پاکستان پر ہندوستان کی کامیابی کی خبریں سناتا تھا۔ سب ہوائی اڈے تباہ ہو چکے تھے۔ ریلوے اسٹیشن اور فوجی ہیڈ کوارٹر ویران ہو چلے تھے۔ ڈھاکہ نشریات بند تھیں اور مغربی پاکستان کا ریڈیو کہتا تھا، ساڑھے 42 فوجی جوانان نے۔

سلہٹ اور جیسور کے بعد اب فوجیں ڈھاکہ کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ دنیا جھوٹ بول رہی ہے۔ اقوام متحدہ میں مذاق ہو رہا تھا۔ ساری قومیں پاکستان کو عالمی جنگ کے خطرے سے ڈرا رہی ہیں۔ بے بسی کی اس کیفیت میں جب جارح ملک کو لاڈلے بچوں کی طرح من مانی کرتے دیکھتے ہیں اور خود پر عتاب پاتا محسوس کرتے ہیں اور مدد کرنے والے بھی اسی کی مدد کو اٹھتے ہیں تو قوم صرف مایوسی سے دعا کر سکتی ہے۔ لوگ بی بی سی سنے بغیر رہ بھی نہیں سکتے اور اپنا بلڈ پریشر بھی بڑھاتے ہیں۔ عجیب اضطراب ہے۔ صبر سے انتظار بھی نہیں کیا جاتا۔ جو گزر رہی ہے بس ایک دم گزر جائے۔

ابتدائی چھ سات دنوں کے بعد لاہور شہر کے آسمان پر سکوت طاری ہو گیا۔ پتہ نہیں کتنے دن سے تو سائرن بھی نہیں بجے تھے۔ ہر شخص خوش فہم ہے۔ اچھی اچھی باتیں کر رہا ہے۔ لیکن اندر سے لرزتا ہے۔ جنگ کے دنوں کا سناٹا بھی ڈراتا ہے۔ دشمن مکار ہے اور وہ ہمیشہ ہوتا ہے۔ ہم اپنی حکومتوں سے بہت پر امید ہیں۔ امید کا اور کوئی سہارا بھی نہیں۔ عام آدمی چوک کے اندھیرے گپ میں کھڑا ایک دوسرے سے زیادہ خود کو دلاسہ دیتا ہے۔ 65ء میں 48 میں جانے تک یہی ہوتا آیا تھا۔ حکمران نااہل بھی ہوں تو ملک کا بچہ فرق نہیں کرتے۔ ملک اپنی تمام تر ریشہ دوانیاں باہمی اختلافات اور بڑے ظلموں سے دب کر رہ جاتے ہیں یا ایسی بے یقینی کے باوجود غیر محسوس ہی تنہا کر رہا ہے۔ چینی یہاں سے بلیک اینڈ وائٹ پاکستانی ٹی وی بڑے فخر سے خرید کے لے جاتے ہیں۔ خود انڈین امرتسر ریلوے اسٹیشن پر اترتے ہیں تو ان کے ہاتھوں میں وہ محیر العقول واٹر کولر ہیں جس میں پانی 24 گھنٹے ٹھنڈا رہتا ہے۔ پاکستان نے ایک کپڑا بنایا ہے۔ فلیٹ کریپ وہ اس کو انڈیا لے جانے کے لیے تگ و دو کرتے پھر رہے ہیں۔ جگہ جگہ سفارش تلاش کرتے وہ ایک دفعہ اس کو چھپا کر اپنی کسٹم پوسٹ سے گزر جائیں تو پھر برسوں یہ کپڑا پھٹنے کا نام نہیں لیتا۔ لوگ پیٹ بھر روٹی کھاتے ہیں۔

ہم سب ہمیشہ سے پُرامید تھے۔ ہم پہلے کی طرح ہندوستان کے ہوش ٹھکانے لگا دیں گے۔ لوگ مایوسی کی بات سننا نہیں چاہتے۔ لیکن ایسے کڑے وقت میں حکمران کہاں غائب ہیں۔ یحییٰ خان جیسے بھی آیا تھا۔ ہم نے تو اس سے بھی اچھی امیدیں ہی وابستہ کی تھیں۔ لیکن اس ساری جنگ میں عوام خود کو تنہا کیوں محسوس کر رہے تھے؟ لیڈرز کہاں تھے؟

قوم جیسی حقیر چیز سے جنگ جیسے کڑے وقت میں مخاطب ہونا بھی گوارا نہیں کیا۔ وہی بلندی سویلین افواہیں اٹھتیں اچھلتیں، امیدیں کبھی ڈوب جاتیں کبھی سر اٹھا لیتیں، مغربی آسمان پر اڑتی چیلوں کے سوا ایک سکوت طاری تھا۔

وہ بار بار تشویش سے آسمان کی طرف سر اٹھا کر دیکھتا۔ ہم تو پہلے بھی کچھ نہیں کر رہے تھے۔ پر اب تو وہ بھی جنگ نہیں کر رہے۔

لوگ بیمار ہو رہے ہیں۔ ایک دوسرے سے الجھ رہے ہیں۔ خوراک میں بے رغبتی ہے۔ بچوں کے سوا کسی کو بھوک ہی نہیں لگتی۔ زندگی معطل ہو چکی ہے اور بالکل فضول ہو کر رہ گئی تھی کہ اطلاع آگئی۔ شام میں جنرل یحییٰ قوم سے خطاب کریں گے۔ اتنی طویل خاموشی اور قوم کو گہری مایوسی میں ڈبو دینے کے بعد جنگ کا اتنا عرصہ چپ سادھنے کے بعد اب آخر اس کو کیا کہنا ہے؟ لوگ گھروں سے نکل کر پھر چوک میں اکٹھے ہونے لگے۔ سنا ہے ڈھاکہ فال ہو گیا۔ جس نے پہلی مرتبہ منہ سے یہ عجیب و غریب کلمہ ادا کیا۔ سننے والے کانوں نے اس کو بے اعتباری سے سنا۔

لوگ ادھر ادھر سے اکٹھے ہونے لگے۔ یہ سچ ہے بی بی سی کہتا ہے ڈھاکہ ڈوب گیا پاکستان ٹوٹ گیا۔

جو جہاں کھڑا تھا اسی جگہ جیسے پتھر کا ہو گیا۔

جنرل صاحب ٹی وی پر آئے تو ان کی صرف آواز آرہی تھی۔ اسکرین پر ان کے مختلف اسٹل پوز (ساکت) جیسے بطور ماڈل پیش کیے جا رہے تھے۔ ٹی وی پر نشر ہونے کے باوجود انہوں نے کیمرے کا سامنا نہیں کیا۔ شاید ابھی اتنی شرم باقی تھی کہ قوم کو یہ منہ کیسے دکھائیں۔ اور انہوں نے تصور کر لیا کہ قوم سب کچھ جانتی ہے۔

"کسی ایک محاذ پر وقتی طور پر پیچھے ہٹ جانے کا مطلب شکست نہیں ہوتا۔ ہم جنگ جاری رکھیں گے۔"

کہاں تھی وہ جنگ۔ جس کے جاری رکھنے کے وہ اعلان کر رہے تھے۔ تقریر میں کہیں یہ بھی نہیں تھا کہ مشرقی پاکستان ٹوٹ گیا یا باقی ہے۔ لوگوں نے پھر خوش فہمیوں کا سہارا پکڑا۔ ڈوبتے کو جیسے تنکا ان کے ہاتھ آگیا۔ وہ پھر جی اٹھے۔ موت منظور تھی مگر شکست نہیں۔ کم از کم انڈیا کے ہاتھوں نہیں۔

لیکن رات کا ابھی پہلا پہر بھی شروع نہیں ہوا تھا کہ ساری دنیا کے خبرنامے اور اخبار چیخ اٹھے مشرقی پاکستان میں ہتھیار پھینک دیے گئے ہیں۔ ہندوستانی فوج فاتحین کی طرح ڈھاکہ میں داخل ہوئی۔ وہ ریڈیو کی ناب گھماتے ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن تک جاتے۔ سمجھنے سے بالکل قاصر رہا کہ غیر ملکی پریس نے "ڈھاکہ کا تھانہ انڈیا کا" پھر اس کی آواز میں یہ غیر معمولی مسرت کس بات کی تھی؟

پاکستان کی تاریخ میں اس سے قبل آج سے بڑا کرب ناک دن کوئی نظر نہیں آتا۔ جب لوگوں کو ذہنی طور پر سب اچھا ہے کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔ اچانک آ پہنچنے والی اس بے حرمتی نے لوگوں کو ایک دوسرے سے نظریں ملانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ ہم ہار گئے۔ ہم نے ہتھیار ڈال دیے۔ شاید ہم مقابلے کے بعد ہار جاتے تو اپنی ہی نظروں میں اس بری طرح تو نہ گرتے۔ جب سربراہ حکومت جانتا ہے کہ وہ قوم کے ساتھ صریح جھوٹ بول رہا ہے اور پھر بھی وہ ڈھٹائی سے بولے جاتا ہے تو سر اس کا نہیں جھکتا۔ پوری قوم کا جھکتا ہے۔ اس نے بڑی بے بسی سے سوچا۔ پتا نہیں اب وہ سڑک پر بھی پھر سر اٹھا کر بے فکری سے کبھی بچا گزر سکے گا۔ لیکن اس کا سر اٹھا کر جینا سربراہان کے لیے کبھی کوئی اہم ایشو نہیں رہا۔ شکست کے اتنے بڑے واقع کے بعد نہایت اطمینان اور سکون سے اس کا اپنا بنایا ہوا آئین اے پی پی کی گرینڈ پر آنا شروع ہوا۔ جیسے ملک میں کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ ان کے لیے واقعی کچھ نہیں ہوا تھا۔ لوگ سکتے اور صدمے کی کیفیت میں چلے گئے۔ کچھ کے ہارٹ اٹیک کی خبریں آئیں۔ کچھ قائد کے مزار پر جا کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ وہ رات پاکستان پر ایسا قہر بن کر ٹوٹی کہ مارے وحشت کے ملک بھر میں کسی کو نیند نہیں آئی۔ یہ ایک ایسی ہی رات تھی۔ جس کی قسم کھائی گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

گھنٹہ بھر کی تقریر تھی۔ فی البدیہہ۔ لوگ اپنے اپنے ٹی وی کے نزدیک آکر مایوسی سے بیٹھ رہے۔ کیا ہو گا؟ اب کیا فائدہ اب حد سے حد اور کیا چیز آپ کو ڈرا سکتی ہے۔ پاکستان ٹوٹ گیا اب مغربی پاکستان بھی ٹوٹ جائے تو ہم اس کو بچا نہیں سکتے۔ ہم مشرقی پاکستان کو بلند بانگ دعووں کے باوجود بچا نہیں سکے تھے۔ ایک بے گور و کفن لاش

سامنے پڑی تھی۔ دوسرا آخری دموں پر تھا۔ آخری ہچکی کا منتظر۔

غیر ملکی پریس اور دنیا بھر کے حکمرانوں کی آوازیں۔ خوشی سے پھٹی پڑ رہی تھیں۔ وہ ایک سے بڑھ کر ایک پاکستان کی بولی لگا رہے تھے۔

"بچا کھچا پاکستان ایک ہفتے کی مار ہے۔ تین دن کی مار ہے۔ گھنٹوں کی مار ہے۔"

"ہندوستان جب چاہے مغربی پاکستان پر بھی قبضہ کر سکتا ہے۔" معاملہ پاکستان کا ہو تو اقوام عالم کو اپنا ہیومن رائٹس والا منشور کبھی یاد نہیں آتا۔ وہ جوش و خروش سے ظالم کے پیچھے کھڑے اس کی پشت پناہی کرتے رہتے ہیں۔

کہیں سے کوئی مری مری صدا بلند بھی ہوتی ہے تو بس یوں ہی اپنا احتجاج تاریخ میں ایک اچھے انسان کے طور پر درج کرانے کے لیے۔

عین اس وقت جب ہم ایک یتیم لاوارث بچے کی طرح سردی سے ٹھٹھرتے 'بے یار و مددگار' کھلے آسمان تلے زمانے بھر کی اٹھی ہوئی انگلیاں سینے کو پڑے تھے اس وقت ٹی وی کی یہ تقریر کیا آس بندھائے گی؟ وہ حکمرانوں کے ہاتھوں ایسے صدمے سے دوچار ہوئے جس میں ان کی کوئی خطا بھی نہیں تھی۔

ہندوستان میں موجود مسلمان جب ہندوؤں کی زیادتی کا شکار ہوتے تو چوری چوری پاکستان کی طرف ضرور دیکھتے تھے۔ انہوں نے خود سے سوچ رکھا تھا پاکستان ایک دن لال قلعے پر پرچم لہرانے ضرور واپس آئے گا۔ جامع مسجد میں نماز پڑھی جائے گی۔ لیکن کیسے پڑھی جائے گی؟ وہ پاکستان کی طرف ناامیدی سے دیکھتے تھے۔ انہوں نے تو اپنی 93 ہزار بندوقیں دشمن کے پیروں میں گرا دی تھیں۔ شاید پاکستان کی حکمران کی یہ آخری نسل تھی۔ اگلی نسلوں نے والدین کی ان خواہشات سے توبہ مانگ لی۔

مفتوح قوموں کی تاریخ ہمیشہ فاتح ملک میں لکھی جاتی ہے۔ لہٰذا پاکستان کا نہ صرف جغرافیہ تبدیل کیا گیا۔ بلکہ اس کی ساری قدیم تاریخ اس کے منہ پر مار دی گئی۔

ملک کے ایک حصے میں ماتم کی کیفیت تھی۔ اسی ملک کے دوسرے حصے میں جشن منایا جا رہا تھا۔ سو ہم نے اپنے دکھ سکھ الگ کر لیے تھے۔ یا شاید کبھی ایک تھے ہی نہیں۔

ایسی اسٹل (ساکت) تصویریں دیکھنے میں آرہی تھیں۔ جس میں اپنی قوم کے لوگ دشمن کے کمانڈر ان چیف کو اپنے کندھوں پر اٹھائے اس کی ممنونیت کا دم بھر رہے تھے۔ اپنی قوم۔ جس سے نجات کے لیے انہوں نے سو سال یک و تنہا جنگ لڑی تھی شاید دوست اور دشمن کے کردار وقت کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں ان چار دنوں میں پاکستان سے محبت رکھنے والوں کا اس حصے میں چن چن کر قتل عام کیا گیا۔ خبریں آتیں تھیں کہ چند دن گلی کوچوں میں ہمارے بھولے بھالے سپاہی دفاع کی جنگ لڑتے رہے اور تاریخ میں جنگ جو کہلائے۔ اس کے بعد ان کا انجام کیا ہوا اس پر وقت خاموش ہے۔ اس وقت تک کے لیے جب آسمان کھلے ہوئے سرخ گلاب کی مانند پھٹ جائے گا۔ قیامتیں بار بار بھی گزرتی ہیں؟

گھروں میں لوگ اسی سکتے سے اس بے رنگ اسکرین کے سامنے دم بخود بیٹھے تھے جو ان پر چار دن سے طاری تھا۔ کسی کو کوئی اچھی امید نہیں تھی۔ امیدیں بھی آخر کہاں تک ساتھ دیتی ہیں؟

بھٹو صاحب نے بولنا شروع کیا۔ ان کا ایک ہاتھ میز پر اور دوسرا کرسی کے ہتھے پر تھا۔ وہ پشت سے ہلکی سی ٹیک لگائے تقریر کر رہے تھے بلکہ یہ تقریر بھی نہیں تھی۔ نہایت سنجیدگی سے وہ قوم سے باتیں کر رہے تھے۔ ان کی آواز

ہموار پُرسکون اور خوش گوار موسم تھی۔

بیدار کرنے والے نعرے لگا رہے تھے عباس رشید کرسی پر بیٹھے اضطراری حالت میں پاؤں ہلاتے ہوئے بولے ...

بھٹو کا یہ فقرہ چھوٹا لیکن نہایت گہرا تھا۔ اگر کوئی ایک ایک لفظ پر غور کرتا آج کے دن ہر گھر میں اسی طرح کھڑے اور بیٹھے لوگ اسی امید اور ناامیدی کے جال میں الجھے "اس کا دیا جلانے کو تیار" صرف ایک شخص کی طرف دیکھ رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

اگلی صبح پھر ایک نئی صبح طلوع ہو رہی تھی۔ رات بھر کے اندھیروں کے بعد جب حافظ صاحب نے "آج کا تازہ اخبار" کی صدا کے ساتھ اخبار صحن میں اچھالا تو روشن دن سامنے تھا۔ آج بہت دن بعد باورچی خانے سے پراٹھوں کی خوشبو پھیلی تھی۔ ایک اور نیا وقت، ایک اور نیا سورج۔

شیخ مجیب اپنے بنائے ہوئے وطن روانہ ہوئے۔ نیب آزاد ہو گئی۔ حمود الرحمٰن حالات و واقعات قلم بند کرنے بیٹھ گئے۔ بھٹو صاحب انسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر سے "آستینوں تک کہنیاں چڑھائے گریبان کھولے کمر پر ہاتھ رکھے گھنٹوں باتیں کیا کرتے۔ ایسے اجتماع اس نسل کے لوگوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ ہجوم تھا یا کسی گھنے درخت کے ہوا سے لرزتے پتے۔ وہ اس قدر محبوب تھے کہ ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے عوام کا ٹھٹ لگ جاتا۔ ان ہی میں ایک بڑا لیے رہنے والے عباس رشید کونے میں کھڑے ایک ٹک ان کی طرف دیکھتے تھے۔ ملک میں ترقی کی بکھرے جھلک نظر آنے لگی۔ اسٹیل مل، ایٹمی ری ایکٹر، میراج ری بلڈ، ہیوی مکینیکل کمپلیکس، اوپن یونیورسٹی، تعلیم بالغاں، دوسری طرف آرٹس کونسل تھی۔ وہیں اڈا تھا۔ نہایت مہذب اسٹیج تھا۔ روبی نے اپنے اس حصے میں ڈرامے کی معراج پر پہنچے دیکھنے والی آنکھوں نے پہلا کبھی دیکھا کہ ایک بوڑھا کسی روشنی سے نظر آئی تو منظر بدلنے والے نہیں تھے۔

روبی پیرا مکان ملا کہ ٹیلی وژن کو تا ستیج میں ان کی بھی کوئی کوتاہی نہیں تھی۔ لیکن روبی پیرا جن کا مطالبہ تھا وہ تو اندھا دھند اس کی پیروی میں بھاگے جاتے تھے۔ یہ کہانی نہیں تھی، پھر بھی ایک دفعہ کا ذکر سے شروع ہوئی تھی۔ اور چونکہ قصہ نہیں تھا لہٰذا وہ ہمیشہ خوشی خوشی رہنے لگے پر ختم نہیں ہو سکتا تھا۔ پتہ بھی نہیں چلا کیسے لیکن پاکستان اس حادثے سے گزر کر اوپر آنا شروع ہو گیا۔

اسلامی سمٹ کانفرنس ہوئی۔ ہر طرف بین اسلام ازم کا چرچا ہوا۔

ڈاکٹر قدیر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پاکستان آ گئے۔

دنیا بھر میں بھٹو بھٹو پاکستان پاکستان شروع ہو گیا۔

پاکستان پھر خار بن کر کھٹکنے لگا۔ لوگوں کو آزادئ صحافت بھی یاد آ گئی۔

اپنے وہ حقوق بھی یاد آنے لگے جو انہیں کبھی ملے ہی نہیں تھے۔

اسلامی نظام کا نفاذ نہیں ہوا یہ بھی یاد آ گیا۔

جو حق انہوں نے 25 سال سے مانگنے کی جرأت نہیں کی تھی وہ سب یاد آ گئے۔

اور جب لوگوں کو یہ یقین ہو چلا تھا اب ملک بھی مارشل لا سے دوچار نہیں ہو گا تو وہ ہتھیار جو دشمن کے قدموں میں گرائے گئے تھے وہیں سے اٹھا کر اپنے ہم وطنوں پر تان لیے گئے۔

☼ ☼ ☼

انگریزوں کے بجائے ٹھنڈی سڑک بے پناہ ہجوم سے اٹی پڑی تھی۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی نعروں سے مزین بلے کارڈ اٹھائے مشتعل گروہ پانی کے ریلے کی طرح آگے کی طرف بڑھتا، توڑ پھوڑ کرتا، آگ لگاتا رواں دواں تھا۔

ایسے ہی قافلے بھاٹی اور ناصر باغ کی طرف بھی جا رہے تھے۔

اس ٹھنڈی سڑک نے ایسے بہت سے انقلابات دیکھے تھے۔ سب سے زیادہ پتھر کھائے تھے۔ آگ لگوائی تھی یا شیشے تڑوائے تھے۔

اسی سڑک پر طالب علموں نے گولیاں کھائی تھیں۔ یہیں خون بہے تھے۔ وہ اب اس قدر عادی ہو چکی تھی کہ اپنے سینے پر گزرنے والے اس حادثے کو بے توجہی سے دیکھتی تھی۔ حادثوں کے بعد حادثے۔ فساد کے بعد فساد۔ کہیں کوئی خاتمہ نہیں۔ حال تاریخ کی راوی نہیں وہ بیان نہیں کر سکتی ان تمام ترالمیہ واقعات کے بعد کیا کہیں کوئی خوشگوار نتیجہ بھی نکلا۔ عباس رشید نے سڑک سے پار اپنی محبوب دکان کی طرف دیکھا۔ جلوس گزر گیا تھا۔ کتابوں کی دکان کے شٹر اٹھائے جا رہے تھے۔ شٹر کے پیچھے کے نیلے شیشے کرچی کرچی کی صورت فٹ پاتھ اور کمرے میں بھرے تھے۔

"دیکھ کے پروفیسر!" اپنی عمر سے دگنے سفید بالوں والے بزرگ نے اسی کے قدموں میں بکھرے کانچ سے بچنے کی تنبیہ کی تھی۔

"کوئی بتائے۔" چچا اسی نے شیشوں کی کرچیاں سمیٹتے بے زاری سے کہا۔ "اگر الیکشن میں بے ایمانی ہوئی تو ہم نے کروائی تھی کیا؟ وہ ہر دفعہ ہمارے شیشے کیوں توڑ جاتے ہیں۔"

اس سے بہت سے ایسے سوال کیے جاتے تھے جن کا جواب وہ کبھی اپنے طالب علموں کو بھی نہیں دے سکا تھا۔ وہ چپ چاپ شیلف میں لگی کتابوں کے پیچھے منہ چھپا کر کھڑا ہو گیا۔ جیسے اس کے نالائق شاگرد سوال کا جواب نہ [illegible] بھرے تھے [illegible] نالائق [illegible] بھی تھا۔

تھوڑی دیر بعد پھر ایک جلوس گزرنے لگا۔ جب تک وہ گزر رہے گا دکان کے شٹر بند رہیں گے۔ زندگی جیسے لمحوں کا کھیل تھی۔ ریورس کرتا ہے۔ پردہ اٹھتا ہے۔ لیکن سامنے بس ایک ہی منظر ہے جو بار بار گزرتا ہے۔

شیلف کے پیچھے ٹہلتے کسی شخص نے اسے چونک کر دیکھا۔ "پروفیسر عباس؟"

"جی فرمایئے۔"

وہ بہت معروف نہیں تھا۔ لیکن اپنے پہچان لیے جانے کا جیسے عادی سا ہو گیا تھا۔

"آپ سے ایک بات کر سکتا ہوں؟"

اسے لمحے بھر کو کوفت سی ہوئی۔ ایک اجنبی شخص اس سے کیا سوال کرے گا؟ ان حالات میں عام آدمی کیا پوچھتا ہے۔ وہ لاعلم نہیں تھا لیکن سیاست نے اسے اکتا دیا تھا۔ اب تو ایک وقت ہوا جب سے شتر مرغ کی طرح اس نے ریت میں سر دے رکھا تھا۔

"جی فرمایئے!" اس نے جھنجلا کر سوچا وہ ملک کی بگڑتی صورت حال اور ممکنہ اگلے مارشل لا کی کوئی بات نہیں کرے گا۔ لیکن اس کو پتہ بھی نہیں چلا کیسے پکوشے میں بیٹھے بے زاری سے چائے کے گھونٹ بھرتے وہ مخاطب کی طرف مکمل متوجہ ہو چکا تھا۔ اس میں کچھ تھا جو اپنی طرف کھینچتا تھا۔

"میرا نام سلمان ہے۔ میری ایک چھوٹی سی فرم ہے۔ مجھے ذاتی طور پر کوئی شکایت بھی نہیں۔ لیکن میں ان حالات سے مایوس ہو چکا ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے میں بھی پاکستان چھوڑ کر اوروں کی طرح یہی نکل جاؤں۔ کیا آپ





مجھے بتا سکتے ہیں، پاکستان کیا ہے؟"

"پاکستان کیا ہے؟" پروفیسر نے ذرا بلند آواز سے پھر اپنا وہ جملہ دہرایا "تم جانتے ہو پاکستان کیا ہے؟ پاکستان صرف مارشل لاء نہیں ہے۔ جب کوئی دروازہ کھٹکھٹا کر روٹی مانگتا ہے تو تنگ چڑھی سے تنگ چڑھی بیگم بھی اپنا آرام حرج کر اٹھتی ہے اور سوالی کو خالی پیٹ اپنے دروازے سے واپس جانے نہیں دیتی۔ یہ پاکستان ہے۔

ایک ایک پیسہ جوڑ کر آخری عمر میں حج کو جاتے پھولوں میں لدے سفر کرتے بوڑھے پھونس حاجی پاکستان ہیں۔

پڑوسی کی بیٹی بیاہنے کے لیے پیسہ پیسہ جوڑ کر جمع کرتے لوگ پاکستان ہیں۔ کسی کی عزت پر روتے بین کرتے۔ کوسوں کا فاصلہ جوتیاں سر پر رکھ کر طے کر کے غم بانٹنے آتے پاکستان ہیں۔ جب آپ کے بچے گھر میں گھس کر سب سے پہلے دادا دادی کو سلام کرتے ہیں اور جب دادی گھر واپسی تک تسبیح ہاتھ میں پکڑے ان کی حفاظت کی دعا مانگتی رہتی ہے۔ یہ روایت پاکستان ہے۔

اور جب ہندوستان سے لاشوں بھری ٹرین لاہور کے اسٹیشن پر آکر رکتی ہے تو وہ پاکستان ہوتا ہے۔

تم مجھ سے گواہی لیتے ہو پاکستان کیا ہے؟ پاکستان دانشوروں کے کھیت کی مولی نہیں۔ وہ میری رائے کا محتاج نہیں۔"

وہ کرسی کھسکا کر میز دھکیلتے بغیر پلٹ کر دیکھے باہر نکل گیا۔

"میں تم سے ایک بات کہوں۔ میری بات مانو گے؟" لارنس کے دیوہیکل درختوں کے نیچے روشوں پر ٹہلتے سلمان نے اس کی طرف دیکھا۔

"کہو اور ایسے نظریات سننے میں تسلیم کرنے کا وعدہ نہیں کر سکتا۔" وہ کتنے عرصے سے ہر وقت کی بحثوں میں الجھے لاہور کا چپہ چپہ پھرتے تھے۔ اس ایک پہلے سوال کے سوا اس نے کبھی کوئی دانش سے اور بات نہیں کی تھی۔ کتنی مدت بعد یہ بات وہ کسی شخص سے کہہ سکتا ہے۔ وہ پھر جس بات کی وضاحت میں پڑی ہوئی۔

"مارشل لاء والی بات سخت ہے۔ رنگ نسل بے رخی سے مزا بار ہے ہیں۔ تم اپنی زبان پر تھوڑا سا کنٹرول کر لو۔"

"نہیں۔" اس نے کورا جواب دیا۔ "میں نہیں مان سکتا۔ یاد رکھو میری حق گوئی پاکستان ہے۔"

☼ ☼ ☼

اور جب اس کے ہاتھ پاؤں تتلی کی سی موٹی رسی سے جکڑ کر اس کو لکڑی کے اس کھانچے سے باندھا گیا جس کو ٹکٹکی کہا جاتا تھا۔ حملہ آور ہنٹر لہراتا بھاگتا ہوا آتا۔ صرف قدموں کی دھمک سے درمیان کا فاصلہ کم ہوتا سنائی دیتا کیونکہ وہ پشت سے حملہ کرتا تھا۔ سزا پر عمل درآمد کرانے والوں نے اس کی قمیص اور بنیان دونوں اتروادی تھیں۔ پچھلے کتنے دنوں سے وہ قلعہ میں بند انہی اور اس سے بدتر شرمناک حالتوں میں گزرتا آیا تھا۔ حالانکہ وہ بچپن سے اتنا شرمیلا تھا کہ کبھی کمرے میں تنہا بھی بنیان پہن کر نہیں گھوم سکتا تھا۔

وہ اس سے کیا چاہتے تھے؟ وہ کسی سے بھی کیا چاہتے تھے وہ نہیں جانتا۔ سوائے اس کے کہ وہ سب سے نفرت کرتے تھے لیکن خوف کے اس انتظار کی یہ بدترین قسم تھی کہ کب وہ لہراتا ہوا اچانک آپ کی ننگی پیٹھ پر انگارے کی سی جلتی ہوئی کاٹ سے ٹکرائے گا۔ اس نے تہیہ کیا تھا وہ حلق بند رکھے گا۔ چیخ کو حلق میں گھونٹ کر۔ کوڑے مارنے اور حملے کے تماش بینوں کی تفریح طبع کا ذریعہ نہیں بنے گا لیکن جب چمڑے کی پتلی تار اس کے شانے

لے کر ریڑھ کی ہڈی کے آخری سرے تک اسے کاٹتی چلی گئی تو بلا ارادہ اس کا منہ کھلا۔ درد سے بھری ایک کراہ اس کے حلق سے آزاد ہو گئی۔

دم بخود کھڑا سلمان اس کو دور سے دیکھتا تھا۔ اس کے ملنے والوں میں اس کو سزا پاتے دیکھنے کا اسے یارا تھا یا نہیں۔ بس منہ اٹھا کر چلا آیا تھا۔ وہ نہ عباس رشید کے بندھے ہاتھ پاؤں کی طرف دیکھتا تھا نہ کوڑا لہرا کر بھاگتے آتے شخص کے چہرے پر مشقت کا پسینہ ڈھونڈتا تھا۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے بھاگتے قدموں کی چاپ سن رہا تھا۔

دھپ دھپ دھپ۔

"کوڑے اسلامی سزا ہے۔" جنرل کا دفاع کرتے محفل میں بیٹھے اس کے ہمنوا بیہودہ کہتے تھے۔ "اگر آپ اللہ کے قانون کو نہیں مانتے تو مرتد ہیں۔ تکلیف تو صرف پہلا کوڑا لگنے کی ہوتی ہے۔ ایسے ہی زبردستی کے شہید بنتے ہیں یہ لوگ اسی کے بعد کمر سن ہو جاتی ہے۔ تکلیف کا احساس ہی نہیں ہوتا۔"

ان کی تسلی نہیں ہوتی تھی۔ ان کے خیال میں پاکستان کا ہر شہری اس قابل تھا کہ اسے کوڑوں سے دھن کر رکھ دیا جائے۔

جب پولیس کی وین ہتھکڑی ڈالے اس کو واپس لے کر چلی تو وہ اس سے ملے بغیر چپ چاپ گاڑی میں آ کر بیٹھ رہا۔ اسے لگا وہ گاڑی نہیں چلا سکتا۔ کتنی دیر سامنے کا منظر دھواں دھواں رہا۔ یہاں تک کہ دو آنسو اس کی آنکھوں سے نکلے اور فضا میں تحلیل ہو گئے۔

"ایک جملہ تم کہنے سے رہ گئے تھے۔" عباس رشید احمس نے یہاں کسی کو مخاطب کیے کہا تھا۔

"کہ میری پشت پر کوڑوں کے پانچ داغ پاکستان ہیں۔"

☼ ☼ ☼

وہ اس بھیانک خواب سے بیدار ہوا تھا۔ جو اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا تھا۔

حلق میں پیاس کی شدت سے کانٹے چبھ رہے تھے جیسے وہ برسوں سے تپتے صحرا میں ننگے پاؤں بھاگتا پھر رہا تھا۔

وہ میٹرس سے اٹھا کھلی فضا میں سانس لینے کو بے تاب وہ ستاروں بھرے آسمان کے نیچے آیا۔ صحن میں لگے نلکے سے منہ لگا کر جیسے اس نے سیروں پانی پیا۔ پانی اس کی باچھوں سے نکل کر گرتا اس کے گریبان کو بھگوتا اس کا دامن شرابور کر چکا تھا۔ اور پیاس تھی کہ بجھنے کا نام نہیں لیتی تھی۔

اس نے کلائی بلند کر کے ستاروں کی مدہم روشنی میں وقت دیکھنا چاہا۔ دو بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ ڈائل کے نیچے سے چوکور خانے میں لکھا تھا۔

4 اپریل 1979ء۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



"عید قرباں مبارک ہو۔" جی کیا کہا؟ پرانی بات ہو گئی ہے؟ ہاہاہا۔ اب نئی باتیں کہاں سے سناؤں آپ کو۔ اگر آپ کا سگنیچر اور میرٹ ہوتا تو میں پوچھتی آپ سے ہی تازی۔ خیر اب شیئر تو کرنی ہے آپ سے اپنی روداد عید قرباں۔

عفت سحر طاہر

وہ ایک سہانی صبح تھی۔

ازمیر شاہ نے میرا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ پھر کسی بات پہ ہنستے ہوئے اس نے میرا ہاتھ کھینچ کے اپنی طرف...

پتا نہیں کس رائٹر کی ہیروئن کی طرح میں ٹھا کر کے اس کے سینے سے لگنے ہی والی تھی کہ جیسے اچانک زلزلہ آگیا ہو۔

"یا خدا۔"

"اٹھ جاؤ روی کی بچی یا پھر روز محشر فرشتوں ہی کو منہ دکھاؤ گی۔" اب کی بار زرمینہ نے مجھے سختی سے جھنجوڑا تھا۔

"خبیثہ۔ مجھے پتا تھا تم ہی ہوگی۔" آنکھیں کھلتے ہی میں اس پہ چڑھ دوڑی۔

"احسان مانو جو اٹھانے آگئی ہوں۔ ورنہ دادی جان اپنی نئی نویلی چپل لے کے آتیں۔" وہ بھی سلگی تھی۔

"ایک منٹ۔ صرف ایک منٹ ہی تو مانگا تھا ظالم دنیا والو۔ بس ازمیر شاہ مجھے گلے سے لگانے ہی والا تھا۔" میں نے پرانی ہیروئن کی سی "اداکارانہ" سسکی بھری تو [illegible] مجھے پکارا۔

"لگانے والا تو نہیں البتہ گلا دبانے والا ضرور ہے کیونکہ وہ جاگنگ کرکے آچکا ہے اور اب ناشتے کے لیے پہنچنے ہی والا ہے اور تمہیں تو شاید یاد نہ ہو مگر مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس ہفتے ناشتہ بنانے کی باری تمہاری ہے اور آج محض چوتھا روز ہے۔"

مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اٹھنا ہی پڑا۔ دادی جان نے سب پوتیوں "اہم۔ میرا مطلب ہے کہ سب پوتیوں میں کام کی ڈیوٹیاں بانٹ دی تھیں جن سے پہلو تہی کرنا دادی جان کو دشمن بنانے کے مترادف تھا۔ سو میں واش روم سے محض دو منٹ میں فراغت پاکر اڑتی ہوئی ڈائننگ تک پہنچی۔

اُف۔ صبح صبح ہینڈسم سے منگیتر کو دیکھنا کتنی تروتازگی دیتا ہے۔ وہ مغرور کالم اخبار میں "گھسا" ہوا تھا۔ عمر ابرار اور حسان مارننگ شو دیکھ رہے تھے اور ہوسٹ کچھ نخرے زیادہ کر رہے تھے۔ لڑکیاں اپنی جمائیاں روکتی کبھی ادھر تو کبھی ادھر کر رہی تھیں۔

دستیاب نہیں ہو "ٹیک پاس" شو کا، دینا ملک کے کارنامے دیکھنے کو بچاریاں بارہ بجے تک ٹی وی کے آگے جمی رہتی تھیں۔

دینا ملک کو تین تین مشٹنڈوں کے ساتھ چہلیں کرتے دیکھ کر گال پیٹتیں۔ اندر سے محظوظ ہوتیں۔

"اتنا ہی برا لگتا ہے تو مت دیکھا کرو۔" میں نے کہا تو فائقہ چمکی۔

"ثواب عبرت بھی حاصل نہ کرے بندہ۔"

سو اب نیند پوری نہیں ہوئی تھی مگر دادی جان کا حکم بھی گویا ٹیک باس ہی کا حکم تھا۔ اس لیے ابھی ینگ جنریشن ناشتے کی میز پر جبکہ بڑے ناشتے سے فارغ ہو کر لاؤنج میں بیٹھے تھے۔

"تمہارے لیے ناشتے میں کیا لاؤں؟" سب سے پوچھ کر میں نے بڑے انداز سے ازمیر سے پوچھا۔

"دو جلے ہوئے توس۔ ایک سخت ابلا ہوا انڈا اور ایک پانی پتی۔" وہ اخبار پر نظریں جمائے سنجیدگی سے بولا تو سب کے ساتھ ساتھ میں بھی حیران ہوئی۔

"یہ کیا ناشتا ہے۔ میں کیسے بناؤں گی؟"

"[illegible] پچھلے چار دنوں سے تو بڑی کامیابی سے بنا رہی ہو۔" وہ اب کی بار مجھے گھورتے ہوئے طنز سے بولا تو سب کی ہنسی چھوٹی۔

اور میں شرمندہ۔ بلکہ دل تو چاہا رو ہی دوں۔

یہ ہوتی ہیں منگیتر سڑیل۔

فلموں میں دیکھا ہے نا آپ نے ہیروئن نمک ڈال کر یا پھر بغیر چینی کے چائے بھی ہیرو کو دے دے تو ہیرو کا ایک ہی ڈائیلاگ ہوتا ہے۔

"تمہارے ہاتھ کے لمس نے پھیکی چائے کو بھی میٹھا کردیا ہے۔" مگر ادھر۔ سلطان راہی پلے پڑا ہے میرے۔ ہیروئن ناچ رہی ہے وہ موصوف کبھی درختوں کو کبھی آسمان کو دیکھے جارہے ہیں۔ بس ہیروئن ہی کو نہیں دیکھ رہے۔

ادھر میرو بھی میرے علاوہ سب دیکھتا ہے۔

میرے پاس سب کی ہنسی سے بچنے کا ایک ہی چارہ تھا کہ میں پاؤں پٹختی کچن میں چلی جاتی۔

اور میں نے یہی کیا۔

☆ ☆ ☆

میں نے کہا میرا کفن کیسا ہوگا فراز
وہ ہنس کے بولی لٹھے دی چادر اتے سلیٹی رنگ ماہیا

میرے موبائل پر میسج آیا تھا۔

"فراز نے پنجابی میں بھی شاعری کی ہے؟" میں متاثر ہوئی تو ماہین نے مجھے گھورا۔

"یہ فارغ اور نکمے لوگوں کا کام ہے کسی کا کلام خراب کرنا۔ فراز نے اردو ہی میں شاعری کی ہے۔ اور بہت خوب صورت۔"

"تو یہ لٹھے دی چادر والا گانا انہوں نے نہیں لکھا؟ میری فرینڈ نے ایس ایم ایس بھیجا ہے۔" میں نے اعتراض کیا۔

"اس نے تو بھیجا ہی تھا مگر اسے کیا معلوم ادھر تمہارا "بھیجا" نہیں ہے۔" زرمینہ نے لقمہ دیا۔

"شٹ اپ۔"

میں نے اسے گھورا اور پھر یاد دہانی کرائی۔

"تمہارا دماغ کتنا کام کرتا ہے یہ تو میں تمہارے "وادیٔ عشق" کے شہزادے کو دیکھ کے ہی جان گئی تھی۔" وہ کھسیانی۔

"زندگی میں ایسے اونچے نیچے موڑ آتے ہی رہتے ہیں۔ نور بیلم" ماہین نے اٹھ کے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"زندگی میں جب تم کو
کوئی رستہ دکھائی نہ دے
کوئی منزل دکھائی نہ دے
کوئی اپنا دکھائی نہ دے
تو تم میرے پاس آنا
گر تمہیں
میں [illegible]"

وہ بہت محبت اور ہمدردی سے کہتے ہوئے ذرا تھمی۔ پھر بولی۔

"آنکھوں کے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گی۔"

زرمینہ۔ جس کی آنکھوں سے اس ہمدردی پر آنسو گرنے ہی والے تھے بدک گئی۔

"[illegible] میری نظر اللہ کے فضل سے کمال کی ہے۔"

"کمال کی ہے۔ تو تمہاری کہاں ہے پھر؟" فائقہ بھولپن سے پوچھنے لگی۔

"جہنم میں۔" وہ چڑی۔

"خدا تمہیں بھی جلدی پہنچائے۔" میں نے ہاتھ بلند کیے تو وہ خطرناک تیوروں کے ساتھ میری طرف بڑھی۔ پھر مجھے ہی سیز فائر کرنا پڑا۔ کان پکڑے تو وہ ٹھنڈی ہوئی۔

گھر آکے میں نے سب لڑکیوں کو "شہزادے" کا قصہ نمک مرچ لگا کے سنایا تھا۔ زرمینہ بے چاری کا تو بیچ میں بے ہوش ہونے کا موڈ ہو رہا تھا مگر اتنی سزا تو اس کا حق بنتی تھی نا۔ جھوٹی کہیں کی۔

"چلو۔ میرا بھائی کون سا کم برا سلوک کرتا ہے تمہارے ساتھ۔" اسے کمینی سی تسلی ہوئی۔

میرا دل توڑنے کی اس نے کوشش تو بہت کی فراز
اسے معلوم نہیں [illegible]

میں نے اطمینان سے کہا اور پھر ماہین سے ایک دھمو کا کھایا۔

"یہ فراز نے کہا ہے؟"

"مجھے تو فرزانہ نے ایس ایم ایس کیا ہے۔ اب اسے فراز نے کہا ہے یا نہیں یہ مجھے کیا پتا۔"

میں نے کندھا سہلایا۔ اس کے سامنے اس کے عزیز شاعروں کی بے عزتی کرکے کوئی کہاں جاتا بھلا۔

"کہ یہ شاعری اس کا منگیتر بھیجتا ہے۔"

میں نے جوش سے بتایا۔

"میری تمام تر ہمدردیاں فرزانہ کے ساتھ ہیں۔" ماہین نے گہری سانس بھرتے ہوئے اپنی کتاب کھول لی تھی۔

"خدا کی قسم لڑکو! کیا شے ہوتے ہیں یہ منگیتر بھی۔ کبھی میری دوستوں سے قصے سنو تو چار چار منگنیاں کروالو۔ اور ایک میرا منگیتر ہے۔ اپنی طرز کا ایک ہی

ثمونہ اور بینی "شے" ہے۔"

میں نے رشک سے کہتے ہوئے آخر میں دانت پیسے تھے۔

"عید آرہی ہے دل کلیجہ بھون کے کھلاؤ تو منگیتر قابو میں آ جائے گا۔"

زرمینہ نے نا ممکن سا مشورہ دیا۔

"ہاں۔ کلیجہ بھون کے اسے کھلاؤں اور خود قبر میں جالیٹوں۔ اسے آزاد چھوڑ دوں۔"

میں تپی۔

"پریشان مت ہو رو بھا جانو! میں تمہاری جگہ لے لوں گی۔"

فائقہ نے ملائمت سے خباثت دکھائی تو میں نے دانت کچکچائے۔

"ضرور۔ بس گورکن سے پوچھنا پڑے گا۔ کیونکہ تمہارا کفن تو تھوڑا سا بڑا ہو گا ہی' قبر بھی تھوڑی بڑی کرانی پڑے گی۔"

"لعنت تمہاری سوچ پر۔ بھری جوانی میں لے کے مجھے بد دعا دے رہی ہو۔"

[illegible]

"[illegible] منگیتر پہ آنکھ رکھنے والی آشوب چشم ہو جائے گی۔"

میں نے اس کے لتے لیے تھے۔ ایک تو ان تمواروں پہ "بوجہ بے رخی منگیتر" میرا دل ویسے ہی دکھا ہوتا تھا۔ اوپر سے یہ بچ بچ۔

"اچھا ہے نا۔ میں نے بھی عمران عباس اور کعب عزیز کے فون نمبرز لے کے رکھے ہوئے ہیں۔ اسی دن فون کروں گی جب میرا منگیتر مجھے لفٹ کرائے گا۔" میرا ارادہ مصمم تھا۔

"اس عید پہ منگیتر کو عید کارڈ نہیں لکھ سکتے؟" میں نے ماہین سے پوچھا جوابا" اس نے مجھے چار آنکھوں سے (عینک سمیت) گھورا۔

"میں کون سا چار منگنیاں بھگتا چکی ہوں۔ ایک ہی "لائق عبرت" منگنی ہوئی ہے ابھی تک ہمارے بٹ ہاؤس میں۔"

"چل نی۔ بڑی آئی۔ عبرت کیوں خدانخواستہ۔ یہ کہو کہ سب جیلس ہوتی ہو مجھ سے۔" ہمیں اترائی۔

لب چاہے لفٹ کراتا تھا یا نہیں مگر بہر حال ایک عدد ہینڈسم منگیتر میری ملکیت تو تھانا۔

"تم چاہو تو میں ہیلپ کر سکتی ہوں۔ میرا بھائی ہے میں اسے بہت اچھے سے جانتی ہوں۔"

یہ زرمینہ تھی۔ لاکھ دفعہ کی آزمائی ہوئی۔ چالاک لومڑی۔

"اور تمہیں "میں" بہت اچھے سے جانتی ہوں۔" میں نے طنز کیا۔

"زندگی میں اگر کچھ حاصل کرنا ہو تو ہمیشہ اپنے دماغ کی سنو۔" ماہین نے باآواز بلند یہ مشورہ یقینا" مجھ ہی کو دیا تھا۔

"لیکن اگر دماغ سے کوئی آواز نہ آئے تو۔؟" میں نے عقل مندی دکھائی۔

"تو پھر آنکھیں بند کرو اور سوچو خوب سوچو۔" وہ ڈرامائی انداز میں بولی۔

میں نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ پھر ایک آنکھ کھول کے پوچھا۔

"[illegible]"

"[illegible] کیا ہے؟"

چند لمحے وہ مجھے گھورتی رہی پھر کھا جانے والے انداز میں بولی۔

"یہی کہ میرے پاس دماغ ہے بھی یا نہیں۔" وہ سب ہنس دیں۔

"خبیثنیاں۔"

"اس بار میں نے خود ہی سوچ لیا ہے کہ میں از میر بٹ کو کیسے پھانسنے والی ہوں۔"

میں نے سسپنس پھیلایا۔

"چارہ ڈال کے۔"

"از میر بٹ ہے یا بکرا۔"

"یہ منہ اور مسور کی دال۔"

"ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا۔"

"کوا چلا ہنس کی چال۔"

"انگور کھٹے ہیں بی بی!"

دیکھ لیا آپ نے۔ یہ زرمینہ' فائقہ' تحریم' ماہین اور [illegible] اپنی بھائی بہنیا کے قربان ہیں۔

جل ککڑیاں۔

مگر میں بھی اس بار انہیں ہوا نہیں لگنے دینے والی تھی کہ میں کس طرح از میر بٹ کو رام کرنے والی ہوں۔

فرزانہ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ بڑی رومانٹک شاعری (جو اس کا منگیتر بھیجتا تھا) مجھے فارورڈ کرے گی (اور میں وہ میسج از میر کو ایس ایم ایس کروں گی' یہ اسے پتا نہیں تھا) میں تو کھل ہی اٹھی تھی۔

چلو۔ کسی طرح تو میرے دلی جذبات اس پتھر دل تک پہنچیں گے۔ ورنہ عید الفطر پہ تو ان جل مرنیوں نے جو ٹرکوں والے شعر لکھ کے اس تک پہنچائے تھے ان کی یاد آج بھی مجھے لرزا دیتی تھی۔

☼ ☼ ☼

لڑکے بکرے لے آئے تھے۔ جی ہاں۔ دو عدد پلے ہوئے بکرے۔ ہم سب ان کا دیدار کرنے لان میں آئے ہوئے تھے۔

[illegible]

"مجھے بکروں کی اتنی بو آرہی ہے کہ میں خود کو دو ٹانگوں والا بکرا تصور کر رہا ہوں۔"

"اور مجھ سے جو جپھیاں ڈالی ہیں ان بکروں نے آتے ہوئے۔" عمر چونکہ بڑی گاڑی میں بکروں کے ساتھ پیچھے بٹھا کے لایا گیا تھا' اس لیے کافی غصے میں تھا۔

اب لڑکے تو گئے نہانے اور بکروں کو باندھ گئے شہتوت کے درخت کے ساتھ۔ ایک بکرا تو فائقہ پہ اتنا فدا تھا کہ بار بار اس کی طرف لپکتا۔

"یا تو اس میں انسانی روح ہے یا تمہارے اندر اسے بکری دکھائی دے رہی ہے۔"

ماہین نے تجزیہ کرتے ہوئے اپنی عینک درست کی تو فائقہ غرا کے رہ گئی۔

"میرے خیال میں یہ جو تم نے نفیس سی فروالا سویٹر پہنا ہوا ہے۔ یہ اس بکرے کی سنزی کی کھال سے بنا ہوگا۔"

میں نے اسے ڈرایا تھا۔

"اس کی سنز بکری تھی وہ کا گل صاحب سو بھی نہیں۔" فائقہ نے مجھے یاد دلایا۔

"بہر حال۔ جو بھی ہو اس بکرے کا دل تم پر بہت بری طرح آیا ہے۔"

زرمینہ نے بھی نوٹس کیا تھا۔

رات کو بکروں کو پچھلے دالان میں باندھ کر چارہ وغیرہ ڈال دیا گیا اور۔۔۔ میں گیارہ بجے تک لڑکوں کے انتظار میں بیٹھی رہی۔ وہ اپنے کسی دوست کے ساتھ قربانی کا جانور خریدنے گئے ہوئے تھے۔

جلتی بھنتی اندر آئی۔

اندر وہ سب ٹی وی کے سامنے براجمان تھیں۔

"یار۔۔۔ درمیان والا دروازہ تو بند کر آؤ۔ بکروں کی آوازیں آرہی ہیں۔ پتا نہیں چل رہا سلمان خان بول رہا ہے یا براؤن گھر کا بکرا۔"

[illegible]

"[illegible] ہاں بکروں کے منہ [illegible] جاؤں گی۔" میں نے واضح کیا۔

"اچھا۔ صرف رات کو ہی اعتراض ہے یا صبح بکروں کے منہ لگ سکتی ہو۔"

فائقہ پہ تو خباثت ختم تھی۔

"قربانی کے بکروں کا مذاق اڑا رہی ہو۔ دیکھنا ان کی روحیں بھوت بن کے ناچیں گی تمہارے کمرے میں۔"

میں نے منہ پہ ہاتھ پھیرا تو اس نے ہاتھ ہلا کے مکھی اڑائی۔

"آج ہم رو بھا کے کمرے میں سوئیں گے۔"

زرمینہ نے پروگرام ختم ہوتے ہی اعلان کیا۔ لڑکے ابھی تک نہیں آئے تھے۔

"میں نے کیا گناہ کیا ہے؟"

"دادی جان نے کہا ہے تم مردوں سے شرط باندھ

کے سوتی ہو اس لیے تمہیں صبح جگانے کے لیے یہ ڈیوٹی مجھے اور فائقہ کو سونپی گئی ہے۔" وہ متانت سے بولی۔

میں بے چاری کیا کر سکتی تھی دانت پیس کے اسے دل ہی دل میں گالیاں دینے کے سوا۔

اور وہ دونوں ذلیل ماریاں سنگل بیڈ پہ کمبل میں یوں گھس کے سوئیں کہ میں بے چاری اس بیڈ کی مالکن ایک کونے میں سکڑی پڑی تھی۔

آدھی رات کو کسی نے کمبل کھینچا۔ میں نے اپنی طرف کھینچا تھوڑی دیر بعد پھر پتا نہیں زرمینہ یا پھر فائقہ نے وہی حرکت کی۔ اس کے بعد ایک عجیب سی آواز۔ جیسے بیڈ کے ساتھ کوئی چیز رگڑی جا رہی ہو۔

"زری۔ یہ۔ گ گ کون ہے؟"

فائقہ میرے کان میں گھسی۔

"چ چ چور۔" زرمینہ کا حلق سوکھ رہا تھا۔ ساتھ ہی ہمارا کمبل کھینچا گیا اور بیڈ یوں ہلا جیسے زلزلہ آیا ہو۔ ہم تینوں نے دلدوز چیخیں ماریں اور اس وقت تک چور، چور کے نعرے لگائے جب تک کہ [illegible] کسی نے آکر کمرے کی لائٹ [illegible] میں کر دی۔ ان دونوں کا تو نہیں میرے تو منہ پہ کسی کو ہاتھ رکھ کے [illegible] بند کرنا پڑا۔ میں نے پٹ سے آنکھیں کھولیں تو ازمیرث [illegible] بھی تھا ڈر بھی اور وحشت بھی۔

یعنی رسم دنیا بھی تھی موقع بھی اور دستور بھی۔ میں کھٹاک سے ازمیرث سے لپٹ گئی۔

"چور۔ چور ہمارا کمبل کھینچ رہا تھا۔ بیڈ کو ہلا رہا تھا۔"

"میں نے کتنی بار کہا ہے کہ سارے دروازے بند کیا کرو یار۔ درمیان والا دروازہ بھی کھلا تھا اور یہ تم نے اپنے کمرے کا دروازہ بھی ٹھیک سے بند نہیں کیا۔ تب ہی تو یہ اندر آ گیا۔"

وہ مجھے آرام سے پیچھے کرتے ہوئے سخت لہجے میں بولا۔ ڈرتے ڈرتے میں نے نظر اٹھائی تو براؤن کلر والے بکرے کو اپنا کمبل چباتے اور بیڈ کے ساتھ سر رگڑتے دیکھ کے مجھ پہ بھی اتنا ہی پانی پڑا جتنا کہ فائقہ اور زرمینہ پر۔

پھر وہ بکرا تو لے گیا مگر ہم تینوں بیڈ پہ گر کے اتنا ہنسیں کہ کیا ہی زندگی میں ہنسی ہوں گی۔

ایسے میں گلے ہے بگاہے ازمیرث کا نادانستہ لمس مجھے رہ رہ کے یاد آ رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا میرے دل میں اس کی محبت نہیں بلکہ شدید محبت تھی۔

✡ ✡ ✡

میں نے فرزانہ کو خاص تاکید کی تھی جو بھی شاعری بھیجو خاص عید کی مناسبت سے بھیجنا۔ اسے میں نے یہ نہیں ہوا لگنے دی تھی کہ اس کے منگیتر کے جذبات میں اپنے منگیتر تک پہنچانا چاہتی ہوں۔ کیا خبر ہانڈی ہی کر جاتی۔ اب عید میں محض ایک دن رہ گیا تھا اور اس ذلیل لڑکی نے مجھے ابھی تک لٹکایا ہوا تھا۔ فون کر کر کے میرا بیلنس ختم ہونے کو تھا۔

"ہٹ ست منگیتر ہے تمہارا۔ ایک میسج کے انتظار میں تم تو آدھی ہو جاؤ گی۔"

"اوف۔ بھیج دے گا کیا پریشانی ہے تمہیں۔"

"ہاں۔ اے کوئی بھیجے گا تو تمہیں بھیجے گا۔" مجھے غصہ آ رہا تھا۔

گھر والوں کی مدد لینے سے میں انکار کر چکی تھی۔ اوپر سے "غیبی امداد" بھی بند ہو گئی تھی۔ حد ہو گئی تھی یعنی کہ۔

اور پھر رات گئے جب میں بالکل مایوس ہو کر نیند میں تھی تو میرے موبائل کی میسج ٹیون بجی۔ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ میں نے تکیے کے نیچے سے موبائل نکالا۔ فرزانہ کا میسج تھا۔

اب پتا نہیں کوئی نظم تھی یا کیا۔ نیند بھری آنکھوں اور ذہن سے کچھ سمجھ نہیں آیا تو میں نے بڑی ایمان داری کے ساتھ اسے میو کو فارورڈ کر دیا۔ اور ساتھ ہی اس ایس ایم ایس کو ان باکس میں سے ڈیلیٹ بھی کر دیا مبادا کوئی اور ہی نہ پڑھ لے اور سرشار سی لیٹ گئی۔ اب بڑے مزے کی نیند آنے والی تھی۔

✡ ✡ ✡

"[illegible] مبارک۔ عید مبارک۔"

مرد حضرات عید کی نماز پڑھ کے آ چکے تھے۔ اور ہم لڑکیاں بھی اس عید پر بھی عیدیاں بٹورنے سے باز نہیں آ رہی تھیں۔

"عید مبارک۔" باہر قصائی آیا تو مرد باہر لپکے۔ میں نے موقع پا کر میو سے کہا۔ (آدھی رات کو فسوں خیز شاعری نے کچھ تو اثر کیا ہو گا)

"تمہیں تو میں ابھی واپس آ کے بڑے اچھے سے عید کی مبارک دوں گا۔ وہ بھی تمہارے ساتھ۔"

وہ سنجیدگی سے کہہ کے باہر نکل گیا تو میں چکرا سی گئی۔ اب پتا نہیں اس کی آنکھوں سے محبت کے شعلے نکل رہے تھے کہ انتقام کے۔ مگر فائقہ دل تھام کے صوفے پہ گری تو میں تن کے مغرورانہ انداز میں بیٹھ گئی۔

"یہ کیا ہو گیا۔ بکرا کیسے۔ میرا مطلب ہے منگیتر کیسے قابو میں کر لیا؟"

زرمینہ متحیر تھی۔

"[illegible] میرے آگے [illegible] ہیں۔"

"الفاظ خرچ کیے ہیں میری جان لفظ۔" میں اترائی۔

"کہاں سے چرائے۔ شاعری سے تمہیں تو کوئی شغف ہے ہی نہیں۔"

ماہین صاف گو تھی۔

"محبت۔ محبت سب کو شاعر بنا دیتی ہے۔ ایسے الفاظ لکھ کے بھیجے ہیں کہ ساری رات کروٹیں بدل کے گزاری ہو گی اس نے۔ ایک ایک لفظ نے تڑپایا ہو گا اسے۔" میں آنکھیں موند کے جھومی۔

"اف۔ کیا لکھ بھیجا؟"

زرمینہ نے مجھے جھنجوڑا تھا۔

"بس رات کو آمد ہوئی تو لفظوں کی نوک پلک سنوار کے میں نے محبوب کو میسج کر دیا۔"

میں بے اعتنائی سے بولی۔

"ہائے شکیلہ آپا کے میاں محبوب کو؟" ماہین نے آنکھیں پھاڑیں۔

"ایک تو تمہیں شکیلہ آپا کا میاں بڑا یاد ہے۔" میں جی بھر کے بدمزہ ہوئی۔ پھر مسکرا کے بولی۔

"اپنے محبوب۔ اپنے میو کو۔"

اور پھر لمبا انتظار۔

مگر ادھر بکرے کی کلیجی اندر آئی تو ساتھ ہی عمر بھی لاؤنج میں آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں کپڑے سے ڈھکی کوئی شے تھی اور ساتھ ایک کارڈ۔

"یہ میو نے تمہارے لیے بھیجا ہے۔"

اس نے دانت چمکائے تو میں کھل اٹھی۔ جھپٹ کے عید کارڈ چھینا۔ جس پہ بڑا بڑا لکھا تھا۔

"یہ دل آپ کا ہوا۔"

وہ سب تو جل جل گئیں۔ اور میں پل بھر میں عرش پہ جا بیٹھی۔

"میو کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔" فائقہ کڑھی تھی۔

بری نظر والے تیرا منہ کالا
دل ہے تیرا کالا اور لہو بھی کالا
[illegible]
[illegible]

میں نے ایک ادا سے کپڑا ہٹایا اور سب کے ساتھ ساتھ میری بھی چیخ نکل گئی (جان نکلتے نکلتے رہ گئی) تازہ تازہ ذبح شدہ بکرے کا ابھی بھی دھڑکتا ہوا بڑا سا دل گویا میری توجہ کا منتظر تھا۔

فائقہ کا قہقہہ سب سے بلند تھا۔ عمر بھی ہنستا ہوا واپس گیا تھا۔

"خبیث نہ ہو تو۔ پتھر دل تمہارا بھائی۔ اپنا دل ہوتا تو بھیجتا نا مجھے۔" اڑے ہوئے حواس قابو میں کرتے ہوئے میں نے ٹرے ٹیبل پر پٹخی۔ اور زرمینہ پہ غصہ نکالا۔ وہ میرا موبائل ٹٹول رہی تھی۔

"میری ہمدردی تمہارے ساتھ ہے۔ تمہارے معصوم اور ان چھوئے الفاظ و جذبات کا جس طرح اس نے جواب دیا ہے تم اس کے قابل ہو۔"

وہ بڑی محبت اور ہمدردی سے کہتے کہتے ٹھٹک گئی۔

میسج تو تم ان باکس میں سے ڈیلیٹ کر چکی تھی۔

یہ ڈیلیٹ آئٹم میں وہ میسج ابھی محفوظ ہے۔ جو اس نے بھائی کو بھیجا تھا۔" وہ یک لخت چہکی تھی۔

"پڑھو تو۔ اس کے کون سے معصوم جذبات تھے جس کا اس ظالم نے اس قدر جابرانہ جواب دیا ہے۔" تابین نے دردمندی سے کہا۔

"رونا کل! تم واقعی اسی قابل ہو کہ وہ تمہیں بکرے کا دل۔ بلکہ اس کا زہر سے بھرا پتہ بھیجتا۔" زرمینہ کراہی تھی۔

"کچھ پھوٹو بھی۔"

وہ سب بے چینی سے دائیں بائیں آبیٹھیں۔

"فرزانہ کا منگیتر اسے اتنی اچھی شاعری بھیجتا ہے۔ کہہ رہی تھی عید پر بھی بہت مزے کی چیز لکھ کے بھیجے گا۔ میں نے کہہ دیا اگر عید کی مناسبت سے ہوئی تو مجھے لازمی بھیجنا۔ سوچا تھا اس پتھر دل منگیتر کے دل کے پتھر پر ان نرم لفظوں کے قطرے گریں تو شاید سوراخ ہو ہی جائے اس میں۔"

مجیبا مستقل طور پر ن ساشہ کی سہیلیوں کے گٹ اپ میں تھی۔

"شاباش ہے۔ "سوراخ شدہ" دل کیا کرتا ہے بھلا تمہارے؟" مجیبا نے مجھے گھورا تھا۔

"جیسی شاعری تم نے اسے بھیجی ہے بھائی کو چاہیے تھا کہ بکرے کے پائے بھی تمہیں ہی بھیجتا۔ اور سری بھی بھیجے سمیت۔"

زرمینہ متاسف تھی پھر وہ میسج پڑھنے لگی۔

کاش اس عید پہ تو
میرا بکرا ہوتا
اور کسی نے نہیں میں نے تجھے پکڑا ہوتا
میں روز تجھے چنے کھلاتا
تھوڑے تھوڑے نہیں
سارے اکٹھے کھلاتا
تو مجھے میں میں کر کے بلاتا
شام کو میں تجھے
گلی گلی گھماتا
پھرے پاس گاڑی نہیں
چھکڑا ہوتا
کاش اس عید پہ
تو میرا بکرا ہوتا
رات کو سردی میں تو اکڑا ہوتا
میری محبت میں
کچھ اس طرح جکڑا ہوتا
کاش اس عید پہ تو
میرا بکرا ہوتا

اس کے یہ مادر پدر آزاد شاعری ختم کرنے تک سب پیٹ تھامے ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہو رہی تھیں۔

اور میں۔؟ بس نہیں چل رہا تھا کہ فرزانہ اور اس کا بکرا۔ میرا مطلب ہے کہ اس کا منگیتر سامنے ہوتا تو ان کا حشر کر ڈالتی۔

"اچھا جی۔ تو یہ آمد ہوئی تھی شاعری کی۔" فائقہ نے تمسخر اڑایا۔

"بلکہ یہ تو "درآمد شدہ" لگ رہی ہے۔"

"یہ گنوائے گی میرے بھائی کو ہاتھ سے۔" زرمینہ نے ہاتھ جھاڑے۔

"دوسروں پہ بھروسہ کرنے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔" یہ تابین چشمالو۔

یہ سب خبیث بھی لڑکیاں انٹرنیشنل کنواریاں۔ پتا نہیں خدا مجھ معصوم کی ہر پول انہی کے سامنے کیوں کھولتا ہے۔

بہر حال۔

آپ سب سے حال عید کہہ کر کچھ دل ہلکا ہوا (دو چار "صاحب منگیتر" قارئین سے گزارش ہے کہ از میرٹ کو منانے کے نادر و نایاب نسخے شیئر کریں اللہ اجر دے گا۔)



فضیلہ عاصم



وہ خاموشی سے آٹا گوندھنے میں مصروف تھی۔ اپنے مسلسل بہتے ہوئے آنسو اس نے اپنے چھوٹے سے میلے دوپٹے سے پونچھ ڈالے تھے۔

آٹے میں پانی زیادہ پڑ چکا تھا اور اب وہ پتلا ہو کر اس کے ہاتھوں سے چپک رہا تھا۔ اس نے ڈبے سے مزید آٹا نکال کر پتلے آٹے پر چھڑکا اور دوبارہ اسے گوندھنے میں مصروف ہو گئی۔



آج پھر اسے اماں سے ڈانٹ پڑی تھی۔ وہ بھی شمیم اور حمیدہ کے سامنے۔ وہ دونوں تو اسے ڈانٹ کھاتا دیکھ کر چپکے سے کھسک لی تھیں مگر اس کا شرمندگی سے برا حال تھا۔

اماں کی ڈانٹ صرف ڈانٹ نہیں ہوتی تھی بلکہ گالیوں کا پورا مجموعہ ہوتا تھا اور یہی بات اسے شرمندہ کر گئی تھی۔ بھلا گالیاں دینے کی کیا ضرورت ہے۔ چاہے جتنا بھی ڈانٹ لیں۔ مگر اس کی ماں جاہل عورت تھی۔ لڑکوں کو پیٹنا اور اس اکلوتی بیٹی کو جھڑپ کے ساتھ گالیوں سے نوازنا‘ وہ اپنے ماں ہونے کا حق سمجھتی تھی۔

دونوں لڑکے تو پٹ پٹ کر ڈھیٹ ہو چکے تھے اور اب ماں کے قابو سے باہر تھے۔ اماں ان کو مارنے دوڑتی تو وہ بجلی کی تیزی سے بھاگ نکلتے اس لیے اب ان کا غصہ بھی معصوم بجو پر ہی اترنے لگا تھا۔

وہ صرف گیارہ برس کی تھی۔ اپنے سرکاری اسکول سے تھکی ہاری آنے کے بعد وہ کولہو کے بیل کی طرح کام میں جت جاتی۔

اماں دوپہر کا کھانا تیار کر کے رکھ دیتی تھی‘ جسے وہ خود ہی نکال کر کھا لیتی البتہ بھائیوں کو اماں اپنے ہاتھ سے کھانا نکال کر دیتی۔ جس دن گوشت پکا ہوتا اس دن تو خاص کر اچھی اچھی بوٹیوں پر صرف بھائیوں کا ہی حق ہوتا۔

اماں خوب چھانٹ چھانٹ کر انہیں بوٹیاں دیتی۔ باوجود اس کے کہ وہ دونوں بہت پٹتے اور ڈانٹ کھاتے بجو کو صاف محسوس ہوتا کہ اماں ان سے پیار بھی بہت کرتی ہے۔

اکثر پٹائی کے کچھ دیر بعد اماں ان کو پیسے دیتی کہ وہ باہر سے کچھ خرید کر کھائیں۔ پیسے اسے بھی دیتی تھی۔ مگر بھائیوں کو وہ لاڈ بھی کرتی تھی‘ جو اس کے حصے میں نا ہونے کے برابر آتا تھا۔ کبھی دھیرے سے پیٹھ تھپک دی اور بس۔

وہ اماں کے لمس کو ترستی تھی اپنے ہوش میں اس نے کبھی خود کو اماں کے قریب نہیں پایا تھا پھر بھی وہ عادی نہیں ہو پائی تھی اور ہر وقت اماں کی توجہ حاصل کرنے کی جستجو میں لگی رہتی تھی۔

بجو کا باپ دو سال پہلے بیمار ہو کر چل بسا تھا۔ اماں کو پنشن ملنے لگی اور دو ہزار دکان کا کرایہ آتا۔ اسی سے گھر کا خرچہ چلتا۔

بھائیوں کو اماں نے پرائیویٹ اسکول میں داخل کرایا ہوا تھا۔ جب ابا زندہ تھے تو وہ بھی بھائیوں کے اسکول میں پڑھتی تھی مگر ابا کے جانے کے بعد اماں نے اسے سرکاری اسکول میں داخل کروا دیا تھا۔ اس کی سب سہیلیاں چھوٹ گئی تھیں۔ اسے سخت افسوس ہوا۔

خیر سکھیوں کا کیا ہے۔ وہ تو نئے اسکول میں بھی بن گئیں۔ مگر اسے اس ناانصافی کا بہت رنج ہوا جو بھائیوں کو اس پر سبقت دے کر کی گئی۔ اسکول کی وہ ایک اچھی طالبہ تھی۔ ساری استانیاں اس سے پیار کرتی تھیں۔

گھر کی بے توجہی کی وجہ سے اب وہ ہر ایک کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش میں زیادہ سے زیادہ اچھے کام کرتی۔ مگر اسے سب سے زیادہ توجہ اماں کی چاہیے تھی۔

وہ بہت چھوٹی تھی شاید چار یا پانچ برس کی جب اماں اپنے ہاتھوں سے اسے تیار کر کے اسکول بھیجا کرتی تھی اسے کپڑے پہناتی‘ چوٹی باندھتی اور موزے تک خود پہناتی۔ مگر جیسے جیسے وہ بڑی ہوتی گئی اماں کھنچتی گئی۔ اسے اماں پر ترس آنے لگا۔

اس نے گھر کے کاموں میں اماں کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا اور پتا نہیں کب گھر کے تمام چھوٹے اور چند بڑے کام اسی کے نام کر دیے گئے۔ اس کی عمر کی کوئی لڑکی اتنے کام نہیں کرتی تھی۔ اماں پھر بھی اس سے دور ہوتی گئی۔ شاید اس نے بجو کو اب مکمل با اختیار سمجھ لیا تھا۔

ابا کے مرنے کے بعد اماں معاشی فکروں میں الجھ کر اور بھی چڑچڑی ہو گئی تھی۔ ہر وقت غصہ ناک پر دھرا رہتا۔

"تو آؤ نا پیل دوج کھیلیں گے۔" شمیم نے پلک [illegible] بجو کو مارتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ وہ لب کھولتی اماں آ گئی۔

"بجو کہیں نہیں جا رہی تو جا شمیم۔ کوئی دس گیارہ برس کی ہو گئی ہو ابھی تک گلی میں کھیلتی ہو؟ اب گھر میں رہا کرو تمہاری اماں منع نہیں کرتی؟"

"نہیں خالہ! اماں تو کہتی ہے‘ دو چار سال اور کھیل لو پھر تو گھر ہی میں بیٹھنا ہے۔" شمیم نے ہنس کر کہا۔

"اے لو بھئی واہ‘ اچھا سبق پڑھایا ہے اماں نے ٹھیک ہے بھئی۔"

"تو پھر لے جاؤں بجو کو؟" شمیم نے امید بھرے لہجے میں کہا۔

"نہیں بالکل نہیں۔ ابھی اسے آٹا بھی گوندھنا ہے اور ڈھیر سے کام پڑے ہیں۔ چلو تم جاؤ۔"

شمیم مایوس ہو کر برا سا منہ بنا کر چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

پالک کاٹ کر اس نے چھلنی میں ڈالا اور نل پر دھونے بیٹھ گئی۔ اچھی طرح ساری مٹی نکال کر اس نے [illegible] باورچی خانے میں دیا اور [illegible] کپڑے اتارنے لگی۔

آج اس کا بہت دل تھا کہ وہ باہر شمیم اور حمیدہ کے ساتھ پیل دوج کھیلے۔ کپڑے اتار کر وہ کمرے میں لے گئی اور تہ کر کے الماری میں رکھنے لگی۔

کپڑے رکھ کر وہ سنگھار میز کے آگے کھڑی ہو گئی۔ بال بکھرے ہوئے تھے اس نے پلاسٹک کا کنگھا اٹھا کر بال سنوارنے شروع کر دیے چوٹی بنا کر وہ باورچی خانے کی طرف چلی۔

چوکھٹ سے چپک کر اس نے اماں کے موڈ کو پہچاننے کی کوشش کی۔ اماں کا چہرہ بے تاثر تھا۔

"اماں!" اس نے دھیرے سے کہا۔

"کہو۔"

"اماں! تھوڑی دیر کے لیے باہر چلی جاؤں؟" اماں نے غصیلے انداز سے مڑ کر اسے دیکھا اور پھنکاری۔

"بڑی بے غیرت ہے تو‘ میری بات تیری سمجھ میں نہیں آئی؟ ہوتے ہے؟ سمجھاؤں کیا؟"

"اماں! صرف تھوڑی دیر کے لیے؟"

"بے غیرت کمینی‘ بڑی اچھال چھکا ہے تو دفعان ہو جا ورنہ وہ جوتے ماروں گی کہ زندگی بھر یاد رکھے گی۔"

اماں کی زبان انگارے اگلنے لگی اور بجو کے سینے میں گرم گرم گولے پھٹنے لگے‘ جو اس کے حلق تک پہنچنے لگے۔ وہ پلٹی اور واپس کمرے میں چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

دروازہ بج رہا تھا وہ بے خبر سو رہی تھی۔ غسل خانے سے اماں کے چنگھاڑنے کی آواز آئی۔

"بجو! مر گئی کیا؟ دروازہ کھول۔ کب سے بج رہا ہے۔"

وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ دل تیز تیز دھڑکنے لگا اور کنپٹیاں سلگنے لگیں۔

"جا رہی ہوں۔" اس نے اماں کو تسلی دی۔

اس نے دروازہ کھولا تو ایک غیر مانوس چہرے کو کھڑا پایا۔ کافی بنی سنوری اس کی اماں کی عمر کی عورت [illegible] کھڑی تھی۔

"بانو رہتی ہے یہاں؟" عورت نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں" بجو نگ جڑی اس کی چپلوں کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"جاؤ اس کو بتاؤ تائی زبیدہ کی بیٹی یاسمین آئی ہے۔"

اس کو اماں کو بتائے بغیر کسی کو اندر بلانے کی اجازت نہ تھی اس لیے یاسمین کو باہر ہی چھوڑ کر وہ اندر دوڑی۔

اماں بال جھاڑتی غسل خانے سے نکل رہی تھی۔

"کون ہے؟"

"وہ کوئی تائی ہیں نا ان کی بیٹی یاسمین۔" وہ پھولی سانسوں کے ساتھ بولی۔

اماں سوچ میں ڈوب گئی جیسے یاد کر رہی

ہوں" یاسمین "بڑبڑاتی ہوئی دروازے کی طرف گئی۔ بجو وہیں کھڑی رہی۔ چند لمحوں بعد اماں اور یاسمین باتیں کرتی ہوئی اندر آگئیں۔

اماں نے صحن میں پڑی واحد کرسی پر یاسمین کو بیٹھنے کی دعوت دی اور خود تخت پر بیٹھ گئی۔

"بجو! چائے بنا' تیری خالہ یاسمین لندن سے آئی ہے۔"

"چائے بنائے گی یہ؟ یہ تو بہت چھوٹی ہے۔" یاسمین حیران تھی۔

"بنالے گی' آتی ہے اسے بنانی۔ ہم تو بھی چھوٹی عمر سے کام سکھاتے ہیں۔"

پھر وہ دونوں بہت دیر باتیں کرتی رہیں۔ یاسمین بجو کو دلچسپی سے سارے کام کرتے ہوئے دیکھتی رہی۔

اماں اس کو اپنے گھر کے دکھڑے سناتی رہی۔ گھر پر لیا گیا بینک کا قرضہ اس کا دردِ سر تھا۔ جس کا رونا وہ ہر ایک کے آگے روتی تھی۔ ابا نے کاروبار کرنے کے لیے لیا تھا مگر سوائے ناکامی اور نقصان کے ہاتھ کچھ نہ لگا اور قرضہ چڑھا سو الگ۔ ڈیڑھ لاکھ' سود چڑھتے چڑھتے سارے [illegible] ہو چکا تھا۔

آج ہونے والی اس نے جھاڑو پونچھا کر کے گھر کو چمکا دیا تھا۔ اتوار کا دن تھا۔ حمیدہ کے گھر بچوں کا میلاد تھا۔ اور وہ ہر حال میں جانا چاہتی تھی۔

"میں بھی نعت صلی اللہ علیہ وسلم پڑھوں گی۔" وہ دل ہی دل میں سوچ کر خوش ہو رہی تھی۔ "میں نے آج سب کام اچھے کیے ہیں۔ اماں مجھے ضرور جانے دے گی۔"

الماری میں سے اس نے اپنا گلابی جوڑا نکالا' یہ پچھلی عید پر اماں نے اسے بنا کر دیا تھا۔ استری کر کے وہ نہانے چلی گئی۔

باہر نکلی تو خالہ یاسمین کو اماں سے باتیں کرتے پایا۔ یاسمین کہہ رہی تھی۔ "تمہیں فکر کس بات کی ہے؟ کیا مجھ پر بھروسہ نہیں؟ میری کوئی بیٹی نہیں' ظاہر سی بات ہے بہت ہی پیار سے اپنی بیٹی بنا کر رکھوں گی۔"

"وہ سب ٹھیک ہے' مگر میری کون سی چار پانچ بیٹیاں ہیں۔ اکلوتی بچی ہے میری۔ یہ نہیں ہو گا مجھ سے۔" اماں کے لہجے کی نرمی بجو کے دل میں گدگدی سی کرنے لگی۔

"تو پاگل ہو' ذرا سوچو قرض کتنا چڑھا ہے تم پر پھر بیٹوں کا مستقبل اور بجو کا بیاہ۔ سب کیسے ہو گا؟"

"اب اللہ پر چھوڑ دیا ہے۔ بندہ کیا کر سکتا ہے۔" اماں کے لہجے میں اس بار بڑی عاجزی تھی۔

بجو کو خالہ یاسمین پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ کیوں مجھے لینا چاہتی ہیں۔ میں اپنی اماں کو چھوڑ کر ان کے پاس کیوں جاؤں؟

وہ باہر چلی آئی۔ یاسمین کو سلام کر کے وہ اماں کی طرف بڑھی۔ "اماں! میں جاؤں حمیدہ کے ہاں۔"

"ہیں؟" اماں چونک گئی۔ "ہاں' جا تو آج میلاد ہے نا۔"

رات بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے وہ مسرت کی انتہائی حد سے محظوظ ہوتی رہی۔

"اماں کو مجھ سے کتنا پیار ہے۔ وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتیں۔" وہ سوچتی رہی اور جانے کب سو گئی۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن اس کی امیدوں اور خوشیوں کا محل دھڑام سے گر گیا' اسے پتا چلا کہ اماں نے اسے یاسمین کے ساتھ بھیجنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

یہ بات اسے اس کے سب سے بڑے بھائی سلیم نے بتائی اور یہ بھی کہ خالہ یاسمین اماں کو چھ لاکھ روپے دے گی تاکہ اماں اپنا سارا قرضہ اتار سکے۔

"لیکن اماں نے کیا کیا؟ وہ میرے بغیر کیسے رہ پائے گی کس طرح سارے کام کرے گی؟ ہر وقت تو اس کے پاؤں میں درد رہتا ہے۔" وہ دوڑتی ہوئی اماں کے پاس گئی۔

"اماں!" اس نے کیاری میں سے ہرا دھنیا توڑتی اماں کو متوجہ کیا۔

مگر اماں خاموشی سے مصروف رہی۔ شاید اسے

اطمینان تھا کہ بجو کیا کہنا چاہتی ہے۔

"اماں!" وہ پھر بولی۔

"ہاں کیا ہے؟" اماں پلٹ کر باورچی خانے کی طرف چل دی۔

بجو بھی اس کے پیچھے باورچی خانے کی طرف چل دی۔

"اماں! میں خالہ یاسمین کے ساتھ لندن نہیں جاؤں گی۔"

"تجھے اپنی بیٹی بنا کر لے جا رہی ہے۔ بہت خیال رکھے گی تیرا۔ وہاں کتنے اچھے اچھے اسکول ہیں اور تجھے تو پڑھنے کا بہت شوق ہے۔"

"مگر میرا یہ اسکول بھی اچھا ہے۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔" وہ بضد تھی۔

"تو تو پاگل ہے۔ اس کے تین بیٹے ہیں۔ بیٹی کی بہت تمنا ہے اسے۔ کہیں سے بھی لے سکتی ہے وہ۔ لیکن اسے تو بہت اچھی لگی ہے۔ تیرا نصیب اچھا ہے۔ لندن جانے کی تو لوگ تمنا کرتے ہیں۔" بجو سر جھکائے [illegible]

"اماں! تم؟ تمہاری [illegible] صرف ایک بیٹی ہے اور میں کتنا کام کرتی ہوں تمہارا۔ جھاڑو کیسے لگاؤ گی تم؟ چھت پر تم سے جایا نہیں جاتا۔ بڑی والی چادریں کون پھیلائے گا؟"

"سب ہو جائے گا تو بے فکر رہ۔"

اب کی بار بجو کو اماں کی بے حسی پر سخت غصہ آیا۔ اس نے اونچی آواز سے کہا۔

"مگر میں نہیں جاؤں گی۔ مجھے تمہارے ساتھ رہنا ہے۔ اپنے گھر میں رہنا ہے۔ مجھے نہیں جانا۔ نہیں جانا۔"

وہ سمجھ رہی تھی اماں جواب میں اس کے گال پر زور کا طمانچہ مارے گی' پیٹھ پر دھموکے لگائے گی' گالیاں دے گی مگر خلاف توقع اماں نے پلٹ کر اسے خود سے لپٹا لیا۔

"میں کہاں تجھے خوشی سے بھیج رہی ہوں۔ پر کیا کروں اس مہینے آخری نوٹس آیا ہے بینک کا' قرض نہ چکایا تو گھر چھین لیں گے ہم سے۔ پھر ہم کہاں جائیں گے؟ پھر تو مجھ سے ملنے بھی تو آیا کرے گی' فکر کیوں کرتی ہے۔"

بجو اماں کے لمس کو پا کر چند لمحوں کے لیے سب کچھ بھول گئی۔

اپنے بچپن کا یہ گہرا دکھ جسے وہ جھیل نہیں پا رہی تھی۔ اماں کی قربت اس پر تھوڑی دیر کے لیے حاوی ہو گیا۔ وہ اماں کی مدد کر رہی ہے۔ اس کی وجہ سے اماں کو سکون ملے گا۔ اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ وہ چپ چاپ اماں سے لپٹی کھڑی رہی اور اس کا دل کسی سہمی ہوئی چڑیا کی طرح دھڑکتا رہا۔

☼ ☼ ☼

اس نے کھڑکی کے پردے کھسکا کر باہر جھانکا۔ برف اب بھی گر رہی تھی۔ ٹیبل کلاک پر نظر ڈالی صبح کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ باہر ہر چیز سفید ہو رہی تھی۔ بوگن ویلیا کے گلابی پھول برف سے چھپ گئے تھے۔ اسے سفید برف کی یہ چادر اب بہت بری لگتی تھی۔ [illegible] زندگی کتنی بے تاثر لگتی ہے۔ جیسے اس کے کوئی معنی ہی نہ ہوں۔

بے دلی سے پردہ دوبارہ گرا کر وہ کچن میں چلی آئی' اس وقت چائے کی شدت سے طلب ہو رہی تھی۔ ٹی بیگ کا ڈبہ کھولتے ہوئے اسے ینسی کا خیال آیا۔ کل اس کی سالگرہ ہے۔ اسکول کی سب سے پیاری بچی کی۔

چائے کی گرم سنہری بھاپ نے اسے ینسی کی نرم گرم دھوپ جیسی رفاقت کا کیف آگیں احساس دلا دیا۔ "تو سجیلہ عرفان یہ بات سچ ہے کہ تم اب بھی اپنی ذات کے حصار میں ہو۔ ینسی تمہیں اس لیے بہت اچھی لگتی ہے کیونکہ وہ کسی کی لے پالک بچی ہے۔ بالکل تمہاری طرح۔

تم بھول نہیں پائیں' وہ سب کچھ جو تم نے

سہا۔ تمہیں سہنے پر مجبور کیا گیا تم یہ زیر رد تو نہیں کرتی تھیں؟ تم تو انتہائی فرماں بردار، سلیقہ مند، جو اور قابل تھیں۔ تمہاری ذات سے بھی کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ پھر بھی؟

چائے کا کپ دھو کر اس نے واپس اس کی جگہ پر رکھ دیا کمرے میں واپس آکر اس نے الماری سے براؤن ٹراؤزر اور آف وائٹ شرٹ نکالی' اپنے کھلے بالوں کو سمیٹا اور چینج کرنے چلی گئی۔ اسے دس بجے ہمایوں سے بریک فاسٹ پر ملنا تھا۔

ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر بال برش کرتے ہوئے اسے اماں کے پلاسٹک کے کنگھے کا خیال آیا۔ جب وہ اس کی چوٹی بنایا کرتی تھی۔ بال بہت گھنے تھے مگر وہ دم سوکھے الجھی رہتی تھی۔ ذرا سا الجھنے پر اماں پیٹھ پر دھمو کا لگاتی تھی۔

شروع شروع میں وہ اماں سے ناراض نہیں تھی۔ اماں نے کہا تھا خالہ اسے اماں اور بھائیوں سے ملوانے ضرور پاکستان لائے گی۔ مگر دن گزرتے رہے اور اس کی امیدیں دم توڑتی گئیں۔

خالہ کے تینوں بیٹے انتہائی درجے کے بدمعاش اور شریر تھے۔ انہوں نے اسے بہت تنگ کیا۔ خالہ کی وہ ایک نہ سنتے تھے۔ خالہ یاسمین اپنے مرحوم شوہر کے اسٹور پر صبح سے رات گئے تک مصروف رہتی اور "جو" اسکول سے آکر سارا گھر سنبھالتی۔ اس کو لا کر خالہ یاسمین نے اپنی مہنگی میڈ کو فارغ کر دیا تھا۔

اماں سے دوری کا صدمہ۔ ابھی تازہ تھا' وہ رات کو تکیے میں منہ چھپا کر بہت روتی تھی مگر آنسو پونچھنے والا نا وہاں کوئی تھا نا یہاں۔

خالہ یاسمین اس کا خیال بھی رکھتی تھی۔ اس سے پڑھائی کے بارے میں پوچھتی۔ اپنے بیٹوں کو ڈانٹتی کہ وہ اسے تنگ نہ کیا کریں۔

اس نے جب بھی خالہ سے پاکستان جانے کی بات کی وہ لمبے چوڑے اخراجات کا دکھڑا رونے بیٹھ جاتی۔ جو اب اماں سے خفا ہو چکی تھی۔

"کیا ان کو میری یاد نہیں آتی۔" آٹا گوندھتے ہوئے تو مجھے ضرور یاد کرتی ہوں گی۔ حمید اور شمیم کو دیکھ کر میرا خیال آتا ہو گا۔ نہیں' آتا ہو گا' اگر میرا خیال ہوتا تو مجھے یہاں کیوں بھیجتیں۔ اماں کو میرا کوئی خیال نہیں۔"

اس کی سوچیں باغی ہوتی جا رہی تھیں۔ پورا سال لگ گیا تھا خالہ کو اسے یہاں لانے میں۔ پیپرز وغیرہ تیار کرنے میں اور بھی بہت سے لمبے معاملات تھے۔

اس پورے عرصے میں وہ ہر ممکن اماں کو قائل کرنے کی کوششوں میں مصروف رہی مگر اماں بینک کا قرض چکا چکی تھی اب خالہ کا قرض چکانا باقی تھا۔

٭ ٭ ٭

پندرہ برس بیت گئے وہ ستائیس برس کی ہو گئی۔ تین سال قبل خالہ ہارٹ اٹیک کی وجہ سے دنیا سے چلی گئی۔ تینوں بیٹے شادیاں کر کے اپنے الگ الگ اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو چکے تھے۔

آخری وقت میں وہی خالہ کے پاس تھی۔ یہ اپارٹمنٹ خالہ نے اس کے نام کر دیا تھا۔ اسٹور پر بیٹوں کا قبضہ تھا جسے اب وہ بیچ کر ہضم کر چکے تھے۔

آخری وقت میں اس نے خالہ کی بہت خدمت کی اور اماں پر ان کا سارا قرض چکا دیا۔ وہ خود ایک اسکول کی ٹیچر تھی اور ہمایوں اس کا واحد دوست' جس سے اس کی سٹی لائبریری میں اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔

پاس رکھے سیل فون کی گھنٹی نے اسے بری طرح چونکا دیا۔

"ہاں بولو ہمایوں!" جواب میں ہمایوں گنگنایا۔

دل میں اک لہر سی اٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی

اسے لگا جیسے پورا ماحول گنگنا اٹھا ہو اف زندگی کی ہلچل' وہ ایسا ہی ہے۔ اس سے جب بھی ملو یا بات کرو یوں لگتا ہے جیسے زندگی کان میں سرگوشیاں کر رہی ہو یا پھر رنگ و بو کا سیلاب امڈ آیا ہو۔

"دل کی لہروں کو قابو میں رکھو۔ میں دس بجے تک پہنچتی ہوں۔"

"اچھا ہے آپ وقت کی پابند خاتون ہیں بچپن میں سے چھٹی کا دن ہے۔ ہو سکتا ہے نیند کے مزے لوٹ رہی ہوں اور میں یہاں "جوئی ڈھابے" میں بیٹھا اوتار سنگھ کو پوریاں تلتے صرف دیکھوں گا۔ دیکھو جلدی پہنچ جانا تمہیں معلوم ہے صبح کی بھوک مجھ سے نہیں ہوتی برداشت۔"

"پتا ہے مسٹر پیٹو! فون رکھو پہنچتی ہوں۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"اوکے سی یو۔"

فون رکھ کر اس نے جلدی سے بال کلپ کیے اور کرسی کی پشت پر پڑا اسکارف سر پر باندھا۔ اب وہ تیار تھی۔

بیگ اٹھا کر اس نے سائیڈ بورڈ سے گھر کی چابیاں اٹھا کر بیگ میں ڈالیں اور دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

٭ ٭ ٭

ہمایوں حسب معمول آدھے گھنٹے سے اس کا منتظر تھا۔ اسے اس کی یہ بات بہت پسند تھی۔ وہ وقت پر پہنچنے کی کوشش میں وقت سے پہلے ہی پہنچ جاتا تھا۔ اس نے بلیو جینز پر "جو" کی دی ہوئی ہلکی گلابی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اسے دور سے آتا دیکھ کر اس نے اوتار سنگھ کو آوازیں لگانی شروع کر دیں۔

ناشتے کے دوران اس کے چہرے کی سنجیدگی کو اس نے بھانپ لیا۔

"کیا بات ہے؟ اتنی چپ کیوں ہو؟"

"نہیں تو۔ میں زیادہ کب بولتی ہوں؟ تم ہی کافی ہو۔"

"اچھا تو میرا بولنا برا لگتا ہے تمہیں۔" اس کے لہجے میں صاف بناوٹ تھی۔

"جانے تم سمجھتے ایسی باتیں؟ چچ چچ"

"پھر کیا سوچا؟" وہ یکدم سنجیدہ ہو گیا۔ وہ چپ رہی۔

اسے معلوم تھا وہ کس بارے میں پوچھ رہا ہے۔ گزشتہ چھ ماہ سے وہ اس سے بضد تھا کہ اسے پاکستان جانا چاہیے۔ اپنی اماں اور بھائیوں کا حال جاننا چاہیے۔

"اچھا تو بھئی کیا پوچھ رہا ہوں۔ اچار دینا۔" اس نے پھر پوچھا۔

"کچھ نہیں سوچا فی الحال۔" اس نے اچار کی کٹوری دیتے ہوئے کہا۔

"کھاؤ تو رک کیوں گئیں؟"

"بس ہو گیا۔ ویسے بھی اتنا ہیوی ناشتہ مجھ سے نہیں ہوتا۔ اب شام تک بھوک نہیں لگے گی۔"

"کچھ نہیں ہوتا کھاؤ ابھی تمہیں میٹنی شو میں لے چلوں گا۔ بڑی اچھی کامیڈی فلم لگی ہے۔"

"سوری میں کہیں نہیں جانے والی۔ گھر جاؤں گی۔"

"اچھا تھوڑی دیر کے لیے وکٹوریہ پارک میں تو بیٹھو گی نا؟" اس نے منت بھرے انداز سے پوچھا۔

وہ انکار نہ کر سکی۔

"او کے۔"

٭ ٭ ٭

اتوار کی وجہ سے وکٹوریہ پارک میں خاصی گہما گہمی تھی۔ کافی دنوں سے برف باری کا سلسلہ چل رہا تھا۔ اس وقت ہلکی دھوپ نکلنے کی وجہ سے لوگ گھروں سے نکل آئے تھے۔

پارک کی ساری برف صاف کر دی گئی تھی۔ گھاس گیلی تھی اور سردی کی شدت میں کئی گنا اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ اپنا اوور کوٹ پہن چکی تھی ہمایوں کے کہنے پر اس نے گلوز بھی پہن لیے تھے۔

دونوں بینچ پر خاموش بیٹھے جھولوں پر کھیلتے بچوں کو دیکھ رہے تھے۔ زندگی متحرک تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" ہمایوں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔"

"پھر اتنی خاموش کیوں ہو؟"

"نہیں تو ایسی تو کوئی بات نہیں بس گزرتے وقت کے بارے میں سوچ رہی ہوں' کتنی جلدی گزر گیا۔"

"ٹھیک ہے۔ ایک بار تم وہاں جا کر ان سب سے مل لو گی نا' تو تمہارے دل پر جمی برف پگھل جائے گی۔"

"چاہے وہاں میرے لیے کچھ بھی اچھا نہ ہو؟"

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟ جب تمہارے اپنے ہیں۔" وہ بضد تھا۔

"مگر سب اپنی اپنی زندگیوں میں مگن' خوش اماں کے بیٹے' بہوئیں' پوتے پوتیاں اور گھر۔" وہ اور زیادہ اداس ہو چکی تھی۔

"تو پھر کیا ہوا۔ تم بھی ان کا حصہ ہو' تم الگ تو نہیں۔"

"میں الگ ہوں۔"

"تمہیں پتا چلا؟ اسمتھ براؤن آئرلینڈ واپس چلا گیا۔"

"نہیں' کب؟ اور کیوں' یہاں اس کی جاب کتنی بہترین چل رہی تھی۔"

"وہ جولیانا کے پاس گیا ہے۔"

"ڈیورس کے بعد؟ لیکن کیوں؟ صرف پانچ ماہ پہلے ہی تو یہ سب معاملہ ختم ہوا ہے۔"

"جولیانا نے ایک بچی کو جنم دیا ہے' ایک ایبنارمل بچی کو۔"

"اوہ۔" اس کے لہجے میں افسوس تھا۔

"وہ اس سے دوبارہ شادی کرنے گیا ہے۔ وہ اسے اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتا۔"

"ہوں۔"

☼ ☼ ☼

جہاز لینڈنگ کرنے جا رہا تھا۔ کھڑکی سے چھوٹے چھوٹے مکان' خیالی زمین' سرمئی سڑکیں نظر آنے لگے تھے۔

اس نے ایک گہری سانس کھینچی جیسے کسی مانوس خوشبو کو محسوس کر کے اپنے اندر اتار لینا چاہتی ہو۔ کسٹم کلیئرنس کے بعد وہ ائیرپورٹ سے باہر نکل کر چپ چاپ کھڑی تھی۔

بہت سے لوگ بہت سے لوگوں کو لینے اور رخصت کرنے آئے ہوئے تھے۔ مگر وہ اکیلی تھی' ساڑھے چودہ برس پہلے بھی کوئی اسے چھوڑنے نہیں آیا تھا اور آج بھی۔

آج تو ایسا ممکن ہی نہیں تھا۔ جون کی تیز دھوپ آنکھوں میں چبھ رہی تھی مگر اس نے اپنے سیاہ شیشوں کی عینک نہیں لگائی۔ وہ ہر شے کو اس کی اصل شکل میں دیکھنا چاہتی تھی۔

دھیرے دھیرے چلتی ہوئی وہ نیم کے گھنے درخت تک جا پہنچی' کچھ دیر وہاں کھڑے رہنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ اس کا وہاں اس طرح اکیلے کھڑے رہنا مناسب نہیں' وہ بھول گئی تھی کہ یہ لندن نہیں ہے۔

فوراً ہی اس نے ٹیکسی لی' اب وہ پھر محو سفر تھی۔

وہاں کیا ہوگا؟ کسی کو میرے آنے کا کچھ پتا نہیں۔ وہ چاہتی تو گھر کے پتے پر خط لکھ سکتی تھی' مگر وہ نہیں چاہتی تھی' اس نے اتنے عرصے میں کبھی ایسا نہیں کیا تھا' وہ کیوں ایسا کرتی؟

اور کس کے لیے؟

وہ چشم تصور سے دیکھنے لگی۔ دروازہ دوبار کھٹکھٹانے پر کھلتا ہے اور [illegible] سعید بھی اس کی ٹانگ سے لپٹ گئی ہے' ساتھ ہی سات آٹھ سال کا ایک شاید اور چھوٹا بچہ دوڑا آتا ہے۔ پیچھے ایک نوجوان خوش شکل عورت چلی آتی ہے۔

"ان' معاف کیجیے گا' یہ بڑا شریر ہے' چلو اندر۔" وہ بچے کو ڈانٹتی ہے۔

"کدھر جانا ہے؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

وہ بری طرح چونکی۔

"ہاں! یہاں سے۔۔"

اب وہ کچھ پریشان ہو گئی تھی' علاقے میں کافی تبدیلی آ گئی تھی۔ بہت سارے نئے مکانات بن گئے تھے' کچھ ٹوٹ کر بنے تھے' بچوں کے کھیلنے کے میدان کی جگہ اونچے اونچے اپارٹمنٹس بن گئے تھے۔

"یہاں سے سیدھے ہاتھ پر لیجیے۔" وہ یاد کر کے بولی۔

"بس یہاں روک دیں۔"

بالآخر وہ پہنچ ہی گئی۔ وہی دروازہ تھا' اسے بھائیوں پر غصہ آیا' اس وقت بھی اس کی حالت کچھ اچھی نہ تھی' اب تو بالکل آثار قدیمہ کا نمونہ لگ رہا تھا۔ دوپہر کا وقت ہونے کی وجہ سے گلی سنسان تھی۔

ٹیکسی والے نے اس کا سوٹ کیس اتار کر دروازے کے آگے رکھ دیا' اس کے جانے کے بعد اس نے دروازے پر دستک دی۔ مگر وہ کھلا ہوا تھا' بلکہ باہر کی کنڈی خفیف سی بند تھی' اس نے کنڈی کھولی اور اندر چلی آئی۔

اف کتنی ویرانی ہے' وہ بچے' وہ شور' وہ رونق' شاید سب دوپہر کا کھانا کھا کر سو چکے ہیں۔ اس نے صحن میں بنے کچن پر نظر ڈالی' کسی گوشے سے ایسا محسوس نہیں ہوتا تھا کہ یہاں لوگ بستے ہیں۔

اماں کی لاڈلی کیاریاں اجڑ چکی تھیں۔ کڑی پتے کا پیڑ سوکھ کر اپنی بے بسی کا رونا رو رہا تھا۔ صحن میں جو تخت پڑا رہتا تھا وہ سرے سے غائب تھا' ایک چارپائی پڑی تھی' جس پر چادر تکیہ کچھ نہ تھا۔ سوکھے پتوں اور کچرے کا ڈھیر الگ ماحول کی سوگواری میں اضافہ کر رہا تھا۔

اس نے جھک کر کچھ اٹھایا۔ کسی دوا کا خالی ریپر تھا۔ وہ کمرے کی طرف بڑھی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا' ہاں وہی سہمی چڑیا کی طرح' وہ دل میں آنے والے اندیشوں سے خوف زدہ تھی۔ کیا ہوا ہے؟ یہ سب؟

کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر سب سے پہلے اماں پر پڑی' وہ کروٹ لے کر لیٹی ہوئی تھیں۔ مگر سو نہیں رہی تھیں۔ دونوں کی نظریں ایک ہی وقت میں ٹکرائیں۔ اور بجو کے قدم جیسے پتھر کے ہو گئے۔

اماں نے بمشکل اٹھ کر اس کی طرف غور سے دیکھا۔

"کون ہو بیٹی؟"

"میں۔"

"بجو!"

"ہاں اماں!" وہ آگے بڑھی اور اماں سے لپٹ گئی۔

اماں رو رہی تھیں' وہ بھی رو رہی تھی۔ سنگ دلی اور سرد مہری دکھانے کے سارے منصوبے خاک میں مل گئے تھے۔

"میری بیٹی آ گئی ہے' میری بجو آ گئی ہے۔" اماں کی آواز رندھ رہی تھی۔

"سب کہاں ہیں اماں؟" وہ سنبھل کر بولی۔

"سب چلے گئے۔ سلیم دبئی چلا گیا' میں نے بہت روکا' مگر نہیں رکا' پھر نعیم بھی چلا گیا' مجھ سے جھگڑا کر کے گیا۔"

"وہ کہاں گیا؟"

"وہ۔۔ وہ لاہور چلا گیا اپنی بیوی کے ساتھ' وہیں رہتا ہے' وہاں سے امریکہ جائے گا۔ پتا نہیں کہاں جائے گا' مجھے سب چھوڑ گئے۔"

وہ اماں کو بغور دیکھ رہی تھی۔ وہ اتنی عمر کی نہیں تھی جتنی لگ رہی تھی۔ وقت سے پہلے سارے بال سفید ہو گئے تھے۔ کھال لٹک کر ہڈیوں سے چپٹی ہوئی تھی۔ ہری ہری نسیں ابھری ہوئی تھیں۔ کپڑے میلے تھے۔ بستر کی چادر بھی بہت میلی ہو رہی تھی۔

"اماں کھانا کھایا؟"

"نہیں' تجھے بھول گئی ہے کیا؟ وہ آتی ہے' حمیدہ کی ماں' گھر کے کام نمٹا کر غریب آتی ہے' مجھے روٹی پکا کر دیتی ہے' دوا کھلاتی ہے' اس سامنے والی چارپائی پر بیٹھتی ہے' باتیں کرتی ہے' پھر وہ چلی جاتی ہے' تو!"

"پھر۔۔؟" اسے اپنے بے معنی سوال پر حیرت ہوئی۔

"پھر رات کو آتی ہے' دوبار' ایک بار کھانا دینے اور ایک بار بارہ بجے' مجھے سونے کا کہہ کر چلی جاتی ہے' ابھی آئے گی' تیرے لیے بھی روٹی پکا دے گی' تو بھی کھانا میرے ساتھ۔"

"بھوک لگی ہے اماں؟"

"ہاں بہت لگی ہے' پر ابھی مجبوری ہے۔"

بجو نے بیگ سے کلپ نکال کر بال باندھے' اسکارف تو وہ پہلے ہی کھول کر رکھ چکی تھی۔ کچن میں آ کر وہ چند لمحے کچھ سوچتی رہی۔ پھر ڈبے سے آٹا نکال کر گوندھنے بیٹھ گئی۔

☼

مکمل ناول

بس شہر کی حدود میں داخل ہی ہوئی تھی کہ چھاجوں چھاج برستے مینہ نے استقبال کیا۔

"بڑی اماں! آپ کی دعائیں بھی کبھی وقت پر پوری نہ ہوئیں۔"

رانیہ نے بے اختیار ماتھے پر ہاتھ مارا۔ بڑی اماں نے سفید ململ کا دوپٹہ چہرے سے کھسکایا، بھاگتی بس کے شیشے سے باہر جھانکا اور برستی بارش کو دیکھ کر بچوں کی طرح کھلکھلائیں اور فخریہ انداز میں اپنا چھاتا لہرا کر بولیں۔

"اب بتا...؟"

راحت جبیں

اک سحر اور ستارہ



بھری بس میں سیاہ چھاتا لہرانے کی گنجائش کہاں تھی۔ اس کی نوک سیدھا سامنے والی گردن میں گھس گئی۔ اس کی دلدوز چیخ پر جو چھاتا کھینچا تو وہ دائیں طرف کھڑے بزرگ کی پسلیاں سینک گیا۔ وہ بچنے کی کوشش میں ایک موٹی تازی خاتون کی گود میں سوار ہو گئے۔

"ہائے ہائے بچنا جانا نے حرکتاں ویکھو۔"

بس میں بلا۔ کار مچ گئی' رانیہ نے بمشکل چھاتا کھینچ کھانچ کر گھٹنوں پر ٹکایا۔ سامنے والے موصوف پلٹ کر گرجے۔

"بڑی بی! اسے سنبھال کر رکھ' ورنہ اٹھا کر باہر پھینک دوں گا۔"

"مجھے؟" بڑی اماں کی آنکھیں ابلیں' جواباً" قدرے شرافت سے بولا۔

"چھاتے کو۔"

"تو ہاتھ تو لگا کر دکھائیں تیرے ہاتھ توڑ دوں گی' ٹنڈا ہو کے بھیک مانگتا پھرے گا۔"

رانیہ نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے' یہ ان کا گاؤں نہیں تھا' جہاں لوگ ان کی سخت سست سن کر بھی بس ہنستے تھے۔

"ہونہہ۔ ابال دیکھ' زنانیوں کی طرح جی چاہتا ہے ابھی قینچی لے کر گنجا کر دوں۔" انہوں نے کینہ توز نگاہوں سے اس کے کندھوں تک آتے بالوں کو دیکھا اور رانیہ کا خیال کر کے چپ ہو گئیں' وہ بھی شاید بزرگ سمجھ کر لحاظ کر گیا تھا۔ بڑی اماں دوبارہ سے دوپٹہ چہرے پر تان کر اونگھنے لگیں تو رانیہ نے سکون کا سانس لیا۔

طبیعت تو ان کی کئی دنوں سے خراب تھی' مگر ڈاکٹر کے پاس جانے سے اتنا ڈرتی تھیں کہ کسی کو بتایا ہی نہیں' بھی کلا نمک چاٹ لیا' بھی پودینہ ڈال کر چائے پی لی۔ بہت ہوا تو حکیم صاحب سے پھکی لا کر پھانک لی' مگر کب تک' اندر ہی اندر مرض بڑھتا گیا' پچھلی دو راتیں سخت تکلیف میں گزریں' کچھ بھی ہضم نہ ہوتا فوراً الٹی آنے لگتی۔

"وہ نہیں شہر کے کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔" خود حکیم جی نے مشورہ دیا۔ ابا نے اپنے چچازاد شبیر احمد کو فون کیا جو شہر میں مقیم تھے' انہوں نے فوراً" کہا۔ "بڑی اماں کو صبح ہی شہر بھجوا دو میں سب دیکھ لوں گا۔"

قرعہ فال رانیہ کے نام نکلا کہ بڑی اماں اپنی اس پوتی کے بغیر ایک قدم نہ چلتی تھیں۔ دوسرے وہ دو سال پڑھنے کے لیے شہر آتی رہی تھی۔ بڑی اماں نے لاکھ ہاتھ پیر مارے کہ اب میں ٹھیک ہوں۔ جوشاندہ پلا دو' پودینہ ابال دو مگر کسی نے ان کی ایک نہ سنی اور بیگ تیار کر دیا۔

"ہائے اللہ! جو ایک دفعہ شہر کے اسپتال گیا' کبھی زندہ لوٹ کر نہ آیا' بوٹی اماں' رجو کا باپ' یہ وہ سب کی میت ہی گاؤں آئی۔"

مگر سب نے کان بند کر لیے' بندوں پر بس نہ چلا تو اللہ کے سامنے گڑگڑائیں۔

"میرے سوہنے رب بارش ہو جائے' بس خراب ہو جائے' شہر کے سارے اسپتال بند ہو جائیں۔"

ان کی بارش کی دعا قبول ہوئی مگر دیر سے کہ بس شہر کی حدود میں داخل ہوئی تھی' گرنے سے وہ اپنا چھاتا بغل میں دبائے بیٹھیں' رانیہ کے لاکھ واویلا کرنے کے باوجود بس ایک جھٹکے سے رکی۔

"اماں اٹھیں۔"

بڑی اماں سیٹ کا سہارا لے کر کھڑی ہوئیں' بائیں ہاتھ میں چھاتا پکڑا' پھر دانستہ نوک سامنے والے کے سر میں گھسا دی' رانیہ نے تیزی سے ان کا ہاتھ کھینچا' اگلے پل دونوں کے منہ کھل گئے' لمبے بال ان کے چھاتے پر لٹک رہے تھے اور سامنے چٹیل میدان تھا۔ رانیہ نے تیزی سے وگ کھینچ کر سامنے والے کی طرف اچھالی۔ خود جہاں تک ممکن ہوا بڑی اماں کو لے کر تیزی سے نیچے اتری' چاروں طرف موٹر سائیکل' رکشوں نے یلغار کر دی' رانیہ نے ایک رکشے پر سامان اور اماں کو لادا' پتا سمجھایا۔

"ٹھیک سے پتا تو ہے۔"

"جی!" اور رکشہ چھپاک' ادھر بڑی اماں کا واویلا شروع ہو گیا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ جب رکشہ فرید کے مطلوبہ ایڈریس پر پہنچا بارش رک گئی تھی۔ راستہ بھر رکشے میں بڑی اماں کا ڈر کا ہوا سانس بحال ہوا۔ سارا راستہ وہ رانیہ کی گود میں گھسی رہیں' کانپتی اور واویلا کرتی آئیں۔ رانیہ انہیں کسی ننھے بچے کی طرح گود میں بھرے بیٹھی تھی۔

"توبہ توبہ' میرے باپ کی توبہ۔ میرے وادے کی توبہ' جو آج کے بعد اس جیسی سواری میں بیٹھوں' سب چھو اوپر نیچے ہو گیا' اوب پیروں پر کھڑا بھی نہیں ہوا جاتا۔ زمین گول گول گھوم رہی ہے' اے رانی! کہیں زلزلہ تو نہیں آگیا' توبہ میرے مولا' رحیم!"

رانیہ ایک ہاتھ سے آگے پیچھے ڈولتی اماں کو سنبھالے دوسرے سے پیسے نکال کر رکشے والے کو دے رہی تھی' جو ان کی باتوں پر خوامخواہ دانت نکال رہا تھا۔ پھر بیگ اتار کر نیچے رکھا۔

"اس سے زیادہ آرام تو اپنی کھوتا ریڑھی ہے۔ سارا اپنڈ گھوم لو ذرا جو دھکا لگے۔"

"اماں بند ہے کھوتا ریڑھی پر بھی آ جائیں۔" رکشے والے نے کہا اور موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے لگا۔

"اے پکڑو... بھاگو... دوڑو۔"

رانیہ نے ہاتھ میں پکڑا بیگ چھوڑا اور لپک کر بڑی اماں کو جپھی ڈال لی۔ غالب گمان تھا کہ وہ چکرا کر گرنے لگی ہیں۔

"ہوئی... نامراد میرا چھاتا۔" ڈرائیور نے تمام تر شور کے باوجود ان کی دہائی سن لی۔

بڑی اماں نے لپک کر چھاتا اٹھایا اور کلیجے سے لگایا اور انگلی اٹھا کر دھمکی دی۔

"ساتھ لے جاتا تو اگلے جہان تجھ سے وصولتی۔"

رانیہ نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے آگے بڑھ کر چاکلیٹی دروازے کے ساتھ لگی نیم پلیٹ کو پڑھا اور بیل پر انگلی رکھ دی اور سر اٹھا کر اس دو منزلہ مکان کا جائزہ لینے لگی' گھر پرانی طرز کا مگر نئے رنگ و روغن کی

وجہ سے اچھا لگ رہا تھا۔ گھر کے باہر دو شہتوت کے درخت تھے۔ جن کے نیچے تین لوہے کی کرسیاں دھری تھیں' ساتھ والا دروازہ غالباً" بیٹھک کا تھا کہ ادھ کھلے دروازے سے جھانکتی نیم تاریکی میں قالین اور صوفے دکھائی پڑتے تھے' غالباً" بیٹھک میں کوئی تھا نہیں' ورنہ اب تک باہر آ ہی جاتا' سڑک کے دونوں اطراف میں تھوڑا تھوڑا بارش کا پانی کھڑا تھا۔ بارش کی وجہ سے موسم خوش گوار ہو گیا۔

بڑی اماں بیٹھنے کے ارادے سے کرسی کی طرف بڑھیں مگر گیلی دیکھ کر سہارا لے کر کھڑی ہو گئیں۔

رانیہ نے کوفت سے دوبارہ بیل پر انگلی رکھی تو دروازہ کھلنے پر ہی اٹھائی۔ مگر دوسرے پل جی چاہا زمین پھٹے اور اس میں سما جائے' بڑی اماں نے کمال پھرتی سے چھاتا کھول اس کے سامنے کا منظر غائب کیا' جہاں موصوف منہ میں جھاگوں جھاگ ٹوتھ برش گھسائے محض ایک تولیے میں ملبوس تھے۔

"ہائے' ہائے بے شرما کپڑے نہیں' شرماں دی لادیتاں' گھر میں بس [illegible]

[illegible]

ڈیل [illegible] پتا تھا' سامنے دو عدد خواتین کھڑی ہوں گی' وہ ادھر بیل کی طرح ٹکریں مار تا اگینٹ بھاگا' ایک لمحے کو خدشہ ہوا کہ جو کچھ ہے وہ بھی یہیں رہ جائے گا' مگر غنیمت ہوا کہ کسی نہ کسی طرح باتھ روم تک پہنچ گیا۔ دروازہ تو کھلا ہی تھا' سو دونوں اندر داخل ہو گئیں۔ صحن عبور کر کے برآمدے میں قدم رکھا تو عین سامنے والے

کمرے سے تن بلک چنگھاڑ اٹھی۔

او گجرا رے... رے...

رانیہ نے بڑی اماں کو دیکھا' وہ احتیاطاً" پوتی کے آگے ہو گئیں' سامنے بنیان اور ہاف پینٹ میں ملبوس قالین پر دراز دونوں ٹانگیں صوفے پر رکھے بڑے انہماک سے ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے واہ واہ کر رہے تھے۔ جہاں بھاری بھرکم موصوف اسٹیج توڑنے

کے دریے تھی۔ تب ہی نگاہ دروازے تک گئی۔ موصوف گھبرا کر اٹھے۔ بوکھلا کر بے ساختہ عملاً شاہ جو صوفے کے نیچے سے برآمد ہوا۔ کھٹ سے ٹی وی بند کر کے شرمندگی سے انہیں دیکھا۔

"ذکیہ نے بھی بتایا نہیں کہ اس کے لڑکے بالے ہیں۔ دو کا یہ حال ہے تو تیسرا تو بالکل ہی۔۔۔ ہائے بے چارہ شبیر احمد!" ناک پر انگلی رکھے بڑی اماں کی سرگوشی اتنی بلند تو تھی کہ سامنے والا جی بھر کے شرمندہ ہوتا۔ اس نے تیزی کے ساتھ صوفے پہ رکھے رسالے، میگزین سمیٹ کر ایک طرف رکھے۔ "آئیے۔۔۔ بیٹھیے۔"

"تمہاری ماں کہاں ہے؟ شبیر احمد تو کام پر گیا ہوگا۔"

"جی اماں نہا رہی ہیں۔" اس نے غور سے دونوں کو دیکھ کر پہچاننے کی سعی کی جو ناکام ہی ہوگی۔

"میں امی کو بلاتا ہوں۔" وہ فوراً کھسک گیا۔

"ایسے برے حال تو نہیں تھے شبیر احمد کے کہ لڑکوں کو ڈھنگ کے کپڑے نہ دلا سکے۔ ایک تو [illegible] میں جھوم رہا ہے اور دوسرے نے چھوٹی سی پینٹ پہن رکھی تھی ویسے یہ ذکیہ شروع ہی سے پھوہڑ اور بدسلیقہ تھی لڑکے بھی اسی پر پڑے ہیں۔"

بیٹھے بیٹھے نظر میگزین کے ٹائٹل پر پڑی تو لاحول ولاقوۃ پڑھنے لگیں، ماڈل کی آستین غائب، پیٹ ننگا۔

"ہا۔۔۔ کپڑے پہننے کا تو رواج ہی ختم ہو گیا لڑکیوں کو کیا کہوں اس مسٹنڈی کو دیکھو۔"

"بڑی اماں! کمر کا درد کیسا ہے؟" رانیہ نے قصداً انہیں اس موضوع سے ہٹایا۔

"ہاں بڑا ہی بھلا ڈاکٹر ہے۔ اللہ اسے اجر دے، لڑکے! تمہاری ماں گھر میں ہی نہا رہی ہے۔"

لڑکا ہوتا تو جواب دیتا، پانچ منٹ بعد وہ دو گلاسوں میں ٹھنڈا مشروب لے آیا، اب بنیان کے اوپر سفید شرٹ پہن رکھی تھی، بڑی اماں نے اپنا سوال دہرایا۔

"جی بدقسمتی سے ساہیوال والے ابھی تک سمندر سے محروم ہیں، اس لیے گھر ہی میں نہانا پڑتا ہے۔" بڑی سادگی سے جواب دیا۔ پھر چھتری ایک طرف رکھنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو بڑی اماں چونکیں، پھر کچھ سوچ کر کہنے لگیں۔

"ہاں بہت سنبھال کر رکھنا۔"

"کیا بہت خاص ہے؟" اس نے سرگوشی میں دریافت کیا۔

"ہاں کھولیں تو گولی چلتی ہے۔" رانیہ پہلے ہی اس چھاتے سے بے زار تھی۔ اصغر نے گھبرا کر چھاتا چھوڑ دیا، رانیہ منہ پھیر کر مسکراہٹ دبانے لگی۔

"آپ مذاق کر رہی ہیں؟" اس نے مشکوک نگاہوں سے رانیہ کو دیکھا۔

"یقیناً۔"

"جو میرے چھاتے کا مذاق اڑایا تو اس کی نوک سے پیٹ میں سوراخ کر دوں گی۔" بڑی اماں نے دھمکی دی۔

"یہ پچھلے جنم میں جھانسی کی رانی رہی ہیں۔"

"وہ کون تھی؟" اماں نے چونک کر پوچھا۔

"آپ [illegible] ہوگا۔۔۔ میں امی کو بلا لاؤں۔"

"اللہ توبہ۔ تمہاری ماں غسل خانے میں سوتی ہیں۔"

وہ بنا جواب دیے باہر نکل گیا، بڑی اماں رانیہ سے پوچھنے لگیں۔

"یہ کس رانی کی بات کر رہا تھا؟"

"اللہ جانے۔" رانیہ کو اپنے بھیگے کپڑوں سے الجھن ہو رہی تھی۔ اس نے بیگ کھول کر اپنے اور بڑی اماں کے کپڑے نکالے۔ جب تک ذکیہ آئیں وہ دونوں کپڑے بدل کر مشروب پی چکی تھیں، گیلے کپڑے رانیہ صحن میں تار پر ڈال آئی تھی۔

ذکیہ کے کپڑے بدن سے چپک رہے تھے۔ گیلے بالوں کی چھوٹی سی "جوڑی" عین ماتھے پر نار رکھی تھی۔ لپک کر بڑی اماں کے گلے لگیں، رانیہ کو پیار دیا، فرداً فرداً سب کا حال احوال دریافت کیا۔ اگرچہ مدتوں سے آنا جانا نہ تھا، مگر واقفیت تو سب کی تھی۔ پھر بڑی اماں واش روم میں گئیں تو واپس آکر پوچھنے لگیں۔

"یہاں تو کوئی پلنگ نہ تھا۔"

"غسل خانے میں پلنگ؟" ذکیہ ہونق ہو گئیں۔

"تمہارا بیٹا بتا رہا تھا کہ تم وہاں سو جاتی ہو۔" کمال معصومیت سے طنز کیا۔ وہ بے چاری شرمندہ ہونے لگیں، تب ہی وہ ہاف پینٹ والا چائے کے ساتھ مزے دار سے پکوڑے اور دہی کی چٹنی لے آیا۔ پکوڑے گھر کے بنے تھے اور اسی نے خود بنائے تھے۔

"ماشاء اللہ بہت ہی سگھڑ ہے۔" "اسی کا آسرا ہے، ورنہ ان گھٹنوں کے درد نے۔۔۔"

اصغر اپنی مزید خوبیاں گنوانے لگا۔

"کپڑے دھو لیتا ہوں، کئی قسم کے کھانے بنا لیتا ہوں، اماں کے سر میں درد ہو تو تیل کی مالش بھی کر دیتا ہوں، میں امی کا بیٹا نہیں بیٹی ہوں، جس گھر جاؤں گا راج کروں گا۔"

بڑی اماں کی آنکھیں کھل گئیں، [illegible] ہنسی [illegible] آنکھوں میں پانی [illegible] رہا تھا۔ غصہ نکل رہا تھا۔ اب اگر وہ ماں کے خیال سے تھوڑا بہت ہاتھ بٹا دیتا تھا تو مہمانوں کے سامنے پول کھولنے کی ضرورت کیا تھی، اس کی مردانگی کو ٹھیس لگی تھی۔

"آپ کو کسی نے کہہ دیا ہے کہ آپ ہنستے ہوئے اچھی نہیں لگتیں۔" یہ سراسر رانیہ پر حملہ تھا۔ وہ سٹپٹا گئی۔ ماں نے ایک ہاتھ کمر پر رسید کیا۔

"ہر وقت کا تخول اچھا نہیں ہوتا۔"

"تو پھر کس وقت کا تخول اچھا ہوتا ہے۔" وہ جل کر پوچھنے لگا۔

"کسی وقت کا نہیں، جاؤ نبیل کو بلاؤ، دادی سے مل لے۔" مگر نبیل نے اندر آنے سے صاف انکار کر دیا۔

"دادی نے مجھے انتہائی نازیبا حلیے میں دیکھ لیا ہے، میں اب ان سے آنکھیں چار کرنے کی ہمت خود میں نہیں پاتا، اکیڈمی جا رہا ہوں۔" اصغر نے اندر آ کر بتایا۔

"تو آنکھیں چار نہ کرے، پر سلام تو کر جاتا۔ جھوٹ نہ بولوں، تیری اولاد بڑی بے مروت ہے۔ سگی نہ سہی پر دادی تو ہوں۔"

بڑی اماں کو جذباتی ہونے میں زیادہ دیر نہ لگی، مگر اصغر ان سے بھی زیادہ جذباتی ہو گیا۔

"شربت پلایا، پکوڑے کھلائے، پھر بھی بے مروت، دادی! آپ نے تو دل ہی توڑ دیا۔"

بڑی اماں کو اس کی شیخیاں ایک آنکھ نہ بھائیں، ان کے تیور دیکھ کر رانیہ کو مداخلت کرنا پڑی۔

"بڑی اماں! تھوڑی دیر آرام کر لیں، پھر آپ کو دوا بھی لینا ہے، شام کو اسپتال۔۔۔"

"ہاں پہلے کھانا کھا لو، سالن تو بنا لیا ہے، اصغر بھاگ کر بازار سے کباب اور کھیر لے آؤ۔"

"نہ۔۔۔ نہ۔۔۔ ابھی بھوک نہیں، کھانا شبیر احمد کے ساتھ کھاؤں گی، کب تک آئے گا۔"

"ہاں میں فون کر دیتی ہوں۔ یہ ادھر کمرے میں آ جائیں، اصغر سامان اٹھا لو۔" کمرے میں آ کر بڑی اماں [illegible]

[illegible] اور جب [illegible] اور ولایت

چھوٹے دو کا یہ حال ہے تو بڑے کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔ کسی کے منہ لگنے کی ضرورت نہیں، جب تک یہاں ہیں بس کمرے تک رہنا اور یہ ذکیہ، دیکھا کیسی گھنی اور میسنی ہے، پتا بھی تھا ہم آ رہے ہیں، گھر میں ہانڈی روٹی بھی نہ کر سکی، بازار سے کباب اور کھیر اور کہا بھی ہمارے سامنے، تاکہ ہم انکار کر دیں، ہونہہ۔ مجھے بھی کوئی شوق نہیں پڑے رہنے کا، کل ڈاکٹر کو دکھا کر واپس چلیں گے، توبہ میں تو اپنے گھر سے دور ایک دن نہ رہ سکوں۔ ہائے، پتا نہیں انور نے بکریوں کو پانی بھی پلایا ہوگا یا نہیں۔"

ان کی دماغی رو دوسری طرف بھٹک گئی تھی، رانیہ نے کوئی تبصرہ نہیں کیا، وہ یوں بھی دوسروں کے بارے میں اتنی جلدی رائے قائم نہیں کرتی تھی، ذکیہ خالہ بھی سادہ مزاج اور دست سی خاتون لگیں، جو نہانے میں

ہی محفلیں لگاتی تھیں‘ کباب اور کھیر کیا خاک بنا پاتیں۔



شبیر احمد کھانے کے وقت تک آگئے‘ دیر تک تائی اماں کے گلے لگے سب کی خیریت دریافت کرتے رہے‘ انھوں نے غصے سے پرے دھکیلا۔

”اب محبت اُمڈ رہی ہے‘ مدتوں تائی کی صورت نہ دیکھی‘ بندہ کبھی عید‘ شب رات پر ہی چکر لگالے‘ چک 93 اتنی دور بھی نہیں۔“

وہ مصروفیت کا عذر پیش کرنے لگے‘ لڑکیوں نے دسترخوان لگایا‘ نبیل بھی شامل تھا‘ وہ شرمندگی اور جھجک اب زائل ہوچکی تھی‘ دونوں بھائی خوب چہک رہے تھے‘ مرغی کا سالن بغیر نمک کے‘ کباب خوب مرچیلے اور بریانی مسالے دار‘ سلاد بھی بازاری وہ جو کبابوں کے ساتھ آئی تھی‘ لچھے دار پیاز‘ بڑے بڑے ٹماٹر اور کھیرے کے قتلے‘ یہ کھانا بڑی اماں کی صحت کے لیے سخت مضر تھا‘ اسی لیے رانیہ نے ان کی پلیٹ میں صرف مرغی کا سالن نکالا۔ مگر اس کی لاکھ گھوریوں اور اشاروں کے باوجود بڑی اماں نے کباب‘ بریانی بھی چکھی‘ کہ مدتوں پرہیزی کھانا کھاتے اوب گئی تھیں‘ جی بھر کے بدپرہیزی کے بعد میں مٹی کی پیالیوں میں جمی کھیر نے دل ٹھنڈا کردیا‘ کھانا آخری مراحل میں تھا‘ جب تیمور بھی آگیا‘ شاندار قدوقامت‘ لباس میں نفاست‘ اچھی ملازمت کا عطا کردہ اعتماد۔

”یہ میرا سب سے بڑا بیٹا تیمور ہے۔“ شبیر احمد نے تعارف کروایا تو بڑی اماں کے منہ سے پھسلا۔

”لگتا تو نہیں۔“

وہ کچھ حیران ہوکر ان کی شکل دیکھنے لگے۔

”باقی دو کو دیکھ کر لگتا تو نہیں کہ یہ بھی تمہارا ہی بیٹا ہے۔“ بڑی اماں کی توصیفی نگاہیں تیمور کا بھرپور جائزہ لے رہی تھیں‘ جوان سے سلام دعا کرنے کے بعد اب کھانے کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ رانیہ نے بس ایک ہی نظر ڈالی اور پلیٹ میں پڑی روٹی جلدی جلدی ختم کرنے لگی۔

”ہاں باقیوں کی نسبت یہ کچھ سنجیدہ مزاج ہے‘ قد کاٹھ میں اپنے نانا پر گیا ہے۔“ ذکیہ نے سادگی سے وضاحت کی۔

”بڑی اماں! آپ نے ہماری ڈائریکٹ انسلٹ کی ہے‘ جس پر ہم نعرۂ احتجاج بلند کرتے ہیں۔“

”میں نے کیا کردیا؟“ بڑی اماں نے حیرت و معصومیت سے دریافت کیا۔

”اللہ رے معصومیت…!“

”اسفر! خاموشی سے کھانا کھاؤ۔“ تیمور نے نارمل سے انداز میں کہا۔ مگر وہ خاموشی سے کھانا کھانے لگا تھا۔ گویا بڑے بھیا کا خاصا رعب تھا۔ شبیر احمد‘ تیمور سے اماں کی بیماری ڈسکس کرنے لگے۔ رات ہی فون کرکے ابا نے ان سے تفصیلی بات کی تھی۔

”میرا دوست ہے باسط‘ اس کے کلینک پر وقت لے لیتا ہوں‘ اسپتال میں کہاں دھکے کھائیں گی‘ شام کو بڑی اماں کو اسپتال چلنا ہے۔“ وہ کہہ رہا تھا۔

”تو بھی… اب اس [illegible] کے بعد ایک کپ گرما گرم چائے ہوجائے‘ سچ کہتا ہوں اماں! آج آپ کے طفیل ہماری بھی عید ہوگئی‘ ورنہ یہ نیک بی بی تو ایک آدھ دال سبزی پر ٹرخا دیتی تھیں۔“ شبیر چاچا نے بیوی کو پیار سے…

”ہاں اب ساری عمر کی خدمتوں کا یہی صلہ ملے گا‘ اب نہیں ہوتا اتنا کام تو کیا کروں؟“ ذکیہ نے بغیر برا مانے ہنس کر کہا۔

”چائے تو اپنی رانیہ بنائے گی‘ جاؤ رانیہ!“

بڑی اماں کے ٹہوکے پر رانیہ نے تحیر سے انھیں دیکھا‘ بھلا ابھی گھر میں نجانے کون کون سی پٹیاں پڑھا رہی تھیں‘ نبیل اور اسفر نے مل کر برتن اٹھائے‘ دسترخوان سمیٹا‘ جبکہ ذکیہ کہہ رہی تھیں۔

”کھانا کھا کر سستی سی ہوجاتی ہے‘ پھر کچھ کرنے کو دل ہی نہیں کرتا۔“

رانیہ کو اسفر نے ”آپ مہمان ہیں“ کہہ کر اٹھنے ہی نہیں دیا‘ اور خود ہی چائے بنا لایا تھا۔



”اللہ کرے کوئی آندھی‘ طوفان ہی آجائے‘ شہر کی ساری سڑکیں بند ہوجائیں‘ گھر سے نکل ہی نہ پاؤں‘ کہاں سے لگ گئی یہ منحوس بیماری‘ ہمیشہ تو حکیم کے جوشاندوں‘ پڑیوں سے ہی آرام آجایا کرتا تھا۔“

ابھی تھوڑی دیر قبل تیمور کا فون آیا تھا۔ ”بڑی اماں کو تیار کردیں‘ میں آرہا ہوں۔“

رانیہ نے بڑی اماں کے کپڑے بدلوائے‘ خود بھی تیار ہوگئی‘ مگر بڑی اماں تھیں کہ سخت بوکھلائی ہوئی تھیں‘ جل تو جلال تو کا ورد کررہی تھیں‘ اوپر سے اسفر کی دل دہلانے والی باتیں۔

”ارے بڑی اماں! اتنی دعائیں اپنے ٹھیک ہونے کی مانگ لیتیں تو یہ بیماری کب کی جاچکی ہوتی‘ مگر آپ کو تو شہر کی سیر کا شوق تھا‘ ڈاکٹر کو ملنے کا اشتیاق…“

”مراں ہو… اللہ کسی دشمن کو بھی ڈاکٹر کا منہ نہ دکھائے۔“

”تو اور کیا۔“ وہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ ”یہ لمبی لمبی چھریاں ہوتی ہیں ڈاکٹر کے پاس‘ بات بعد میں کرتے ہیں‘ چیر پھاڑ پہلے‘ اور اگر آپ نے کچھ الٹا سیدھا بول دیا تو جھٹ سے زبان میں ٹیکا ٹھونک دیں گے‘ ایک ہتھوڑی بھی ہوگی‘ آپ کے گھٹنوں پر مار مار کر چیک کریں گے کہ کہیں جھوٹ موٹ کی تو بیمار نہیں۔“

”جھوٹ‘ بکواس‘ گپ۔“ نبیل برابر بیٹھ کر تسلیاں دینے لگا‘ مگر بڑی اماں روہانسی ہوگئیں۔

”اللہ کی مار ان بدبختوں پر‘ شبیر! میں نہ جاؤں گی‘ بھلے یونہی موت آجائے۔“ انھوں نے اندر آتے شبیر احمد کو دیکھ کر دہائی دی۔

”اماں! کچھ نہیں ہوگا‘ رانی اور تیمور آپ کے ساتھ ہیں‘ کہیں تو میں بھی چلے چلتا ہوں۔“

بڑی اماں نے مایوسی سے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ موسم گرد آلود اور حبس زدہ تھا۔

تب ہی تیمور نے اندر آکر سلام کیا‘ ایک طائرانہ نظر رانیہ پر ڈالی اور بڑی اماں سے پوچھنے لگا۔

”بڑی اماں! آپ تیار ہیں۔“

”پانچ منٹ رک جا‘ پتر! آندھی آنے والی ہے۔“ انھوں نے بڑی خوشی سے فضا میں پھیلی گرد کی باس سونگھی۔

”نہیں… ہم پہنچ جائیں گے۔“

”دو منٹ صبر کرو‘ شاید آندھی آہی جائے۔“

انھوں نے اتنی حسرت سے کہا کہ سب کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی‘ اسفر قہقہے لگانے لگا۔

”میرا مطلب ہے‘ پتا تو کرلیتے میرے لال! کیا خبر ڈاکٹر آج چھٹی پر ہو۔“ بڑی اماں نے بے چارگی سے سب کو دیکھا‘ اسفر نے انھیں بازوؤں میں بھر کر گاڑی میں بٹھا دیا۔ پھر شرارتی نگاہوں سے رانیہ کو دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”اب تو خود سے چل [illegible]“

رانیہ بڑی [illegible] دیکھا گئی۔

تیمور ڈاکٹر کو بتاچکا تھا کہ بڑی اماں ڈاکٹری علاج سے کس قدر خوف زدہ ہیں۔ وہ تھا تو تیمور کا دوست‘ مگر اسفر کا سگا بھائی لگتا تھا۔ اس نے پہلے تو دادی کو اپنی دادی کی بلکہ مرحومہ دادی کی باتیں سنائیں‘ پھر کچھ لطیفے‘ لطیفوں کے درمیان ہی چیک اپ بھی ہوگیا‘ رانیہ نے کچھ بتانے کی کوشش بھی کی تو جھڑک دیا۔

”مریضہ آپ ہیں یا یہ؟“

اور آخر میں اعلان ہوا۔

”ایسی اچھی دادی ہیں‘ میں تو نہ جانے دوں گا‘ اپنے گھر لے جاؤں گا۔“ یہ تیمور تو بالکل گھامڑ ہے‘ اسے بزرگوں کی کیا قدر۔“

”ہاں… شبیر احمد کی ساری اولاد اپنی ماں پر پڑی ہے۔“

بڑی اماں نے انتہائی سادگی سے کہا‘ رانیہ نے سٹپٹا

کر تیمور کو دیکھا۔ وہ مسکراہٹ ہونٹوں میں دبائے موبائل کے ساتھ مصروف تھا۔ "ڈاکٹر بڑی اماں کو ٹیسٹ کر آیا تھا" سو وہ خوشی خوشی اگلے دن آنے کے لیے تیار ہو گئیں۔

رات کے کھانے میں ذکیہ نے مرغ چنے کا سالن اور کسٹرڈ بنایا تھا' شوربے میں دوڑتے چنے' ان کا تعاقب کرتی بوٹیاں' بنا کسی سجاوٹ کے کسٹرڈ' جس میں موٹے موٹے بادام اور کشمش دل کھول کر ڈالی گئی تھیں۔

"ہونہہ! ساری عمر گزر گئی ذکیہ کو سالن بنانا نہیں آیا۔ مانو تو شوربہ نہیں مگر مہ پانی میں روٹی ڈبو کر کھالی ہو۔"

حسب عادت اپنے کمرے میں آکر بڑی اماں نے تبصرہ کیا۔ رانیہ خاموش ہی رہی' بڑی اماں کو تو اچھی خاصی چیز پسند نہ آتی تھی۔ یہاں تو خیر ذکیہ کے ہاتھ میں ذائقہ ہی نہ تھا۔ وہ بڑی اماں کے پیر دبانے لگی' منت کر کے دوا کھلائی' آخر وہ سو گئیں' مگر نئی جگہ کی وجہ سے اسے نیند ہی نہ آرہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"ایک پیالی چائے کی بنا دے رانی!"

وہ نماز پڑھ کر دعا مانگ رہی تھی۔ جب بڑی اماں نے کہا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا کر جائے نماز تہ کی' اور باہر آگئی' برآمدے میں کچن کا دروازہ تھا۔ وہ اندر آگئی۔ سنک میں رات والے برتن یونہی پڑے تھے' سنک اور چولہا دونوں ہی گندے۔

"بے چاری ذکیہ خالہ' کوئی بیٹی ہوتی تو۔۔۔"

اس نے تاسف سے کچن کی حالت دیکھی' کیتلی دھو کر چولہے پر رکھی' فریج سے دودھ کا جگ نکالا' چینی' پتی کی تلاش میں ایک دو کیبنٹ کھولے' دوسرے لمحے اس کے منہ سے چیخ برآمد ہوئی۔ اور وہ بے تحاشا بیل کی طرح رستے میں آئی ہر چیز بشمول اسفر کے ٹکریں مارتی سیدھی بڑی اماں تک پہنچی اور ان کے پہلو میں دبک کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

"یہ آپ مارننگ واک کا شوق پورا کر رہی تھیں۔" اسفر کا مسکراتا چہرہ دروازے سے جھانکنے لگا۔

"وہاں کچن میں۔۔۔" رانیہ نے شرمندہ ہو کر کچھ کہنا چاہا۔

"لو۔۔۔ آپ نے ہمارے مہمانوں کو ڈرا دیا۔" اسفر نے آنکھیں پھاڑیں۔

"کچن میں مہمان؟" بڑی اماں نے باری باری دونوں کی شکل دیکھی۔

"میں تو صرف ایک کپ چائے بنانے گئی تھی۔" رانیہ کو غصہ آنے لگا۔

"اور سارے کیبنٹ کھول لیے۔"

"پتی نہیں مل رہی تھی۔" رانیہ چڑ گئی۔ "اور مجھے کیا خبر تھی کہ آپ کے کیبنٹ میں چوہے استراحت فرماتے ہیں۔"

"چوہے۔۔۔" بڑی اماں اچھلیں۔

"یہاں نہیں' کچن میں۔" اسفر نے تسلی دی۔

"میں نہیں چائے پیتی' نہ جانے کس کس برتن میں پھدکتے پھر رہے ہوں گے۔"

بڑی اماں نے بدک کر کہا تو وہ ہنستا ہوا چلا گیا' تھوڑی دیر میں واپس آیا تو ہاتھ میں پکڑی ٹرے میں چائے کے دو مگ پڑے تھے' ساتھ میں نمکین اور میٹھے بسکٹ بھی۔

"بالکل نئے مگ ہیں' ابھی ڈبے سے نکال کر دھو کر چائے ڈالی' ڈبے میں چوہوں کا گھسنا ناممکن۔"

"میں چائے نہیں پیتی۔" وہ ایک مگ بڑی اماں کو تھما چکا تھا اور دوسرا اٹھا رہا تھا۔

"میں تو پیتا ہوں۔" اس نے دوسرا مگ منہ کو لگایا' رانیہ شرمندہ سی ہو گئی۔ کیا ضرورت تھی اتنی جلدی بول اٹھنے کی۔ اسفر اب ان سے کلینک کی تفصیل پوچھ رہا تھا۔ بڑی اماں خوشی خوشی بتانے لگیں۔

"بڑا ہی بھلا بچہ تھا' اللہ اسے خوش رکھے' جاتے ہی جوس پلایا' گھر کے جانے کی ضد کر رہا تھا۔"

"بڑی اماں! آپ نہیں جانتیں' تیمور بھائی کو ابھی تو جان بوجھ کر آپ کو جعلی ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے۔

اگر آپ وہاں جا کر شور شرابہ کرتیں' اگلی بار دیکھیے گا سچ مچ کے ڈاکٹر کے پاس لے کر جائیں گے۔ وہ اتنا پیارا ہوا تو میرا نام بدل دیجیے گا۔" اسفر نے ڈرانا چاہا' مگر بڑی اماں لاپروائی سے چائے پیتی رہیں۔

"دیکھ لیے سب ڈاکٹر' اب نہیں تمہاری باتوں میں آنے والی' اور تیمور' وہ تم تینوں میں سب سے بھلا بچہ ہے۔"

"چلیں۔" اسفر نے بھنا کر کپ پٹخا۔ "صبح سویرے اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر پلانا بھی بےکار گیا۔"

بچوں کی طرح وہ منہ بنا کر نکل گیا' بڑی اماں ہکا بکا رہ گئیں۔

"میں نے اسے کیا کہا؟"

رانیہ مسکرا کر خاموش ہو رہی' تب ہی ذکیہ اندر آئیں' چائے کے برتنوں پر نظر پڑی تو کچھ شرمندہ ہو گئیں۔

"میں ناشتے کا ہی پوچھنے آرہی تھی۔"

"تمہیں بہت تڑکے ناشتے کی عادت ہے۔" بڑی اماں نے ٹوکا۔

"ہائے کیا بتاؤں اماں' ممتاز کے جانے کے بعد اٹھا ہی نہیں گیا' اب بھی طبیعت میں سستی سی ہے' ایک کپ چائے مل جائے تو۔۔۔" رانیہ ان کا مطلب سمجھ گئی اور سمجھ تو بڑی اماں بھی اچھی طرح گئی تھیں۔ تب ہی جھٹ سے بولیں۔

"تمہارا بھلا بیٹا کر لایا تھا۔ رانیہ کو تو چوہوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔" ذرا سا چوہا اب چوہوں میں بدل گیا تھا ذکیہ کا منہ کھل گیا' پھر ہنسنے لگیں۔

"ہاں! ایک کم بخت ہے تو سہی' اسفر' نبیل سے کئی بار کہا اسے مار دو' یا چوہوں کی دوا لا دو' پر سنتے کہاں ہیں۔"

"میں بنا لاتی ہوں۔" رانیہ نے کہا' مگر بڑی اماں کی کہنی دن میں تارے دکھا گئی۔

"کیا ہوا؟" ذکیہ کہنی تو نہ دیکھ سکیں' مگر منہ کے زاویے ضرور دیکھ لیے۔

"کچھ نہیں۔ اس کے پیٹ میں درد ہے' رات بازار کا کھانا موافق نہیں آیا۔"

بھلا بڑی اماں کسی کو بخشتی تھیں' لگے ہاتھوں بازار کا کھانا بھی گنوا دیا' رانیہ کا دل چاہا سر پیٹ لے۔ ذکیہ اٹھ گئیں۔ اوپر سے ناشتہ بھی بازار سے آیا اور بڑی اماں نے خوب ڈٹ کر کھایا۔

"یہ شبیر احمد تو بہت تڑکے جاتا ہوگا۔ اس کا ناشتہ کون بناتا ہے۔"

"کبھی اسفر بنا دیتا ہے' کبھی۔" ذکیہ ایک لمحے کو ٹھٹکیں۔ "کبھی میں۔"

"اللہ کی شان۔ پچھلے دس سالوں سے میں نے تو کوئی ایسا دن نہیں دیکھا۔" نبیل بڑبڑایا۔ ذکیہ کا دھموکا اس کی کمر پر پڑا۔

"بدتمیز ماں کا مذاق اڑاتے ہو۔ اب میں چلنے جوگی نہیں رہی۔ بھول گئے تم دونوں کو کان سے پکڑ کر پچھواڑے والے اسکول میں چھوڑنے جاتی تھی۔"

"امی! مہمانوں کا تو لحاظ کریں۔" نبیل بڑبڑایا' وہ اچھا خاصا گورا اور شرمیلا سا لڑکا تھا۔

"تم نے کیا تھا ماں کا لحاظ۔"

"السلام علیکم۔"

بڑی اماں کے ساتھ ساتھ پوری کے چھوٹے چھوٹے نوالے بناتی رانیہ نے سر اٹھا کر دیکھا پھر تیزی سے سر جھکا لیا۔ کالی پینٹ پر سفید لائنوں والی شرٹ چمکتے جوتے سلیقے سے جمے بال' خوشبوؤں کا استعمال ایک معطر سی خوشبو چہار سو سرسرانے لگی۔

اسے دیکھ کر رانیہ کے ذہن میں ایک ہی لفظ آیا۔ "نفیس" اس کے بولنے چلنے لباس ہر چیز سے نفاست جھلکتی تھی۔ شاید وہ اسی لیے بھی نمایاں لگتا تھا کہ اس کے برعکس اسفر اور نبیل اول جلول سے حلیے میں رہتے تھے۔

بڑی اماں کی آنکھوں میں ابھی پسندیدگی کی جھلک تھی۔

"میں بارہ بجے تک آؤں گا۔ بڑی اماں! آپ تیار رہیے گا۔ کچھ ٹیسٹ کروانے ہیں۔"

تیمور نے انڈا اپنی پلیٹ میں منتقل کرتے ہوئے

کہاں، بارہ بجے تک رانیہ بڑی اماں کو تیار کرنے کے ساتھ ساتھ خود بھی تیار ہو گئی۔ بارہ بجے تیمور آیا تو صرف بڑی اماں کو ساتھ لے کر چلا گیا۔ بڑی اماں کو رانیہ کے بغیر کہیں بھی جانے کی عادت نہ تھی۔ سو تھوڑا اپ سیٹ ہوئی تھیں۔ مگر تیمور نے آرام سے کہہ دیا۔

"ہو چلی جائیں گی۔ ان کا بھی چیک اپ ہونا ہے۔ رانیہ گھر پر ہے۔"

موسم بھی گرد آلود تھا۔

"اور بڑی اماں اس موسم سے کتنا گھبراتی ہیں۔"

اس نے برآمدے کے سرے پر کھڑے ہو کر سوچا۔ اندر جانے کو جی ہی نہیں چاہا۔ سو کچھ دیر وہیں کھڑی رہی۔

چند لمحے بیتے۔

"کپڑے اتار لو۔ آندھی آنے والی ہے۔" ہمسائے میں کسی نے نجانے کس کو آواز دی۔

رانیہ نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھائیں۔ پھر دھک سے رہ گئی۔

گرد کا طوفان اس کے سر پر آ پہنچا تھا۔

ہوائیں تیز تھیں۔

آسمان کی سرمئی رنگت۔ زردی مائل سرخ۔

خشک مٹی کی باس سانسوں کو الجھا گئی۔

"اوئی ماں۔" وہ بگٹٹ بھاگی اور دھاڑ دھاڑ سارے دروازے بند کرنے لگی۔

ڈرائنگ روم کی ساری کھڑکیاں۔ باورچی خانے کے کھلے کیبنٹ الماریاں۔

وہ بھاگم بھاگ سب جگہ کی کنڈیاں چڑھاتی رہی۔

اسفر اسٹڈی روم میں تھا۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی اوپر آئی۔ یہ کمرہ لڑکوں نے اپنے پڑھنے لکھنے کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ جہاں کتابوں کے انبار کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر بھی موجود تھا۔ اسفر باہر کے موسم سے بے نیاز کمپیوٹر میں مگن تھا۔ اسے اوپر دیکھ کر گڑبڑا سا گیا۔

"کیا ہوا؟" رانیہ کے چہرے پر تشویش کے گہرے بادل چھائے تھے۔

"طوفان آ گیا۔۔۔ اور بڑی اماں۔۔۔ وہ اس موسم سے کتنا گھبراتی ہیں۔"

اسفر نے کھڑکی کا پردہ کھسکایا۔

شیشے کے اس پار سارا منظر دھندلایا ہوا تھا۔

"پریشان کیوں ہوتی ہیں؟ یہ طوفان ان کی گاڑی اٹھا کر زیادہ دور نہیں لے جائے گا۔"

اسفر نے دانستہ مذاق کیا۔ ساتھ ہی موبائل اٹھا کر تیمور کا نمبر ملایا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں خیریت سے ہیں۔ ہسپتال پہنچے تب آندھی آئی تھی۔ بالکل سکون اور حفاظت سے ہیں۔" تیمور نے تسلی دینے کے بعد بڑی اماں سے بھی بات کروائی۔ وہ اپنی پریشانی میں تھیں۔

"کیسی بے عقل ہے۔۔۔ مجھے چھوٹا نہیں دیا۔ اب اگر بارش آ گئی تو۔۔۔"

رانیہ کی تسلی ہو گئی۔ بڑی اماں خوف زدہ نہیں تھیں۔ اسفر کا خیال تھا اب وہ چلی جائے گی۔ مگر وہ یونہی ادھر ادھر دیکھتی رہی۔۔۔ پھر کچھ جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"چھوٹے بھیا! میں ادھر ہی بیٹھ جاؤں۔۔۔؟"

"ہائے۔۔۔ اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا! آپ جیسی حسین دوشیزہ سامنے بیٹھ گئی تو مجھ جیسا نوجوان۔۔۔ آہم۔۔۔ خوبرو نوجوان۔ کتاب کمپیوٹر میں کیسے دل لگائے گا۔"

رانیہ اس کی بات پر دل کھول کر ہنسی۔

"ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے بھیا! جو مجھے ایسی باتوں سے ڈراتے ہیں۔ دھیان سے اپنے کام پر توجہ دیں۔ دوسری چیزوں میں دل لگانے کو اک عمر پڑی ہے۔"

"ہائیں۔" اسفر نے حیرت سے اس کا جواب سنا۔ پھر غیر ارادی طور پر پوچھنے لگا۔ "کتنا پڑھا ہے آپ نے؟"

"الف۔ اے کیا ہے؟" وہ خود ہی ایک طرف پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"گاؤں میں کالج ہے؟"

"نہیں۔۔۔ دو سال شہر آتی رہی۔"

"ہر روز؟"

"ہوں۔۔۔ ویگن کا اسٹاپ ہمارے کالج سے زیادہ دور نہ تھا۔" وہ بہت سادگی اور اعتماد سے جواب دے رہی تھی۔

"بی اے کیوں نہیں کیا؟"

"بس 'پڑھائی میں دل نہیں لگا۔۔۔"

اس نے یونہی ایک کتاب کھول کر ورق گردانی شروع کر دی۔ وہ بھی خاموشی سے کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد آندھی کا زور ٹوٹ گیا تو وہ نیچے چلی آئی۔ ہر شے دھول مٹی سے اٹی ہوئی۔۔۔ اب فارغ بیٹھ کر بھی کیا کرتی۔ بالٹیاں بھر بھر کر صحن اور برآمدے میں پانی بہانے لگی۔۔۔ گھنٹے بھر میں اندر باہر سے دھول کا نام و نشان بھی غائب تھا۔۔۔ اسفر نیچے آیا تو متحیر سا کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ ان کے یہاں شام کو آئی آندھی اگلے دن ملازمہ ہی آکر نکالتی تھی۔ صاف ستھرا' دھلا دھلایا گھر اور کرنے والی چراغ کے جن کی طرف [illegible]

"ایک عدد جیتی جاگتی لڑکی کا وجود اس گھر کے لیے کس قدر ضروری ہے۔"

"تم کیا سوچ رہے ہو؟" نبیل ابھی ابھی آیا تھا۔ اسے بہت بیزار دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"کاش ابو! اس گھر کی لڑکی ہوتا۔" اسفر نے حسرت سے آہ بھری۔ نبیل بدک کر پیچھے ہٹا۔

"لاحول ولا۔" وہ لڑنے مرنے پر اتر آیا۔

"کاش! تیری جگہ ایک عدد بہن پیدا ہو جاتی۔"

"میری جگہ کیوں' تیری جگہ کیوں نہیں۔" اس نے بازو چڑھا لیے تھے۔

✡ ✡ ✡

شبیر احمد نے بڑی اماں کو واپس ہی نہیں جانے دیا۔ کہاں تو وہ ایک دن بھی رکنے کو تیار نہ تھیں۔ اب آرام سے بیٹھ گئیں۔ پھر رانیہ کے واپس جانے کا کیا سوال؟ مگر وہ خوش نہ تھی۔ یوں ہاتھ پیر توڑے کسی کے گھر بیٹھ رہنا اسے پسند نہ تھا۔ مگر بڑی اماں اسے بغل میں دبوچے رکھتیں۔

آخر لڑکوں والا گھر تھا۔

مگر کب تک۔ اس دن ذکیہ کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ تیمور نے شائستگی سے درخواست کی کہ ناشتہ وہ بنا دے۔۔۔ وہ بڑی اماں کے کچھ بھی کہنے سے پہلے کچن میں پہنچ گئی۔ باورچی خانہ کا دروازہ غالباً "رات ہی سے بند تھا۔ کھلتے ہی ناگواری سی مہک چاروں طرف پھیل گئی۔

"اوہ نوں۔" ناک سکوڑتے ہوئے اس نے جائزہ لیا۔ گندے مندے برتنوں کی بھرمار تھی۔ سنک بھی بھرا ہوا۔۔۔ اور سارے کے سارے کاؤنٹر بھی۔۔۔ حتیٰ کہ چھوٹی سی ٹیبل پر بھی اگر کسی نے کھانا کھایا تھا تو برتن جوں کے توں دھرے تھے۔ کچرے سے ابلتی ڈسٹ بن اور برتنوں میں بچے کھچے کھانے کی مہک نے اس کا جی متلا دیا۔ پہلے کچرے کی ٹوکری اٹھا کر باہر والے دروازے کے پاس رکھی۔ پھر سلیب پر دھرے ناشتے کے برتن ہٹا کر اپنے لیے جگہ بنائی۔

"کمال ہے' اتنے افراد تو نہیں ہیں گھر میں۔۔۔ ہاتھ کے ہاتھ برتن دھو لیا کریں تو اتنا بکھراوا تو نہ ہو۔۔۔ لگتا ہے پہلا برتن دھونے کے بجائے نیا استعمال کرتی ہیں۔"

وہ زیر لب بڑبڑائی۔ پھر خیال آیا یقیناً "یہ کام لڑکے کرتے ہیں۔۔۔ پکایا کھایا اور کچن سے باہر۔" اس نے فریج سے آٹا نکالا۔۔۔ آٹا اتنا سخت کہ بمشکل ہی پیڑا بنا پائی۔

"یا اللہ! یہاں کام کرنا کتنا مشکل ہے۔"

اس نے پہلے گھر کے افراد گن کر پراٹھے کے پیڑے بنا کر رکھ دیے۔۔۔ پھر آملیٹ کی تیاری کی۔ سالن گرم کیا۔ سالن سے دو بوٹیاں نکال کر ریشہ ریشہ کر کے آملیٹ میں مکس کیا۔ ہری مرچیں' ٹماٹر' اور باریک دھنیا کاٹ کر ملایا۔ پہلے ٹیبل صاف کی۔ اس کے بعد پراٹھے بنانے شروع کیے۔ پیڑے اب کچھ نرم پڑ گئے تھے۔۔۔ اس لیے خوش رنگ و خستہ پراٹھے تلے گئے۔

"ارے! اتنا اہتمام۔" جب تک شبیر احمد آئے' وہ ٹیبل پر آملیٹ' سالن سجا دی۔۔۔ اچار رکھنے کے بعد اب چنگیر میں پراٹھے رکھ رہی تھی۔

"چاچا جی! یہ زیادہ اہتمام تو نہیں۔" وہ کچھ جھینپ گئی۔ نجانے وہ لوگ کیسا ناشتہ کرتے تھے۔ اس نے چاہا کہ پہلے ذکیہ چچی سے پوچھ لے۔ مگر وہاں دروازہ بند تھا۔ تیمور سے پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ سو خود ہی بنا لیا۔

"ارے بچے! ہم تو چائے میں پاپے ڈبو کر۔۔۔ اچھا اچھا۔۔۔ ارے بھئی تیمور! آجاؤ ایسا مزے دار اور گرما گرم تیار شدہ ناشتہ بڑے عرصے بعد نصیب ہوا ہے۔ اسفر' نبیل اٹھ جاؤ۔۔۔ ورنہ اس نعمت سے محروم رہ جاؤ گے۔"

انہوں نے ایسا شور کیا کہ ذکیہ ہائے ہائے کرتی اپنے کمرے سے برآمد ہوئیں۔

"میں نے کہا نیک بخت۔۔۔! جب تک ہماری بیٹی یہاں ہے' ہم تو اسی کے ہاتھ کا ناشتہ کریں گے۔۔۔ مزے دار آملیٹ۔۔۔ خستہ پراٹھے۔"

رانیہ مسکراہٹ دباتی چائے دم کرنے لگی۔۔۔ پھر بڑی اماں کے لیے ناشتہ ٹرے میں سجایا۔ تیمور بھی آفس کے لیے تیار ہو کر وہیں آ گیا۔۔۔ ایک خوشگوار سی خوشبو' ناشتے کی خوشبو پر حاوی ہونے لگی۔۔۔ ذکیہ نے بھی پلیٹ اپنے سامنے کھسکا لی۔۔۔ نبیل کو بھی آواز دی۔۔۔ رانیہ اپنا اور بڑی اماں کا ناشتہ ٹرے میں رکھنے آئی تو وہ نروٹھے پن سے بولیں۔

"نہیں۔۔۔ نہیں پہلے وہاں سب کو ٹھنسا لو۔۔۔ میرا کیا ہے' چاہے بھوکی مروں۔"

"اماں! پہلے آپ کے لیے لائی ہوں۔۔۔ میں چائے لے آؤں۔"

"سن! لڑکے بھی ادھر ہی ہیں۔" انہوں نے رازداری سے پوچھا۔

"جی' چاچا اور چاچی بھی۔"

"اچھا۔۔۔" انہوں نے کچھ لمحے غور کیا۔ پھر اثبات میں سر ہلا کر ناشتے کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ رانیہ نے واپس جا کر سب کے لیے چائے نکالی۔

"ہائے ہائے۔ کبھی میں بھی ایسے ہی پراٹھے بناتی تھی۔" ذکیہ نے آہ بھری۔

"تو اب کیا ہوا؟ درد گھٹنوں میں ہے ہاتھوں میں تو نہیں۔"

وہ انہیں نوک جھونک کرتا دیکھ کر چائے لے کر بڑی اماں کے پاس آ گئی۔ ناشتہ کر کے واپس آئی تو افراد خانہ غائب اور برتن جوں کے توں۔۔۔ بچا ہوا دہی فریج میں' اسفر کا ناشتہ ہاٹ پاٹ میں' خود برتن دھونے لگی کہ نوکرانی کو گیارہ بجے تک آنا تھا۔ اسے بے اختیار اپنا چھوٹا سا کچن یاد آیا۔ مجال نہیں کہ کوئی چیز اپنی جگہ سے ہل جائے۔۔۔ برتن' سبزیوں کی ٹوکریاں' حتیٰ کہ ماچس رکھنے کی باقاعدہ جگہ مقرر تھی۔ چینی' پتی' چولہے سے انتہائی قریب اور اتنی نمایاں جگہ پر رکھے جاتے کہ باہر سے بھی کوئی آتا تو آسانی سے چائے بنا سکتا تھا۔ برتن دھو کر کچن کے سارے سلیب صاف کیے اور بڑی اماں کے پاس آ گئی۔ اس تمام عرصے میں اس نے وہ بیگ کھولنے کی کوشش [illegible] علاوہ [illegible] نہیں جانتی تھی کہ اسفر نے [illegible] احسان [illegible] ہوں۔

✡ ✡ ✡

واشنگ مشین کی گھوں گھوں بہت تیز تھی۔ گویا صحن میں جہاز اتر رہا ہو۔۔۔ پہلی بار رانیہ نے ڈر کر بند ہی کر دی۔ پھر اسفر نے تسلی دی۔

"یہ اڑے گی نہیں۔"

پردے' چادریں' تولیے' کور' بیڈ شیٹس۔۔۔ اسفر نے سب ڈھیر کر دیں۔ بڑی اماں' زیر لب بڑبڑاتی رہیں۔ "مفت کی نوکرانی ہاتھ لگ گئی ہے۔" مگر رانیہ کو مزا آ رہا تھا۔ گاؤں میں یہ سب ہاتھ سے دھونا پڑتا تھا۔ واشنگ مشین تو تھی۔ مگر خراب ہوئی تو ٹھیک کروانے کی نوبت ہی نہ آئی۔ کبھی "وہ نئی مشین لے لیں" کا مشورہ دیتی تو بڑی اماں فوراً "ڈنگا ڈال کر" اس کی خواہش کو منہ کے بل گرا دیتیں۔

"تیرے جہیز میں دوں گی۔"
یا۔
"تمہو جہیز میں لے ہی آئے گی۔"
"ہاں - ابھی آس میں میرے ہاتھ گھساتے رہیں۔" رانیہ لاکھ تلملاتی...... ہونا تو وہی تھا جو بڑی اماں چاہتیں۔ سب سے زیادہ مزا ہوائی جہاز کے ساتھ آرہا تھا۔ ادھر کپڑے ڈالو۔ ادھر سوکھے سوکھے باہر۔ ملازمہ کو پنکھوں کی صفائی پر لگا رکھا تھا۔ جو کالے بھجنگ ہو کر شکل بدل گئے تھے۔ فرشوں کی دھلائی۔ دیواروں کی جھاڑائی۔ پنکھوں کی صفائی۔ غرض کون سا کام تھا جو رہ گیا ہو۔ کراکری ساری کی ساری نکال کر صاف کی گئی۔ نجانے کتنے زمانوں کے بعد بے چاروں کی اصل شکل دکھائی دی۔ کھانا چچی نے بنایا۔ بس سادہ سے دال چاول۔ خیال تھا اہتمام شام کو مہمانوں کی آمد پر ہو جائے گا۔ ان کے کھانا بنانے تک رانیہ بھی فارغ ہو گئی۔ ملازمہ تو تھی ہی۔ اسفر نے پورا ساتھ دیا۔ پردے لٹکانے' بیڈ شیٹ بدلنے۔ سٹنگ کرنے میں۔ گھر کی شکل نکل آئی۔ گھر ستھرا چمکتا ہوا۔ نبیل کالج سے آیا تو کھڑا رہ گیا۔

"ہمارے ہاں تو عید پر بھی گھر کی یہ شکل نہیں دکھتی۔ آپی! تم نے کون سی چھڑی گھمائی۔" وہ بازو اٹھائے چاروں اطراف گھوم لیتا اور شاباش' شاباش کہتا جاتا۔

رانیہ مسکراتی اپنے کام میں لگی رہی۔ بڑی اماں کو اس کی شوخیاں ایک آنکھ نہیں بھائیں' تب ہی ترخ کر بولیں۔

"ہاں..... گھر تو عورت کے سلیقے سے بنتا ہے۔ اب بغیر ہاتھ پیر ہلائے تو گھر صاف ہونے سے رہا۔" رانیہ نے شکر کیا کہ...... چچی وہاں نہ تھیں۔

جس وقت تیمور واپس آیا..... وہ کچن کے برتن ویسے الماریوں میں لگا رہی تھی اور حلیہ بتا رہا تھا کہ سارا کمال اسی لڑکی کا ہے۔ ہر چیز جگمگاتی' صاف ستھری' گھر کتنا کشادہ اور کھلا کھلا سا لگ رہا تھا۔ فرش ٹھنڈے اور بے حد سرخ۔ وہ ننگے پاؤں ایک سے دوسرے کمرے میں پھرتے رہے۔ پھر کچن کے دروازے میں آکھڑے ہوئے۔ وہ ان کی طرف پشت کیے اپنے کام میں مگن تھی۔ دوپٹہ اب بھی سلیقے سے اوڑھ رکھا تھا۔ دبلی پتلی' دھان پان سی لڑکی۔ انہیں بے حد اچھی اور اپنی اپنی سی لگی۔ تب ہی عقب سے اسفر آکر کھنکارا۔ تیمور کے ساتھ ساتھ رانیہ نے بھی پلٹ کر دیکھا۔

"کس سوچ میں ہو بھائی؟" اسفر کے لبوں پر معنی خیز سی مسکراہٹ دیکھ کر وہ جھل سا ہو گیا۔

"میں اپنے چپل ڈھونڈ رہا تھا۔"

"کچن میں......" اسفر نے بھنوئیں اچکائیں تو وہ اسے گھورتا باہر نکل گیا۔ جہاں نبیل اس کے چپل لیے آرہا تھا۔

"دراصل وہ اس پری کو دیکھنے آئے تھے۔ جس نے چھڑی گھما کر سارے گھر کا نقشہ بدل دیا۔" رانیہ جھینپ کر دوبارہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

رفیعہ خالہ کو دیکھ کر رانیہ کو یقین ہو گیا۔ کاہلی اور سستی رفیعہ چچی کے خاندان کا امتیازی وصف ہے۔ وہ کم از کم پیدل نہیں..... اور اتنی موٹی کہ جہاں بیٹھ جائیں' وہاں سے اٹھنا محال ہو جاتا۔

"ہونہہ' ڈھائی من کی دھوبن۔" بڑی اماں استہزائیہ انداز میں بڑبڑائیں..... ان کی لڑکی نبیلہ بھی فربہی مائل تھی۔ مگر قد لمبا ہونے کی وجہ سے بھدی نہ لگتی۔ چھوٹی آنکھیں۔ صاف رنگت' خوب صورت کٹاؤ والے ہونٹ۔ بے حد سیاہ بالوں کی موٹی سی چوٹی' جو کمر کے درمیان تک آتی۔ دیکھنے میں اچھی لگتی۔ اس نے سب سے پہلا اعتراض کھانے پر کیا۔

"یہ کیا خالہ' کھانا گھر پر بنایا ہے۔"

رانیہ نے دسترخوان پر نظر دوڑائی۔ مٹن قورمہ' چکن بریانی' کباب' سلاد' رائتہ' چٹنیاں' میٹھے میں ڈھیر سارے میووں والی کھیر..... لذت کام و دہن کے تمام ہی لوازم موجود تھے..... پھر اعتراض کس پر تھا......؟ گھر پہ بنانے پر۔

"انہوں نے ہی تو نہیں رانیہ آپی نے بنایا ہے۔ کھا کر بس انگلیاں چاٹتی رہ جائیں گی۔" نبیل بول اٹھا۔ اسفر نے رانیہ کو تسلی دی۔

"دراصل نبیلہ دو ہی کاموں کے لیے آتی ہے۔ ایک تو سارا سال بنائے گئے کپڑے ساہیوال والوں کو دکھانے کے لیے۔"

"کیوں ساہیوال والوں نے کبھی نئے کپڑے نہیں دیکھے...... یا خانیوال میں زیادہ عجوبہ کپڑے ہیں۔ ارے ہاں..... دوسرا مجھے بھی دکھانا۔" بڑی اماں کسی کو شرمندہ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھیں۔ نبیلہ نے اسفر کو بری طرح گھورا۔

"اور دوسرا؟" رانیہ نے دریافت کیا۔

"یہاں کے ہوٹلوں کے کھانے چیک کرنے۔ شکر ہے' ہم لاہور یا کراچی جیسے شہر میں نہیں رہتے۔"

"ہاں' تم تو جیسے بہت کھلاتے ہو۔ پچھلی بار بھی شوارما نہیں کھلایا۔ جستی نان پر ٹرخا دیا تھا۔" نبیلہ نے منہ بنایا۔

"تو تمہیں! تم نے ابھی تک شوارما نہیں کھایا۔ کیا خانیوال میں نہیں ملتا۔"

"وہاں کیا نہیں ملتا۔ ہاں ہم جس بھرے پرے گھر میں رہتے ہیں۔ وہاں ایسی عیاشیوں کا تصور کہاں؟ کہیں جانا ہو۔ پورے ٹبر کو ساتھ لے کر جانا پڑتا ہے۔" رفیعہ خالہ بریانی کی پلیٹ پر قورمے اور کباب کا ڈھیر لگا رہی تھیں۔

"خالہ' نبیلہ کا یہ مینار ڈھیر ہو جائے گا۔ ایک پلیٹ اور ساتھ رکھ لیں۔" اسفر سے رہا نہ گیا۔

"امی' یہ آپ کا مذاق اڑا رہا ہے۔" نبیلہ نے خبردار کیا۔

"یہ شروع ہی سے بہت مخولیا ہے۔ میں نے کبھی اس کی باتوں کا برا نہیں مانا۔"

"ہاں' کھانے پینے کے معاملات میں۔" وہ بڑبڑایا۔

"یہ اجو کہاں رہ گیا۔ کھانا کھالے۔" ذکیہ چچی کو بھائی کی یاد ستائی۔

"اجو ماموں' پانی کا نل لیک کر رہا تھا..... وہی کس رہے ہیں۔"

"ہے..... یوں..... آتے ہی شروع ہو گیا۔" بڑی اماں نے حیرت سے پوچھا۔

"بس عادت پڑی ہے۔ پانچ سال وہاں دوبئی میں مکینک کا کام کیا۔ واپس آکر دو دکانیں خرید کر کرائے پر چڑھائیں۔ خود تیرے میرے گھر میں شوق پورا کر لیتا ہے۔"

"تو دکان کھول کر بیٹھ جائے۔"

"بس من موجی ہے۔"

"تو شادی کیوں نہ کی؟"

"مانتا نہیں۔"

"تو عمر یونہی رول دے گا۔"

"اس کی مرضی۔ ہم بہنوں کے ارمان تو دل میں ہی رہ گئے۔" ان کے ارمان لہجے سے چھلک رہے تھے۔ بے حد سرسری اور لاپروا لہجہ۔

"جاؤ' اجو بھیا کو بلالاؤ۔ کھانا تو کھالے۔" ذکیہ چچی نے اسفر سے کہا۔

اجو بھیا آگئے۔ کالی ڈھیلی سی پینٹ' سرخ شرٹ' جس میں توند نمایاں ہو رہی تھی۔ سانولی مائل گندمی رنگت۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں۔ سر غالباً گنج تھا۔ جب ہی ٹوپی مستقل سر پر براجمان تھی۔ عمر اڑتالیس پچاس کے قریب۔

"سلام بڑی اماں!" وہ جھکے' بڑی اماں نے سر پر پیار دیا اور بہ نظر غائر جائزہ لیا۔

"اب تو تم بھی بڑے آبا لگ رہے ہو۔ بہت پہلے دیکھا تھا۔ تب لڑکے سے تھے۔"

وہ جھینپ کر کھانے کے لیے بیٹھ گیا۔ کھانے کے بعد رانیہ نے برتن سمیٹنے شروع کیے تو اسفر اور نبیل ساتھ دینے لگے۔ نبیلہ ٹی وی لگا کر بیٹھ گئی۔

رانیہ نے بچے ہوئے کھانے فریج میں محفوظ کیے۔ پلیٹوں میں سے ہڈیاں..... بچے ہوئے چاول۔ روٹی کے ٹکڑے ایک شاپر میں نکالے۔

"ان کا کیا کریں گی۔ ڈسٹ بن میں ڈالیں گی؟"

نبیل نے کہا۔ تو اس نے تیزی سے نفی میں سر ہلایا۔

"رزق کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ تمہارے محلے میں کتے بلیاں نہیں ہوتے۔"

"گھر کے پچھواڑے کھلا میدان ہے۔ وہاں بہت۔"

"وہیں ڈال دینا۔ ثواب ملے گا۔" رانیہ نے چولہے پر چائے کا پانی چڑھایا۔ خود برتن دھونے لگی۔ نبیل چائے کے لیے کپ نکالنے لگا۔

"رہنے دو... میں کرلوں گی۔"

"آپ برتن دھولیں۔ میں چائے دیکھ لوں گا۔ پہلے ہی آپ سارا دن تھکی ہیں۔"

نبیل نے فکر مندی سے کہا تو وہ مسکرا دی۔ نبیل نے چائے بنا کر پیالیوں میں نکالی اور ٹرے میں رکھ کر لے گیا۔ اس نے سارے برتن دھو کر خشک کیے۔ شیلف میں لگا کر سلیب صاف کر رہی تھی جب تیمور آگیا۔

"کچھ چاہیے تیمور بھائی؟"

"ہاں۔ کافی۔"

"وہ... مجھے بنانی تو نہیں آتی۔ اگر آپ بتادیں تو..."

تیمور نے اک نگاہ اس کے شرمندہ شرمندہ چہرے پر ڈالی پھر کیبنٹ کھول کر سامان۔

"کوئی بات نہیں، میں بنالوں گا۔"

وہ اپنا کام ختم کر چکی تھی۔ سو ہاتھ صاف کرتی باہر نکلنے لگی پھر تیمور کی آواز پر رک گئی۔

"رانیہ! بہت بہت شکریہ۔ آج تم نے گھر کو گھر بنا دیا۔"

"تیمور بھائی! میں نے تو بس..." وہ جھینپ سی گئی۔

کیا خبر تھی اس کے ذرا سے ہاتھ پیر ہلانے سے سب یوں خوش ہو جائیں گے۔ اسے تو یہاں کام کرنا ذرا بھی مشکل نہ لگا۔ گاؤں میں اب تک وہ لوگ لکڑیاں جلاتے تھے۔ یہاں تو آدھی رات کو بھی یہ بٹن گھماؤ۔ ایک دیا سلائی جلاؤ تو چولہا گرم... جھٹ پٹ چائے کھانا تیار... برسات کے دنوں میں گیلی لکڑیوں کو جلانا کیسا وقت طلب کام تھا۔ ابا رات کو دیر سے زمینوں سے لوٹتے... وہ ادھ جلے اپلے راکھ میں دبا دیتی۔ تاکہ ابا کے آنے تک چولہے میں چنگاری رہے اور وہ کھانا گرم کرسکے۔"

"کیا سوچنے لگیں۔ کوئی ہمارے لیے اچھا کرے تو اس کا شکریہ تو ادا کرنا چاہیے۔" وہ مگ میں کافی پھینٹ رہا تھا۔

رانیہ نے ذرا سی نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور بے ارادہ بولی۔

"وہ تو غیروں کا ادا کیا جاتا ہے۔"

"بالکل! اور یہ تو ہماری اپنی ہیں۔" اسفر نے انٹری دی۔ تیمور نے ایک نظر دونوں کو دیکھا اور مبہم سا مسکرا دیا۔ رانیہ کترا کر باہر نکل گئی۔

رانیہ اور گھر کے دیگر افراد کے مابین جو جھجک تھی۔ غیر محسوس انداز میں ختم ہو گئی۔ وہ بھی مصروف ہو گئی۔ اسے کام کر کے مزا بھی آتا تھا اور خوشی بھی ملتی تھی۔ وہ ساری ریسیپیز جو اس نے رسالوں سے پڑھ پڑھ کر حفظ کر رکھی تھیں۔ یہاں بنانے کا موقع ملتا تھا... لڑکوں کو دھلے دھلائے استری شدہ کپڑے مل رہے تھے... سو وہ رانیہ آپی کے گن گاتے...

بڑی اماں کی طبیعت بھی پہلے سے بحال ہو رہی تھی۔

ان ہی دنوں ایک دن ابا آئے۔ ڈھیر ساری سبزیوں اور پھلوں کے ساتھ... ساتھ ایک کین میں دس کلو دودھ بھی تھا۔ وہ انہیں لینے آئے تھے مگر شبیر چچا نے روک لیا۔ بڑی ماں کی انتڑیوں کی سوزش اب کنٹرول ہونا شروع ہوئی تھیں۔ وہاں پھر کوئی بدپرہیزی ہوئی تو مسئلہ بڑھ بھی سکتا تھا۔ سو وہ متفق ہوتے علاج کے لیے مزید رقم رانیہ کو تھما کر چلے گئے۔

ذکیہ چچی نے سکون کا سانس لے کر رانیہ کو ساتھ لپٹا لیا کہ ایسے چٹورے مہمانوں کی خاطر داری ان کے بس کا روگ کہاں تھا۔

☼ ☼ ☼

کچھ دن تو نبیلہ اور رفعہ خالہ یہاں موجود رہتے

والوں سے ملتے ہیں... مصروف رہتیں۔ ذکیہ پہلے تنہا ہونے کی وجہ سے کہیں نکل نہ پاتی تھیں... ایک ہی شہر میں رہتے مہینوں رشتے داروں کی خیر خبر نہ ہوتی...

اب گھر میں رانیہ اور بڑی اماں تھیں... سو بے فکر ہو کر ساتھ نکل جاتیں۔ پیچھے بڑی اماں بڑبڑاتیں۔

"ہاں۔ ہم نوکر ہیں جو ان کی گھر کی چوکیداری کریں۔"

"انہوں نے تو آپ سے بھی کہا تھا... چلی جائیں۔"

"جانتی ہوں۔ دل سے نہیں کہا تھا۔ صرف صلح ماری تھی۔ پھر تمہیں اکیلے کیسے چھوڑ جاتی۔" [illegible]

"مجھے لگتا ہے اس بہانے خاندان میں لڑکیاں دیکھنے جاتی ہیں۔ آخر تیمور اب کمانے لگا ہے۔"

"نہیں ایسا کچھ سوچتا ہوا تو پہلے نبیلہ کے بارے میں سوچیں گی۔ آخر ان کی بھانجی ہے۔"

رانیہ نے چولہا بند کیا اور چاولوں کا ڈھکن اٹھایا... سارے کچن میں چاولوں کی اشتہا انگیز خوشبو پھیل گئی۔ خود وہ سلاد کے لیے سبزیاں کاٹنے لگی... رات ٹی وی پر اس نے سلاد بنانے کی مختلف مگر آسان ترکیب نوٹ کی تھی۔

"ارے رہنے دو۔ اس لڑکی میں ہے کیا؟ نری شوشا... خود کو کسی ڈرامے کی ہیروئن سمجھتی ہے۔"

"اچھا چھوڑیں... ہمیں کیا۔ ظہر کی اذان ہو رہی ہے۔ آپ وضو کریں۔"

"ٹھیک کہا۔ ہم کیوں دوسروں کی برائیاں کر کے ان کے گناہ جھاڑیں۔" وہ اٹھ کر واش روم میں چلی گئیں۔ رانیہ نے سلاد بنایا۔ رائتہ بنایا۔ سلاد کا رنگ روپ دیکھ کر خود کو شاباش دی۔ پھر وہ کچن صاف کر رہی تھی۔ جب تیمور اور اجو ماموں ایک ساتھ گھر میں داخل ہوئے۔ دونوں کسی بات پر زور و شور سے بحث کر رہے تھے۔

"بس کریں ماموں! آپ نے خود اپنی زندگی کو محدود کر لیا ہے۔ زندگی ایک جگہ ٹھہر جانے کا نام نہیں۔ تسلسل کا نام ہے۔ یوں ٹھہر کر آپ نے کسی اور کا نہیں صرف اپنا نقصان کیا ہے۔ دیکھا جائے تو سب کے سب آپ کی ذات سے فائدہ ہی اٹھا رہے ہیں۔"

"میاں! تم کیا جانو۔ محبت کس چڑیا کا نام ہے۔"

"اس محبت کا فائدہ جو زندگی کو روگ بنا دے۔"

"رانیہ۔ کھانا تیار ہے۔" وہ باتیں کرتے کرتے کچن کے دروازے میں آکھڑا ہوا۔

"جی۔"

"ماموں! یہیں آجائیں۔" دونوں ہاتھ دھو کر وہیں بیٹھ گئے۔ رانیہ نے جلدی جلدی کھانا لگایا۔

"واہ۔" ماموں نے سلاد باؤل نظروں کے سامنے لہرایا۔ رانیہ جھینپ کر پانی رکھنے لگی۔ وہ کھانا کھاتے ہوئے بھی مسلسل داد دے رہے تھے۔

"عجیب بات یہ ہے کہ ذائقہ ہر ہاتھ میں نہیں ہوتا۔ اس لڑکی کے ہاتھ میں جادو ہے۔"

"چلو۔ رانیہ! ایسی ہی جادو اثر چائے بھی پلا دو۔"

تیمور ہنس کر بولا۔ اس نے ایک بار بھی تعریف نہیں کی تھی۔ [illegible] کر کھانا کھایا تھا... رانیہ کو [illegible] وصول ہوئی [illegible]

وہ چائے پیالیوں میں نکال رہی تھی۔ جب تیمور خود ہی چائے لینے آگیا۔ تب ہی رفعہ خالہ، نبیلہ اور ذکیہ چچی واپس آگئیں۔ ذکیہ تو بڑی اماں کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ جبکہ نبیلہ اور رفعہ کچھ ٹھٹک کر رک گئیں۔ دونوں کو ساتھ ساتھ کھڑے دیکھا۔ پھر ایک دوسرے کو معنی خیز انداز میں دیکھا۔

بات ساری ذہنیت کی ہوتی ہے۔ تب ہی اک عام سا منظر انہیں بہت خاص لگا۔ رفعہ اس منظر کو اپنے ہی مفہوم پہنا رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"خیریت! تم کسی دورے پر نہیں نکلیں؟" نبیلہ کو گھر پر دیکھ کر اسفر نے پوچھا۔ جو اپنے کپڑے نکال نکال کر دیکھ رہی تھی۔

"نہیں۔"

"تمہیں رشتہ داروں نے مزید برداشت کرنے سے انکار کر دیا۔"

"جی نہیں۔ آج ہم تمہارے ساتھ کھانا باہر کھائیں گے۔ کسی بہت اچھے ریستوران میں۔" نبیلہ نے اطمینان سے جواب دیا تو اسفر کو غش آگیا۔

"ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں۔" اس نے گلاس رانیہ کے ہاتھ میں تھمایا اور خود تیزی سے نکلنا چاہا تو اندر آتے تیمور سے ٹکرا گیا۔ رانیہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"خیریت۔" انہوں نے ایک نظر رانیہ کے ہنستے چہرے پر ڈالی۔

"یہ آگئے اب ان سے کرو فرمائش۔"

"کیسی فرمائش؟"

"محترمہ کو کھانا باہر کھانا ہے۔"

"کچن سے باہر۔ صحن میں لگا دو۔"

"گھر سے باہر۔"

"کسے؟ رانیہ کو؟"

"نہیں بھئی۔ ہمیں۔ نبیلہ..." رانیہ بوکھلائی۔

"تو کھلا دو۔ مہمان ہے۔" تیمور نے فراخ دلی سے کہا۔

"یہ مہمان داری۔ آپ نبھالیں۔"

"فرمائش تم سے ہوئی ہے مجھ سے نہیں۔" انہوں نے والٹ نکالا اور پیسے اسفر کو تھما دیے۔ وہ بری طرح پھنس گیا۔

"یہ ہوئی نا بات... رانیہ! جلدی سے میری یہ والی قمیص استری کر دو۔" نبیلہ نے جوش سے کہا۔ رانیہ نے حیرت، اسفر نے ناگواری اور دروازے میں تیمور نے ٹھٹک کر نبیلہ کو دیکھا۔

"آپ کے ہاتھ میں کوئی ڈیفیکٹ ہے محترمہ!" اسفر نے اپنا لہجہ ہلکا پھلکا ہی رکھا۔

"کیوں؟" نبیلہ نے حیرت سے دریافت کیا۔

"کیونکہ رانیہ بھی آپ کی طرح یہاں مہمان ہے۔"

"اچھا..." نبیلہ نے غور سے رانیہ کو دیکھا۔ پھر ہنس دی۔ "دراصل... رانیہ کو دیکھ کر لگتا نہیں کہ یہ مہمان ہے۔"

رانیہ نے اس کے طنز کو پوری طرح محسوس کیا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ تیمور نے ایک طرف ہو کر رستہ دیا۔ پھر ملامتی سی نگاہ نبیلہ پر ڈال کر اسفر کی طرف متوجہ ہوا۔

"رانیہ کو بھی لے جانا۔"

رانیہ نے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ عذر یہ دیا کہ آج بڑی اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ رفیعہ خالہ خوشی خوشی تیار ہو گئیں۔ اسفر نے سر پیٹ لیا۔

"تم بھی چلی جاتیں رانیہ! سارا دن کاموں میں جتی رہتی ہو۔" ان کے جانے کے بعد ذکیہ نے پیار سے رانیہ کو کہا۔ جو بڑی اماں کے سر میں مالش کر رہی تھی۔

"چچی! میرا دل نہیں چاہ رہا تھا۔"

"بڑی نیک بچی ہے۔ جب سے یہ آئی ہے۔ میری تو ساری فکریں ہی دور ہو گئیں۔ کیسے سارا بوجھ اٹھا لیا۔"

بڑی اماں کو ذکیہ کے منہ سے تعریف سن کر دلی خوشی ہوئی۔ جبکہ رانیہ سادگی سے کہہ رہی تھی۔

"بوجھ کیسا چچی! سارا دن فارغ رہ کر کرتی ہی کیا ہوتا ہے۔"

"رانیہ! یہ شرٹ کا بٹن تو لگا دو۔ اگر فارغ ہو تو۔" تیمور شرٹ اٹھائے اندر آیا۔

"جی فارغ ہو گئی۔ شرٹ رکھ دیں۔ میں ہاتھ دھو آؤں۔"

اور ہاتھ دھوتے ہوئے رانیہ کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ سب بھی اپنے کاموں کے لیے رانیہ ہی کو آواز دیتے تھے۔ مگر جب نبیلہ نے کہا تو دونوں بھائیوں کو کیسے غصہ آیا تھا۔ جب وہ لوگ واپس آئے تو اسفر کا موڈ خراب تھا۔ جبکہ نبیلہ اور رفیعہ خالہ خاصی خوش تھیں۔

ان کے ادھر ادھر ہونے کے بعد اسفر بتانے لگا۔

"سب سے پہلے ہوٹل کے چکنے فرش پر رفیعہ خالہ سنک گئیں۔ ہائے کیا منظر تھا۔ جب وہ چاروں شانے چت ہوٹل کی چھت کو گھور رہی تھیں۔ اب ان کو ہلانا ہم جیسے بندے کے بس کی بات کہاں تھی... دو بیرے بلوانے پڑے... دوسری محترمہ نے بیٹھتے ہوئے ایسی زور سے ٹیبل ہلائی۔ کہ اس پر رکھا کرسٹل کا گلاس۔ یہ نیچے۔"

اس کے بیان سے زیادہ اس کے انداز دلچسپ تھے۔ ہنستے ہنستے رانیہ کا برا حال ہو گیا۔ آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ تیمور نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ ورنہ وہ تو ہمیشہ لیے دیے انداز میں اور بے حد خاموش رہا کرتی تھی۔

"اس کی ہنسی کتنی کھنکدار ہے۔"

"بس کرو اسفر! اگر کسی نے سن لیا تو۔" وہ بمشکل بولی۔

"خدا کی قسم بھائی! آئندہ میں انہیں ساتھ لے کر نہیں جاؤں گا۔"

"کیا باتیں ہو رہی ہیں۔" نبیلہ ہاتھ منہ دھو کر آگئی۔

"کچھ نہیں کھانے کی تفصیل بتا رہا تھا۔" اسفر نے [illegible] رانیہ کی دوبارہ ہنسی چھوٹ گئی۔ تیمور مسکرا [illegible]

نبیلہ مشکوک نگاہوں سے سب کے چہرے دیکھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

باہر آسمان پر بادل تیزی سے اکٹھے ہو رہے تھے۔ غالب گمان تھا کہ یہ سیاہ گھٹائیں ضرور برسیں گی۔ بڑی اماں تھوڑی دیر قبل تیمور کے ساتھ اپنا چیک اپ کروا کر لوٹی تھیں۔ اب تیمور ان کی دوائیاں لینے گیا تھا۔

"بڑی اماں کچھ کھائیں گی؟" رانیہ نے آہستگی سے ان کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ کچھ نڈھال سی لگ رہی تھیں۔

"نہیں کچھ دیر لیٹوں گی۔"

رانیہ نے پلٹ کر بیگ سے وہ روپے نکالے جو آپا دے کر گئے تھے۔ تب ہی اسفر اندر آیا۔

"بڑی اماں! تھوڑی دیر کے لیے اپنا چھاتا ادھار دے دیں۔"

اور بڑی اماں۔ وہ تو ساری بیماری بھول بھال گویا بندوق تان کر کھڑی ہو گئیں۔

"خبردار! میرے چھاتے کی طرف دیکھا بھی تو...!"

"ارے۔ میں تو بس تھوڑی دیر کے لیے۔"

"ہاں خراب کر دو... یا توڑ پھوڑ دو تو۔" وہ ہاتھ نچا کر بولیں۔

"لیں... میں کوئی بچہ ہوں۔" وہ خفا ہو کر باہر نکلا۔ رانیہ اس کے پیچھے لپکی۔

"اسفر بھیا! برا مت مانو۔ بس اماں اس کے بارے میں بہت جذباتی ہیں۔ کسی کو بھی نہیں دیتیں۔"

"کیوں یہ کیا بڑے ابا کی نشانی ہے۔" وہ برآمدے کے کنارے روٹھا کھڑا تھا۔ صحن میں بارش برس رہی تھی۔

"نہیں۔ ان کے پوتے کی نشانی ہے۔ ہمارے چھوٹے چچا بہت پہلے دبئی چلے گئے تھے۔ شادی بھی وہیں کی۔ [illegible] چھتری بھول گئے تب سے اسی [illegible] ہیں۔ بارش ہو یا دھوپ اسے ساتھ لے کر گاؤں میں نکلتی ہیں۔ سنبھال سنبھال کر رکھتی ہیں کہ کبھی تو وہ واپس آئے گا اور اپنی چھتری مانگے گا۔"

"تو چچا پھر کبھی واپس نہیں آئے؟"

"نہیں۔ کچھ عرصہ تک خط وغیرہ آتے رہے۔ بڑی اماں کو پیسے بھی بھجواتے تھے۔ پھر سب بھول بھال گئے۔ سنا ہے خوش ہیں۔ اپنے بیوی بچوں میں مگن۔ ماں کبھی یاد ہی نہیں آئی۔"

"اوہ سوری۔ دراصل مجھے ٹیوشن کے لیے جانا ہے۔ لیکن اب لگتا ہے ارادہ ملتوی کرنا پڑے گا۔ بارش تیز ہو رہی ہے۔" وہ سیڑھیاں چڑھ گیا تو رانیہ شبیر احمد کے کمرے میں آگئی۔ جانتی تھی کہ وہ اس وقت کمرے میں تنہا ہوں گے۔

"آؤ... آؤ رانیہ بیٹی! اوں۔ خالی ہاتھ۔ بھئی میری چائے کہاں رہ گئی۔" خوش دلی سے گویا ہوئے۔

"اچھا ہے آگئی ہوں چچا جان! ابھی تو یہ دینے آئی تھی۔" اس نے نوٹوں کی طرف بڑھائی۔

"یہ کیا ہے؟" ان کے چہرے پر سنجیدگی در آئی۔

"بڑی اماں کے علاج کے لیے ابا نے کچھ رقم دی تھی۔"

"تو میں اس کا کیا کروں؟"

"انہوں نے کہا تھا کہ آپ ان سے نہیں لیں گے تو میں آپ کو دے دوں۔"

"جاؤ۔"

"جی؟" رانیہ نے حیرت سے چچا کو دیکھا۔ جو سخت غصے میں آگئے تھے۔

"ابھی اور اسی وقت یہاں سے چلی جاؤ۔"

"لیکن چچا! یہ۔"

"جاؤ۔" وہ دھاڑے۔ رانیہ نے بھاگنے میں عافیت جانی اور برآمدے میں تیمور سے ٹکرا گئی۔ وہ بھی بارش کی وجہ سے بھاگتے ہوئے برآمدے میں آیا تھا۔ رانیہ کے ساتھ ساتھ بمشکل دوائیاں سنبھالیں۔

"کچھ نہیں۔ وہ چچا جان بہت زور سے ڈانٹا تو میں۔" وہ خجل سی ہو کر دوپٹہ ٹھیک کرنے لگی۔

"ابو نے تمہیں کیوں ڈانٹا؟"

"کچھ نہیں۔ میں تو صرف یہ رقم انہیں دینے گئی تھی کہ اماں کے علاج پر لگا دیں۔"

"پھر تو ٹھیک ڈانٹا۔ یہ دوائیاں پکڑو۔"

"سنیں۔ تیمور بھائی! آپ یہ پیسے رکھ لیں۔ اتنی مہنگی دوائیاں آتی ہیں۔"

تیمور اس کی طرف جھکا۔

"سنو لڑکی! میں ابو سے زیادہ زور سے ڈانٹ سکتا ہوں۔ اس لیے فوراً" یہاں سے بھاگ لو۔"

اس نے ہاتھ پکڑ کر دوائیوں کا شاپر اسے تھمایا اور اندر چلا گیا۔ وہ متذبذب سی وہیں کھڑی رہی۔ پھر ہلکا سا مسکرا کر بڑی اماں کے پاس چلی گئی۔ اور کھڑکی سے رفیعہ خالہ نے سنا تو کچھ نہیں۔ ہاں دیکھا بہت کچھ۔

✡ ✡ ✡

"تو کیا! یہ تائی یہاں کیوں ڈیرے ڈالے بیٹھی ہیں۔" باداموں والا سست رنگا زردہ جو بطور خاص فرمائش کرکے بنوایا گیا تھا کھاتے کھاتے رفیعہ نے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔ ذکیہ پاس بیٹھی شملہ مرچ کاٹ رہی تھیں۔

"علاج کروانے آئی ہیں۔"

"اور یہ ان کی پوتی۔ رانیہ۔" انہوں نے یوں نام لیا گویا حلق میں کوئی کڑوا بادام آگیا ہو۔ اب کے ذکیہ نے ذرا حیرت سے بہن کو دیکھا۔

"ان کی دیکھ بھال کے لیے۔"

"ہا۔۔۔ ہا۔۔۔" وہ یوں ہنسیں کہ پورا تخت ہل ہل گیا۔ ذکیہ کو ٹوکری کے ساتھ ساتھ خود کو بھی سنبھالنا پڑا۔۔۔ ایک شملہ مرچ پھدکی اور دور تک لڑھکتی چلی گئی۔ فیشن میگزین پڑھتی نبیلہ نے ناگواری سے ماں کو دیکھا۔

"امی اب بریک بھی لگاؤ۔"

"اللہ بخشے ہماری ماں ٹھیک ہی کہتی تھیں۔ ہم پانچ بہنوں میں یہ ذکیہ اللہ میاں کی گائے ہے تو بچپن سے ہی ایسی بھولی ایک بدھو۔ جس کا دل چاہے ڈوری پکڑ کر گھما ڈالے۔ یہ گھوم جائے گی۔"

"پتا نہیں کیا بولے جارہی ہو۔ رفیعہ آپا! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" ذکیہ نے بے زاری سے دور شملہ مرچ کو یوں دیکھا۔ گویا وہ ان کے اشارے پر واپس چلی آئے گی۔

"ذکو! تمہیں سمجھ میں اسی وقت آئے گا جب پانی سر سے اونچا ہو جائے گا۔ وہ چھٹانک بھری چھوکری تمہاری آنکھوں میں دھول جھونک کر کیا کیا کھیل کھیل رہی ہے تو آنکھیں بند کرکے سوتی رہ۔ جوان لڑکوں والا گھر اور وہ یوں دندناتی پھر رہی ہے گویا تو نہیں۔ وہ اس گھر کی مالکن ہو۔"

اور نبیلہ بھی میگزین چھوڑ ماں کی شکل دیکھنے لگی۔

"جانے دیں آپا! وہ ایسی لڑکی نہیں۔ بڑی شرم والی بچی ہے اور یہ بھی تو دیکھو مجھے کتنا سکھ دے رہی ہے سارا دن گھر کے کام، کچن پکڑے۔۔۔"

"بس اسی جھانسے میں رہنا۔" وہ تلملا کر رہ گئیں۔

"ویسے۔ لڑکی تو اچھی ہے۔" ذکیہ کچھ سوچ کر مسکرائیں۔ "ساری زندگی کے لیے گھر کے کاموں سے جان چھوٹ جائے گی۔"

رفیعہ نے اس زور سے پلیٹ پٹخی کہ دو ٹکڑے ہوتے ہوتے بچی۔

"ہاں۔ پھر تو وہ تجھے پلنگ پر بٹھا کر ہی کھلائے گی۔ کیسی بے عقل ہے۔ تجھے نظر ہی نہیں آرہا اور میں نے ایک ہفتے میں دیکھ لیا یہاں ہو کیا رہا ہے۔ لڑکے ہیں تو رانیہ آپی۔ رانیہ آپی۔ شبیر احمد ہیں تو رانیہ بچی۔ چائے اس کے ہاتھ کی بنی۔ کھانا ماں کے ہاتھ کا بدمزا لگنے لگا ہے۔ کپڑوں کے لیے آواز اسی کو پڑتی ہے۔ اور تیمور وہ دفتر سے آتے ہی سیدھا بڑی اماں کے کمرے میں حاضری دیتا ہے۔ تو کہاں ہے؟ کن خیالوں میں ہے۔ وہ دن دور نہیں جب بیٹا ماں کے سامنے کھڑا ہو گیا اور ایک بار اس گھر میں آگئی۔ تو تجھے یوں کونے میں لگا دے گی۔ گویا وہ دیوار پر لگی تصویر۔ ہمارا کام تھا خبردار کرنا۔ آگے تو جان تیرا کام۔ سیانی مائیں ابھی بیٹوں کی شادی اپنی پسند سے کرتی ہیں۔ ورنہ سر پکڑ کر روتی ہیں۔"

ذکیہ ہکا بکا بہن کی شکل دیکھے گئیں۔

"ہاں ای آپا! بات تو آپ کی ٹھیک ہے۔ تیمور نے مجھ سے تو کبھی اچھی طرح بات بھی نہیں کی۔ اور اس سے یوں مسکرا مسکرا کر چیزیں مانگتے ہیں۔ اور وہ بھی ایسی میسنی ہے۔ آدھی رات تک کچن میں کھڑی رہتی ہے۔ پتا ہے تاب سے آخر میں تیمور نے آکر کھانا کھانا ہوتا ہے۔" نبیلہ کی آنکھ میں آنسو اتر آئے۔ رفیعہ نے جھٹ سے اسے بغل میں دبوچ لیا۔

"ہائے میری معصوم بچی! ایسی چالاکیاں تجھے تو نہ آئیں۔ کیسے کیسے ارمان تھے دل میں کہ تیمور تو میرا ہی بیٹا ہے۔ میری بہن ہے۔ میرا ہی احساس کرے گی۔ پر ٹھیک ہے۔ جیسے تیرے نصیب۔ وہ حامد یاد ہے۔ جس نے اپنی پسند کی شادی کی اور اس کی بیوی نے بیمار ماں کو۔۔۔!"

ایک کے بعد ایک قصہ۔ دونوں ماں بیٹی نے مل کر ذکیہ کو ہلا کر رکھ دیا۔ اور ذکیہ بیچ میں بھولی بلکہ بدھو تھیں۔ جس کا دل چاہے ڈوری پکڑ کر گھما دے۔ اور رفیعہ نے انہیں گھما ڈالا تھا۔

تھکے تھکے الجھے ذہن کے ساتھ وہ ٹوکری اٹھا کر کچن میں آئیں۔ جہاں رانیہ رات کے کھانے کے لیے قیمہ بھون رہی تھی۔ ساتھ ہی اسفر مگ میں کافی پھینٹ رہا تھا۔ دونوں کسی بات پر ہنس رہے تھے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" ذکیہ نے ٹوکری کاؤنٹر پر پٹخی۔

"امی! میں رانیہ کو کافی بنانا سکھا رہا ہوں۔"

"کیوں؟" سوال بے جواز تھا۔ رانیہ سبزی اٹھا کر دھونے لگی۔

"مستقبل میں بھی بنانا پڑ سکتی ہے۔" اسفر نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"ہوں۔" وہ ٹھٹکیں، پھر ٹھٹک گئیں۔ کافی اس گھر میں کون پیتا تھا۔

صرف تیمور۔۔۔

مستقبل میں کافی۔۔۔

ان کا سر زور زور سے چکرانے لگا۔

✡ ✡ ✡

بڑی اماں کی طبیعت رات سے خاصی خراب تھی۔ گھر میں نت نئے کھانے بنتے۔ وہ اپنا پرہیزی کھانا چھوڑ کر دسترخوان پر آموجود ہوتیں۔

"بڑی اماں! بس آج سے آپ کھانا اپنے کمرے میں کھائیں گی۔" رانیہ چڑ گئی تھی کہ اچھا بھلا ٹھیک ہوتے ہوتے پھر سے بیمار پڑ گئی تھیں۔

"تیری وہ پھیکی سی کھچڑی میرے حلق سے نہیں اترتی۔"

"تو آرام کیسے آئے گا؟"

"نہ آئے۔۔۔" وہ ننھے بچوں کی طرح رو دی تھیں۔

"ٹھیک ہے ابا کو فون کرتی ہوں۔ آج ہی ہمیں واپس لے جائیں۔ قائدہ علاج کروائے گا۔"

"آرام آگیا تو واپس جانا پڑے گا۔" رفیعہ

بیزار ہو گئیں۔ ذکیہ پہلو بدل کر رہ گئیں۔

"بڑی امی! باسط آپ کو دیکھنے آیا ہے۔" تیمور نے اندر آکر اطلاع دی۔

"ہاں۔ ہاں۔ بلالو۔ بڑا ہی نیک بچہ ہے۔"

"رانیہ! جب تک تم چائے بنالو۔" تیمور نے بنا اس کی طرف دیکھے کہا۔ ذکیہ نے فوراً" اٹھنے کی کوشش کی۔

"میں بناتی ہوں۔"

"نہیں امی! آپ بڑی اماں کے پاس بیٹھیں۔ رانیہ بنالے گی۔ ساتھ میں کچھ کھانے کو بھی۔" وہ نارمل سے انداز میں کہہ کر باہر نکل گیا۔ رفیعہ خوامخواہ کھنکارنے لگیں۔ ذکیہ نے سٹپٹا کر نبیلہ کو وہاں سے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بھی اٹھ کر کچن میں آگئی۔ رانیہ فریج کھول کر جائزہ لے رہی تھی۔

"کیا بنانے لگی ہو؟"

"دہی بڑے بنائے تھے۔ ساتھ میں کباب فرائی کر دیتی ہوں۔ کیا خیال ہے؟"

"میں نے تو ابھی چکھے بھی نہیں۔"

"بہت ہیں [illegible] لو۔ تم بھی تو مہمان ہی ہو۔"

"اور [illegible]" نبیلہ نے چبھتے ہوئے انداز میں پوچھا۔ رانیہ کو اس کا انداز محسوس تو ہوا مگر ہنس کر ٹال گئی۔ وہ ذکیہ چچی کی سگی بھانجی تھی۔

"ایک دن مہمان۔ دوسرے دن مہمان اور تیسرے دن۔ پنجابی کی کہاوت تو تم نے سنی ہی ہوگی۔"

"تمہارا یہاں دل لگ گیا ہے؟" نبیلہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"مجبوری ہے بہن۔! ورنہ اپنے گھر کی تو بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ اماں بہت یاد آنے لگی ہیں۔"

نبیلہ کو لگا۔ وہ اس کے سامنے بن رہی ہے۔ اس لیے طنزیہ سی ہنسی کے ساتھ دہی بھلے ایک بڑے باؤل میں نکالے اور باہر آگئی۔ رفیعہ ہانپتی کانپتی آکر تخت پر ڈھیر ہو گئیں۔ وہ ہمیشہ چلتی کم اور ہانپتی زیادہ تھیں۔

"شاباش لڑکی! وہ وہاں کچن میں اپنا سگھڑاپا دکھا رہی ہے اور تو پیالہ بھر بھلے کھا رہی۔ یہ نہیں کہ چائے ہی بنا دیتی۔"

"گزرتی رہے۔ اب چار دن یہاں آرام کرنے آئی ہوں یا کام؟"

"ہاں۔ وہاں تو کل جوتی تھیں۔"

"بڑے مزے کے ہیں۔ امی ٹیسٹ تو کرو۔" اس نے ماں کی بات کا برا نہ مانا۔

"ہاں کم بخت کے ہاتھ میں ذائقہ بہت ہے۔ یہ تمہارا ماموں کہاں ہے؟"

"چچا شفیع کے گھر گئے ہیں۔"

"اب وہاں بھی موٹر کھول کر بیٹھ گیا ہو گا۔ اس اجو کو بھی ذرا عقل نہیں۔ سارے خاندان کو مفت کا مکینک مل گیا۔ اب سارے کھا جائے گی؟"

"آپ کے لیے اور لے آتی ہوں۔" وہ کھڑی ہو گئی۔

دوسری طرف باسط حیرت سے پوچھ رہا تھا۔

"خیریت تو ہے تیمور! آج تمہارے گھر میں اتنی جلدی چائے اور وہ بھی لوازمات کے ساتھ۔"

"بکواس نہ کرو۔ تجھے تو پتا ہی ہے۔ امی بیمار رہتی ہیں۔ اب یہ رانیہ نے۔"

"او تو یہ سارا کمال کزن کی آمد کا ہے۔"

"میرا خیال ہے تمہیں عزت راس نہیں آئی۔" تیمور نے گھورا تو وہ شرافت سے چائے پینے لگا۔

☼ ☼ ☼

بڑی اماں کو پرہیزی کھانا کھلا کر دوا دی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اونگھنے لگیں تو رانیہ باہر نکل آئی۔ لمبی دوپہر کاٹے نہ کٹ رہی تھی۔ اپنا گھر شدت سے یاد آنے لگا۔ برآمدے میں اجو ماموں ٹی وی کھولے بیٹھے تھے۔

"تمہیں بھی دوپہر کو نیند نہیں آتی۔ کبھی ہم تو جوانی میں بہت سویا کرتے تھے۔"

وہ مسکرا کر استری اسٹینڈ کی طرف بڑھ گئی۔ جہاں دھلے کپڑوں کا ڈھیر رکھا تھا۔ اب فارغ بیٹھنے سے تو اچھا تھا۔ کپڑے استری کر دیتی۔ اجو ماموں سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ اپنا بچپن، اسکول کا زمانہ۔ اساتذہ کی

"ماموں! آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟" ذہن میں چھپا سوال زبان پر آگیا۔

"وہ نہیں مانی۔"

"کون؟"

"جس سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔" انہوں نے پیچ کس کان پر پھنسایا اور کپڑے سے ہاتھ صاف کرنے لگے۔

"یہ کب کی بات ہے؟"

"زمانے گزر گئے۔ تب میں سولہ سال کا لڑکا تھا۔ میٹرک کا اسٹوڈنٹ۔ پانچ سال تک رج کے عشق کیا اور جب شادی کی باری آئی تو اس نے اسی لڑکے کے بڑے بھائی سے شادی رچالی۔ جس کے ہاتھ میں اسے خط اور تحفے بھجوایا کرتا تھا۔ اور صاف مکر گئی کہ زندگی میں اس نے مجھ سے محبت بھی کی تھی۔ بس دل ٹوٹ گیا۔"

"اچھا۔" رانیہ کسی سوچ میں ڈوبی۔ "تو کیا محبت اپنی زندگی برباد کرنے کا نام ہے۔"

"ہونہہ! فضول باتیں مت کرو۔" انہوں نے [illegible] کہ تمہاری دادی کو بھنک بھی پڑ گئی کہ میں تمہیں یہ سب بتا رہا ہوں۔ تو رہے سہے بال بھی اتار دیں گی۔ جوان لڑکیوں کو ایسی باتوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔"

"خود چاہے سولہ برس کی عمر میں عشق کیا ہو۔" رانیہ نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔ ان کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری تو انگلی اٹھا کے تنبیہا" بولے۔

"فضول باتیں مت کرو۔" ٹی وی کا انجر پنجر اس کے اندر ڈال کر بند کیا اور کندھے پر رکھے اندر چلے گئے۔ پیچھے صرف ان کی گنگناہٹ رہ گئی۔

"شب غم مجھ سے مل کر ایسے روئی۔"

"یہ بھی خوب انسان ہیں۔" وہ اپنے کام میں مگن ہو گئی۔ چاچا اور چاچی کے کپڑے پریس کر کے تہہ لگائی۔ پھر شرٹس استری کرنے لگی تب ہی نبیلہ کمرے سے آنکھیں ملتے ہوئے برآمد ہوئی۔

اسے دیکھا تو جھنجلا گئی۔

"تم ہر وقت کام ہی کرتی رہتی ہو۔"

"تو اور کیا کروں۔" رانیہ نے سادگی سے پوچھا۔

"کپڑے استری کر رہی ہو۔"

"نہیں کھانا بنا رہی ہوں۔" رانیہ کو اس کے بے تکے سوال پر ہنسی آگئی۔

"اس میں ہنسی کی کیا بات ہے۔" نبیلہ کو برا لگا پھر پوچھنے لگی۔ "یہ شرٹ تیمور کی ہے؟" رانیہ نے غور سے کاسنی شرٹ کو دیکھا۔ پھر کندھے اچکا دیے۔

"پتا نہیں۔"

"اتنی معصوم تو نہیں ہو۔"

"ہاں اس سے زیادہ ہوں۔"

"اب یہ کپڑے الماری میں رکھنے جاؤ گی۔ آج چھٹی ہے اور تیمور اپنے کمرے میں ہی ہے۔"

رانیہ نے ایک پل کو نبیلہ کی بات کے مفہوم پر اچھی طرح غور کیا۔ پھر اپنے غصے کو دبا کر کھڑی ہوئی۔ استری بند کی اور اطمینان سے بولی۔

[illegible] نے کیے ہیں۔"

"ہونہہ۔ کتنی تیز ہے۔ مجھے کیا ضرورت ہے ایسے جتن کرنے کی۔ تیمور میرا ہے اور میرا ہی رہے گا۔" نبیلہ اس کے جانے کے بعد تک بڑبڑاتی رہی۔ نبیل نے حیرت سے اسے دیکھا اور ہمدردی سے پوچھا۔

"ہواؤں سے کیوں لڑ رہی ہو آپی؟"

"ہونہہ! مجھے کیا ضرورت ہے کسی سے لڑنے کی۔" وہ تنک کر بولی تب ہی نبیل کی نگاہ استری شدہ کپڑوں پر پڑی۔

"یہ سب آپ نے کیا ہے؟"

نبیلہ نے ایک نظر تہہ شدہ کپڑوں پر ڈالی پھر ڈھٹائی سے بولی۔

"ہاں۔"

✡ ✡ ✡

"یہ موٹی بھینس اور چھوٹی بلی واپس کب جائیں گی۔" برے برے منہ بنا کر لیے کھاتی بڑی اماں نے اچانک سوال کیا۔ رانیہ کا منہ کھل گیا۔ پھر سمجھ میں آیا تو کھل کر ہنسی۔

"آپ بھی نا!"

"زہر لگتی ہیں دونوں۔ ویسے بھی ان کے ارادے ٹھیک نہیں۔"

"کیوں' ڈاکہ ڈالنے کا ارادہ ہے کیا؟" رانیہ نے رازداری سے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ ذکیہ کے بیٹے پر۔"

"چلیں۔۔۔ ہمیں کیا۔" رانیہ چوٹی کھول کر بالوں میں برش کرنے لگی۔

"ہمیں کیوں نہیں۔ میں نے تو کئی بار سوچا ہے۔" کچھ کہتے کہتے بات لبوں میں دبا گئیں اور آئینے میں منعکس ہوتا رانیہ کا عکس دیکھنے لگیں۔

"ماشاء اللہ' کیسی نکھرتی جارہی ہے۔"

وہ اسے کسی اور جہنے کسی اور روپ میں دیکھ رہی تھیں۔ رانیہ بالوں کی چوٹی بنانے لگی تو بے اختیار بولیں۔

"کبھی کبھی بالوں کو دو بھی لگالیا کر۔ کیچر"

"ارے۔۔۔ آپ ہی تو کہتی ہیں اس سے بال خراب ہوتے ہیں۔"

رانیہ نے کہا تو وہ چپ سی ہو گئیں۔ دوسری طرف ذکیہ تیمور سے پیسے مانگ رہی تھیں۔

"تمہاری خالہ نے پرسوں واپس چلے جانا ہے۔ سوچتی ہوں نبیلہ کو دو سوٹ لے دوں۔ وہ بھی تم سب کے کپڑے لائی ہیں۔"

"ان کی کون سا جیب سے پیسے خرچ ہوتے ہیں۔ اعجاز میاں جو ہیں چلتے پھرتے بینک۔" شبیر احمد نے اخبار سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

"ہاں تو اعجاز کے کون سا آل اولاد ہے۔ بھانجے بھانجیوں پر ہی خرچ کرے گا' برا پیسہ ہے میرے بھائی کے پاس' خاندان میں جس کو ضرورت ہو اسی سے ادھار مانگتا ہے۔" ذکیہ کے لہجے میں تفاخر آیا۔

"ہاں جو کبھی واپس نہیں ہوتے۔" وہ بڑبڑائے۔

"تو آپ کو کوئی مسئلہ ہے؟" وہ چڑ گئیں۔

"زیادہ خود غرضی بھی اچھی نہیں ہوتی۔"

"تیمور!" وہ تلملا کر تیمور کی طرف پلٹیں۔

"لے لیں امی' صبح دے دوں گا۔"

"ایک سوٹ رانیہ اور ایک بڑی اماں کے لیے بھی لے آنا۔" شبیر احمد نے اخبار کا صفحہ پلٹتے ہوئے کہا۔

"لے آؤں گی' وہ جانے کا نام تو لیں۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائیں۔

✡ ✡ ✡

وہ چائے بنانے کے لیے نکلی تو برآمدے کے آخر میں ٹھٹک کر رکی۔ اوپر بنا چاند اور چاندنی کے سیاہ رات بجتی تھی' اور وہ چارپائی پر دراز دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے ہوئے گنگنا رہے تھے' ان کی رو' رو کر ابھری گنگناہٹ اس رات کی اداسی و تنہائی میں اضافہ کر رہی تھی۔

"دشت ہجراں میں سایہ نہ صدا تیرے بعد
کتنے تنہا ہیں ترے آبلہ پا تیرے بعد

لب پہ اک حرف طلب تھا' نہ رہا تیرے بعد
دل میں تاثیر کی خواہش' نہ دعا تیرے بعد"

رانیہ کو وہ بے حد تنہا' اداس اور بے چین لگے' وہ آہستگی سے چلتی ان کے قریب آگئی۔

"ماموں!"

ان کی گنگناہٹ نے دم توڑ دیا۔

"چائے لاؤں؟"

"نبیلہ سے کہا تو تھا۔" انہوں نے ٹوپی منہ پر کھینچ لی' نہ جانے کیوں رانیہ کو شک ہوا' ان کی آنکھیں سرخ تھیں۔

"نبیلہ تو۔۔۔" رانیہ کچھ کہتے کہتے رک گئی' نبیلہ اکثر ماموں کی فرمائش یونہی نظر انداز کر کے کہہ دیتی۔ "میں

بھول گئی تھی۔"

"یا وہ لڑکی!" وہ اس کی ادھوری بات جان گئے تب ہی لہجے میں تھکن سی ابھر آئی۔

رانیہ کچن میں چلی آئی' پھر سوچا باقی سب سے بھی پوچھ لے' رفیعہ' ذکیہ اور نبیلہ لاؤنج میں تھیں اور رفیعہ کہہ رہی تھیں۔

"بس تم کسی بھی بہانے کچھ دنوں کے لیے اجو کو یہاں روک لو' اتنے میں' میں اس چنڈال کا کچھ کرتی ہوں۔"

لاشعوری طور پر رانیہ ٹھہر گئی۔

"پر۔۔۔ آپا! اب اجو کا گھر بس جائے تو اس میں حرج کیا ہے؟"

"ہائے نہیں' پھر تو ہمیں ماموں کا گھر خالی کر کے اپنے گھر جانا پڑے گا' اور وہ گھر کتنا چھوٹا ہے۔" نبیلہ تڑپ کر سیدھی ہوئی۔

"تو۔۔۔ تو چپ کر۔۔۔ اب اس عمر میں گھر بسائے گا' جب ہم زور لگا رہے تھے تب تو مانا نہیں۔"

"اب وہ کرنا چاہتا ہے تو آپا تم کیسے روکو گی؟"

"وہ ہاں' [illegible] ساتھ والے [illegible] اب اجو پر نظر ہے۔ اکثر کچھ نہ کچھ پکا کر بھجواتی ہے' تم اعجاز کو یہاں روکو' میں اس کا کوئی نہ کوئی بندوبست کرلوں گی۔"

اگلے دس منٹ کی گفتگو میں رانیہ کو ان کی سوچ اور ذہنیت پر افسوس ہونے لگا' وہی روایتی' خود غرضانہ باتیں کہ اس کی بیوی کے آنے پر ان ساری مراعات سے محروم ہونا پڑے گا۔ جن سے رفیعہ اور ان کے دیگر بہن بھائی فائدہ اٹھا رہے تھے۔ وہ چپکے سے پلٹی' ان کے لیے چائے بنا کر آئی تو ماموں اب بھی اسی پوزیشن میں گنگنا رہے تھے اور تیمور واش بیسن پر ہاتھ منہ دھو رہا تھا۔

میری روح میں جو اتر سکیں' وہ محبتیں مجھے چاہئیں
جو سراب ہوں نہ عذاب ہوں' وہ رفاقتیں مجھے چاہئیں

"ماموں! چائے۔"

"آ۔۔۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئے' پیالی اس کے ہاتھ سے سنبھالی۔

"تم اچھی لڑکی ہو۔"

"شکریہ۔" اس نے بالوں کی لٹ کو کانوں کے پیچھے اڑسا۔ "ایک بات کہوں؟" چائے کی چسکی لیتے ماموں نے ایک سوالیہ نظر اس پر ڈال کر اجازت دی۔

"اگر دل میں نئی رفاقتوں کی خواہش پیدا ہوئی ہے تو اب اس سے دست بردار مت ہوں۔ اپنے لیے خود سوچیں۔ کبھی کبھی ہمارے بہت اپنے' خود غرض ہو جاتے ہیں۔ ہمارے بارے میں درست فیصلہ نہیں کرپاتے۔ سو اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھیں۔ بچی محبت گزرے زمانے کو بھول جائیں۔ یوں بھی آپ کی محبت کسی مزار پر بیٹھ کر محبوب کا نام جپنے والی نہیں۔ وہ اپنی زندگی شروع کرچکیں' آپ اپنی زندگی شروع کریں' سیانے کہتے ہیں ہمسفر کے بغیر جوانی کٹ سکتی ہے' بڑھاپا نہیں۔"

ماموں کی چائے ہاتھ میں ہی ٹھنڈی ہو گئی۔

تیمور نے اک خوشگوار سی حیرت کے ساتھ تولیہ کھینچ کر چہرہ صاف کیا۔

"چھوٹے لوگ کہتے ہیں' مگر اچھا بول لیتے ہیں۔"

دوپٹے کی بکل میں چھپی سادہ سی لڑکی کو اس رات تیمور نے بلاارادہ کئی بار سوچا تھا۔

✡ ✡ ✡

ماموں اعجاز جاتے ہوئے بڑی اماں سے ملنے آئے' رانیہ وہیں بیٹھی اماں کے کپڑے تہہ لگارہی تھی' انہوں نے انگلی اٹھا کر تنبیہاً کہا۔

"بڑوں کو نصیحت نہیں کرتے۔"

"سوری ماموں!" اس نے شرمندگی سے سر جھکا دیا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھا اور کھوئے کھوئے لہجے میں بولے۔

"بہت سے لوگ بہت کچھ کہتے ہیں' مگر وہ باتیں یونہی سر سے گزر جاتی ہیں' لیکن کبھی کبھی وہی بات سیدھی دل میں اتر جاتی ہے' یہ اس لمحے کا اعجاز ہوتا ہے

پا کہنے والے کے خلوص کا اثر ہے بہر حال اللہ تمہارے نصیب اچھے کرے۔"

وہ ذکیہ کے لاکھ روکنے پر بھی نہیں رکے تھے اور اس وقت رفیعہ بری طرح جھنجلائیں جب انہوں نے کہا۔

"ان شاء اللہ! جلد ہی آپ سب کو بلاؤں گا۔"

اور جاتے جاتے انہوں نے ایک بات تیمور کے کان میں بھی کہی تھی۔

"تم نے شادی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

"ابھی تو کچھ نہیں۔"

"جب بھی سوچنا اس لڑکی کو ذہن میں رکھنا۔ تمہارے گھر کو جنت بنادے گی۔"

تیمور نے ان کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔ رانیہ، رفیعہ خالہ سے مل رہی تھی۔ وہ ماموں کی طرف پلٹا، وہ مسکرائے اور باہر نکل گئے۔

اس رات تیمور نے کھل کر رانیہ کے بارے میں سوچا۔ اس کے ذہن میں اپنی شریک حیات کے بارے میں صرف اتنا ہی تصور تھا کہ کوئی ایسی لڑکی ہو جو ہر قسم کے حالات میں اس کا ساتھ دے سکے۔ اس نے زندگی میں بہت برے حالات دیکھے تھے اور جھیلے بھی۔ وہ ایسی لڑکی جو تنگی و فراخی میں اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلے۔ اس کے گھر کو پرسکون رکھے۔ باقی تعلیم، شکل و صورت، امارت کے بارے میں اس نے کبھی کچھ نہ سوچا تھا۔

"تو ایسی لڑکی، رانیہ کے سوا اور کون ہو سکتی ہے؟"

دل نے چپکے سے فیصلہ دے دیا تھا۔



سارا مسئلہ ٹائمنگ کا تھا یا قسمت کا۔ صحیح بات غلط وقت پر ہو جانے سے بھی بات ہلکی پڑ جاتی ہے، سب گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ ابھی تو رفیعہ خالہ کی باتوں کی گونج ان کے کانوں میں تھی کہ تیمور نے چپکے سے ماں سے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔

اولاد اپنی ماں سے ہی کہہ سکتی ہے۔ مگر نہ جانے کیوں مائیں ہی اس موقع پر اولاد کی دشمن ہو جاتی ہیں۔ حالانکہ تیمور نے یہ فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر صرف اپنے لیے نہیں بلکہ اس پورے گھر کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر کیا تھا۔

معاملہ صرف دل کا نہ تھا۔

مگر ذکیہ حیرت سے یوں بیٹے کا منہ دیکھنے لگیں گویا اس کی دماغی حالت پر شبہ ہو۔

(گویا رفیعہ ٹھیک کہہ گئی تھیں، میری ہی آنکھوں پر پٹی بندھی تھی۔) دماغ میں کھٹ ہوئی۔

"تم پاگل ہو گئے ہو؟"

تیمور نے تعجب سے ماں کو دیکھا۔

"وہ لڑکی کسی بھی طرح تمہارے قابل نہیں۔" وہ اضطراری انداز میں آلو کے موٹے موٹے چھلکے اتارنے لگیں۔

"وہ کیسے؟" اس نے تحمل سے دریافت کیا۔

"تمہیں اس میں نظر کیا آیا ہے، جاہل، گنوار، اللہ جانے ایف اے بھی کیا ہے یا نہیں، اور تم اعلا تعلیم، اچھی ملازمت، تمہیں تو کوئی بھی اچھی لڑکی مل جائے گی۔"

"رانیہ اچھی لڑکی نہیں ہے؟ اماں تو آپ ہر وقت رانیہ کی تعریف میں رطب اللسان رہتی تھیں اور اب...؟"

"ہیں۔ وہ تمہاری بیوی کی حیثیت سے مجھے قبول نہیں، اس کی تعلیم۔" وہ محض اسے چپ کروانے کے لیے لولے لنگڑے عذر تراش رہی تھیں۔

"امی! مجھے ڈگریوں سے کیا لینا، وہ سلیقہ مند ہے، گھر ہے، گھر سنبھالنا جانتی ہے، پھر اتنی خدمت گزار...!"

تیمور کو سرے سے اعتراض کی وجہ ہی نظر نہ آئی تھی۔ گھر والوں کا رویہ عجیب و غریب تھا۔ اس کی توقع کے برعکس۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اک خوبرو نوجوان تھا۔ خوب صورت، امیر گھرانوں کی لڑکیوں کے رشتے گھر بیٹھے آرہے تھے، مگر صرف خوب صورتی اور امارت نہیں چاہیے تھی۔ اسے صرف گھر کا سکون

اور شاید رانیہ کی شکل میں نظر آرہا تھا۔

(آدمی) نہیں آگے پیچھے پھرتی ہے کم بخت۔ خوب ہے، کہاں کس کس بندے کو کیسے پھنساتا ہے۔ بس آگے پیچھے گھوم کر باتیں بنانی، پھر ساری عمر کے مزے، یہ گر بنائے کام میں مصروف رہنا، شرم و حیا کے مظاہرے، مزے دار کھانے، پتا تھا اس کو کیسے الو بنانا ہے، اور یہ بن گیا، یہ شریف زادیوں کے چلن ہیں؟"

تیمور خاموشی سے ماں کا چہرہ پڑھ رہا تھا، جو بے سوچے اور شور سے آلو کاٹے جارہی تھیں۔ مگر ماتھے کی تیوریوں میں مرتے لکھی تھی پھر وہ بڑبڑائیں۔

"میں بھی بے وقوف، جوان جہان لڑکوں میں اسے کھلا چھوڑ کر خود لاپروا ہو گئی۔ آج ہی چلتا کرتی ہوں اس بڑی بی کو۔"

"فار گاڈ سیک امی!" وہ جھنجلا کر کھڑا ہوا۔ اس کی ایک ایک حرکت سے اضطراب مترشح تھا۔ "میں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا ہے اور آپ ہیں کہ..." اس کا چہرہ ضبط سے سرخ ہو رہا تھا۔

"دیکھو لڑکے! اگر اسے اس گھر میں بسانا ہے تو مجھے [illegible] دو۔" ذکیہ نے غصے سے چھری ٹوکری میں [illegible] وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ رانیہ کو آتے دیکھ کر لب بھینچ گیا۔ وہ اپنی ہی رو میں آگے بڑھتی آئی لاپروا، انجان سا انداز۔

"لائیں چچی! ہانڈی بنالوں۔" اس نے تو معمول کے انداز میں ٹوکری اٹھانا چاہی، ذکیہ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور درشت لہجے میں بولیں۔

"رہنے دو، میں خود ہی بنالوں گی۔"

مارے خفت کے رانیہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ تیمور تیزی سے پلٹا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ رانیہ بھی خود پر قابو پاتی کمرے میں چلی گئی۔

"دیکھ رہی ہوں اس کے تیور، ابھی سے ماں کو آنکھیں دکھا رہا ہے، اس چڑیل کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ مجھے تو یہ گھر سے ہی نکلوا دے گی۔ ہائے اللہ! میں کیا کروں۔"

وہ منہ پر دوپٹہ رکھ کر پھپک پھپک کر رونے لگیں۔

طویل دو رویہ درختوں کی قطار میں وہ دونوں ہم قدم تھے۔ ڈھلتی ہوئی خوشگوار شام جس کے نارنجی پن میں سرمئی رنگ گھلنے لگا تھا۔

"اب کیا سوچنے لگے؟" باسط نے اپنے اور تیمور کے درمیان چھائی طویل خاموشی کو بے حد اکتا کر توڑا۔

"تم بتاؤ باسط! کیا میرا فیصلہ غلط تھا؟"

"نہیں، لڑکی تو ٹھیک ٹھاک تھی، پر یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں، تجھے رانیہ سے اچھی لڑکیاں مل سکتی ہیں۔" وہ لاپروا انداز میں گویا ہوا۔

"باسط! میں جانتا ہوں، مگر میں نے اسے دیکھا ہے، اس کا سلیقہ، طریقہ، گھر کو سجانے کا شوق، بزرگوں کی خدمت کا جذبہ، وہ کم بولتی ہے، مگر اچھا بولتی ہے۔ اس نے چند جملوں میں ابو بھیا کو چت کر دیا اور وہ کہتے تھے۔ "تیمور اس لڑکی کو جانے مت دینا، یہ اس گھر کو بنا دے گی۔ تم سب کو جوڑ کر رکھے گی۔" مگر یہ اتنی ساری خوبیاں امی کو نظر نہیں آرہیں۔"

"ہو سکتا ہے وہ [illegible] کو [illegible] کی خوبیاں ہوں۔ رانیہ کی کم تعلیم [illegible]"

"ایک بات بتاؤ، تم اور تم جس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، وہاں بیویاں سوشل سرکل میں موو کرتی ہیں؟" تیمور ٹھہر گیا تھا۔

"تو؟"

"تمہاری ماں نے پیٹ کاٹ کر تمہیں ڈاکٹر بنایا ہے۔ تم نہیں چاہو گے کوئی ایسی لڑکی آئے کہ ان کا بڑھاپا سنور جائے؟"

"یار! اب تو چاہتا کیا ہے؟"

"باسط! میں نے اپنے گھر میں شروع سے ہی بہت ابتری دیکھی ہے۔ امی کی شادی چھوٹی عمر میں ہوئی تھی۔ وہ الھڑپن ساری زندگی کے پھوہڑپن میں بدل گیا۔ وہ سلیقہ، وہ طریقہ، جو تمہارے اور طارق کے گھر میں دکھائی دیتا تھا، مجھے کبھی اپنے گھر میں دکھائی نہیں دیا۔ تمہاری امی ایک ہی وقت میں کئی چیزیں جھٹ

یہ بنا کر چائے کے ساتھ سرو کرتیں۔ طارق کی ممی نے بہت کچھ بنا کر فریز کر رکھا ہوتا اور ہمیں ہمیشہ بازار بھاگنا پڑتا یا ابو اک طویل عرصے سے چائے کے ساتھ وہ سلائس نگل کر آفس سدھارتے۔ کوئل تو امی کی صبح آنکھ ہی نہ کھلتی اور جو کبھی کھل جاتی تو ناشتا بنتے بنتے وہ وقت آجاتا کہ ابو آفس سے لیٹ ہوتے اور ہم اسکول و کالج سے، ہمارے یونیفارم مڑے تڑے واشنگ مشین میں پڑے ہوتے اور بعض اوقات یونہی ان پر استری پھیر کر ہمیں تھما دیا جاتا۔ یار! میں نے بہت بچپن میں فیصلہ کر لیا تھا کہ میری بیوی میں اور کچھ ہو نہ ہو سگھڑاپا ضرور ہوگا۔"

"لے بڑے اونچے عزائم تھے۔ لوگ بچپن میں ڈاکٹر، انجینئر بننے کے خواب دیکھتے ہیں، یہ سگھڑ بیوی کے خواب دیکھ رہا تھا۔"

"بکواس بند کر۔" تیمور کے پنچ نے اس کے قہقہے کا گلا گھونٹ دیا۔

"یار! میری جان کیوں کھا رہے ہو، انکل سے بات کرو۔"

"کرچکا ہوں۔" تیمور نے اک جھٹکے سے بال نوچ ڈالے۔ شبیر احمد کا رویہ یاد آیا۔ وہ کچھ لمحے حیرت سے اس کی شکل دیکھتے رہے، پھر مبہم سا مسکرا دیے۔

"ہاں! وہ اچھی لڑکی ہے، میری بھتیجی ہے، پر اب اسے بھول جاؤ۔"

تیمور کو یہ سمجھ میں نہ آیا کہ اس کی ایک معقول سی بات کے جواب میں سب کا ردعمل ایسا کیوں ہے؟ شبیر احمد اس کی نگاہوں میں پنہاں سوال پڑھ گئے۔

"اپنی ماں کی مرضی کے خلاف اسے لاؤ گے تو اس گھر میں بھی سکون نہیں ہوگا۔ تمہیں چاہیے تھا رانیہ کے جانے کے بعد مجھ سے بات کرتے، میں کسی طریقے سے رشتہ کروا دیتا، بیچ میں تم آتے ہی نا اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

گویا تیمور کی پسندیدگی اس کا جرم بن گئی۔ بہت سے سوال، بہت سے دلائل، مگر باپ نے خاموش کروا دیا۔

"میں اس گھر میں اک طویل جنگ کا متحمل نہیں ہو سکتا، نبیلہ بھی اچھی بچی ہے، بس تمہاری ماں کی بھانجی ہے اور کچھ اسی کی خصوصیات کی حامل ہے۔"

"یار! کتنی عجیب بات ہے، یہ والدین اپنے بچے کی پسند کی ہر چیز دلاتے ہیں، کپڑے، جوتے، کھانا، کتابیں اور جہاں بات پسند کی لڑکی کی آتی ہے، وہیں آنکھیں ماتھے پر رکھ لیتے ہیں، اجنبی بن جاتے ہیں، صرف اس خوف سے کہ یہ لڑکی ان کے بیٹے کو لے اڑے گی، ہمیں پس پشت ڈال دے گی، اس بات کی کیا گارنٹی کہ دوسری لڑکی یہ سب نہیں کرے گی۔"

"یہ سب سطحی باتیں ہیں۔" باسط نے لاپروائی سے ہاتھ ہلایا۔ "جہاں یہ سب ہوتا ہے، وہاں لڑکی میں نہیں، کمی لڑکے میں ہوتی ہے۔ اچھا ایک بات بتا تیمور! دنیا میں ایک رانیہ ہی تو سگھڑ اور سلیقہ مند لڑکی نہیں۔"

باسط کا لہجہ معنی خیز تھا۔ تیمور نے کچھ لمحے خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھا۔ پھر آہستگی سے گویا ہوا۔

"تم نے کبھی دسمبر کی راتوں پر محیط چاندنی کو دیکھا ہے۔ تاریکی کو چیرتی، خوب صورت، اجلی، معطر اور کنواری، اَن چھوئی [illegible] ایسی ہی لگتی ہے۔"

باسط دم بخود سا اسے دیکھے گیا۔

☆ ☆ ☆

"کیا بات ہے رانی! بہت چپ چپ ہے؟"

وہ کب سے کھڑکی میں کھڑی باہر خالی صحن کو دیکھے جا رہی تھی۔ بڑی اماں سے رہا نہ گیا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی بند کر دی۔

"آج گھر کے کسی کام کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔" انہوں نے مشکوک نگاہوں سے اس کے چہرے کے تاثرات جانچے۔

"دل نہیں چاہ رہا۔" وہ حد درجہ بے زار تھی۔

"بڑی اماں! واپس چلیں، جب ڈاکٹر کہے گا ہم چیک اپ کے لیے آجائیں گے۔"

"ہاں چلے چلیں گے، اب اس بڑھاپے میں روز روز دھکوں کے دھکے نہیں کھائے جاتے۔"

ان کا پیار اور ساتھ نہ ٹالنے والا تھا۔ نبیلہ کی باتیں چچی نے [illegible] رانیہ وہ کچھ سوچ اور سمجھ رہی تھی، پھر رفیعہ بھی تک رہیں۔ رانیہ کو ان کی ٹٹولتی نگاہوں سے الجھن سی ہوتی رہی، مگر اب چھٹی حس کہتی تھی، رانیہ بی بی یہاں سے چلنے کی تیاری کرو ورنہ بات کردار تک جائے گی۔

"تمہارا دل نہیں لگ رہا، نبیلہ بھی تو چلی گئی۔" انہوں نے پیار سے پوتی کو دیکھا، وہ اس کے مستقبل کے بارے میں بہت پُرامید تھیں۔ اب تو سوچ لیا تھا شبیر احمد سے اشارے کنائے میں خود ہی بات کرلیں گی۔

"اب کدھر؟"

"ابا کو فون کرنا ہے؟" وہ مزید کوئی بھی بات سنے بغیر باہر نکل گئی۔

فون فارغ نہ تھا، ذکیہ چچی مصروف تھیں۔ وہ ان کی پشت کی طرف کھڑی انتظار کرنے لگی۔

"ہاں، ہاں! تم سچ آتی ہو، وہ میرے ہی لڑکے کو پھانسنے کے چکر میں تھی۔"

"یا اللہ! یہ لڑکی اور ان کو بھی کیسی کیسی خوش خیالیاں لاحق ہوتی ہیں، اب نہ جانے کس کی بات ہو رہی ہے۔" رانیہ نے استہزائیہ انداز میں سوچا۔

"تم فکر نہ کرو، میں اور شبیر احمد کچھ دنوں تک آئیں گے، تم سے نبیلہ کی بات کرنے، تیمور کی کیا جرأت۔"

"رہنے دو اس دادی پوتی کو تو میں آج ہی چلتا کروں گی، بہت تماشے دیکھ لیے، میری نظروں کے سامنے سارے کھیل ہوتے رہے اور میں ہی انجان رہی۔"

رانیہ کو لگا وہ آسمان سے زمین پر آ گری ہے۔

"ساری زندگی گاؤں میں اپلے تھوپ کر شہر میں بسنے کے خواب دیکھ رہی ہے۔ میں کیا پاگل ہوں، جو اپنے ایسے شان دار بیٹے کے لیے کوڑا کرکٹ اکٹھا کر لوں۔"

مزید کچھ بھی سننے کی تاب نہ تھی۔ وہ خود کو گھسیٹتی ہوئی کمرے تک آئی۔

"کیا ہوا؟" بڑی اماں اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گئیں۔ کانپتا جسم، زرد رنگت، وہ ان کی گود میں سر رکھ کر پھپک پھپک کر رو دی۔

"رانی، رانو کیا ہوا؟"

"واپس چلیں، بڑی اماں، آج ابھی...؟"

"کسی نے کچھ کہہ دیا۔"

"بس تیاری کریں؟" وہ بے دردی سے چہرہ رگڑتی تھی اور الماری کے اندر سے اپنا بیگ نکال کر تیزی سے چیزیں سمیٹنے لگی۔ جب ذکیہ آئیں، وہ سامان سمیٹ کر زپ لگا رہی تھی۔ ان کی طرف سے رخ موڑ لیا۔

"کیا ہوا؟" انہوں نے تحیر سے منظر دیکھا۔

"کچھ نہیں، واپسی کی ضد کر رہی ہے۔"

"اچھا، اچھا۔" ان کی خوشی چھپائے نہ چھپی، سانپ بھی مر گیا، لاٹھی بھی نہ ٹوٹی، منہ سے کچھ بھی نہ کہنا پڑا۔

"ہاں بڑے دن رہ لیا۔" بڑی اماں کا لہجہ بجھا بجھا سا تھا۔

"آپ اور رانیہ کے دم سے کتنی رونق ہو گئی۔ رانیہ نے تو میرا سارا بوجھ ہی اٹھا لیا تھا۔ اب پھر سے وہی تنہائی۔" انہوں نے چہرے اور لہجے میں زبردستی اداسی سمونے کی کوشش کی۔

"ہاں تو بہو لے آ، ساری تنہائی دور ہو جائے گی۔" بڑی اماں پھر سے پرجوش ہو گئیں، رانیہ نچلا لب چبانے لگی۔

"اب یہی کروں گی۔"

"دیکھی کوئی لڑکی؟" انہوں نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔

"بڑی اماں! شام گہری ہو جائے گی، ہمیں ابھی نکلنا چاہیے۔" رانیہ نے تیزی سے ان کی بات قطع کی۔

"گاؤں میں پیسے لگے ہیں؟ شبیر احمد سے مل کر ہی جاؤں گی۔" انہوں نے بری طرح گھورا۔

"آپ کو نبیلہ کیسی لگی؟ مجھے تو بہت پسند ہے، پھر

"ہم دونوں بہنوں کی بہت پہلے سے خواہش تھی۔"

بڑی اماں نے حیرت سے ذکیہ کی شکل دیکھی۔ جو نبیلہ کی تعریف میں رطب اللسان تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس جہیز کی تفصیل بتانے لگیں جو نبیلہ ان کے گھر لانے والی تھی۔

بڑی اماں نے آہستگی سے سر اٹھا کر رانیہ کو دیکھا۔

"ہاں اچھی ہے' اللہ مبارک کرے' رانیہ تم ٹھیک کہتی ہو' شام گہری ہو جائے گی۔ ہمیں ابھی نکلنا چاہیے۔"

ذکیہ نے رسمی طور پر انہیں روکا اور ان کے جانے کے بعد ہاتھ جھاڑ کر بولیں۔

"خس کم جہاں پاک۔" اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

★★★

تیمور خاصی دیر سے واپس لوٹا تھا۔ پورے گھر میں خاموشی تھی۔ بس کچن میں کچھ کھٹ پٹ کی آوازیں تھیں۔ وہ کچھ سوچ کر کچن کی طرف آ گیا۔ وہاں اسفر شاپر سے نان اور کباب نکال رہا تھا۔

"خیریت' آج کھانا گھر میں نہیں بنا؟" اسفر نے ایک نظر اسے دیکھا اور پلیٹیں نکالنے لگا۔

"گھر میں بہت خاموشی ہے۔" تیمور نے کباب کا قتلہ اٹھا کر منہ میں ڈالا۔

"ہوں۔ مہمان جو چلے گئے۔"

"کون چلا گیا؟" تیمور نے ٹھٹک کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"رانیہ اور بڑی اماں۔ کھانا کھائیں گے؟" وہ نارمل سے انداز میں پلیٹیں اٹھا کر ٹیبل کی طرف بڑھ گیا۔

"نہیں۔" تیمور کا لہجہ بجھ سا گیا۔

"انہیں تو جانا ہی تھا' یہ تو وقتی عیش تھے' اب پھر سے ہوٹلنگ کے لیے تیار ہو جائیے۔"

"ہوں۔" وہ خاموشی سے پلٹ گیا۔

خاموشی' جو اس کے وجود کے ساتھ ساتھ دل اور روح پر بھی چھا گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ویگن ابھی آدھی بھری تھی۔ ارد گرد بے حد شور تھا۔ اک چھوٹا سا بچہ روغنی نان بیچ رہا تھا۔ ایک لمبا لڑکا جوس اور ٹکو کے پیکٹ لیے بھاگ رہا تھا۔ سفید ٹوپی اور سبز جالی والا مسجد کے لیے چندہ مانگ رہا تھا۔ وہ تین فقیرنیاں۔ ویگن میں گھسی آ رہی تھیں۔ اور ہر عورت سے سر کے سائیں کا صدقہ مانگ رہی تھیں۔ چھیلے کٹے ہوئے ناریل بیچنے والے کی آواز سب پر حاوی تھی۔ پکی گری' میٹھی گری

وہ ہر طرف سے بے نیاز سر جھکائے گود میں دھرے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔

بڑی اماں بالکل خاموش تھیں اور ان کا چھاتا یوں ان کے پہلو میں پڑا تھا جیسے کوئی شریر بچہ مناسب توجہ نہ پا کر روٹھ جائے۔

وہ چپ تھیں تو رانیہ کی وجہ سے کہ اندر ہی اندر تو خوب تلملا رہی تھیں۔

"ستیاناس۔ کیسی کوڑھ مغز نکلی یہ ذکیہ۔ شروع سے ہی عقل سے خالی ہے۔ اللہ نے خالی گھڑا سر پر دھرا ہے۔ ورنہ یوں ہیرا ہاتھ سے گنواتی۔ ہے کیا اس رفعہ کی لڑکی میں۔ گوکا و۔ گیلا بھوس (کوڑی)۔ اللہ کرے چاروں میں مارے وکھا دے۔ لکی ہڈ حرام ہو کہ خود ذکیہ کو اٹھ کر پانی پلانا پڑے۔ چولہے سے پکڑ کر گھر سے باہر نکالے۔ ایسا خوند (خاوند) کو قابو کرے۔" اور خوند کے ساتھ ہی انہیں تیمور یاد آ گیا۔ کیسا شاندار تھا۔ ہمیشہ تصور میں اسے رانیہ کے برابر دیکھا۔

"ہونہہ۔" اک سرد سی آہ لبوں سے خارج ہوئی اور بے چینی سے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔

"یہ رانی اتنی چپ کیوں ہے' کیا سوچ رہی ہے۔ کہیں یہ بھی تیمور کو۔"

ان کی نظروں کا ارتکاز تھا یا رانیہ یونہی سر اٹھا کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔ ویگن بھر کر چلنے کو تیار تھی۔ ارد گرد کی بھیڑ دوسری ویگن کی طرف شہد کی مکھیوں کی طرح لپکی۔

"رانی! ایسے چپ کیوں ہے؟"

"کچھ نہیں اماں!" اس کے لب ہلے۔ پھر ہونٹ اس نے ایک جھٹکے سے بھینچ لیے۔ اب بڑی اماں اسے کیا کہتیں۔ وہ دادی تھیں۔ اسے اولاد سے زیادہ چاہتی تھیں۔ اس کا بھلا سوچتی تھیں مگر رانیہ۔ رانیہ کیا سوچتی تھی۔

"ایک عزت نفس ہی تو تھی۔ وہ بھی لیرو لیر ہوئی۔ میں نے کب امیدیں لگائی تھیں۔ میں نے کہاں اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوششیں کیں۔ ان کے گھر میں رہتی تھی ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھنا اچھا نہیں لگا۔ شبیر چچا نے بڑی اماں کے علاج کے لیے ایک روپیہ بھی ان سے نہیں لیا۔ میں تو ان کا احسان چکا رہی تھی۔ مجھے کیا خبر تھی۔ چچی یہ سوچ رہی ہیں۔ میں نے تو کبھی تیمور بھائی سے ڈھنگ سے بات تک نہیں کی۔ اور اب۔ کاش! ہم کچھ دن پہلے لوٹ آئے ہوتے۔ تیمور کا رشتہ طے ہونے کی خبر ملنے سے پہلے۔ اب چچی تو یہی سمجھتی ہوں گی کہ میں یہ خبر سننے کے بعد۔"

اس نے چہرہ جھکا لیا۔ اور ویگن ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

جس دن تیمور کی بارات گئی۔ اس دن نبیلہ اور تیمور کے نکاح سے قبل اعجاز اور ان کی پڑوسن مریم کا نکاح ہوا۔ انہوں نے اپنے گھر کا اوپر والا پورشن خالی کروا لیا تھا۔ موقع ایسا تھا کہ رفعہ صرف تلملانے کا کام کر سکیں۔ ذکیہ کو تک اعجاز سے کوئی براہ راست فائدہ نہ اٹھا سکی تھیں۔ سو بھائی کو مبارک باد دی اور ڈھیروں جہیز کے ساتھ نبیلہ کو بیاہ لائیں۔ ولیمہ کے فوراً" بعد تیمور اور نبیلہ سیر و تفریح کے لیے روانہ ہو گئے۔ پیچھے ذکیہ گھر سیٹ کرواتی سو سو بار پھرتیں اور بار بار وہ سونے کا سیٹ نکال کر دیکھتی رہیں جو نبیلہ کی ساس کی حیثیت سے انہیں تحفتاً دیا گیا تھا۔

"اور رانیہ کو بیاہ کر لاتی تو ایک چھلا بھی ہاتھ نہ آتا۔"

وہ دونوں واپس آئے تو نبیلہ کی ہنسی نہ رکتی تھی۔

تیمور بھی بظاہر مطمئن ہی دکھائی دیتا تھا کہ اس نے کبھی بھی اپنی خوشی یا غم کا اظہار کھل کر نہ کیا تھا۔ ذکیہ مطمئن ہو گئیں۔ خیال تھا کہ اب سارا گھر نبیلہ کے سپرد کر کے خود بے فکر ہو جائیں گی۔ اگلے دو دن نبیلہ تھکن اتارنے کو کمرے میں بند رہی۔ پھر رفعہ لے لینے آ گئیں۔

"کبھی اتنے دن مجھ سے دور نہیں رہی۔ اداس ہو گئی ہے۔ ہفتہ بھر پاس رکھوں گی۔ کیوں تیمور؟"

"امی سے پوچھیں۔" وہ کچھ کترا گیا۔ اب امی کیا کہتیں۔ نئی نئی رشتے داری بدلی تھی۔ بہن سمدھن بن گئی تھی۔ سو اجازت دیتے ہی بنی۔ اگلے ہفتہ بھر محلے والوں کے سوالوں کا جواب ہی دیتی رہیں۔ جو دلہن دیکھنے آتے تھے۔

☼ ☼ ☼

ان کی آنکھ کھٹ پٹ کی آواز سے کھلی۔ شاید کوئی برتن گرا تھا۔ انہوں نے ہڑبڑا کر دیکھا شبیر احمد مزے سے خراٹے لے رہے تھے۔

"ہیں۔ یہ کچن کا دروازہ کہیں کھلا تو نہیں رہ گیا۔" الا اسید دھا چلا' پیروں میں چپل تک نہ ہو سکا تیزی سے کچن کے دروازے تک پہنچیں۔ وہاں تیمور کو دیکھ کر ٹھٹک گئیں جو اپنے لیے چائے بنا رہا تھا۔

"بے وقوف لڑکی۔!" وہ چپکے سے پلٹیں اور خواب خرگوش کے مزے لیتی نبیلہ کو جھنجوڑ دیا۔

"کیا ہے خالہ! سونے دو نا۔"

"اٹھ کر تیمور کا ناشتہ بناؤ۔ وہ آفس جا رہا ہے۔"

"پہلی بار جا رہا ہے۔ پہلے بھی تو وہ خود ہی ناشتہ بنایا کرتا تھا۔" وہ کتنی منہ پھٹ تھی۔ اس کا اندازہ ذکیہ کو اسی پل ہوا۔

"جب تک رانیہ رہی۔"

"خالہ!" وہ تلملا کر اٹھی۔ "رانیہ چلی گئی۔ میری تیمور کے ساتھ شادی بھی ہو گئی۔ اب جو میں پہلے تھی۔ وہی رہنے دیں۔"

خالہ کو ہکا بکا چھوڑ کر خود کمبل اوڑھ لیا۔

"اس کی عقل کو کیا ہوا؟" وہ متحیر سی پلٹیں تو تیمور ناشتے کی ٹرے اٹھائے اندر آیا۔ وہ سلاس کپ پکا انڈا۔۔۔ ایک چائے کا مگ ہے۔ انہیں بیٹے پر ہی غصہ آنے لگا۔ وہ بیوی کو اٹھا نہیں سکتا تھا۔

"اٹھایا تھا۔۔۔ اٹھی نہیں۔" وہ ان کی نگاہوں کا سوال پڑھ چکا تھا۔

"تو اس کے لیے بھی بنا لاتے۔" ذکیہ نے تلملا کر کہا۔

"بحث کروں گا تو آپ ہی خفا ہوں گی کہ میری بھانجی ہے۔" وہ اطمینان سے کہہ کر سائیڈ ٹیبل کی طرف بڑھ گیا۔ ذکیہ بہت دیر تک تلملاتی رہیں۔۔۔ تیمور آفس چلا گیا۔۔۔ انہوں نے شبیر احمد، اصغر اور نبیل کا ناشتہ بنایا۔

"ہمارا خیال تھا آج بھابھی کے ہاتھ کا ناشتہ نصیب ہو گا۔" نبیل نے کہا تو وہ دل ہی دل میں بڑبڑائیں۔

"اس کے تو شوہر کو نصیب نہ ہوا۔"

نبیلہ جس وقت اٹھی۔ سب لوگ جا چکے تھے۔ نوکرانی کام کر رہی تھی اور ذکیہ بیٹھی سبزی بنا رہی تھیں۔

"خالہ! ناشتے میں کیا ہے؟" اس نے دروازے میں کھڑے ہو کر زوردار انگڑائی لی۔

"کچن میں سب ہی کچھ ہے۔ جو دل چاہتا ہے بنالو۔" ذکیہ نے قدرے رکھائی سے جواب دیا۔ وہ دھپ سے ان کے قریب بیٹھی۔

"خالہ! ناراض ہو؟"

"مجھے کیا ضرورت ہے۔ تمہارے فائدے کے لیے اٹھانے گئی تھی۔ نہیں تو نہ سہی۔ شوہر کا دل خدمت گزاری سے مٹھی میں آتا ہے۔"

"مگر خالو تو بنا خدمت کے مٹھی میں آ گئے۔"

"دفع ہو۔" ذکیہ نے غصے سے کہا تو نبیلہ نے ہنستے ہوئے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"مذاق کر رہی ہوں خالہ! اچھا اب اس رجو کو بھیج کر حلوہ پوری تو منگوا دیں۔ سچ بہت دل چاہ رہا ہے۔"

"چٹوری۔"

☆ ☆ ☆

زندگی تقدیر اور انسانی فیصلوں کے تال میل کا نام ہے اور کوئی نہیں جانتا اس کے فیصلے کے نتیجے میں تقدیر جو پیالہ پیش کر رہی ہے۔ اس میں امرت ہے یا زہر۔

"یہ چائے ہے؟"

"آپ کو لسی نظر آتی ہے؟" وہ بدلحاظی سے کہہ کر کمرے میں گھس گئی۔ ذکیہ نے پیالی پٹخ دی۔ شبیر احمد نے اخبار سے نظر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"خیریت، بہو کا مزاج برہم ہے۔"

"کب نہیں ہوتا۔ جب کام کرنا پڑے، موت آتی ہے۔" وہ بھنا کر بولیں۔

"آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔"

اور جو ہو رہا تھا۔ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ نبیلہ اچھی تھی بس ذرا کام چور تھی اسے گھومنے پھرنے بننے سنورنے اور ہوٹلنگ کا شوق تھا۔ تیمور کسی حد تک اس کے شوق پورے کرتا۔۔۔ پھر کبھی کبھی جھنجلا جاتا۔۔۔ جس دن کپڑے دھونا ہوتے۔۔۔ اس دن نبیلہ کا موڈ زیادہ ہی خراب ہوتا۔

"نبیلہ! سبزی لا دو۔ میں بنا دوں۔" ذکیہ کی زیادہ کوشش یہی ہوتی کہ گھر کا سکون بحال رہے۔ خاص طور پر چھٹی کے دن۔ اس لیے حتی الامکان اس کی مدد کرتی رہتیں۔

"اب کھانا بھی میں بناؤں؟" اس نے دروازے میں کھڑے ہو کر دہائی دی۔

"کون سے پہاڑ توڑنے ہیں۔ ایک سبزی ہی تو بنانی ہے۔"

"ابھی جو دھوبی گھاٹ کھلا ہے۔ اس سے تو نبٹ لوں۔" نبیلہ ترخ کر بولی۔

"چار جی ہیں گھر میں۔ اب ان کے کپڑے بھی نہیں دھلتے۔"

"بس کرو تم دونوں۔" شبیر احمد جھنجلا کر کھڑے ہوئے۔ "دسترخوان دو، بازار سے روٹیاں اور سالن لے آتا ہوں۔"

ذکیہ کا خیال تھا۔ نبیلہ شوہر کے سامنے ہی کچھ جا کرے گی۔ مگر اس نے ڈھٹائی سے دسترخوان اور ڈونگا انہیں تھما دیا اور اسی ڈھٹائی سے فرمائش بھی کر ڈالی۔

"خالو جی! کباب بھی لائیے گا۔ رائتہ اور سلاد بھی۔"

ذکیہ نے دل ہی دل میں جتنی گالیاں تھیں سب بھانجی پلس بہو کو دیں۔ رانیہ بے طرح یاد آگئی۔ جتنے دن وہ رہی۔ ایک دن بھی کھانا رائتے اور سلاد کے بغیر نہ تھا۔ بازار سے روٹیاں لانے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

"اچھا خیر بعد میں ساری ایسی ہی ہو جاتی ہیں۔ اس نے کون سا چارپائی پر بٹھا کر کھلانا تھا۔" ذکیہ نے تنفر کے ساتھ سوچا۔ مگر دل اپنی ہی کسی بات سے منکر تھا۔

☆ ☆ ☆

"اللہ جانے کہاں جا مری ہے۔ گھنٹے بھر سے آوازیں دے رہی ہوں۔ اتنا بھی نہیں کہ دو گھونٹ پانی ہی لا دے۔ او نبیلہ!"

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا۔ ذکیہ نبیلہ سے زچ ہوتی گئیں۔ تیمور یوں چپ تھا کہ ساس بہو کے تعلقات میں نرمی گرمی چلتی رہتی۔ کبھی باہم شیر و شکر ہو جاتیں۔ کبھی ایک دوسرے کے خلاف بڑبڑاتی پھرتیں۔

"خود ہی اٹھنا پڑے گا۔" کل سے گھٹنوں کا درد شدت اختیار کر چکا تھا۔ سردیوں کی آمد کے ساتھ ہی ان کا مسئلہ بڑھ جاتا۔ اب بھی انہیں پانی پینا تھا۔ اصغر ہمیشہ ان کے کمرے میں پانی وغیرہ رکھ جاتا تھا۔ آج نجانے کیسے بھول گیا۔ وہ ہائے وائے کرتے اٹھیں۔ لاؤنج میں لڑکوں نے ہنگامہ مچا رکھا تھا۔ ٹی وی چل رہا تھا۔ باتیں بھی ہو رہی تھیں۔ وہ دیوار کا سہارا لیتی کچن کے دروازے تک آئیں۔ مگر رک گئیں۔ چولہے پر غالباً چائے کے لیے پانی رکھا تھا۔ اور خود موبائل فون کان سے لگائے نبیلہ زور و شور سے لگی ہوئی تھی۔ "ہاں اماں!" اسے تو یقین تھا اس وقت کچن میں کوئی نہیں آئے گا۔

"نوکرانی بن کر رہ گئی ہوں۔ کھانا بھی میں بناؤں۔ کپڑے بھی میں دھوؤں۔ استری بھی کروں۔ ایک نوکرانی آتی ہے صفائی کے لیے۔ برتن تک خود دھونے پڑتے ہیں۔ خالہ! خود تو ساری عمر بل کر نہ دیں۔ اب مجھ سے توقع کرتی ہیں کہ سارا کام کروں۔ بازار سے روٹی بھی منگوالوں تو بڑی بی کو غصہ آجاتا ہے۔ امی! مجھے بلا لو۔ ایک دو ماہ تو سکون سے گزار لوں۔"

ذکیہ کا دل چاہا۔ اسے چٹیا سے پکڑ کر گھما ڈالیں۔ لیکن ایک تو اس کی چٹیا نہیں رہی تھی کہ شادی کے بعد پہلا کام بال کٹوانے کا کیا تھا۔ دوسرے وہ ہنگامہ کیسے کرتیں کہ یہ فیصلہ تو ان کا اپنا تھا۔ بنا آہٹ کیے غصے کے ابال کو دباتی آ کر بستر پر دراز ہو گئیں۔ پھر غصہ بڑبڑاہٹ میں ڈھل گیا۔

"اپنے گھر میں کیا پلنگ توڑتی رہی ہے۔ کمبخت زبان دراز! ماں نے بھی کچھ سکھا کر بھیجا ہے۔ ایسی ہی لاڈو تھی تو نوکرانی ساتھ بھیج دیتی۔ ساری عمر احسان کے نیچے دبی رہیں۔ ورنہ اپنا باپ تو کچھ کمانے جوگا نہ تھا۔ اچھا کیا جو اجو نے اپنا گھر بسا لیا۔ وہ مریم سب کو ٹھکانے پر رکھتی ہے۔ ورنہ میرے بھائی کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا گئیں۔ آپا اور اس کی اولاد۔"

"امی! کس سے لڑ رہی ہیں؟"

اصغر کے ہاتھ میں پانی کی بوتل اور گلاس تھا۔ دو گلاس پانی پیے تب جا کر کچھ سکون ہوا۔

"نبیلہ پر غصہ نکال رہی تھیں؟"

"ہاں۔ وہی تو ہے۔ جی کا جنجال۔ کام کی نہ کاج کی۔"

"وہ تو شروع ہی سے ایسی ہیں۔ کہا تو تھا آپ کو۔" لاپروائی سے بولا تو وہ چپ سی کر گئیں۔ دل ہی دل میں سوچا۔

"ہاں کہا تو تھا۔ پھر بھی دھوکا کھا گئی۔"

"اچھا! آپ فکر نہ کریں۔ جس لڑکی سے میں

شادی کروں گا۔ وہ بہت سگھڑ ہوگی۔ آپ کی بہت خدمت کرے گی۔" وہ بیٹھ کر ان کا سر دبانے لگا تو ذکیہ مسکرا دیں۔

"ہاں تمہاری بیوی بہت دیکھ بھال کرلا کرے گی۔"

"تو بھائی کے ساتھ دشمنی کیوں کی؟" وہ پوچھنا چاہتا تھا۔ مگر ماں کو پریشان دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

دو دن کے بعد نبیلہ کا بھائی اسے لینے آگیا تھا۔ "امی کی طبیعت ٹھیک نہیں نبیلہ کو یاد کر رہی ہیں۔" اور جتنا بڑا بیگ نبیلہ لے کر گئی ذکیہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ دو ماہ سے قبل آنے والی نہیں ہے۔

انہیں دنوں گاؤں سے رانیہ کی شادی کا بلاوا آگیا۔ دل میں اک کسک سی اٹھی۔ ان کے گھٹنوں میں اتنی تکلیف تھی کہ وہ جا ہی نہ سکیں۔ تیمور کو باسط کی بارات کے ساتھ جانا تھا۔ اسفر کے ایگزام چل رہے تھے سو شبیر احمد اکیلے ہی شریک ہوئے۔

☼ ☼ ☼

"یہ کیا کل کا سالن ہے؟" پلیٹ میں جھانکتے ہی تیمور کی تیوری چڑھ گئی۔

"طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس لیے سالن نہیں بنایا۔" نبیلہ نے قدرے رکھائی سے جواب دیا۔ جواباً تیمور نے ٹرے کو زور سے پرے دھکیلا اور بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔

"ہونہہ نخرے۔" وہ ٹرے اٹھانے کو جھکی تو ذکیہ ٹوک بیٹھیں۔

"پتا تو ہے اس کے مزاج کا۔"

"اچھے بھلے مزاج تھے۔ یہ مجھ سے شادی کے بعد ہی بننے لگے ہیں۔ بے دام کی غلام جو مل گئی ہے۔"

اس نے ٹرے واپس پٹخی۔ ذکیہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ مگر ماحول مزید خراب نہ ہو اس لیے رک گئیں۔ پہلے ہی وہ ڈیڑھ ماہ کے بعد گھر آئی تھی۔ کہا تو بس اتنا۔

"کچھ کباب وغیرہ بنا کر فریز کرلیا کرو تو ایسے وقت کام آجائیں۔"

"ہاں۔ سارا دن چولہا چوکی کرتی رہوں۔" وہ بڑبڑائی۔ جواباً "وہ بھی بڑبڑا دیں۔

"میرا بچہ بھوکا نجانے کہاں چلا گیا۔"

"بچہ بازار سے کچھ ٹھونس لے گا۔ بھوکا نہیں رہے گا۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ اسفر سے کہیے گا چائے بنائے تو مجھے بھی دے جائے۔"

"ہاں۔ وہ تو تیرا نوکر لگا ہے۔" وہ اس کے جانے کے بعد بڑبڑاتی رہیں۔ اسفر نے چائے بنا کر سب کو دی۔ تیمور رات گئے واپس آیا۔ وہ اس کے انتظار میں برآمدے میں بیٹھی تھیں۔

"آپ کیوں اتنی سردی میں یہاں بیٹھی ہیں؟"

تمہاری بیوی جو لمبی تان کر سو گئی۔ دروازہ کون کھولتا۔"

"میرے پاس چابی تھی۔" وہ شرمندہ ہو گیا۔

"کھانا دوں؟"

"نہیں۔ باسط کے ساتھ کھایا تھا۔" وہ آہستگی سے کہہ کر کمرے میں چلا گیا۔ اور یہ پہلی بار نہ تھا۔ اکثر ایسی کسی بھی چپقلش کے بعد وہ کھانا اسی کے گھر کھاتا۔ شاید اس کی بیوی بہت سلیقہ شعار تھی۔ سارے گھر کو سنبھال کر رکھتی تھی۔ تیمور اس کے ہاتھ کے بنے قیمے کے کبابوں کی بہت تعریف کرتا اور جس دن تعریف کرتا۔ نبیلہ کا سارا دن بڑبڑاتے گزرتا۔

اگلی صبح نبیلہ کی طبیعت اور مزاج دونوں پہلے سے زیادہ خراب تھے۔ ذکیہ کو شک سا گزرا تو لے کر لیڈی ڈاکٹر کے پاس گئیں۔ واپسی پر نبیلہ مسکرا رہی تھی تو ذکیہ ہواؤں میں اڑ رہی تھیں۔ وہ دادی بننے جا رہی تھیں۔ پہلے بیٹے کی پہلی اولاد۔ وہ خوشی سے بے حال ہو رہی تھیں۔ اسفر اور نبیل کو بھی بتایا۔ اسفر نے باقاعدہ بھنگڑا ڈالا۔

تیمور نے پہلے سے زیادہ نبیلہ کا خیال رکھنا شروع کر دیا اور نبیلہ۔ وہ پہلے سے زیادہ نازک مزاج ہو گئی تھی۔ جو تھوڑا بہت کام کو ہاتھ لگا لیتی تھی۔ اب اس سے بھی گئی۔ کپڑے دھونے اور برتنوں کے لیے نوکرانی کو زیادہ پیسے دینے لگی۔ ناشتہ سب اپنا اپنا بناتے۔

دوپہر کا کھانا ذکیہ بناتیں۔ تو رات کا نبیلہ۔ جو اکثر ہی [illegible] سے آنے لگی۔ شبیر احمد اور ذکیہ کو اب بازار کے کھانے سوٹ نہیں کرتے تھے۔ ذکیہ کو اپنے اور میاں کے لیے گھر میں روٹی بنانا پڑتی تو دل ہی دل میں خوب بڑبڑاتیں۔

"سوچا تھا۔ بہو آئے گی تو کچھ آرام نصیب ہوگا۔ ابھی تک اپنی ہی ہڈیاں گھسنی پڑتی ہیں۔"

☼ ☼ ☼

پہلی شرٹ اٹھائی تو بٹن غائب۔ دوسری نکالی تو کف میلے۔ اور باقی سب بھی ٹھیک ٹھاک الماری میں ٹھنسی تھیں۔ اس نے ایک نظر بے دھڑک سوتی بیوی پر ڈالی پھر کچھ سخت سست کہنے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے شرٹ اس کی طرف پھینکی۔

"اس کے بٹن لگا دو۔" خود تولیہ اٹھا کر واش روم میں گھس گیا۔ نبیلہ نے سارا کمرہ دیکھ لیا۔ سفید تاگا اور اس میں انکائی سوئی نہ ملی۔ ذکیہ سے پوچھا۔ انہوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔

"کیا کروں۔ موصوف [illegible] لگا دیا۔" تیمور تولیے سے چہرہ صاف کرتا قریب آیا۔

"نہیں۔ وہ سفید دھاگا۔"

تیمور نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا۔ اس کے ہاتھ سے شرٹ جھپٹی اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

"ہونہہ۔ اب جائیں گے اپنے لنگوٹیا یار کے گھر۔ اور واپسی پر اس کی بیوی کے گن گا کر میرے کان کھائیں گے۔ ان عورتوں کو تو جیسے اور کوئی کام ہی نہیں ہوتا۔ سارا دن کچن میں گھسی رنگ برنگے کھانے پکاؤ اور ان جیسوں کو کھلا کر دوسرے گھروں میں فساد ڈلواتی ہیں۔ لو۔ آدھا ڈرامہ تو اس [illegible] کے چکروں میں ہی نکل گیا۔"

وہ دوبارہ سے ٹی وی کے سامنے بیٹھ گئی۔ مجبوراً ذکیہ کو یاد دہانی کرانا پڑی کہ ابھی رات کا کھانا پکانا ہے۔

"خالہ! آلو مٹر رکھے ہیں۔ اسفر نبیل تو رات کا کھانا گھر پر کھاتے ہی نہیں۔" واہ رے معصومیت اور لاپروائی۔ وہ عش عش کر اٹھیں۔

(ارے بی بی! تم گھر میں پکاؤ تو ہی کھائیں۔ غریب کوئی برگر سے پیٹ بھر لیتا ہے تو کوئی نان سے)

"اور تیمور!" وہ ضبط سے پوچھنے لگیں۔

"فکر نہ کریں۔ وہ اب کھانا کھا کر ہی آئیں گے۔ اور واپسی پر کچے قیمے کے کباب بنانے کی ترکیب لکھوا کر لائیں گے۔" وہ جل بھن کر بولی۔

"ظاہر ہے مرد کو گھر میں سکون نہ ملے تو وہ باہر ہی جائے گا۔" ذکیہ اک سرد آہ بھر کر بولیں۔

"تو ٹھیک ہے وہیں رہیں۔ جہاں سکون ملتا ہے۔ نبیل اپنے لیے برگر لینے گیا تو میرے لیے بھی منگوا لیجیے گا۔"

(اللہ کرے۔ تجھے تو معدے کا السر ہو جائے۔)

انہیں اندازہ ہو گیا تھا اپنے اور میاں کے لیے روٹی خود ہی بنانا ہوگی۔

(کاش! تو میری بھانجی نہ ہوتی۔ یا میں نے اپنے پیروں پر یہ کلہاڑی نہ ماری ہوتی۔ اب کس سے کہوں کہ فیصلہ تو مجھ اکیلی کا تھا)

☼ ☼ ☼

اب قصور کس کا تھا کہ گھر میں داخل ہوتے ہی تیمور کی نظر کچرے کی ابلتی ٹوکری پر پڑ گئی جس پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ وہ بڑی بھی عین دروازے کے پاس تھی کہ ہر آنے والے کا ناکرا سب سے پہلے اس بدنما پلاسٹک کی ٹوکری سے ہوتا۔ ابھی ابھی جس گھر کی مہکتی فضا سے نکل کر آیا تھا۔ اس کے بعد یہ منظر اس کی نفیس طبع پر اچھا خاصا تازیانہ ثابت ہوا۔

"گھر ہے کہ کوڑا خانہ۔" اس کی ٹھوکر سے ٹوکری اچھلی اور دور تک لڑھکتی گئی۔ سارے صحن میں کچرا بکھرتا چلا گیا۔ کمرے سے نبیلہ اور ذکیہ بھی نکل

آمین۔ اوپر سے نبیل نے بھی جھانکا۔

"دوسرے کے گھر جاؤ تو پھول پودے استعمال کرتے ہیں اور سال۔" "کیوں ماؤ کھانا چھینا" تیمور کا مزاج لوز تھا۔ وہ کیہ حیرت سے بیٹے کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

"ہاں تو ملازمہ نہیں آئی۔ اب کوڑا پھینکنے میں باہر جاؤں۔" برداشت تو نبیلہ میں بھی ذرا نہ تھی۔ کبھی کبھی تو بھول ہی جاتی کہ شوہر سے بات کر رہی ہے۔

"تو اسے یوں فرنٹ پر رکھنا ضروری ہے۔"

"سارے میں گند ڈال دیا۔ اب اسے کون صاف کرے گا۔"

"میں کر دیتا ہوں۔" وہ پچھاڑ کھانے کو دوڑا۔ "اللہ کسی کو ایسی پھوہڑ بیوی نہ دے۔"

"تو جاؤ۔ کوئی سگھڑ ڈھونڈ لاؤ۔"

"نبیلہ!" وہ کیہ نے گھر کا۔ تیمور کھولتا ہوا کمرے میں گھس گیا۔

"بڑے آئے کہیں سے مجھے باتیں سنانے والے۔"

"عجب بتا ہے کہ وہ اس وقت غصے میں ہے تو کیوں آگے سے بول رہی ہو۔"

"آپ کو بھی سارے عیب مجھ ہی میں نظر آتے ہیں۔" نبیلہ نے غصے سے کہا۔ پھر ایک نظر صحن میں ڈالی۔ "مجھ سے نہیں ہوتا یہ سارا گند صاف۔"

اور پاؤں پٹختی دوسرے کمرے میں گھس گئی۔

"تو مجھ دکیہ! اٹھا جھاڑو۔ اور لگا سارے صحن میں۔ یہی تیرا نصیب ہے۔" وہ اک آہ بھرتی گھٹنوں پر دباؤ ڈالتی کھڑی ہوئیں۔ تب ہی نبیل نیچے آیا۔

"امی! میں کر دیتا ہوں۔"

"ہک ہا۔ بچارے میرے بیٹے۔"

رات کو وہ تیمور کو سمجھانے لگیں کہ نبیلہ نے رات سے کھانا نہیں کھایا تھا۔

"کیوں اتنا غصہ کرتے ہو۔ تمہیں تو پتا ہے۔ وہ ماں بننے والی ہے۔ ایسی حالت میں۔۔!"

"امی! وہ کیا دنیا کی پہلی عورت ہے۔ اور بچہ کیا کہتا ہے گھر کے ہر کام سے ہاتھ کھینچ لو۔ باقی عورتیں کام نہیں کرتیں۔"

"تم بھی تو ہر بات میں دوسروں کی مثال لے آتے ہو۔ بیوی جیسی ہے۔"

"کبھی ان کے گھر جا کر تو دیکھیں۔ میرے دوستوں کی بیویوں سے ملیں تو پتا چلے کہ عورت کا سلیقہ گھر کا نقشہ بدل دیتا ہے۔" تیمور کے لہجے میں اضطراب سا اتر آیا۔

"اچھا جو بھی ہے۔ اب جاؤ اسے مناؤ۔"

"میں؟ خواہ مخواہ۔۔" وہ بدکا۔

"تیمور! اس نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ خواہ مخواہ تمہاری اولاد کو نقصان ہو گا۔ اس حالت میں بیوی کا خیال رکھنا اسے پرسکون رکھنا شوہر کی ذمہ داری ہے۔ خواہ مخواہ ظالم مت بنو۔"

"اچھا! میں ظلم کر رہا ہوں؟"

"اب بس کرو اور جاؤ۔ ماں کی بات بھی نہ مانو گے؟" انہوں نے قدرے پیار سے کہا تو وہ مجبور سا ہو کر اٹھ گیا۔

"کسی دن آپ کو باسط کے گھر لے جاؤں گا۔ اس کی امی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ ہسپتال رہ کر آئی ہیں۔ عیادت کر لیجئے گا۔"

"ہاں ہاں۔ جب تم فارغ ہو۔"

اور اگلی اتوار جب تیمور گھر پر تھا۔ اس نے ماں سے کہا کہ وہ تیار ہو جائیں۔ انہیں باسط کے گھر جانا ہے۔

☼ ☼ ☼

دو منزلہ سبز بیلوں سے ڈھکا خوبصورت گھر تھا۔ براؤن اسٹائلش سا گیٹ۔ جسے پار کرتے ہی اک چھوٹا سا قطعہ دائیں ہاتھ۔ بے شمار پھولوں سے بھرا۔ فضا میں لیموں کے درختوں کی مہک۔ کونے میں کیلے کا درخت۔ سامنے پورچ میں گاڑی کھڑی تھی۔

"باسط نے گھر نیا بنایا ہے۔" انہوں نے خوبصورت رہائشی دروازے کو دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں کچھ عرصہ قبل اپنے پرانے مکان میں کچھ تبدیلیاں کی تھیں۔" تیمور نے مختصراً بتایا اور

[illegible] نہیں ہے۔ مگر گھر خوبصورت
[illegible] ہے۔ کچھ اس کی بیوی بہت سلیقہ مند
[illegible] سادہ ہی تھا۔ مگر انہیں طنز لگا۔ مگر
[illegible] ایک چھوٹے لڑکے نے کھولا۔
[illegible] ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ صوفے پر
[illegible] ڈرائنگ روم کے فرنیچر، دیواروں
[illegible] کارنر میں بڑے سے واز اور فلاور
[illegible] رکھا۔
[illegible] فرنیچر ہے۔ باسط کی بیوی جہیز میں لائی

[illegible] کو دیکھا۔ وہ صرف چیزوں کی
[illegible] اور تیمور جب بھی یہاں آتا۔ یہی
[illegible] ایک ذرہ۔ یا کوئی بھی فالتو چیز
[illegible] نہیں بجتی تھی۔ جبکہ ان کے
[illegible] صوفے پر بٹھانے سے قبل صوف
[illegible] مہمان اپنے کپڑے جھاڑ رہا

[illegible] ڈرائنگ روم میں کیوں بٹھوایا۔
[illegible] لے جاؤ۔ میرے ہاتھ آنے میں
[illegible] مدھم سی آواز بہت دور سے سنائی

[illegible] لڑکا انہیں لے کر باسط کی امی کے
[illegible] کے سہارے بیٹھی انہی کی منتظر
[illegible] سے استقبال کیا۔ لڑکے ایک
[illegible] دوست تھے۔ مگر ان دونوں کی
[illegible] ہوئی تھی۔ اور گھر تو وہ آئی ہی پہلی
[illegible] پر ان کی دوائیاں، پھلوں کی
[illegible] ترتیب میں اور اتنا قریب تھا کہ
[illegible] کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ انہیں
[illegible] یاد آئیں تو سرد سی آہ بھر کر رہ

[illegible] کی تفصیل سنا رہی تھیں۔

تیمور نے خاموشی سے اخبار اٹھا لیا۔ تھوڑی دیر میں ملازم لڑکا نہیں نازک کرسٹل کے گلاس تھما گیا۔ جس میں تازہ پھلوں کا رس تھا۔

"ماشاءاللہ گھر بہت ہی اچھا بنا لیا ہے۔"

"ہاں۔ میرے بیٹے اور بہو دونوں ہی کو گھر سجانے کا بہت شوق ہے۔ باسط نے تو سب جمع جتھا کلینک پر لگا دیا تھا۔ جو تھوڑا بہت پاس تھا اس گھر پر لگا دیا۔ بہو کو بھی ساتھ لے آتیں؟"

جواب کے ساتھ ہی سوال داغا۔ وہ گڑبڑا گئیں کہ انہوں نے کہا تو تھا مگر نبیلہ نے جواب دینا گوارا ہی نہیں کیا۔ اور چائے کا کپ اٹھا کر باہر نکل گئی۔ جب سے وہ امید سے ہوئی تھی نخرے کچھ اور بڑھ گئے تھے۔

"اس کی طبیعت ہی کچھ ٹھیک نہ تھی۔" وہ آہستگی سے گویا ہوئیں۔

"اچھا۔ اچھا کوئی خوش خبری ہے؟ میری بہو کے ہاں بھی ہے۔" باسط کی امی خوش ہو کر بولیں۔

"پھر بھی سارے کام کرتی ہے؟" بے ساختہ ذکیہ کے منہ سے پھسلا۔ تیمور نے اخبار سے نظریں ہٹا کر ایک نظر ان کو دیکھا۔

"ہاں ہاں بڑی ہی نیک طبیعت کی بچی ہے۔ سارا گھر اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا ہے۔ گاؤں سے بیاہ کر لائی ہوں۔ سچی بات ہے میں تو اس رشتے پر راضی ہی نہ تھی۔ سوچا تھا ڈاکٹر بیٹے کے لیے ڈاکٹر بیوی لاؤں گی۔ مگر باسط نہیں مانا۔ کہنے لگا۔

"وہ سارا دن ہسپتال میں ہوگی تو آپ کیا کریں گی۔ مجھے تو ایسی بیوی چاہیے جو آپ کی دیکھ بھال کرے اور میرے مسائل سمجھے۔ دو بیٹیوں کی شادی پچھلے سال کی ہے۔ چھوٹی والی ڈاکٹر بن رہی ہے۔ بھابھی بھابھی کرتی ہے ہم نے بھی سارا گھر اس کے حوالے کر دیا۔ سیاہ کرے یا سفید۔ بیٹی بنایا ہی نہیں سمجھا بھی ہے۔ اپنی بچی کو سخت سست کہہ لوں گی۔ اسے کبھی سخت لفظ نہیں کہا۔ اور اسے بھی مان بڑھانا آتا ہے۔ روز رات کو دوا کھلائے گی۔ باتیں کرے گی۔ سر دبائے گی۔"

ذکیہ بے چینی سے پہلو بدلنے لگیں۔

تیمور کے لبوں پر استہزائیہ سی مسکراہٹ بکھری۔

"بیٹیوں کی شادی کہاں کی ہے؟" انہوں نے موضوع بدلنے کی سعی کی۔ وہ فوراً بیٹیوں کے سسرال کا حدود اربعہ بتانے لگیں۔ ذکیہ نے رشک سے اس بے فکر بڑھیا کو دیکھا اور آہ بھر کر سوچا۔

"ہائے لوگوں کے نصیب۔ ایک ہمیں ملی ہیں۔ بک بک۔"

ملازم لڑکا چائے لے آیا۔ شامی کباب، چکن رول، بسکٹ، ساتھ میں دو طرح کی چٹنیاں جن کے بارے میں ساس صاحبہ نے بتایا کہ گھر میں بنائی ہیں۔ بہو بے جا اسراف پسند نہیں کرتی۔ ذکیہ جز بز سی ہو گئیں۔ بہو تھی یا افلاطون۔ ہر فن مولا۔

تب ہی ہوا کے جھونکے کی طرح وہ اندر چلی آئی۔ سیاہ منقش سی چادر میں خود کو چھپائے۔

"السلام علیکم۔"

تیمور نے سر ہلا کر جواب دیا۔ اور ذکیہ۔ ان کے منہ میں کباب رکھے کا رکھا رہ گیا۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"راضیہ۔" [illegible] کباب اگلا۔

"جی آپ تو میری شادی میں نہیں آئیں۔ سب لوگ انتظار کرتے رہے۔"

"ہاں۔ وہ میں..." انہوں نے گڑبڑا کر تیمور کو دیکھا۔ اس نے بھی بتایا ہی نہیں راضیہ کی شادی باسط سے...

"کھانا باسط کے گھر سے کھا آیا ہوں۔"

"جی۔ کھانا ایسا بناتی ہے کہ اس کے بعد کسی اور کے ہاتھ کا اچھا ہی نہیں لگتا۔"

"جادو نہیں۔ وہ اپنے شوہر اور گھر کے لیے دل سے کام کرتی ہے۔"

"ایک باسط کا گھر ہے ہر وقت آئینے کی طرح چمکتا ہوا۔ اور ایک میرا کباڑ خانہ..."

بہت جلد کی کہی باتیں وقتاً فوقتاً ان کے کانوں میں گونجنے لگیں۔

"میں نے تو بہت دفعہ تیمور بھائی سے کہا آپ کو لے کر آئیں۔ مگر یہ سنتے ہی نہیں باسط سے کہا بھی سے ملوا لائیں۔ مگر وہ مصروف ہی بہت ہوتے ہیں۔ دعوت کرنا چاہی تب بھی تیمور بھائی نہیں مانے۔"

وہ باتیں ان سے کر رہی تھی۔ اور ساتھ ساتھ اپنی ساس کو کباب کھلا رہی تھی۔ وہ نخرے کر رہی تھیں یہ اصرار۔

"ڈاکٹر صاحب نے کسی قسم کا پرہیز نہیں بتایا۔ کہہ رہے تھے۔ سب کچھ کھلاؤ۔ تب ہی جسم میں طاقت آئے گی۔ نبیلہ کو کیوں نہیں لائے؟"

ذکیہ یک ٹک اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ کتنا بدل گئی تھی۔

پہلے سے زیادہ خوبصورت، پہلے سے زیادہ پُراعتماد۔ پہلے سے زیادہ سلیقہ مند۔

انہوں نے سر جھکا لیا۔

بات صرف اتنی سی ہے کہ ہیرے کی قدر جوہری جانتا ہے۔ مگر سامنے والا جوہری نہ ہو یا جوہری کی نگاہ نہ رکھتا ہو۔ تو ہیرے کو معمولی سا موتی سمجھ کر چھوڑ دیتا ہے۔

کبھی کبھی تقدیر ہمیں مٹی کے پیالے میں امرت پیش کرتی ہے۔ مگر ہم مٹی کے پیالے کو حقارت سے دیکھتے ہوئے ٹھکرا دیتے ہیں۔

قصور کس کا ہے؟

تقدیر کا یا ہماری کم نگاہی کا؟

☆

ام ثمامہ

ارساں کے جال

میں شیر افگن وڑائچ عرف شیری ہوں جو فیصل آباد کے چک دو سو چوالیس میں پیدا ہوا اپنا بچپن وہیں گزارا اور ابتدائی تعلیم بھی مجبوراً "وہیں حاصل کی۔

میں پانچ عدد بڑی بہنوں کا لاڈلا اور چھوٹا بھائی ہوں اور بے بے اور ابا کی اکلوتی اولاد نرینہ ' جس کا میں نے زندگی میں ہر قدم پر جائز و ناجائز فائدہ بخوبی اٹھایا۔

میرے خیال میں کبھی کبھی انسان کی روح غلطی سے ایسی جگہ جا بستی ہے جہاں سے اس کی ذات کے کسی پہلو کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

پنڈ سے میرا اتنا ہی تعلق تھا کہ وہاں میرے ماں باپ بستے تھے اور میں وہاں پیدا ہوا حالانکہ مجھے ماڈل ٹاؤن یا ڈیفنس جیسے کسی علاقے میں پیدا ہونا چاہیے تھا' پنڈ کی تازہ کھلی ہوا' صبح سویرے مرغوں کا اذانیں دے کر اٹھانا پھر بے بے کے ہاتھ کے اصلی گھی میں تر بتر پراٹھے کھانا' ٹیوب ویل پر نہاتے ننگ دھڑنگ لڑکے' شرم سے دہری ہوتی لڑکیاں' مٹی مکھیاں' مچھر' رات کی طرح سر شام پھیلا تا گلیوں کا اندھیرا' درخت تلے پنڈال پر بیٹھے بڈھے بابے درخت تلے چٹائی پر بیٹھ کر پڑھنا کم اور ماسٹر کے کام کرنا' مار زیادہ کھانا' ساگ مکئی کی روٹی' پائے' موٹے موٹے چاولوں والی کھیر مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔

مجھے یہ سب اپنے آپ سے آؤٹ آف اسٹینڈرڈ لگتا تھا' بڑی مشکل سے میں نے پنڈ کے اسکول سے میٹرک پاس کیا اور ابا سے ضد کر کے شہر کے کالج میں داخلہ لے لیا اور جب شہر جا کر ہاسٹل میں رہنے کی بات آئی تو میرے تین عدد کلف زدہ اور بڑی بڑی مونچھوں والے بہنوئیوں نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"سالے صاحب جی! شہر میں کھجل خوار ہو کر کیا لے گا اتنے مربعے ہیں' مزے سے بیٹھ کر زمین داری کرو۔"

لیکن میں کیا کرتا۔ میں مزے سے زمین داری کرنے کے لیے پیدا ہی نہیں ہوا تھا' حالانکہ بچپن میں ٹریکٹر کی سواری ہی آتی تھی ابا اور بے بے نے میرے نخرے اٹھانے کے لیے رکھے تھے۔ مگر ان کا دل نہ کیا کرتا خود کو یہاں مس فٹ سمجھتا تھا۔

بے بے تو باقاعدہ ناراض تھیں' آپاؤں کے ورجن بھر بچوں نے رو رو کر اپنی پکوڑا جیسی ناکوں کو مزید سجا لیا تھا اور "ماما جی نہ جاؤ' ماما جی نہ جاؤ" گا گا کر میرے کان کھا لیے تھے۔

مگر میں نے سب کی منتوں' ترلوں اور محبتوں کو نظر انداز کر کے اپنے شہری مستقبل کے لیے ہاسٹل میں داخلہ لے لیا اور مزے سے رہنے لگا۔

مہینے میں ایک دوبار بے بے' ابا اور بہنوں کے اصرار پر ان سے ملنے آتا اور جلدی واپسی کی راہ لیتا' پڑھائی میں' میں ہمیشہ اچھا رہا تھا' انٹر میں اچھے نمبر آئے تو ابا سے کہہ کر پنجاب یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا۔

ابھی میں ایم اے کے فائنل ایئر میں ہی تھا کہ پنڈ سے فون آیا کہ

بے بے کی طبیعت خراب ہے جلدی آؤ' میں شام کو ہی پنڈ کی طرف روانہ ہو گیا۔ پنڈ سے مجھے الرجی تھی مگر بے بے' ابا اور آپاؤں سے مجھے بے حد پیار تھا۔

گھر پہنچا تو بے بے بخار میں پڑی تھیں اور پنڈ کی درجن بھر عورتیں نیم حکیم خطرہ جان کے مصداق اپنی اپنی مرضی کا علاج تجویز کر رہی تھیں۔

"بس جی' کی علاج کرنا' اللہ اللہ کرو' بی بی دا ٹائم آ گیا ہے۔" ایک بڑی بوڑھی نے اٹھتے ہوئے گویا مکا دی' پھر سب کو وہاں سے روانہ کیا اور کرسی کھینچ کر بے بے کے پاس بیٹھ گیا۔

"آ گیا پتر!" انہوں نے نقاہت سے آنکھیں کھولیں۔

"آپ فکر نہ کرو بے بے! مجھے لگتا ہے آپ کو ملیریا ہو گیا ہے' آپ میرے ساتھ شہر چلو میں آپ کو وڈے ڈاکٹر کو چیک کراؤں گا۔"

"ناں ناں پتر' وہ تو بندے تو مشینوں' ٹوٹیوں' تاروں کے وس پڑے ہیں' میں شہر نہیں جاؤں گی' اسی برس کی ہو گئی ہوں' ادھر ہی جیئی ہوں' یہاں ہی پلی بڑھی' یہاں ہی رکتی' کرتی گزری میں۔" وہ دھیرے دھیرے بول رہی تھیں' پھر تھوڑی دیر خاموش ہوئیں اور کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔

"شیرے پتر!" وہ پیار سے مجھے یہی پکارتی تھیں۔

"جی بے بے!" میں نے پیار سے ان کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔

"پتر تو ویاہ کر لے۔" انہوں نے خود ہی اپنی بیماری کا علاج تجویز کر دیا۔ "تو وہٹی لے آ میں آپوں آپ ٹھیک ہو جاؤں گی' ساون بھادوں میں تیری دو بہنوں کا بھی ویاہ ہو جائے گا تو میں بڈھی جان اکیلی رہ جاؤں گی۔ پتر پھر تیرے بالکے کا کیوں سے دل بہلا رہے گا۔"

مجھے لگا اچانک کرسی پر کسی نے چار سو چالیس وولٹ کا کرنٹ چھوڑ دیا ہو اور پھر سمجھ میں آیا کہ یہ بخار ملیریا کا نہیں مطالبہ منوائی کا بخار ہے۔

"پتر شیرے! تیرے مامے کی دھی بلو بچپن سے تیری منگ ہے اور پنڈ کے حساب سے اس کی عمر کی کڑیاں چار چار بچوں کی مائیں بن گئی ہیں۔ بڑی صابر اور سمجھدار لڑکی ہے تیرے نام پر بیٹھی ہے تو کالج



کرلے اور خفتی تیری پڑھائی پوری ہونے پر کروا لیں
گے تاکہ میرے بھرا کے سر سے بن ماں کی بچی کا بھار
اترے۔ اب تو پنڈ میں لوگ طرح طرح کی باتیں بنانے
لگے ہیں کہ شیرا فضن اتنی ساری جماعتیں پڑھ کر بلو
سے کیوں ویاہ کرے گا۔"

ابھی ایک جھٹکے سے سنبھل نہیں پایا تھا کہ بے بے
نے فوراً "دوسرا جھٹکا لگایا اور وہ بھی چار سو چالیس
وولٹ کرنٹ سے دس گنا زیادہ بڑا۔ میری آنکھوں
کے سامنے چھ سال والی بلو دھپ سے آ کر کھڑی
ہو گئی۔

اپنے وزن کے باعث وہ کہیں بھی چھم سے کھڑی
ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

"ہاں! میں ابھی پڑھ رہا ہوں اور اس طرح کا کوئی
فیصلہ بالکل نہیں کرسکتا اس سے میری پڑھائی پر اثر
پڑے گا۔" میں نے جان چھڑانا چاہی۔

اتنا سننا تھا کہ بے بے نے ایک چیخ ماری اور چپ
ہو گئی۔ بے بے کی آواز سن کر میری پانچوں آپا میری
دونوں آپیاں اور سنا سب جاتے [illegible]
کر رونے لگیں اور ان کے دو جن بھر بچے بھی اپنی
ماؤں کی نقل کے ساتھ تان ملانے لگے۔

بے بے نے بامشکل ان کے چنگل سے خود کو چھڑایا
اور جوتیوں اور گالیوں کے ذریعے یہ احساس دلایا کہ
ابھی وہ زندہ ہیں۔ ساری باری باری شرمندہ ہو واپس اپنے
اپنے کاموں میں جت گئیں۔

"ہائے' پنڈ والے سچ کہتے ہیں تو بدل گیا
ہے۔" اماں رو رو کر بین ڈالنے لگی۔ "دیکھ شیرے پتر! اگر تو
نے میرے بھرا کے آگے میرا سر نیواں کرنے کی کوشش
کی تو میرا مرا منہ دیکھے گا۔"

پھر انہوں نے دودھ گھی کی نہ جانے کیا کیا نہ
بخشنے کی دھمکیاں دیں۔ ابا نے خرچہ پانی بند کرنے کا
اعلان کیا اور آپاؤں نے ویر نہ ماننے کی قسم کھائی تو مجھے
ماننا ہی پڑا۔ اب کیا کرتا مجھے اپنا کیریئر تو بنانا تھا اور اس
کے لیے میں ابھی ابا پر ڈیپینڈ کرتا تھا۔ میرے منہ سے
مری مری ہاں نکلنے کی دیر تھی کہ بے بے اگلے ہی پل
چارپائی سے اٹھ گئی۔

"نی چھیمی! اری او اماں مر گئیں ساری کی ساری۔
جلدی کرو الماری میں رکھا مٹھائی کا ڈبہ نکال کر لاؤ اور
چادر بھی لے آ۔ شیرے کے ابا! تم کیا منہ تک رہے ہو
جلدی سے اپنا شملہ اور واسکٹ پہن کر آؤ میں ابھی اور
اسی وقت منظور بھراجی کے گھر جاؤں گی اور شگن دے
کر تاریخ رکھ کر آؤں گی۔" میں حیران پریشان کھڑا
بے بے کی پھرتیاں دیکھ رہا تھا۔

"منی جلدی سے جا اور الماری میں سے بادام اور
گھی کا پیاں بھی چک لیا جو تمہارے بلو گٹرو سے بچا بچا
کر رکھا تھا۔"

"بے بے! ہم بھی چلیں۔" گڈی آپا نے مچل کر
کہا۔

"نال مرن جوگیو! تم نے تو لیپا پوتی کرتے کرتے
رات کر دینی ہے۔ آج میں اور تمہارے ابا جا رہے ہیں
کل تم لوگ سارے کی طرف گیت گانے چلی جانا۔"

بے بے نے پاؤں میں میری لاہور سے لائی سوفٹی
اڑسی [illegible] کام والی چادر اوڑھی اور لپک جھپک ابا کے
ساتھ ویڑے کی دہلیز پار کر گئیں۔

پیچھے پیچھے آپاؤں کے دو جن بھر بلو گٹرو اے اساں
تے جاناں بلو دے گھر کنے جاناں بلو دے گھر گانے
"بلو ماہی آوے آوے" کے نعرے لگاتے نانا ناں کے
پیچھے چل دیے۔



بے بے کے جانے کے بعد میں اپنے کمرے میں
بیٹھا یہی سوچ رہا کہ یہ "آنا" "فانا" میرے ساتھ کیا ہو گیا
تھا۔ میری زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ اسی پنڈ کی مٹی سے جڑ
گیا تھا جس سے میں ہمیشہ دور بھاگتا تھا لیکن ہمارے
یہاں بچپن کی منگ کی شادی اپنے منگ کے علاوہ کسی
سے نہیں ہوتی چاہے وہ ساری عمر کنواری بیٹھی رہے
اور اس خیال نے بھی دل میں چٹکی لی کہ ابھی میری دو
بہنیں کنواری بیٹھی تھیں میرے کسی ناحق فیصلے کے
ذرا اثر ان کے ساتھ بھی کچھ غلط ہو سکتا تھا۔

پھر میں نے کچھ اور بھی سوچ رکھا تھا اس لیے
دل ہی دل میں مطمئن سا ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ سفر کی تھکن
اور اماں کی اموشنل بلیک میلنگ نے تھکا کر رکھ دیا تھا۔
ابھی صبح سے آنکھ لگی بھی نہیں تھی کہ صحن میں مچے
بے ہنگم شور نے آنکھ کھولنے پر مجبور کر دیا اور ابھی
ٹھیک سے آنکھیں کھل بھی نہیں سکی تھیں کہ
بے بے نے آ کر منہ میں موتی چور کا لڈو ٹھونس دیا اور پھر
اس کے بعد ایک کے بعد ایک لڈو منہ میں زبردستی ڈالتا
اور پیٹ میں جاتا رہا۔ ابا نے جیب سے لال لال نوٹ
نکال کر وارے اور گلے سے لگایا۔

"شیرے پتر! مبارکاں اگلے ہفتے کی تاریخ پکی ہوئی
ہے نکاح کے لیے۔ بھا منظور تو خوشی کے مارے رو ہی
پڑا۔"

"ہاں ہاں اتنا پڑھا لکھا اور چنگا داماد جو مل گیا۔" بے بے
نے بھی صدقے واری ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں پتر! تجھے نہیں پتا تیری اس کی جتی ہاں نے پنڈ
میں موجود میرے دشمنوں اور جلنے والوں کے منہ پر
ایسی کراری چپیڑ ماری ہے کہ کتنے دن تک لال ہوتا
رہے گا۔" [illegible]

رات کو میں بے بے کی چارپائی پر بیٹھا تھا اور وہ مجھے
دیکھ دیکھ کر نہال ہو رہی تھیں جیسے مالک "قربانی" سے
پہلے بکرے کو دیکھ دیکھ کر نہال ہوتا ہے۔ میں نے ان کا
ہاتھ تھام کر دھیرے سے پکارا۔

"بے بے! آپ نے اپنی مرضی کی اور میں نے انکار
نہیں کیا مگر ایک بات یاد رکھنا میں شہر میں تعلیم مکمل
کرنے کے بعد وہیں نوکری کروں گا اور پھر وہیں اپنی
پسند اور معیار کے مطابق لڑکی سے ویاہ بھی کروں گا اور
یہ آپ کی لاڈلی بلو بیگم آپ کے پاس ہی پنڈ میں رہے گی
نکاح پر جانے سے پہلے آپ اسے میری شرط سمجھ
لیں۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

"اچھا شیرے پتر! یہ تو بعد کی باتیں ہیں مجھے پتا ہے
میری دھی رانی اتنے بھاگوں اور گنوں والی ہے کہ تو شہر
اور شہری کڑیوں کو بالکل بھول جائے گا۔ بھرا منظور نے
سارے پنڈ کی مخالفت مول لے کر صرف اور صرف بلو
کو اس لیے پڑھایا ہے کہ تجھے یہ نہ لگے کہ میری بیوی
پڑھی لکھی نہیں ہے۔" بے بے کے لہجے میں پیار اور
مان ہی مان تھا۔

"ہاں آئی بڑی کوکب خواجہ کی جانشین اور بھاگوان
تو اسی کے گھری دھان کی فصل کو ہاتھ لگائی تو وہ سونے
کی ہو جائے اور زیادہ سے زیادہ پنڈ کے تھرڈ کلاس
اسکول سے دس جماعتیں پڑھائی ہوں گی اور اماں تو
ایسے جتا رہی ہیں جیسے پی ایچ ڈی ہولڈر ہو۔" میں جل
کر سوچ رہا تھا۔



سارا گھر ہری نارنجی برقی مرچوں سے روشن تھا بس
میرے دل میں مستقل لوڈ شیڈنگ تھی۔

سارا ہفتہ میں نے یہ سوچتے گزارا تھا کہ جانے بلو
بیگم کیسی ہو گی کیسے ہنستی ہو گی کیسے چلتی ہو گی کیسے
بولتی ہو گی' رنگ تو اس کا گورا چٹا تھا مگر اللہ جانے وزن
میں کوئی کمی ہوئی یا گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ
اضافہ اور اس کے [illegible] میں بھی نہیں پایا تھا۔

پھر اس دوران میں تو موصوفہ بیٹھنے کے پانچ دن
اپنا ہو کے گھر ہی پائی جاتی تھی مگر میرے آنے پر گھر
میں پردے کی بو بن کر بیٹھ جاتی تھی کیونکہ پنڈ میں
منگ سے پردہ کیا جاتا ہے اور میں نے بھی اس کے
چھپنے پانے کا نوٹس بھی نہیں لیا تھا اور لیتا بھی کیوں
میں تو شہری شہزادہ تھا جسے بے بے نے ممتا اور مجبوری
کے کھونٹے سے بلو جیسی گنوار دیہاتن کے پلے سے باندھ
دیا تھا۔

"وے شیرے! تو ابھی تک تیار نہیں ہوا بارات
جانے والی ہے اور تو ابھی تک اجڑا اجڑا بیٹھا
ہے۔" چھیمی آپا! اپنے کسی لال پیلے کو چارپائیوں کے
نیچے ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھکے مجھے بھی ڈانٹ رہی تھیں۔

"بس آپا! تیار ہو رہا ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد میں آف وائٹ شیروانی جس پر
سیون کورے دبکے کا کام تھا ساتھ کامدار ملتانی کھسے اور
سیون اور آف وائٹ پگڑی جو ابا نے بطور خاص لاہور

سے منگوائی تھی پیچھے کھڑا تھا۔

یہ سارا تماشا دیکھنے کے لیے میں نے لاہور سے اپنے کسی دوست کو بلانے کی غلطی نہیں کی تھی اور دو بہنوں کی چھٹی کو بے بے کی بیماری کے کھاتے میں ڈال دیا تھا۔ حتیٰ کہ اپنے بیسٹ فرینڈ نوفل کو بھی نہیں۔

چاروں طرف بھڑکتے چمکتے کپڑوں والی عورتیں روتے لڑتے بچے اور کلف زدہ مردوں کا جم غفیر جمع تھا اور میں سب کے درمیان تماشا دکھانے والے بندر کی طرح کھڑا تھا۔ ساری آپائیں حلق پھاڑ پھاڑ کر "دیساں دا راجہ میرے بابل دا پیارا امڑی دے دل دا سہارا نی ویر میرا گھوڑی چڑھیا گھوڑی چڑھیا سیوں گھوڑی چڑھیا" گا رہی تھیں۔

اپنے آفت قیامت قسم کے بچوں کے ہوتے ہوئے اور اپنے اکلوتے اور چہیتے ویر کے ویاہ کی خوشی میں وہ شاید آگے کا گانا بھول گئی تھیں اور مسلسل اسی ایک لائن کی گردان دل و دماغ پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ اس طرح کے بے ہنگم اور بے تحاشا شور میں سب دروازے کی طرف کھنچ گئے۔

بے بے نے ماتھا چوم کر صدقہ دیا اور میں گھر سے باہر نکلا مگر ہائے یہ کیا اب اس سارے تماشے کے بعد اس کی بھی ضرورت تھی؟ میں نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے سامنے کے دل فریب منظر کو دیکھا۔

گھوڑی چڑھیا گانا صرف گانے کی حد تک نہیں تھا بلکہ حقیقتاً "دروازے پر ایک سفید گھوڑی گوٹے کا لال دوپٹہ اوڑھے کھڑی تھی اور شاید میرا ہی انتظار کر رہی تھی۔

"ابا! یہ دو گلیاں آگے تو جانا ہے۔ میں گھوڑی دیکھ کر بدکا۔"

"رسم ہے سالے صاحب جی! بھائی تو پڑے گی۔" بڑے بہنوئی نے مزہ لیتے مسکراتے ہوئے کہا۔

ان سارے لوگوں کو جنہیں میں نے اپنے شہری بابو ہونے کے زعم میں کبھی لفٹ نہیں کرائی تھی انہیں میری اس درگت پر دلی خوشی ہو رہی تھی۔ اور بالآخر مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اس گھوڑی پر سوار ہونا پڑا اور مجھے سو فیصد یقین تھا کہ میں اس گھوڑی پر سوار ایک سجا بنا گدھا لگ رہا ہوں گا۔

دو گلیوں کا فاصلہ آدھے گھنٹے میں طے ہوا کیونکہ ماسیوں، چاچیوں، تائیوں، ناسیوں کے بھوجوان پتروں نے لڈیاں ڈال ڈال کر سارے پنڈ کی دھرتی کو ہلایا ہوا تھا۔

گھوڑی پر بیٹھے بیٹھے جب میں زیر لب استغفراللہ استغفراللہ کا ورد کر رہا تھا تو ایک انوکھا خیال میرے دل میں آیا کہ کاش! یہ گھوڑی مجھے بھگا کر بلو کی پہنچ سے کہیں دور لے جائے مگر خیال گھوڑا بلکہ گھوڑی ابھی بھاگنے بھی نہیں پائی تھی کہ "گھر آگیا پتر!" کی آواز نے اس کی لگامیں کھینچ دیں۔

گھوڑی سے مجھے چار بندوں نے مل کر اتارا اور اندر لال تنبو میں لا کر بٹھایا۔ تھوڑی دیر میں مولانا صاحب تشریف لائے۔ قبول ہے قبول ہے قبول ہے کے بعد مبارک سلامت کا شور مچ گیا۔ پھر ہر ایرا غیرا نتھو خیرا مجھ سے گلے ملنے کو لپکنے لگا۔

پھر پہلے نے شرافت پر لیکچر دے کر مجھے عورتوں والے حصے میں بلوا بھیجا۔ دل دھک دھک کر رہا تھا اور دماغ سائیں سائیں۔ جانے کیوں مجھے یہ سب ابھی تک ایک خواب کی مانند ہی لگ رہا تھا کہ حسب معمول ابھی نوفل مجھ پر پانی کا پورا جگ ڈال کر کہے گا۔

"شیر افگن وڑائچ صاحب! اگر لاہور کے سارے گھوڑے گدھے بیچ لیے ہوں تو اٹھ جائیے۔"

اور پھر وہی نوفل کی صورت ہاسٹل کا کمرہ اور یونیورسٹی کی تیاری مگر نہیں یہ سب حقیقت تھی زندہ جاوید حقیقت۔

مجھے ایک کرسی پر لا کر بٹھایا گیا اور بلو بیگم کی سہیلیاں میرے ارد گرد ایسے منڈلانے لگیں جیسے چھتے کے گرد شہد کی مکھیاں۔

"نی دیکھو وے دولہا بھائی جان کتنے سوہنے ہیں۔ ہائے بلو دی تے لاٹری نکل آئی۔" ایک چنچلی سی سہیلی نے

"سلام دولہا بھائی جان!" ایک بھرکیلی نے ماتھے تک ہاتھ لے جا کر سلامی دی اور پھر سب کی سب ٹھٹھے لگانے لگیں۔

"وے مرجانیو! دولہا بھائی جان دی کوئی خاطر شاطر ہی کر دی کی؟" بالآخر ایک کو خیال آہی گیا۔ میں نے کل رات سے ٹینشن اور غصے کے مارے کچھ نہیں کھایا تھا۔

تھوڑی دیر میں بھرکیلی چنچلی دو عدد پلیٹیں لے کر نمودار ہوئی ایک میں گلاب جامن اور دوسری میں شربت کا گلاس رکھا تھا۔ میں نے جلدی سے ایک صحت مند سا گلاب جامن اٹھایا اور منہ میں ڈال لیا۔

"بے بے..." شدید غصے اور تکلیف کے مارے میرے حلق سے ایک دردناک چیخ برآمد ہوئی کم بختوں نے گلاب جامن کے اندر لال مرچ بھر رکھی تھی۔

میرے سر سے لگی اور تلووں پر بجھانے کے لیے میں نے جلدی سے شربت کے گلاس کو منہ لگایا مگر اس میں بھی نمک اور لال مرچ کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ چاروں طرف سے ہنسنے کی آوازیں آنے لگیں۔

ان آوازوں میں میری پانچوں آپاؤں اور بے بے کی آواز سن کر مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا کہ میری اس درگت کو وہ بھی انجوائے کر رہی تھیں۔

بے بے تو ہر کام میں پیش پیش تھی وہ اس وقت میری ماں کم اور بلو کی پھوپھی زیادہ لگ رہی تھیں۔

"دیکھا ہم شرط جیت گئیں۔ بجو کہتی تھی میرا دولہا پڑھا لکھا اور شہری ہے کہ تم لوگ اسے الو نہیں بنا سکو گی۔" پیچھے سے ایک فاتحانہ آواز آئی۔

میں غصے کے مارے کرسی سے یکدم کھڑا ہو گیا یعنی کہ شیر افگن وڑائچ عرف شیری کو ان دیہاتیوں کے ہاتھوں الو بھی بننا تھا میرا خون کھولنے لگا۔

"ناں بچے ناں! یہ تو بچیاں مخول کر رہی تھیں آج نہ کریں گی تو کب کریں گی۔ سکھیوں کا اتنا حق تو ہوتا ہے۔ لے تو یہ ٹھنڈا پانی پی اور بیٹھ جا۔" بے بے نے

کندھے سے تھام کر بٹھایا۔ "چلو کرو اب معاف ہو گیا۔ اب جو کسی نے میرے پتر کو ستایا تو چنگا نہیں ہو گا۔"

پانی کا گلاس پی کر میں پھر اٹھ کھڑا ہوا اور باہر تنبو میں آ گیا۔ ابھی واپسی کے گھوڑی پر سوار سفر کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ابا کے دروازے پر ایک نئی نکور کار آ کر کھڑی ہو گئی جسے رنگ برنگی جھنڈیوں سے سجایا ہوا تھا۔

معلوم کرنے پر پتا چلا کہ کار بلو بیگم کے اعزاز میں منگائی گئی ہے کیونکہ رسم کے مطابق نکاح کے بعد اسے چند گھنٹوں کے لیے رخصت ہو کر ہمارے ساتھ جانا تھا اور پھر واپس آجانا تھا۔

میں پہلے ہی گاڑی کے اندر جا کر بیٹھ گیا تھا اور دل ہی دل میں مسلسل کھول رہا تھا اور گرد کے ماحول سے بالکل بے پروا بلو کی بدتمیز سکھیوں نے رو رو کر آسمان سر پر اٹھایا ہوا تھا حالانکہ یہ عارضی رخصتی تھی انہوں نے اپنی سریلی آوازوں میں

"ساڈا چڑیاں دا چنبہ وے بابل اساں اڈ جاناں"

گا کر بلو کو گاڑی میں بٹھایا اور گاڑی روانہ ہو گئی۔ میں نے ایک بار بھی پیچھے دیکھنے کی زحمت نہیں کی اور گاڑی سے اتر کر جلدی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا پھر پگڑی اور شیروانی کی قید سے خود کو آزاد کر کے بستر پر گر گیا۔

کمرے میں آئے اور سکون کا سانس لیتے کچھ ہی لمحے گزرے تھے کہ بے بے کمرے میں داخل ہوئی۔

"ہائے ہائے پتر! یہ کیا حال بنا کر لیٹا ہے؟ خیر تو ہے نظر لگ گئی ہوگی سوہنا بھی تو اتنا لگ رہا تھا میرا شہزادہ!" بے بے نے زمین پر پڑی پگڑی اور بستر پر پڑی شیروانی کو دیکھ کر شور مچایا۔

"کچھ نہیں بے بے! تھک گیا تھا اور پھر یہ سب چیزیں پہننے کی عادت نہیں ہے اس لیے اتار کر رکھ دی۔" میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں بے بے کو تسلی دی۔

"چل فیر ٹھیک ہے پتر! مگر تو یہ سب پھر سے پہن لے۔ رسم کے مطابق رخصتی کے بعد تیری اور بلو کی

ملاقات ہوتی ہے۔ آؤ تم ایک دوسرے کو دیکھ لو چند باتیں کر لو۔"

بے بے کی زبانی پتا چلا کہ ساری فلم کا ڈراپ سین ابھی باقی رہتا ہے۔

"شیر! اپنی بلو ننھی سی تھی' جب اس کی ماں اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ میں نے ہی اسے ماں بن کے پالا ہے۔ بھرا منظور تو اسے دیکھ دیکھ کر جیتا ہے۔ میری بچی سیدھی سادی ہے آج کل کی کڑیوں والے چلتر نہیں آتے اسے اور تو اپنی کتابی باتوں کا رعب نہ ڈالنے بیٹھ جانا' چار اچھی باتیں کرنا تاکہ بچی کا دل ہولا نہ ہو پتر! کڑی جب اپنا سب کچھ چھوڑ کر آتی ہے تو سسرال والوں کو اسے پیار اور مان کے ساتھ اپنے گھر کا حصہ بنانا چاہیے۔ جتنا اسے اپنا سمجھو گے اتنا جلدی وہ اپنوں کو بھولتی جائے گی اور ہاں یہ انگوٹھی بھی اسے پہنا دینا۔ مجھے معلوم تھا تجھے تو خیال نہیں آنا تھا۔"

بے بے سارا سبق پڑھا کر اور ایک سرخ مخملی ڈبیا میرے ہاتھ پر رکھ کر جلدی تیار ہو کر باہر آنے کا حکم صادر کر کے چلی گئیں۔

اندر کمرہ ... کمرہ تھا جسے اس نے پلاسٹک کے پھولوں اور چمکیلی پتیوں سے خوب سجوایا تھا۔ میں پانچ منٹ تک دروازے پر کھڑا رہا اور پھر آر یا پار کا خیال کر کے اندر داخل ہو گیا۔

پلنگ پر ایک لال رنگ کی گٹھڑی لمبا سا گھونگھٹ نکالے پیروں تک بچھی بیٹھی تھی۔ لال رنگ کے سوٹ پر اتنے ستارے تھے کہ شاید کپڑے کو بھی سانس نہیں آ رہا تھا۔ گٹھڑی کا پھیلاؤ اس کے صحت مند ہونے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ میں نے دھیرے سے پلنگ کے قریب بیٹھ کر سلام کیا اور گھونگھٹ الٹ دیا وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ایک موٹی تازی گنوار سی ساتھن بنی بیٹھی تھی۔ گہری لال لپ اسٹک گالوں پر گلابی لالی بڑا سارا نتھ نکا جس نے آدھے سے زیادہ چہرے کو چھپا رکھا تھا۔ رنگ تو گورا چٹا تھا مگر موٹاپے نے ہر چیز کا بیڑا غرق کر رکھا تھا۔

اور پھر ایک چیخ کے ساتھ میں بستر سے اٹھ بیٹھا۔ بے بے کے جانے کے بعد چند گھڑیوں کے لیے میری آنکھ لگ گئی تھی اور ان چند لمحوں میں میں نے ہولناک خواب دیکھا تھا۔ انگوٹھی کی ڈبیا ابھی بستر کے سرہانے ہی پڑی تھی اور پگڑی اور شیروانی بھی ہنوز اپنی جگہ موجود تھی۔

میں نے سکھ کا سانس لیا مگر مجھے پتا تھا بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی جیسا میں نے ابھی ابھی خواب دیکھا تھا ایسی ہی حقیقت کا چند لمحوں کے بعد مجھے سامنا کرنا تھا۔

"کوری جی! بے بے کہہ رہی ہے جلدی سے تیار ہو کر ان کے کمرے میں آ جاؤ۔ تھوڑی دیر میں ماما جی بلو بھابھی کو آکر لے جائیں گے۔"

چھوٹی آپا نے دروازے میں سے منہ نکال کر خبرنامہ سنایا اور جلدی سے غائب ہو گئی۔ میں منہ بناتے ہوئے واش بیسن کی طرف چل دیا۔

کمرے میں داخل ہونے کے بعد جو منظر میری نگاہوں نے دیکھا وہ تو خواب والے منظر سے زیادہ چونکا دینے والا تھا۔

سلیقے سے کیا گیا میک اپ نفیس سا سونے کا سیٹ بلڈ ریڈ اور ڈل گولڈن کلر کا بہت پیارا سا لہنگا پہنے پلنگ پر ایک دبلی پتلی گوری چٹی خوب صورت سی دلہن بیٹھی تھی۔ گھونگھٹ پہلے ہی سے اٹھا ہوا تھا اور تھوڑی گھٹنوں پر ٹکائے وہ تھکی تھکی سی لگ رہی تھی جو میرا ہی انتظار کر رہی تھی۔ آہٹ پر پلکوں کو ذرا سا اوپر اٹھا کر دیکھا اور پھر جھکا لیا۔

اور میں شیر افگن وڑائچ دروازے پر ہی ایلفی کا اشتہار بنا زمین سے جڑا کھڑا تھا۔ پہلی نظر میں دیکھنے سے وہ کسی بھی اسٹائل سے پینڈو نہیں لگ رہی تھی' بڑی مشکل سے اپنے پیروں کو حرکت دی ایلفی سے آزاد کروایا اور پلنگ کے کنارے پر بیٹھ کر سلام کیا جواب میں دھیرے سے صراحی دار گردن کو ہلکی سی جنبش دی گئی۔

پلنگ پر بیٹھے بیٹھے پانچ دس منٹ کا وقفہ ہوا تو میں خود ہی ... کیونکہ میں بولتا بھی تو کیا بولتا۔ مجھے اپنے غصے' جھنجھلاہٹ اور احساس برتری سے بھرے جملے ... دہرانا تھا۔

"شیر افگن صاحب!" بلو نے سر اٹھا کر مجھے مخاطب کیا۔ بولنے کا اسٹائل بھی کافی بولڈ تھا۔ "آپ سوچ رہے ہوں گے کہ بے بے نے ایک اجڈ گنوار ساتھن آپ کے پلے باندھ دیا ہے اور شاید اسی وجہ سے آپ کمرے میں آنے سے بھی کترا رہے تھے مگر لگتا ہے کہ آپ اس بات سے قطعا" ناواقف ہیں کہ عقل' شعور' تعلیم' سلیقہ سب اللہ تعالیٰ کے ودیعت کردہ اوصاف ہیں اور وہ یہ نہیں دیکھتا کہ ان اوصاف کا مالک شہری ہے یا پینڈو۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں بریرہ منظور احمد جس نے ایم اے سائیکالوجی کیا ہے۔ اس کے علاوہ پینٹنگ' کوکنگ اور کمپیوٹر کے شارٹ کورسز بھی کر رکھے ہیں اور آج کل گاؤں میں لڑکیوں کے چھوٹے اسکول کی بنیاد ڈال رہی ہوں۔ پھپھو جب آپ سے رشتے کی بات کرنا چاہتی تھیں تو آپ کو سب بتا دینا چاہتی تھیں مگر میں نے انہیں منع کیا۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ آپ اپنی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ بنا کسی لالچ' صرف اپنوں کی خوشی کی خاطر کر سکتے ہیں کہ نہیں۔ کیونکہ پنڈ اور پنڈ والوں سے تو آپ کو شروع سے الرجی تھی مگر میرے لیے رشتے اپنی جگہ اور اپنے لوگ بہت اہمیت رکھتے ہیں۔" وہ دھیرے دھیرے بول رہی تھی اور میں ہونقوں کی طرح سن رہا تھا۔

"جب تمہارا نام اس قدر پیارا ہے تو سب تمہیں بلو کیوں کہتے ہیں؟" مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو میں نے عجیب سا سوال کر ڈالا۔

"شیر افگن صاحب! بلو مجھے پھپھو بچپن میں بہت پیار سے کہتی تھیں اور پھر جب انسان بڑا ہو جائے بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کر لے تو کیا پیاروں کا پیار چھوٹا ہو جاتا ہے؟ اس لیے مجھے ابھی بھی اسی نام سے پکارے جانا پسند ہے۔"

اس کے پاس مجھے لاجواب کرنے کے لیے ہر جواب موجود تھا۔

"لیکن مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ پنڈ میں رہتے ہوئے تم اتنی تعلیم یافتہ ہو سکتی ہو اور پنڈ میں ایسی کوئی خاص ترقی بھی نظر نہیں آئی پھر تم نے یہ ساری تعلیم کہاں رہ کر حاصل کی؟" میں نے اپنی بے خبری پر شرمندہ ہوتے ہوئے دریافت کیا۔

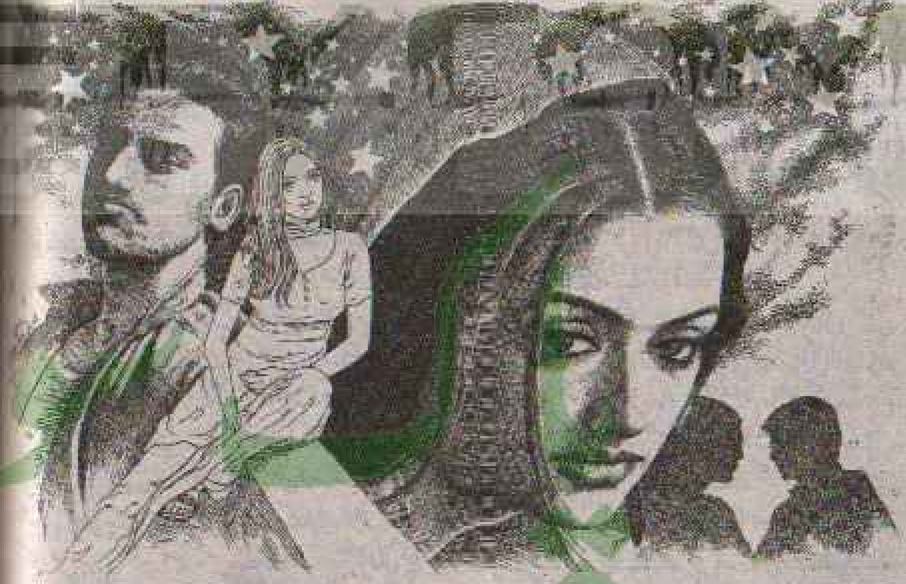
"آپ جیسے لوگ جو پنڈ میں رہنا پسند ہی نہیں کرتے انہیں یہاں کے حالات کی کیا خبر ہو گی اور زیادہ تر لوگ جو شہروں میں جا کر اعلا تعلیم حاصل کرتے ہیں وہ یہاں واپس آنا اپنی شان کے خلاف تصور کرتے ہیں تو پھر ان علاقوں میں ترقی کہاں سے نظر آئے گی۔ شاید آپ کو پھپھو کی زبانی معلوم ہوا ہو کہ اماں جی کے مرنے کے بعد ابا نے مجھے کس قدر ناز و نعم سے پالا ہے۔ میری کوئی خواہش کبھی رد نہیں کی۔ تعلیم حاصل کرنا میری اولین خواہش اور شوق تھا سو لاہور میں میری رشتے کی خالہ رہتی تھیں میں نے گاہے بہ گاہے وہاں رہ کر اپنی تعلیم مکمل کی اور مختلف کورسز کیے۔"

بلو اپنی بات مکمل کر کے خاموش ہو گئی شاید اسے یاد آ گیا تھا کہ وہ اس وقت دلہن کے روپ میں حجلہ عروسی میں بیٹھی ہے۔ بلو کی ساری باتیں برسات کی طرح میرے دل کی دھرتی پر کن من کن من برس رہی تھیں اور پنڈ کی اڑتی دھول اور گرد بھیگتی جا رہی تھی اب مجھے اپنا پنڈ اجلا اجلا نظر آ رہا تھا۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد مجھے واپس آکر اپنے پنڈ اور اس کے لوگوں کے لیے بہت کچھ کرنا تھا اور پھر بلو رانی کو ہمیشہ کے لیے رخصت کروا کر بھی تو لانا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے سوچا۔

اپنے خیالات سے بلو کو آگاہ کرتے ہوئے اس کے مہندی لگے ہاتھوں کو تھام کر بے بے کی دی ہوئی انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنا دی۔

بلو نے مسکراتے ہوئے انگوٹھی کو دیکھا۔ اس کی مسکراہٹ میں تشکر' اپنا پن اور اطمینان کی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ ✻



رخسانہ نگار عدنان

۵۵

پچپن ویں قسط

ان کی زندگی کا حاصل ان کے سامنے دھرا تھا اور انھیں اس سے کوئی بھی دلچسپی نہیں تھی۔

اتنے سال جب ان کے دماغ نے انتقام کا یہ طریقہ۔ سوچنا شروع کیا تھا۔ انہیں بہت پہلے پتا چل چکا تھا کہ محمود عالم ایک بیٹی کا باپ بن چکا ہے۔

وہ چند ہی سالوں میں اتنا اختیار، اتنی طاقت حاصل کر چکی تھیں کہ اگر چاہتیں تو محمود عالم کو کسی بھی اندھیری رات میں کسی اندھی گولی، کسی پاگل اندھا دھند بھاگتی گاڑی کے ٹائروں کے نیچے کچل سکتی تھیں مگر۔ محمود عالم کی موت تو ان کا مقصد نہیں تھا۔

وہ مر جاتا تو پھر کون دیکھتا۔ نیلم کامیابی، بلندی اور طاقت کے کس منصب پر فائز ہو چکی ہے، وہ کیا کیا کچھ کر سکتی ہے

وہ سب کچھ جس کا وہ خود بھی تصور نہیں کر سکتے۔

انہوں نے انتقام کے لیے ایک طویل اور صبر آزما شکل میں اپنایا۔

جس میں محمود عالم قطرہ قطرہ پگھل کر گھلتا۔۔۔ مرنا چاہتا مگر نہ مرتا۔ جینا چاہتا جی نہ سکتا۔ بس یہ ان کی خواہش تھی جس کی تڑپ نے انہیں اتنے سال گناہ کی دلدل میں دھنسے رہنے کے باوجود اس کی گندگی اور تعفن کو محسوس نہیں ہونے دیا۔

ورنہ وہ چاہتیں تو چند سال پہلے کوشش کر کے اس گناہ بھری دلدل سے آہستہ آہستہ باہر نکل سکتی تھیں لیکن اگر وہ ایسا کر لیتیں تو پھر آج یہ سب کرنے پر کیسے قادر ہوتیں؟

انہوں نے سلگتا سگار ایش ٹرے میں رکھا اور اپنے سامنے پڑا لفافہ اٹھا کر اس میں سے سی ڈی نکال کر دیکھنے لگیں۔

صرف ایک چھوٹا سا فیصلہ معمولی سا ارادہ ان کے اس شاطر اور صبر آزما انتقام کو پوری دنیا میں نشر کر سکتا تھا۔

عزہ کی ڈریسنگ روم اور اپارٹمنٹ کی وڈیو اور جس لڑکے کے ساتھ اس کی مکسنگ کی گئی تھی اس کا چہرہ کہیں نہیں تھا مگر اس کے باوجود یہ سین مکمل اور جامع تھا اور اس کے باوجود۔

اس کے باوجود وہ کون سی طاقت تھی جس نے انہیں اتنی بڑی خوشی اتنی طاقت ملنے کے باوجود نڈھال سا کر ڈالا تھا۔

بدن سے ساری توانائی نچڑ گئی تھی جیسے کوئی غبارے سے ہوا نکال دیتا ہے۔

انہیں لگا یہ ایک بے کار یا کل رذیل سی چیز ہے، جس نے ان کے اتنے سال کھا لیے۔ ان کی سوچیں ان کے خیالات سب کچھ اس بیکار سی شے کی نذر تو ہو گئے تھے۔

"اس کو محمود عالم دیکھے گا تو اس کا دل ایک جھٹکا بھی نہیں سہ سکے گا۔"

انہوں نے [illegible] کر کے اس شام کا [illegible] مقطعی کا سہارا لیے [illegible] چلتی عزہ سے بے خبر کمزور پتے کی طرح لرزتا ان کے سامنے کھڑا تھا۔

"وہ تو اس سی ڈی کا ایک سین نہیں دیکھ پائے گا اور مر جائے گا اور جب محمود عالم مر جائے گا۔ تو یہ دنیا کتنی خالی کتنی بے مقصد بے وجہ سی ہو جائے گی۔"

عجیب سی کیفیت ان کے اندر پیدا ہو رہی تھی۔

محمود عالم مر جائے۔ یہ تو انہوں نے اس وقت بھی بددعا نہ کی تھی نہ سوچا تھا جب وہ اسے دھوکا دے کر دوستوں کے ساتھ شمالی علاقہ جات کی سیر کو چلا گیا تھا۔

پھر اتنے سالوں بعد اتنی اذیت کرب اور تکلیف کے اتنے سال گزار چکنے کے بعد بھی ان کا دل یہ گوارا نہیں کر رہا تھا کہ محمود عالم مر جائے!

"تو پھر یہ کیا ہے؟" وہ سن ہو کر کھڑی ہو گئی۔

اپنی کیفیت خود ان کو ہی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

انہوں نے ہاتھ میں پکڑی سی ڈی کو کچھ دیر دیکھنے کے بعد پاس پڑے اپنے ہینڈ بیگ میں رکھ دیا۔

"وہ میری بلا سے جئے یا مرے مجھے اب اس سے کچھ غرض نہیں ہونی چاہیے جیسے عزہ کی زندگی اور موت سے دلچسپی نہیں رہی۔ کبھی بھی تو میں کیوں اس کے بارے میں سوچوں چاہے وہ زندہ رہے یا جہنم میں جلے۔۔۔ آئی ہیٹ

"اور اس نے جو کچھ میرے ساتھ کیا ہے اس کی سزا تو بھگتنی ہی ہو گی۔"

اگلے ہی لمحے وہ پہلے والی یاقوت بن چکی تھیں ظالم اور بے رحم!

انہیں تیار ہونے میں پون گھنٹہ لگا۔

سب سے ضروری کام انہوں نے اپنی اور لائبہ کی انگلینڈ کے لیے فرسٹ اویلیبل فلائٹ میں ٹکٹیں کنفرم کرائیں۔

"لائبہ آج آ جائے گی خود سے نہ بھی آئی تو اس تنزیل کے کتے کی موت مار کر میں اکیلی ہی نکل لوں گی۔ مجھے اب ان سب بدبختوں سے کچھ غرض نہیں ہونی چاہیے۔

محمود عالم عزہ کی سی ڈی دیکھ کر اور احسن مراد تنزیل کی لاش دیکھ کر جیتے جی مر جائیں۔ مجھے اس سے بڑی خوشی اور کہاں سے ملے گی۔ لائبہ اگر آج ملتی ہے تو ٹھیک ورنہ اسے بعد میں بھی بلایا جا سکتا ہے۔ اب میرا یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔"

کچھ دیر پہلے آنے والا فون کچھ اسی طرح کی بری خبریں دے گیا تھا۔ کہ ان کے گرد قانون کا گھیرا تنگ کیا جا رہا ہے۔ ان کی کچھ برانچز کئی دنوں سے حساس اداروں کے انڈر آبزرویشن میں ہیں۔ اس آبزرویشن کا آخری نتیجہ کیا نکلنا ہے یہ تو انہیں بھی معلوم تھا۔

انہوں نے کچھ سوچ کر احتیاطاً "اپنا دوسرا پاسپورٹ" کچھ دوسری ضروری سفری دستاویزات بھی اپنے بیگ میں رکھ لیں۔

اے ٹی ایم کارڈ چیک بکس اور کافی کیش ان کے بیگ میں پہلے سے موجود تھا اس کی انہیں فکر نہیں تھی۔

"اگر حالات کچھ ایسے ہوئے تو شاید میں سیدھا ایئرپورٹ ہی چلی جاؤں۔"

اس آخری خیال کے ساتھ انہوں نے کمرے میں موجود کچھ بھی ایسا جہاں سے ان کے قدموں کے نشان ڈھونڈے جا سکتے تھے سب ضائع کیا اور پھر اطمینان بھری آخری نظر اپنی تیاری پر ڈالی۔

آخری بار انہوں نے لائبہ کے فون پر ٹرائی کیا اس کا فون بند تھا۔

"کہیں لائبہ واپس تو نہیں چلی گئی؟" یکدم سے انہیں خیال آیا۔

انہوں نے جلدی سے جا کر لائبہ کے کمرے کی تلاشی لینا شروع کر دی۔

اس کا پاسپورٹ موجود تھا اور دوسری چیزیں بھی۔

"پھر وہ جا کہاں سکتی ہے؟" نئے سرے سے پریشانی نے آن گھیرا۔

"اور جہانگیر ہمدانی کہاں دفعان ہوا۔ اس دھمکی کے بعد اس کا بھی کچھ پتا نہیں۔"

"کہیں اس نے تو لائبہ کے ساتھ کچھ برا۔۔۔ نہیں نہیں اس میں اتنی جرأت نہیں ہو سکتی۔" انہوں نے فوراً سر جھٹک دیا۔

کچھ سوچ کر انہوں نے اسامہ کا نمبر ملایا۔

"اسامہ! میری بات دھیان سے سنو۔ تنزیل سے کہو لائبہ کو لے کر گھنٹہ بھر میں میرے گھر پہنچ جائے۔ ورنہ جو میں اس کے ساتھ کروں گی وہ الگ۔ جو میں تمہاری بہن عائشہ کے ساتھ کروں گی اس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا!" اس کی گمبھیر چپ پر وہ بولیں۔

"میں سن بھی رہا ہوں اور سمجھ بھی چکا ہوں میم اور مجھے بے حد افسوس ہے۔ میں آپ کا یہ پیغام تنزیل یا عائشہ کو یا

لائبہ کو کسی کو بھی نہیں دے سکتی کہ ایسا کرنے کے لیے مجھے آپ کے چہرے پر پڑا خوب صورت نقاب نوچنا پڑے گا اور مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں ہے... اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے لائبہ آپ کے بارے میں سب کچھ جان چکی ہو اور اب وہ آپ سے نظریں ملانے سے گریزاں ہو۔"

رک رک کر اسامہ نے وہ خوش نما حقیقت سے نقاب کھینچ ڈالا جس کو ایک ڈھب سے لائبہ کے سامنے پیش کرنے کے لیے انہوں نے ڈائری لکھی تھی۔

"وہ ڈائری، وہ ڈائری کہاں گئی؟" دوسرے لمحے ان کا ماتھا ٹھنکا۔

انہوں نے اسامہ کو کوئی جواب نہیں دیا اور فون بند کر دیا۔

انہوں نے لائبہ کے کمرے کی تلاشی لینا شروع کی مگر وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ ڈائری یہاں نہیں ہے۔

وہ تھک ہار بیٹھ گئیں اور سوچنے لگیں کہ انہوں نے آخری بار اس ڈائری کو کہاں رکھا تھا۔

بیگ میں انہوں نے وہ ڈائری خود رکھی تھی اس کے بعد وہ کہاں گئی بہت سوچنے پر بھی انہیں یاد نہیں آسکا۔

"کاش میں اس وقت جب لائبہ نے مجھ سے وہ ڈائری لی تھی۔ اسے اسی وقت دے دیتی وہ پڑھ تو چکی ہوتی۔"

انہیں پچھتاوا ہونے لگا۔

"اگر اس نے وہ ڈائری پڑھ لی ہوتی تو وہ ضرور میرے پاس آتی ایک بار تو پوچھتی... اس کا باپ۔"

ان کے دل میں کچھ چبھا تھا۔

وہ لائبہ کا باپ بھی تو ہے... اور اسی رشتے کے لیے بھی وہ جہانگیر ہمدانی کی منتیں کیا کرتی تھیں کہ وہ ان سے شادی کر لے تاکہ لوگوں کو بتا سکیں کہ لائبہ کا کوئی باپ بھی ہے۔

"کیا لائبہ کبھی نہیں جان پائے گی کہ اس کا باپ کون ہے؟" ان کے ماتھے پر پسینہ سا آگیا۔ عجیب فیصلے کی گھڑی [illegible]

[illegible] جہاں کہیں بھی ہے اپنی مرضی اور خوشی سے ہے [illegible] اور وہ بھی نہیں۔"

اس خیال سے ان کے دل کو اطمینان سا ہوا۔

ان کی تیاری مکمل تھی۔ ایک آخری نظر سب طرف ڈال کر وہ باہر نکل آئیں۔

وہ پہلے بھی جانے سے پہلے بتا کر نہیں گئی تھیں اور اس کی ضرورت تھی بھی نہیں۔ یہاں تھا کون جو ان کے آنے جانے کی خبر رکھتا یا منتظر رہتا تھا۔

وہ گاڑی میں آکر بیٹھ گئیں اور کتنی دیر یونہی پلٹ کر گھر کو دیکھتی رہیں۔

انہیں اس گھر سے کچھ خاص انسیت تو نہیں تھی مگر جانے کیوں لگ رہا تھا وہ دوبارہ یہاں نہیں آسکیں گی۔

ڈرائیور اور گن مین کو ان کے آنے کا پتا نہیں چلا تھا، دیکھتے ہی بھاگ کر آئے انہوں نے ہاتھ اٹھا کر دونوں کو منع کر دیا۔

"اب شاید مجھے کسی کی بھی ضرورت نہیں۔" انہوں نے ایک الوداعی نگاہ سب طرف ڈال کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

جانے سے پہلے انہیں ایک بار تو محمود عالم سے ملنا تھا وہ سی ڈی دینے کے لیے۔

☼ ☼ ☼

"بھائی! آپ جانتے ہیں امی کی طبیعت کتنی سخت گیر تھی اور اولاد کے ساتھ بھی ایک حد تک بے تکلفی کی

انکل تھیں... بابا آپ کے چلے جانے کے بعد گھر سے ہمارے انکل کا تعلق سے ہو کر رہ گئے تھے اور میں جیسے اکیلی رہ گئی تھی۔ دوست بھی میری کوئی نہیں تھی پھر جب یہ سب ہوا تو میں کسی سے بھی کچھ شیئر نہ کر سکی۔ میرا ایک غلط قدم مجھے ہر اگلا قدم اسی غلط سمت میں اٹھانے پر مجبور کرتا چلا گیا۔"

نظریں جھکائے اسامہ کو اپنی تکلیف دہ آپ بیتی کا کچھ حصہ بتا رہی تھی۔

"انہوں نے میرے انکار پر آخری حد پار کر ڈالی وہ سارا گند اٹھا کر گھر بھیج دیا اور امی تو اگلی سانس بھی نہ لے سکیں۔ ان کی آخری ملامتی نظریں میں کبھی بھی نہیں بھول سکتی۔"

اتنے سالوں بعد بھی وہ ماں کا نزع کا عالم بھول نہیں پائی تھی۔

"میں پاپا کو یہ سب کیسے بتاتی اور کیسے یہ برداشت کر سکتی تھی کہ وہ کیا کچھ پاپا کے ساتھ کر گزریں۔"

"وہ بھی۔" اسامہ خود کو کڑے امتحان سے گزار رہا تھا برداشت اور ضبط کے... اور جراحی کے عمل میں تو یہ سب ناگزیر ہے جب معاشرے میں اس قسم کے ناسور پلتے چلے جاتے ہیں تو پھر انہیں جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے غیرت کے دعوے دار والدین اور ایسی لڑکیوں کے گھر والے اگر تھوڑا سا خود پر جبر کر کے اس عمل سے گزر سکیں تو بہت کچھ نہ سہی مگر کافی حد تک اس ناسور کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔

"پھر کچھ بھی نہیں... میں میڈیا، ہوٹ اور ان کے گینگ کے ہاتھوں کھلونا بنتی چلی گئی۔" وہ بے حد دھیمی سی گھٹی آواز میں بدقت بولی۔

"اور تم یہ سب کہہ سکتی ہو تاکہ دوبارہ ان ظالموں پر ہاتھ ڈالنے کے لیے یہ ضروری ہے۔"

"نہیں بھائی!" وہ خوف سے لرز اٹھی۔

"تو پھر اب سب پھر کیسے ہو گا؟" وہ بے بسی سے بولا۔

"مجھے نہیں پتا... شرمندگی کے لیے بھائی اور نہیں بار بار میں اس اذیت سے نہیں گزر سکتی مجھے کسی گمنام کسی گوشے میں جہاں سے لوگ مجھے ڈھونڈ نہ سکیں نہ پہچان سکیں وہاں ڈال دیں مجھے اب اور کچھ نہیں چاہیے۔"

"تم جانتی ہو دنیا میں رہتے یہ ممکن نہیں۔"

"رہتے" وہ دہرا کر بولی "یعنی زندہ رہتے... تو مرا بھی تو جا سکتا ہے اور بے تحاشا لوگ مرتے ہیں تو میں کیوں نہیں؟"

"نہیں اب نہیں... اگر تم نے بہادری سے یہ سب کہنے کا حوصلہ کیا تو پھر زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کا سامنا بھی کرو۔"

"میں اتنی بہادر نہیں۔" وہ بھنچی ہوئی آواز میں بولی۔

"بننا پڑے گا تمہیں عائشہ! میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"میں نے بہت ضبط کیا ہے اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو..." وہ ذرا دیر بعد بولا۔

"میں نے یہ سب کچھ آپ کو اس لیے سنایا ہے کہ... میں اب کوئی بھی فیصلہ کرنے کے قابل نہیں ہوں خود سے۔"

"جانتا ہوں... اس لیے چاہتا ہوں اب تمہارے ساتھ کوئی اور ہو جس کے ساتھ مل کر تم آنے والی زندگی کا یہ فیصلہ پورے اعتماد اور بھروسے سے کر سکو۔" وہ نرمی سے بولا۔

"جی!" وہ حیرانی اور ناسمجھی سے اسے دیکھنے لگی۔
"میں تمہاری شادی کرنا چاہتا ہوں۔"
وہ بے یقین نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔
"یہ ممکن نہیں۔" بہت دیر بعد وہ سر جھکا کر بولی۔
"یہ ممکن ہے یا نہیں تم اسے مجھ پر چھوڑ دو۔ تم صرف یہ بتاؤ کہ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں اس فیصلے پر۔"
"ایسا نہیں ہو سکتا۔ آپ سمجھ کیوں نہیں رہے؟" اب کے وہ کچھ جھلا کر بولی۔
"تم اس بات کو جانے دو۔" وہ سرسری انداز میں بولا۔ "تمہیں کوئی پسند ہے تو مجھے بتاؤ۔"
"بھائی!" وہ بھونچکی سی رہ گئی۔ اسے امید نہیں تھی اسامہ اس سے یہ باتیں کرے گا وہ بھی بغیر کسی جھجک کے۔
"دیکھو اب وہ بات نہیں رہی ہے۔ اگر بابا زندہ ہوتے یا تمہاری والدہ تو شاید یہ سب مجھے اپنے منہ سے نہ کہنا پڑتا۔ تمہیں شاید میری بے تکلفی حیران کر رہی ہے مگر یہ ضروری ہے۔" وہ گہرا سانس لے کر بولا۔
"تنزیل کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" ذرا دیر بعد وہ پھر سے بولا۔ اور وہ اس کی شکل دیکھنے لگی۔
"میرا خیال ہے وہ تمہیں پسند کرتا ہے اور شاید تم بھی۔ ایم آئی رائٹ؟" وہ اس کے اس طرح دیکھنے پر پھر سے بولا۔
"ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ سر جھکا کر بولی۔
"اور اگر میں تنزیل سے خود بات کروں تو؟" وہ پھر سے بولا۔
"نہیں بھائی! بالکل بھی نہیں۔" وہ جلدی سے بولی۔
وہ لمحہ بھر کو خاموش سا رہ گیا۔
"تنزیل تمہارے بارے میں سب جانتا ہے۔" وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں بہت کچھ جتا گیا تھا۔ عائشہ کی نظریں اور بھی [illegible]
"اور اب تمہاری شادی اس سے ممکن ہے۔ وہ تمہیں پہلے سے جانتا ہے۔ تم سمجھ رہی ہو نا۔" اس کا سر مزید جھک گیا۔
"میں تنزیل سے بات کروں گا۔" وہ اس کے جھکے سر کو نیم رضامندی سمجھا تھا۔
"نہیں بھائی! بالکل نہیں۔" وہ تیزی سے بولی۔
"نہیں، میرے خیال میں اس میں کچھ بھی حرج نہیں۔" وہ اطمینان سے بولا۔ "اگر وہ تمہیں پسند کرتا ہے تمہارے بارے میں سب کچھ جانتا بھی ہے تو یقیناً وہ خود سے بات کرے گا لیکن ابھی وہ جاب لیس ہے تو شاید بات کرنے میں جھجک محسوس کرے یا اس معاملے کو ابھی ڈیلے کرنا چاہے تو اس لیے اگر میں خود بات کر لوں تو اس میں کچھ برائی نہیں۔"
"نہیں بھائی! میں ایسا نہیں چاہوں گی۔"
"تو تمہیں صرف یہ اعتراض ہے کہ میں تنزیل سے خود بات نہ کروں، تنزیل سے رشتے پہ تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے؟" اسامہ نے اسے گھیر لیا تھا۔
"نہیں۔ میں۔ یہ تو نہیں۔" وہ گھبرا گئی۔
"میں جانتا ہوں تمہیں اب کسی بھی معاملے پر فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اب ہوں تمہارے ساتھ۔

بک۔ تمہیں کسی سے ڈرنے کی بھی ضرورت نہیں، سیدھا یا قوت ہوں یا کوئی بھی تم سے ملنے آئے یا فون کرے تم سامنے نہیں آؤ گی۔ میں اب سب کچھ خود فیس کروں گا۔ تم گیٹ کھولنے بھی نہیں جاؤ گی۔ سمجھ رہی ہونا میری بات کو۔" وہ اسے ہدایات دے رہا تھا۔
وہ سر ہلا کر رہ گئی۔
"آج تنزیل آتا ہے تو میں اس کی بھی رائے لینے کی کوشش کرتا ہوں، یہ معاملہ جتنی جلدی طے ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔" وہ خود سے بولا۔
"بھائی! تنزیل کی فیملی۔ وہ خود۔ میرے خیال میں آپ ان سے کوئی بات نہ ہی کریں تو اچھا ہے۔" دروازے کے پاس رک کر متذبذب انداز میں عائشہ پھر سے بولی تو اسامہ یونہی سر ہلا کر رہ گیا۔
وہ لمحہ بھر کھڑی رہی پھر باہر نکل گئی۔
یہ تو اسے پتا چل گیا تھا اسامہ تنزیل سے بات ضرور کرے گا اور شاید تنزیل کچھ ٹائم کی مہلت لیتے ہوئے شاید مان بھی جائے مگر اس کی فیملی۔ یقیناً وہ عائشہ کا بیک گراؤنڈ جاننے کے بعد کبھی بھی ہامی نہیں بھریں گے۔
وہ سوچتی ہوئی کمرے میں آ کر بیٹھ گئی۔
"اور جو کچھ تانیہ کے ساتھ ہو چکا ہے اس کے بعد بھی۔" اس کے دماغ میں نئی سوچ ابھری۔
"اور انہوں نے تانیہ کو بھی گھر سے نکال دیا تو پھر مجھے کیسے اور کیونکر قبول کریں گے۔" ایک کے بعد ایک اندیشہ سر اٹھا رہا تھا۔
اس نے تھک کر آنکھیں بند کر لیں۔ ابھی کچھ بھی واضح اور یقینی نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

"بیبی! لوگ بڑے صاحب کے کمرے میں ہیں، جو مہمان آئے ہیں وہ بھی۔" ملازمہ نے عزہ کو جوس پیش کرتے ہوئے جواب دیا۔
"اور کون آیا ہے؟" وہ ملازمہ سے بھی نظریں ملا کر بات کرتے ہوئے دقت محسوس کر رہی تھی۔
"آپ کے ماموں کی فیملی اور نانا۔"
"اور دائم۔۔۔ دائم بھی ہے؟" اس نے دھڑکتے دل سے وہ بات پوچھی جو وہ بہت دیر سے پوچھنا چاہ رہی تھی۔
"جی وہ بھی ہیں، بلاؤں انہیں؟" وہ جیسے جان بوجھ کر بولی۔
عزہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔
اس کے اشارہ کرنے پر ملازمہ جا چکی تھی۔ اس نے جوس کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔
"اگر دائم نے خود سے کوئی فیصلہ کر لیا ہوتا۔ میں نے اسے آتے ہی کال کی تھی وہ مجھے کال بیک کرتا یا خود سے بھی اس کے دل میں ہے ذرا ت۔ پھر سوچنے کے بعد صبح سے اتنا ٹائم ہو گیا۔ وہ مجھ سے بات کر سکتا تھا یوں اس طرح اپنے پیرنٹس کے ساتھ آنا اور پھر مجھ سے ملنے سے گریز کرنا۔ اس سب کا کیا مطلب ہے؟"
اس کی ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئیں۔
"تو وہ فیصلہ کر چکا ہے اپنے منہ سے صرف مجھے نہیں سنا سکتا تو اس لیے اس کے پیرنٹس۔۔۔" اسے دھیرے دھیرے سب سمجھ میں آنے لگا۔
"جب سب کچھ کھو چکی ہوں تو دائم کو کھونے کا حوصلہ بھی تو میرے اندر ہونا چاہیے۔ اس وقت بابا! میرے دل و دماغ نے مجھے اس وسوسے سے ڈرایا تھا کہ یہ بھی ہو سکتا ہے دائم مجھ سے متنفر ہو سکتا ہے، ناراض ہو سکتا ہے اور

ناراض تو وہ تھا مجھ سے نہیں نے اس کی ناراضی کی کون سی پروا کی۔ اب مجھے اس کی نفرت سہنے کے لیے بھی خود کو تیار کرنا چاہیے اور اس کا انکار سننے کے لیے بھی۔“ اس کا دل اس خیال سے جیسے مٹھی میں آگیا۔

”نہیں یا اللہ! اتنا کڑا اتنا مشکل امتحان مجھ سے نہ دیا جائے گا۔ مجھ پر رحم کرنا۔ مجھے معاف کر دینا۔۔۔ دائم، دائم مجھ سے دور نہ ہو۔۔۔ وہ تو مجھ سے متنفر نہ ہو۔ میرا دل یہ سہہ نہیں پائے گا۔“ اس کا چہرہ اپنے ہی آنسوؤں سے بھیگنے لگا۔

”پاپا اور مما کی نفرت تو میرے لیے کچھ نئی نہیں۔ روز اول سے بس یہی کچھ تو سہتی چلی آرہی ہوں مگر دائم کی نفرت۔۔۔ نہیں، یہ میں برداشت نہیں کر پاؤں گی۔ میں اس سے معافی مانگ لوں گی۔ اس کے آگے ہاتھ جوڑ دوں گی جو وہ کہے گا کروں گی مگر وہ مجھے نہ چھوڑے۔“ وہ جذباتی انداز میں سوچتے ہوئے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

اگر اسے میرا یقین ہی نہ رہا ہو تو میری معافی اور میری منت اسے کیا مجھ پر بھروسا کرنے دے گی۔ ہرگز نہیں۔“ اس خیال نے جیسے اس کے جسم کو بے جان سا کر دیا۔

”اب اس طرح کے بہت سے انہونے اور ناقابل یقین لمحے میری زندگی میں بار بار آنے والے ہیں۔ ایک کے بعد دوسرا۔ میرے ایک فعل کا مسلسل نتیجہ بن کر تو مجھے ان سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ مجھے بہادری کے ساتھ ان سب لمحوں کا سامنا کرنا ہے۔ گھر سے جانے کا فیصلہ بھی میرا تھا اور اس کی صلیب بھی مجھے ہی اٹھانی ہے۔ اب جو بھی ہو خواہ پاپا مجھے گھر میں رکھیں یا نہیں، دائم مجھے اپنائے یا نہیں۔ مجھے ان سیاہ راتوں کا کفارہ ادا کرنا ہے۔ مکمل بہادری کے ساتھ سب کچھ فیس کرتے ہوئے۔“

لمحے بھر کی سوچ نے جیسے اسے صدیوں کی توانائی دے ڈالی۔

اس نے بڑے اطمینان سے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے بال سنوارے۔ اپنے روئے ہوئے چہرے پر ذرا سی بشاشت پیدا کی۔ تین چار گہرے گہرے سانس لے کر پھر سے خود کو یاد کرایا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔

وہ بظاہر مضبوط قدموں سے چلتی ہوئی محمود عالم کے کمرے تک آگئی تھی۔

[illegible] قبولیت یا حقارت جو بھی اس کا مقدر بننے جا رہا تھا۔۔۔ وہ سب کچھ اپنے کانوں سے سننا اور آنکھوں سے دیکھنا تھا۔ [illegible] خواب سی بے یقینی رہی نہ تھام سکے۔

مگر کمرے کے باہر پہنچتے ہی اسے جس طرح کے انکشافات سننے کو ملے لمحہ بھر کو وہ سب کچھ بھول گئی۔

☼ ☼ ☼

”میں اندر آسکتی ہوں۔“ وہ دائم سے ملنے کے لیے تیار ہو کر باہر نکل رہا تھا جب دروازے پر اسے دیکھ کر تانیہ رکتے ہوئے بولی۔

”ہاں آجائیں۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

چند ہی دنوں میں ایک نہ کہہ سکنے والی انسیت پیدا ہو چکی تھی۔

وہ کمرے میں آکر کرسی پہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔

”آپ کو شاید کچھ کہنا ہے مجھ سے؟“ ذرا سے انتظار کے بعد وہ اسے دیکھ کر بولا۔

”جی کہنا تو ہے مگر سمجھ میں نہیں آرہا۔“ وہ انگلیاں موڑتے ہوئے بولی۔

”آپ کو جو کہنا ہے بلا جھجک کہہ سکتی ہیں۔“ وہ نرمی سے بولا۔

”سب کچھ تو آپ جانتے ہیں۔“ وہ گہرا سانس لے کر بولی۔

”تو پھر۔۔۔“ اسامہ سمجھا نہیں۔

”مجھے پتا ہے ابو اب مجھے کبھی قبول نہیں کریں گے نہ گھر آنے دیں گے اور ظاہر ہے میں یہاں تو پڑی نہیں رہ سکتی“ وہ رک رک کر بولی۔

”مگر تنزیل نے تو۔۔۔“ اس نے کہنا چاہا۔

”تنزیل کی بات ابھی رہنے دیں۔ ابھی اسے خود اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے اور میں اسے اپنی وجہ سے مزید کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی۔“

”تو پھر کیا کریں گی آپ؟“

”فی الحال کہیں رہنے کا بندوبست ہو جائے تو اس کے بعد چھوٹی موٹی جاب کر لوں گی۔“

”پھر اس کے بعد؟“ اسامہ اسے دیکھ کر بولا۔

”اس کے بعد کچھ بھی نہیں۔ بہت طلب نہیں ہے مجھے زندگی سے۔“ وہ سادگی سے بولی۔ اسامہ اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس کے چہرے پر ایک مستقل حزن کی کیفیت ٹھہری گئی تھی جیسے وہ ابھی بہت سے آنسو بہا کر بیٹھی ہو اور اب اس کی آنکھیں آنسوؤں سے خالی ہو چکی ہوں۔

”اور جو۔۔۔ میڈم یاقوت اور جہانگیر پر آپ کیس کرنے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ وہ کیا پیچھے ہٹ گئیں؟“ اسامہ جتا کر بولا۔

”میں اکیلی کیا کر سکتی ہوں۔“ وہ بے بسی سے بولی۔

”اکیلی کیوں۔۔۔ میں جو ہوں آپ کے ساتھ۔“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا اور تانیہ اسے حیرت بھری نظروں سے دیکھتی رہ گئی۔

”میرا مطلب ہے میں آپ کا اس کیس میں ہر طرح سے ساتھ دوں گا۔“ وہ اگلے ہی لمحے وضاحت دیتے ہوئے بولا۔

تانیہ کی نظریں جھک گئیں۔

[illegible] اس دل نادان نے کتنا کچھ سوچ اور اخذ کر لیا تھا اور یہ سچ تو اس دل نے اس کے دل میں جڑ پکڑ چکی تھی جب وہ پہلی بار اس سے ملی تھی پھر آنے والی بہت سی راتوں میں اس نے اسامہ کے بارے میں بہت کچھ سوچ ڈالا تھا۔

اس کے چہرے پہ شاید انہیں سوچوں کا عکس نمایاں ہو رہا تھا جو اسامہ بھی یک ٹک اس کو دیکھتا چلا گیا۔

”کیا سوچنے لگیں آپ؟“ وہ آہستگی سے بولا۔

”نہیں کچھ بھی نہیں۔ میرے پاس سوچنے کو ہے ہی کیا؟“ وہ ہارے ہوئے لہجے میں بولی ابھی ابھی دل جس خوش فہمی میں جلا ہوا تھا وہ لمحہ بھر میں ہوا کا رزق بن چکی تھی اب پھر اس کے ہاتھ خالی تھے۔

”بہت کچھ ہے کیوں نہیں ہے اور کچھ نہیں تو ایک ہینڈسم و جیہہ نوجوان آپ کے سامنے بیٹھا ہے آپ اس کے بارے میں سوچ سکتی ہیں۔“ وہ مذاقاً بولا اور تانیہ کے دل میں جیسے اس کا مذاق ترازو ہو گیا۔

”کیا اس نے میری سوچوں کو پڑھ لیا ہے۔ کچھ دنوں سے وہ سب جو چوری چھپے میں اس کے بارے میں سوچتی چلی جا رہی ہوں۔“

”آپ کو برا لگا کچھ؟“ وہ پھر سے بولا تو وہ اس حد تک اس کی سوچوں کو پڑھنے کے قابل ہو چکا تھا۔ تانیہ نے گھبرا کر اسے دیکھا۔

”نہیں اس میں برا لگنے والی کون سی بات ہے؟“ وہ پھیکے سے لہجے میں بولی۔

”تو اچھا لگنے والی تو ہے نا!“ وہ مسکرا کر بات سے بات نکال کر بولا۔ ”میں آپ کو کیسا لگتا ہوں؟“ اس نے

اچانک سے پوچھ ڈالا۔

لمحہ بھر کو تانیہ سُن سی ہو گئی جیسے کسی نے اس کے دل کے اندر جھانک لیا ہو وہ اسامہ سے نظریں نہ ملا سکی۔

"تانیہ!" اس کی خاموشی پر وہ آہستگی سے بولا۔

"آپ شاید کہیں جا رہے تھے میں نے آپ کا کافی ٹائم لیا۔" وہ ایکدم سے کھڑے ہو کر بولا۔

اسامہ اسے دیکھتا رہ گیا۔

کشمکش میں تو وہ بھی مبتلا تھا جب سے تانیہ سے ملا تھا مگر وہ یہ سب سوچنا نہیں چاہتا تھا۔

وہ اس سے تو پوچھ بیٹھا تھا مگر خود سے پوچھتے ہوئے کترا رہا تھا، ابھی تو اس کے دل کو انوکھی سی لگی تھی چونکا دینے والی۔

لائبہ کے بعد وہ پہلی لڑکی تھی، جس کے بارے میں اس کا دل سوچنا چاہتا تھا، ہر وقت اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔

"لائبہ کے بعد کیوں؟ لائبہ سے زیادہ تو کوئی بھی نہیں ۔۔۔ اور ابھی مجھے لائبہ سے بات کرنی ہے ۔۔۔ ایک بار تو پوچھنا ہے اس سے ۔۔۔" وہ یکدم سوچ کا زاویہ بدل کر خود سے کہنے لگا۔

"اور اس کے بعد ۔۔۔ اگر اس نے پھر بھی انکار کر دیا تو ۔۔۔ اور میں نے تو اس سے کہہ رکھا تھا میں عمر بھر انتظار کرتا رہوں گا تو وہ انتظار کیا تانیہ کو دیکھتے ہی بدل گیا؟" وہ اپنی سوچ کی تبدیلی پہ خود ہی حیران رہ گیا۔

"آپ پلیز میرے لیے کہیں اور رہائش کا بندوبست کر دیں۔ میں جلد سے جلد یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔"

تانیہ جاتے ہوئے کہہ کر گئی تو اسامہ اسے جواب میں کچھ کہہ نہیں سکا فی الحال وہ کسی سے کوئی بھی جھوٹا دلاسا دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

"پتہ نہیں کب اپنے ٹھکانے پر آئیں گی۔" اس کا ذہن بھٹکنے لگا۔ "لائبہ کا گریز، اس کا بار بار انکار اور میں اس کے منہ سے کیا سننا چاہتا ہوں۔" گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے بھی وہ الجھن اس کے اعصاب پہ سوار رہی۔

"مجھے آج ہی کال میں یہ فیصلہ کر لینا چاہیے ۔۔۔ تانیہ کو کہیں اور بھیج دینا چاہیے ۔۔۔ ماشہ کے لیے تنزیل سے بات کرنا بھی ضروری ہے چیزوں کو ٹھکانے پر لانے کے لیے کوشش بھی تو کرنا پڑتی ہے۔" اس کے دل میں موہوم سی امید پیدا ہوئی کہ وہ چیزوں کو جلد ہی ان کے اصل ٹھکانے پر لے آئے گا۔

اور اطمینان سے ڈرائیو کرنے لگا۔ اسے دائم سے مل کر ابھی یہ سب کچھ ڈسکس کرنا تھا۔

☆ ☆ ☆

لمحہ بھر کو تو ان کا جی چاہا فی الحال واپس پلٹ جائیں۔

ہوا سے ہلتا پردہ اندر کا منظر دکھا چکا تھا۔

ان سے چند قدم آگے ان کی طرف پشت کیے تنزیل کھڑا تھا۔ تنزیل مراد ۔۔۔ جس کی وہ ابھی اور اسی وقت حالات کی نزاکت کا خیال کیے بغیر بھی گردن دبوچ لینا چاہتی تھیں۔

مگر اندر کمرے میں محمود عالم کے ارد گرد مصطفیٰ، ڈاکٹر خشندہ، دائم، سارہ کے ساتھ احسن مراد، یاسمین اور آغا فیاض بھی موجود تھے۔

اتنے سارے لوگوں کا بیک وقت سامنا کرنا ۔۔۔ اگرچہ وہ سب ہی ان کے مجرم تھے مگر وہ ان سے یوں باز پرس کے بارے میں سوچ کر نہیں آئی تھیں۔

"کیوں نہیں ہو سکتا یہ؟" سارہ کی دھاڑ نے ان کے خیالات کو بریک لگائی۔

"کم از کم میرے جیتے جی یہ ممکن نہیں سارہ بیگم!" خوب چبا کر مگر قدرے مدھم آواز میں ساتھ محمود عالم

واپس سے سارہ اور اس کے ساتھ بیٹھے احسن اور یاسمین کی طرف دیکھ کر بولے۔

"اور میں یہ کر کے دکھاؤں گی، تنزیل اور عزہ کی شادی ۔۔۔" وہ اپنے ازلی ہٹ دھرم لہجے میں بولیں۔

اور لاؤنج کے آخر میں کھڑی [illegible] کو چوکھٹ کو تھامنا پڑا۔

وہ تو یہاں کچھ اور ہی سوچ کر آئی تھی۔

یہ تو اس کے خواب و گمان میں بھی نہیں تھا۔ "کیا مما ابنارمل ہو چکی ہیں؟" پہلا خیال اس کے دل میں یہی آیا۔

"تم پاگل ہو چکی ہو خبطی عورت!" محمود عالم نے اس کی سوچ کو الفاظ کا روپ دیا۔ ان کے لہجے کی حقارت اور بیزاری سب ہی پر عیاں تھی۔

"پاگل ہوں یا خبط الدماغ آپ کی طرح عمر بھر دھوکا نہیں کھاتی رہی۔ ان جیسے خود غرض اور مطلبی دوستوں کے ہاتھوں۔" سارہ کو مصطفیٰ سے بدلہ لینے کا موقع مل گیا تھا۔

مصطفیٰ نے ایک نظر اسے دیکھا اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"میرے خیال میں محمود! مجھے اب اجازت دو۔" وہ دائم کے چہرے کی طرف دیکھے بغیر بولے جہاں کچھ اور ہی تحریر تھا۔

محمود عالم نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

وہ خفت بھرے انداز میں پھر سے بیٹھ گئے۔

"اور محمود عالم! میں نے کبھی دھوکا کھایا بھی نہیں۔ پہلے دن سے مجھے یقین تھا کہ تم مجھ سے نہیں نیلم سے محبت کرتے ہو اور تم جانتے ہو میرا یہ یقین کتنا حقیقت پر مبنی تھا۔" وہ اپنے حساب کتاب کھولتے ہوئے بولیں۔

"اور میں یہ بھی جانتی تھی۔ تمہارا یہ جگری دوست تمہارے کینے کا ساتھی ہے تب ہی تمہیں ایسی ہی سوچ پر ضرور دھوکا دے گا۔" وہ نفرت سے بولیں۔

"آپ اپنی حد میں رہیں۔" مصطفیٰ نے اس طرح کی ذلت کب سہی تھی۔

"خیر مجھے ضرورت بھی نہیں آپ جیسے شخص کے منہ لگنے کی میرے خیال میں اب آپ جا سکتے ہیں۔" وہ اسی انداز سے بولیں۔

"یاسمین! اٹھو آ کر ادھر بیٹھو۔ تنزیل نہیں آیا؟" وہ یک بیک لہجہ بدل کر مٹھاس بھرے انداز میں بولیں۔

"اس کا نام مت لو میرے سامنے۔" محمود عالم ایکدم سے بھڑک کر بولے۔

"صرف نام نہیں محمود! اب وہ آپ کا بیٹا اس گھر کا حصہ بھی بننے والا ہے بہتر ہے آپ اپنے دل کو سمجھا لیں۔"

سارہ بڑے آرام سے بولیں۔

"تم جانتی ہو تنزیل کون ہے؟" محمود نفرت سے بولے۔

ان کے انداز میں کیا تھا، لمحہ بھر کو کمرے میں سانپ سونگھ گیا۔ اٹھتے ہوئے مصطفیٰ پھر سے بیٹھ گئے۔

"کون ہے مجھ سے بڑھ کر اور کون جانے گا۔ میرا بھتیجا ہے میرے بھائی کا اکلوتا بیٹا۔" ایسا فخر عمر بھر میں کبھی سارہ کو اپنے بھائی کے لیے محسوس نہیں ہوا تھا جیسے اس وقت تنزیل کے لیے ان کے لہجے میں تھا۔

"کیا آپ کو نہیں پتا۔" وہ اتراتے ہوئے بولیں۔

"وہ تمہارے بھائی کا بیٹا نہیں ۔۔۔ بلکہ اس کا کچھ بھی نہیں۔" وہ ڈرامائی انداز میں بولے۔ سارہ بھلا کیا سمجھتیں سبھی ان کی طرف دیکھ کر رہ گئے سوائے احسن مراد کے۔

"کیا ۔۔۔ کیا کہہ رہے ہیں؟ طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی مجھے آپ کی۔" سارہ ہکلا کر بولیں۔

باہر کھڑے تنزیل کے دل کی دھڑکنیں اتھل پتھل ہو رہی تھیں۔ اس کا چہرہ لمحہ بہ لمحہ سرخ ہوتا جا رہا تھا۔

وہ اس جگہ سے بھاگ جانا چاہتا تھا مگر کسی ان دیکھی قوت نے اس کے دونوں پاؤں جیسے زمین کے ساتھ باندھ دیے تھے۔

"وہ کسی کا بھی بچہ نہیں۔۔۔ وہ رات کے اندھیرے میں ویرانے سے اٹھایا گیا وہ وجود ہے سارہ بیگم! جسے عام طور پر پیدا کرنے والی مائیں کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا کرتی ہیں۔ میری بات کا یقین نہیں تو سامنے کھڑے اپنے اس بھائی سے پوچھ لو۔ کیا میں نے غلط کہا؟" بہت عرصے کے بعد آج انہیں احسن مراد کو یوں ضرب لگانے کا مزہ آیا تھا۔

احسن مراد کا سر جھکتا چلا گیا اور یاسمین کی آنکھوں میں جیسے مرچیں سی بھرنے لگیں۔

"بکـ۔۔۔ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ جھوٹ غلط بکواس۔" سارہ بے یقینی سے دیکھتی اٹک اٹک کر بولی۔

"مجھ سے نہیں، اپنے بھائی سے پوچھو۔ اب تو ان کو سچ بول دینا چاہیے۔ اب تو وہ آئینہ انہیں بھی دیکھ لینا چاہیے۔ جو وہ شاید تنہائی میں بھی نہیں دیکھتے ہوں گے۔ ایک حرام کا بچہ گود لے لیا۔"

"بس کریں بھائی صاحب!" یاسمین کی ممتا تڑپ کر آگے بڑھی۔

"تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ پوچھو اپنے اس شوہر نامدار سے۔" جانے کیوں انہیں اذیت دینے میں مزہ سا آیا۔

خود اذیت کا ایک دریا عبور کر آئے تھے مگر احساس کی دولت سے شاید ابھی بھی محروم تھے۔

"کیا حقیقت اب بھی سامنے نہیں آنی چاہیے یاسمین بھابھی؟" وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے۔

"احسن مراد! محمود کیا کہہ رہا ہے بتاؤ مجھے۔" ثریا بانو کو کسی نے جیسے جھنجوڑ ڈالا تھا۔

احسن خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھ کر رہ گئے۔

"اور تم نے مجھ سے اتنی بڑی بات چھپائے رکھی۔۔۔" وہ صدمے سے بے جان ہی ہو گئیں۔

"کہاں سے [illegible] اٹھا کر لائے تھے اور کیوں؟" وہ ان کا [illegible] اذیت سے بولیں۔

احسن مراد [illegible] رات کا آخری پہر آیا۔

جب فضا میں ہر طرف حی الفلاح کی صدائیں گونج رہی تھیں اور وہ نماز پڑھنے کے لیے مسجد جانے کے لیے گھر سے نکلے اور تولیے میں لپٹے اس وجود کی رونے کی آواز جانے کیسے ان کا دل تڑپا گئی۔ وہ کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر اسے بانہوں میں بھر کر اندر لے گئے اندر جہاں ان کی زچہ بیوی جس نے رات کے آخری پہر تانیہ کو جنم دیا تھا ابھی ابھی تو وہ ان کے کانوں میں اذان دے کر نکلے تھے کہ یہ بچہ۔۔۔ وہ فوری طور پر کچھ بھی نہ سوچ سکے اور اسے لا کر یاسمین کے پہلو میں اس بچی کے ساتھ لٹا دیا۔

یاسمین کے سوال بچے کو دیکھتے ہی دم توڑ گئے۔

اور صبح سارے میں یہ خوش خبری گردش کر رہی تھی کہ احسن مراد اور یاسمین کے گھر جڑواں بچے پیدا ہوئے ہیں۔

حتیٰ کہ ثریا بانو بھی اس حقیقت سے لاعلم رہیں۔ وہ ان دنوں شدید بیمار تھیں اور یاسمین کے ساتھ نہ تو ہسپتال جا سکیں اور نہ ان لمحوں میں ان کے پاس تھیں۔

"تو یہ تھی میری حقیقت۔۔۔" جانے کس قوت نے اس کے قدم زمین سے اکھیڑے تھے وہ وحشت زدہ آنکھیں لیے احسن مراد کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"تو اس لیے آپ کو مجھ سے اتنی نفرت تھی؟" وہ رک رک کر بولا۔

"تن۔۔۔ نہیں۔" لفظ احسن مراد کا ساتھ نہیں دے پائے۔

"یا نہیں۔۔۔ کیا اس بات کو جھٹلا سکتے ہیں آپ؟" وہ زور سے چیخا۔

"تن۔۔۔ نہیں تنزیل میرے بچے! یہ یہ جھوٹ بول رہے ہیں۔" یاسمین پاگلوں کی طرح اسے اپنے ساتھ لپٹا کر بولیں۔

"تم میرے بیٹے ہو۔۔۔ میری جان ہو۔ میں نے تمہیں پیدا۔۔۔" وہ بولتے بولتے ایک دم سے رک گئیں۔

"مجھے پیدا کیا تھا آپ نے؟" وہ یکدم ان سے الگ ہوتے ہوئے بولا۔

اور یاسمین سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

نظریں کسی بھاری بوجھ سے جھک گئیں۔

"ان سے کیا پوچھتے ہو ان میں سچ بولنے اور بتانے کی ہمت ہوتی تو یہ اس رات جب تمہیں اپنے دروازے کے آگے سے اٹھا کر لائے تھے تو اپنی سگی ماں سے نہ بول دیتے کہ اس کے گھر صرف پوتی پیدا ہوئی ہے جڑواں بچے نہیں۔"

محمود عالم طنز کا نشتر چبھو کر بولے۔

"جب بڑی ماں! یاد ہے نا آپ کو آپ نے اپنی بیماری کی شدت میں مجھے اسپتال بھیجا کہ ان کی کوئی اطلاع نہیں آئی جا کر پتا کروں۔" وہ یوں بول رہے تھے جیسے بیماری ان کے قریب آئی ہی نہیں تھی۔

"اور اسپتال میں مجھے بتایا گیا کہ یاسمین نے بیٹی کو جنم دیا ہے اور انہیں ڈسچارج کر دیا گیا ہے۔ میں گھر کی طرف پلٹ آیا۔ ابھی کچھ دور تھا کہ میں نے جو منظر دیکھا۔۔۔" وہ رک گئے۔

"اور پھر بھی تم چاہتی ہو کہ میں اپنی بیٹی کی شادی اس لڑکے سے۔ جس کے حسب کا پتا ہے نہ نسب کا جو کسی کے گندے اعمال کا ثمر ہے۔"

"چپ کر جائیں بھائی صاحب! خدا کے لیے چپ کر جائیں۔ آپ میرے بچے [illegible]"

یاسمین [illegible] محمود عالم [illegible]

"یا میرے [illegible] حقیقت چھپ جائے گی؟ [illegible]" ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔

"نہیں۔۔۔ اب یہ بات چھپ سکتی ہے اور نہ میں اسے برداشت کروں گا۔" وہ اسی نفرت بھری نظروں سے تنزیل کو دیکھ کر بولے جس سے وہ ہمیشہ آج تک اسے دیکھتے آئے تھے۔

اور تنزیل کو یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا پورا وجود کسی گٹر سے برآمد شدہ تعفن میں لپٹا ہے۔

اور سب لوگ ناک منہ کے آگے ہاتھ رکھے اسے ترحم اور نفرت کی ملی جلی کیفیت سے دیکھ رہے ہیں۔

"لیکن میں صرف اتنا جانتی ہوں۔ یہ میرا بیٹا ہے۔ جس لمحے سے یہ میری گود میں آیا میں نے اسے کبھی خود سے الگ نہیں سمجھا۔ کیا ہوا جو میں نے اسے پیدا نہیں کیا۔ رشتہ صرف پیدا کرنے والے کا نہیں ہوتا پالنے والے کا بھی ہوتا ہے۔" یاسمین اپنا چہرہ صاف کر کے مضبوط بے لچک آواز میں بولیں۔

وہ غیر محسوس طریقے سے تنزیل کے آگے کسی ڈھال کی طرح کھڑی ہو گئی تھیں۔

"اور مجھے اس کے حسب نسب کسی بھی چیز کی ضرورت نہیں۔ یہ میرا بیٹا ہے اور میں اس کی ماں ہوں۔ اس کے پیچھے کیا حقیقت ہے یا کہانی اور اس کے کیا نتائج ہیں مجھے ان میں سے کسی بھی بات سے کوئی غرض نہیں۔"

وہ رک رک کر کہتے ہوئے پھر سے اسے اپنے پیچھے چھپاتے ہوئے بولیں۔

کمرے میں موت کی سی خاموشی چھا چکی تھی۔

میڈیا قوت وہیں جمی کھڑی تھیں۔

ہوا ہے بار بار بلتا رہ ان کی مستعدی سے سب کو آگاہ کر چکا تھا مگر شاید اس وقت کوئی بھی ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

اور وہ خود جیسے اس انکشاف کے تانے بانے سے الجھ کر رہ گئی تھیں۔

"ٹھیک ہے تم لوگوں کو فرق نہیں پڑتا تو نہ پڑے پہلے بھی کون سا پڑا تھا۔ یہ تو خاندانی اور عالی نسب لوگوں کی باتیں ہیں۔" محمود عالم تھکے ہوئے انداز میں کہہ کر تکیے سے ٹیک لگا گئے۔

"اور میں اس سے نہ اب نہ آئندہ بھی کوئی تعلق رکھنا چاہوں گا۔" وہ سارہ کو دیکھ کر بولے۔

"تمہاری بیٹی نے محمود عالم! جیسا خاندانی کام کیا ہے اس کے بعد یہ اتنی بڑی بڑی باتیں تمہارے منہ سے اچھی نہیں لگتیں۔"

جانے ثریا بانو نے تنزیل کو اپنانے کے بارے میں کیا فیصلہ کیا تھا مگر اس لمحے انہوں نے محمود عالم کو یاد دلانا ضروری سمجھا کہ وہ کون سا حادثہ ہے جس نے اسے بستر پر ڈال رکھا ہے۔

محمود عالم جواب میں لمحہ بھر کو کچھ بول ہی نہ سکے۔

تنزیل آہستگی سے یاسمین کے ساتھ سے ہٹ کر جانے لگا۔

"ٹھہرو ابھی یہ کہانی مکمل نہیں ہوئی۔" ڈاکٹر رخشندہ نے آگے بڑھ کر تنزیل سے کہا۔

سب بے اختیار چونکے تھے۔

"جس وقت مجھ سے یہ ناقابل معافی جرم سرزد ہوا اس لمحے میں بھی اپنی زندگی کے نازک ترین دور سے گزر رہی تھی جس سے ہر بیاہتا عورت گزرتی ہے۔ بانجھ پن کا داغ میں صحیح ہوتے ہوئے بھی خود سے دھو نہ سکتی تھی اگرچہ ایسا نہ تھا۔ قدرت مجھے بار آور کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی مگر اس سے پہلے..." وہ رک گئیں۔

بے حد مختصر الفاظ میں انہوں نے اس شام کی ساری کہانی بیان کر دی۔

"اور وہ عورت نشے میں لاچار ہے سارا مان کر اس کا بچہ لے آئی تھی وہ بعد میں... لیکن نہیں۔" وہ رک گئیں۔

"وہ بچہ میں نے خود اپنے ہاتھوں سے احسن صاحب کے گھر کے دروازے کے آگے رکھا تھا اور خود دور کھڑی دیکھتی رہی تھی کہ کہیں یہ بچہ کسی آوارہ کی خوراک نہ بن جائے۔

ہاں اس لمحے میں اتنی خوف زدہ تھی کہ جب احسن صاحب نے اس بچے کو جھک کر اٹھایا تو میں... تیزی سے وہاں سے گاڑی لے آئی۔ اس کے بعد مجھے زندگی نے اتنی مہلت ہی نہ دی کہ میں پلٹ کر پتا کر سکتی کہ اس بچے کا کیا بنا۔ مگر محمود بھائی! وہ عورت جس کا وہ بچہ تھا۔" وہ محمود عالم کے سامنے آ کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"بہت سالوں بعد میرے بیٹے کے علاوہ دارین کہ چلی آئی اور میری مشکل کہ میں اس گھر کا ایڈریس فوری طور پر یاد رکھ سکی نہ صاحب خانہ کا نام... میں ان کے بارے میں کچھ جانتی تھی..."

سب حیرت بھرے انداز میں رخشندہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"لیکن ان ساری باتوں سے پھر بھی یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ یہ لڑکا کون ہے؟" وہ اسی لہجے میں پھر سے جتاتے ہوئے اسے اس کے لاوارث ہونے کا طعنہ دے گئے تھے۔

ڈاکٹر رخشندہ آگے بڑھیں اور یاقوت کا ہاتھ پکڑ کر سامنے لے آئیں۔

"اب یہ تو میں نہیں بتا سکتی کہ اس لڑکے کا باپ کون ہے البتہ وہ عورت جس سے میں نے اس کا بچہ جدا کیا تھا وہ یہی یاقوت ہیں جن کے بارے میں میں پہلے بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی تھی۔"

رخشندہ کا یہ سب کہتے ہوئے جیسے سانس پھول سا گیا۔

اور محمود عالم کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف پلک جھپکے بغیر دیکھ رہے تھے۔

"میرے خدا یہ تو کیا ہے نیلم۔" ثریا بانو نے سر پکڑ کر بے یقینی سے یاقوت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

اور آغا قیاس تو جیسے پتھر کے بت بن گئے تھے۔

"کرو اقرار محمود عالم اب سب کے سامنے... آج تو ان سب کے سامنے اقرار کرو کہ میں کون ہوں... یہ کون ہے؟"

یاقوت ایک دیوانگی کے عالم میں آگے بڑھ ان کا گریبان جھنجوڑ کر بولیں۔

وہ عجیب وحشت بھری نظروں سے انہیں دیکھ کر رہ گئے۔

"نیلم!" ان کے لب کپکپائے۔

"بھول جاؤ میرے نام کو بتاؤ تمہارا مجھ سے کیا تعلق تھا؟ کیا رشتہ تھا اور مصطفیٰ صاحب! آپ تو گواہ تھے ہمارے نکاح کے... تھے نا؟ کچھ فرض تو آپ کا بھی تھا... تھا یا نہیں؟"

وہ ان کے آگے آ کر لرز کر بولیں۔

مصطفیٰ بے بسی سے انہیں دیکھ کر رہ گئے۔

اور ثریا بانو لبوں پر انگلی رکھے حیرت کی تصویر بنے ہوئے تھیں۔

"بتاتے کیوں نہیں نکاح کیا تھا تم نے مجھ سے یا چند کالی راتوں کا سودا؟" وہ پھٹ پڑیں۔

اور محمود عالم نے زمین پہ نظریں گاڑ دیں کہ کاش یہ زمین شق ہو سکے اور وہ اس میں سما جائیں۔

"اور یہ..." وہ تو تنزیل کی طرف مڑ کر کچھ کہنے لگی تھیں جیسے بکھر کر رہ گئیں۔

جس سے اتنے عرصے میں سب سے زیادہ نفرت کی تھی سب سے زیادہ اپنے انتقام کا نشانہ بنایا تھا سو وہی... وہی تھا ان کی زیست کا حاصل... اس آبلہ پائی کا ثمر وہی تو تھا۔ اور وہ اس کے ساتھ کیا کیا نہ کرتی رہیں۔

اور محمود عالم تو جیسے سکتے کے عالم میں تھے۔

ابھی جس کے حسب نسب اور کوڑے کے ڈھیر سے اٹھائے جانے کے طعنے وہ دے چکے تھے وہ وہی تھا جس کی بھی انہوں نے عزہ کی پیدائش سے پہلے ہونے کی بے تحاشا دعائیں مانگی تھیں۔

اور انہیں پتا بھی نہیں تھا قدرت ان کی یہ دعا پہلے سے قبول کر چکی ہے۔

وہ بے یقین نظروں سے تنزیل کو دیکھ رہے تھے۔

جس کی نظروں میں ان کے لیے کوئی جذبہ نہیں تھا نہ نفرت نہ محبت نہ جوش نہ امید صرف اجنبیت تھی۔

اور یاقوت کو تو لگا وہ اس سے کبھی بھی نظریں نہیں ملا سکیں گی۔

"تنزیل... تنزیل میرا بیٹا!" وہ بے یقین لہجے میں زیر لب خود سے بولے۔

"بھول رہے ہیں آپ جسٹس صاحب! آپ کا کوئی بیٹا نہیں۔ تنزیل جس بے نسب بے نام شخص کا نام ہے وہ کسی کوڑے کے ڈھیر سے اٹھایا ہوا قابل نفرت کیڑا ہے یاد ہے نا آپ کو ابھی چند لمحے پہلے آپ نے یہ سب بولا تھا۔"

وہ ایک قدم آگے بڑھ کر عین ان کے سامنے آ کر بولا۔

یاقوت نے بے اختیار سا ہو کر اس کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھا وہ کرنٹ کھا کر بدکا تھا۔

"تم مجھے چھونے کا حق بھی نہیں رکھتیں۔" وہ نفرت سے غرایا۔

"تنزیل! وہ سب غلط فہمی..." ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کن الفاظ میں اپنی غلطی کا اعتراف کریں۔ غلطی بھی وہ جو کسی ٹوٹی مالا کے گرتے دانوں کی طرح ایک کے بعد ایک ہوتی چلی گئی ان سے۔

"غلط فہمی۔۔۔ غلط فہمی تو خاتون آپ کو ہوئی ہے۔" وہ زور سے چلایا۔

"میرا تعلق ہے اس شخص سے جس کے اندر تکبر اور حسب نسب کا غرور کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ اس سے کوئی تعلق نہیں بلکہ کسی سے بھی نہیں ہے میں۔۔۔" وہ یاقوت کو ایک دھکے سے ہٹاتا ہوا جانے لگا کہ یاسمین نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"تنزیل۔۔۔ مجھو میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔" وہ اس سے ملتجی لہجے میں بولیں۔

"ہرگز نہیں میرے بیٹے ہو تم۔۔۔ میں نے تمہیں اتنے سالوں کی تلاش کے بعد پایا ہے۔ میں تمہیں اب خود سے جدا نہیں ہونے دوں گی۔" یاقوت ایک دم سے دونوں کے بیچ آکر سوچے سمجھے بغیر بولیں۔

اور وہ دونوں کے بیچ کھڑا تھا۔

میڈم یاقوت کے مدمقابل بھی کون تھا۔ معمولی سی عورت جسے شاید وہ کبھی دیکھنا بھی پسند نہیں کرتیں اور آج۔۔۔ انہیں خود کو اس سے برتر ثابت کرنا کتنا مشکل لگ رہا تھا بلکہ ناممکن۔

"بیٹا۔۔۔!" وہ چبا کر بولا۔ "کیا تم جیسی عورتوں کو بھی بیٹوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔" اس کا طرز تخاطب اس طرح کا تھا کہ میڈم یاقوت جیسے عرق عرق ہو کر رہ گئیں۔

"نہیں یاقوت میڈم! تم کو بیٹے کی نہیں ایک آلۂ کار کی ضرورت ہوتی ہے۔ استعمال کیا اور استعمال کے بعد اس کی ضرورت نہ رہی تو اسے برباد کر دیا۔ یہی ہے نا آپ کے بزنس کا موٹو۔" وہ نفرت سے بولا۔

"میں آج جو کچھ ہوں جیسی ہوں اس شخص کی وجہ سے ہوں، جو تمہیں بھی اس دنیا میں لانے کا سبب بنا اور میری بربادی کا بھی۔" وہ محمود عالم کی طرف انگلی اٹھا کر تڑپتے ہوئے لہجے میں بولیں۔ کچھ یوں جیسے کوئی چٹان ٹوٹ کر گری ہو۔

"اور کیا خدا کو بھی یہی شاندار جواب دے کر مطمئن کر دیں گی آپ۔۔۔ کیا وہاں بھی آپ کی یہ ہوشیاری اور [illegible]"

[illegible]

"تم آج مجھے جو بھی کہہ سکتے ہو، کہہ لو۔" بہت دیر بعد وہ بولی تھیں۔ "میں نے تمہارے ساتھ جو سلوک کیا اس کی کیا وجہ تھی۔ یہ تم نہیں جانتے۔" وہ رک رک کر نرم لہجے میں سمجھانے کی کوشش کرنے لگیں۔

"میں آپ کے بارے میں سب جانتا ہوں۔ وہ بھی جو نیلم پر گزرا اور وہ ظلم بھی جو آپ نے یاقوت بن کر معصوم لوگوں پہ ڈھائے۔ اور کیا بتانا چاہیں گی آپ مجھے۔"

اس کے پاس ان کے ہر تیر کا جواب موجود تھا۔

"لیکن تم۔۔۔" ان کی سمجھ میں نہ آیا اب کیا بولیں۔

"لیکن حقیقت صرف یہ ہے میڈم یاقوت! اگر اس دنیا میں نام نسب اتنا ضروری ہے، رشتے تعلق اتنے ناگزیر ہیں تو آپ جیسوں سے رشتہ تعلق نسب قائم کرنے سے بہتر ہے میں اپنے ہاتھوں سے اپنی جان لے لوں۔"

"نہیں نہیں ایسے مت کہو میں بہت تڑپی ہوں تمہیں پانے کے لیے۔" وہ بے قراری سے بولیں۔

"کبھی ان لڑکیوں کے ماں باپ بھی تڑپے ہوں گے جن کو آپ نے یوں برباد کیا کہ وہ جیتے جی کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہیں۔"

اور میڈم یاقوت پر جیسے کسی نے تیزاب انڈیل دیا ہو وہ ساکت سی کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔

اس طرح برملا کب کسی نے انہیں یہ سب کہا تھا اور اگر ایسا کچھ کہنے کی کوشش بھی کی تھی تو وہ کب اپنے پیروں پر سلامت گیا تھا اور اس وقت ان کی بے بسی کس عالم کی تھی کہ وہ اسے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھیں۔

"اس کے باوجود بھی آپ کے خیال میں رشتہ ہونا ضروری ہے تو مجھے سخت فخر ہوگا اس بات پر کہ مجھے فقط اس عورت نے اکیلے جنم دیا ہو۔" وہ آہستگی سے یاسمین کے کندھے کے گرد بازو حمائل کر کے بولا۔

"کاش خدا نے بچے کی پیدائش کے لیے باپ کا وجود لازم نہ رکھا ہوتا اور آج مجھے اس بات پر فخر ہوتا کہ میرا کوئی باپ نہیں۔"

اس نے ایک نظر محمود عالم پر ڈالی اور دوسری احسن مراد پر۔

دونوں کی نظروں میں سوائے شرمندگی اور پچھتاوے کے کچھ بھی نہیں تھا۔

"یہ بے لوث عورت جو پہلے دن سے جانتی تھی کہ یہ لاوارث بچہ ہے زمین پر پڑا اٹھایا ہوا بچہ۔۔۔ پھر بھی اس نے میری پرورش یوں کی جیسے کوئی اپنے اعلا خاندانی ولی عہد کی کرتا ہے۔ یہ شاید دنیاوی لحاظ سے ہر طرح سے غریب تھی مگر اس کا دل ممتا کے جذبوں سے مالامال تھا۔ اور اگر مجھ سے دوسری بار بھی اس دنیا میں آنے سے پہلے پوچھا گیا کہ میں کسے اپنی ماں منتخب کروں تو خدا کی قسم میرا انتخاب پھر یہی کم حیثیت بے مایہ عورت ہوگی جو میری ماں ہے۔" کہہ کر اس نے یاسمین کو اپنے ساتھ لپٹا لیا جو روئے جا رہی تھیں۔

"چلیں امی ان حسب نسب سیم و زر کی پوجا کرنے والوں میں ہم جیسے تہی دامن لوگوں کی جگہ نہیں۔"

وہ ان کا ہاتھ تھام کر انہیں ساتھ لیے باہر نکل گیا۔

اور میڈم یاقوت کو لگا جیسے وہ اپنی زندگی کی ہر بازی ہار گئی ہوں۔ ان کے قدم ان کا اپنا ہی بوجھ اٹھانے سے لاچار تھے۔

شاید وہ کھڑے کھڑے گر پڑتیں کہ ان کے بیگ میں پڑے مسلسل بجتے سیل فون نے انہیں ان کے وجود کا احساس دلایا۔

وہ ہارے ہوئے قدموں سے چلتی باہر آگئیں۔

انہیں محمود عالم سے کیا گلہ تھا۔ [illegible] ان کے بیگ میں محمود عالم کی بربادی کا مکمل سامان موجود تھا اور وہ اسے برباد کرنا بھول گئیں۔ یہ کیا انہونا واقعہ ہو گیا تھا۔

انہیں تو لگ رہا تھا وہ عمر بھر اب صرف اپنی بربادی پر ہی نوحہ کناں رہیں گی۔ انہیں یاد بھی نہیں آئے گا کہ انہوں نے کسی کو کبھی برباد کرنے کا سوچا بھی تھا۔

کمرے میں ابھی بھی موت کی سی خاموشی تھی جیسے یہاں سے ابھی ملک الموت اپنے تیر چلا کر گیا ہو۔

وہ باہر آکر گاڑی سے ٹیک لگا کر گہرے گہرے سانس لینے لگیں۔ سینے میں رکے سانس کو باہر کھینچنے میں انہیں کافی دقت ہو رہی تھی۔

ان کا سیل فون پھر سے بجنے لگا۔ اگرچہ انہیں کسی بھی خبر کسی بھی شخص کا انتظار نہیں تھا مگر پھر بھی غیر ارادی طور پر ان کے ہاتھ بیگ میں چلے گئے ان کے ہاتھ میں وہ سی ڈی تھی۔

وہ اسے کتنی عجیب سی نظروں سے دیکھتی رہیں۔

دوسرے لمحے انہوں نے اس سی ڈی کے چار ٹکڑے کر ڈالے اور پیروں کے نیچے مسل دیے۔

سیل فون پھر بج رہا تھا۔

انہوں نے نام اور نمبر دیکھے بغیر سیل فون کانوں سے لگا لیا۔ اور دوسری طرف سے آتی آواز نے جیسے ان کے مردہ جسم میں ہزار وولٹ کا کرنٹ دوڑا دیا۔

وہ جھٹکے سے سیدھی ہوئیں اور دوسرے لمحے ان کی گاڑی اڑتی ہوئی ایک مخصوص سمت میں دوڑ رہی تھی۔

(آخری قسط آئندہ ماہ)

امِ صوعہ



اسے بچپن سے ہی ایک کریز تھا۔ ڈاکٹر بننے کا کریز۔ اس کے نزدیک ہر وہ انسان جو ڈاکٹر تھا آئیڈیل تھا۔ اسے وہ کہانی اور ڈراما بے حد اٹریکٹ کرتا جس میں ڈاکٹر کا مرکزی کردار ہوتا۔ اماں اس کے اس جنون سے آگاہ تھیں جب ہی انہوں نے اسے میڈیکل کی تعلیم دلانے کا پختہ عزم کرلیا تھا۔ جیسے ہی انٹر کے ایگزام کلئیر ہوئے اور وہ بہترین نمبروں کے ساتھ پاس ہوا۔ اماں نے اپنا وعدہ پورا کردیا اور اس کا داخلہ کرانے کی تیاری شروع کردی۔ اس کام میں بھی ہمیشہ اس گھر کے کاموں میں پیش پیش رہنے والا اسجد ہی آگے آگیا تھا۔ پراسپیکٹس، ایڈمیشن فارم اور کالج میں اس کے ساتھ خواری وہ ہر جگہ ساتھ ساتھ تھا۔

اس وقت بھی اس کے فارم پہ لگنے والی فوٹوز اسٹوڈیو سے لے کر آیا تو اماں نے سندس کو اس کے لیے چائے بنانے دوڑایا تھا۔

"اماں! تصویریں تو دیکھنے دیں مجھے اپنی کیسی آئی ہیں؟"

وہ اٹھتے اٹھتے بھی بسوری مگر اماں نے بھیج کر دم لیا یہ کہہ کر "واپس آکے دیکھ لینا یہ کہیں بھاگی جارہی ہیں۔"

"اہم!" وہ کھولتے پانی میں پتی ڈال رہی تھی اس کھنکار پہ پلٹی۔ اسجد کو دیکھ کر حیرانی سے بولی تھی۔

"یہاں کیوں آگئے؟ میں چائے لا ہی رہی تھی۔"

"تصویریں چاہیے تھیں تمہیں، میری وجہ سے ڈانٹ پڑی۔ یہ لو دیکھ لو اپنی فوٹو!"

وہ اس کی سمت تصویروں کا ننھا سا سفید لفافہ بڑھائے ہوئے تھا۔ وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

"ارے یہ بھی کوئی ڈانٹ تھی؟ اماں تو مجھے اس سے بھی زیادہ ڈانٹ لیتی ہیں۔ میں برا نہیں مانتی۔ کون سا غصے سے کہتی ہیں۔"

اس کے ہاتھ سے فوٹوز لے کر ان پہ ایک نگاہ ڈالتی وہ اپنی سادگی سے کہہ رہی تھی۔

"ہاں تم بالکل بچی ہونا! ویسے اچھی آئی ہیں تمہاری فوٹو۔"

"اس لیے کہ میں خود بھی بہت اچھی ہوں۔ یہ بھی اماں ہی کہتی ہیں۔" وہ کھلکھلائی۔ اسجد اس کے چہرے پہ بکھرے خوب صورت رنگوں سے نظریں چرانے لگا۔

"نہیں میں بھی کہتا ہوں۔ بلکہ بہت کا اضافہ کرلیتا ہوں۔"

اس کا لہجہ بھاری ہوگیا مگر وہ تو ہمیشہ سے بدھو تھی اب بھی اس گہری بات کو نہیں سمجھی۔

"تمہارا بیٹھک اسکول کیسا جا رہا ہے؟"

اسجد بیٹھک اسکول نام سے ایک ایسا تعلیمی ادارہ قائم کرچکا تھا جس میں غریب اور مزدور کے بچوں کو نہ صرف مفت تعلیم دی جاتی تھی بلکہ ساتھ پیسے بھی دیے جاتے تھے۔ تاکہ ان کے والدین انہیں اس تعلیم سے محروم نہ کریں۔

"بہت اچھا جا رہا ہے۔ میرے کچھ دوست بھی اب تو میرے ساتھ اس پراجیکٹ میں شریک ہوئے ہیں پہلے چند بچے تھے مگر اب تو بچوں کی تعداد بھی بڑھ گئی ہے۔" وہ خوش ہو کر بتا رہا تھا۔

"اچھی بات ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ تم خود بھی اپنی تعلیم پہ دھیان دو۔"

وہ مدبرانہ مشورہ دے رہی تھی۔ اسجد کی آنکھوں میں شوخی اتر آئی۔

"فی الحال تو تم پہ توجہ دے رہا ہوں۔ ان گلابی کپڑوں میں اور بھی پیاری لگ رہی ہو۔ سندس ڈیئر! پلیز جلدی سے اتنی بڑی ہو جاؤ تاکہ میں تم سے اپنی فیلنگز شیئر کرسکوں۔"

وہ اسے دیکھتے ہوئے سوچ گیا۔ سندس نے اس کی نگاہوں کو محسوس کیا تو بے چین سی ہوگئی۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں۔" وہ فی الفور سنبھل گیا۔ حالانکہ جی چاہتا تھا اسے کچھ تو اشارہ دے ہی دے مگر اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ لے کر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

کالج میں اس کا ایڈمیشن ہوا تو پڑھائی کی ذمہ داری بڑھ گئی۔ وہیں اس کی ایک اور لڑکی سے دوستی ہوگئی تھی۔ عطرت کا تعلق بہت اچھے گھرانے سے تھا۔ یہ دوستی بھی چند مہینوں میں اتنی گہری ہوگئی تھی کہ وہ اس کے اپنی برتھ ڈے پہ دیے گئے بلاوے پہ اسے منع بھی نہیں کرسکی کہ عطرت کو برا لگ سکتا تھا۔ جبکہ جانے کی صورت میں اچھا خاصا خرچہ نکل آتا۔ لباس بھی اس کے پاس کوئی ڈھنگ کا نہیں تھا۔ اس سے بھی زیادہ اہم عطرت کے لیے اس کی حیثیت کے مطابق مہنگا سا تحفہ۔

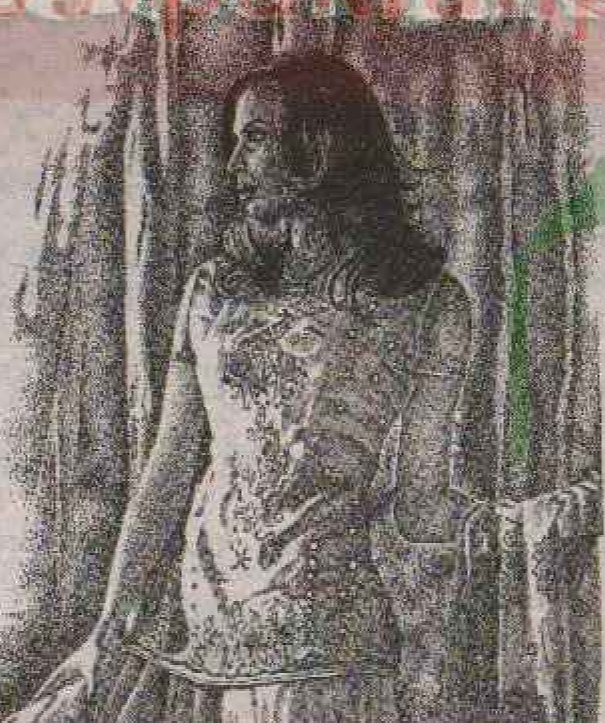
"یہ تو تم پڑھ رہی ہو؟"

اسے کتابیں پھیلائے بال پوائنٹ ہونٹوں میں پھنسائے سوچوں میں گم دیکھ کر اسی وقت آنے والے اسجد نے چھیڑا۔

"پڑھنے کی کوشش کررہی ہوں مگر۔"

"مگر کیا؟ کوئی پریشانی ہے؟"

اسجد نے سنجیدگی سے دریافت کیا اور سندس نے ہمیشہ کی طرح سے اپنی الجھن اس کے سامنے رکھ



دی۔ جس کا اس نے منٹوں میں حل نکال دیا تھا۔

"ہاں البتہ اس کی نہیں اپنی حیثیت کو مدِ نظر رکھ کر وہ سندس! جو قدردان لوگ ہوتے ہیں وہ قیمت کو نہیں جذبے کو اہمیت دیتے ہیں۔"

اس نے بردباری سے کہا۔ پھر اٹھ کر اس کی وارڈروب کھول لی۔ اور گلابی اور آتشی سوٹ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا جس پہ خوب صورت سی لیس دوپٹے اور شرٹ کے دامن پہ لگی تھی اور یہ سوٹ اماں نے پچھلی عید پہ اسے خود تیار کر کے دیا تھا۔

"بہت اچھا ہے گلابی رنگ۔ تم پہ ویسے بھی بہت جچتا ہے۔ سب میں نمایاں لگو گی۔"

امجد کے سنجیدہ لہجے میں بھی اس کے جذبوں کی سچائی اتر آئی تھی۔ اس کی سب سے نمایاں لگنے والی بات کا تب تو سندس نے یقین نہیں کیا مگر وہاں تقریب میں جب ڈاکٹر مہران نے جو کہ عطرت کا خالہ زاد تھا اور انگلینڈ سے ڈاکٹری کی اعلا تعلیم حاصل کر کے حال ہی میں وطن واپس لوٹا تھا سندس کے سراپے کو اس کی من موہنی سی صورت کو بہت ستائش نظروں سے دیکھا تو اسے یقین آیا کہ امجد نے کچھ غلط بھی نہیں کہا تھا۔ ڈاکٹر مہران خوب ڈیشنگ اور ہینڈسم تھا مگر جب اس کی نگاہ و التفات کا مرکز وہ ٹھہری تو وہاں تقریب میں ہی بہت سی حاسدانہ اور رشک آمیز نگاہیں سندس کا گھیراؤ کرنے لگی تھیں۔

"عطرت بتا رہی تھی کہ آپ کو ڈاکٹر بہت اچھے لگتے ہیں؟"

وہ اپنا تعارف اس سے کروانے کے بعد بہت دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جبکہ وہ نروس ہونے لگی تھی۔

"جی بس۔"

"مجھے تو آج سے قبل اپنا پروفیشن اتنا اچھا کبھی نہیں لگا۔"

وہ جانے کیوں اتنا خوش ہو رہا تھا۔ پھر کسی قدر سنجیدہ ہو کر بولا۔

"اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک پرسنل سوال کر لوں آپ سے؟"

اور وہ کنفیوژ سی اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"اگر میں آپ کے ہاں اپنا پرپوزل بھجواؤں تو آپ کو برا تو نہیں لگے گا۔ ایکچوئلی سندس میں ایسا ہی ہوں۔ اچانک مگر پائیدار فیصلے کرتا ہوں۔ آپ کو پہلی نگاہ دیکھ لینے کے بعد میرے دل نے مجھے آگاہ کر دیا تھا کہ آپ ہی وہ لڑکی ہیں جسے میں شریکِ حیات بنا کر خوش رہ سکتا ہوں۔ مجھے آپ کی خوب صورتی سے بڑھ کر آپ کی معصومیت نے اٹریکٹ کیا ہے۔"

وہ کتنے اطمینان سے حالِ دل کہہ رہا تھا اور وہ اتنی پزل ہوئی تھی کہ گھبرا کر وہاں سے ہٹ گئی۔ وہ ڈاکٹر مہران کی بات کو مذاق سمجھتی۔ ایک امیرزادے کا مذاق جو وہ لڑکیوں سے یونہی کر جاتے ہیں۔ اگر جو اگلے چند دنوں میں ڈاکٹر مہران سچ اپنا پرپوزل نہ بھجواتا تو وہ گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔

"بھلا خواب اس طرح بھی پورے ہوتے ہیں۔"

اس نے حیرت سے سوچا اور بھرپور آسودگی سے مسکرا دی۔



ڈاکٹر مہران کا پرپوزل اماں کے لیے بھی کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔ اتنے بڑے گھر کا خوب صورت پڑھا لکھا لڑکا از خود خواہش مند تھا تو پھر بھلا وہ کیوں کفرانِ نعمت کرتیں۔ یوں ایک مہینے کے اندر اندر ہی بات بھی پکی ہوئی اور منگنی کی تاریخ طے کر دی گئی۔

منگنی سے کچھ دن پہلے کی بات تھی۔ جب بجھے ہوئے چہرے اور سرخ متورم آنکھوں کے ساتھ بہت دنوں بعد امجد ان کے ہاں آیا تھا۔ وہ تو اس کی حالت دیکھ کر ہی حیران رہ گئی۔

"تم بیمار رہے ہو کیا؟"

"اب تو یہ بیماری عمر بھر جان نہ چھوڑے شاید؟" وہ مضمحل تھا۔ سندس پریشان ہو گئی۔

"کیا کہہ رہے ہو امجد! خدا نہ کرے۔"

"کیوں کہہ رہی ہو ایسا؟ کیا لگتا ہوں میں تمہارا کہ میری تکلیف سے تمہیں تکلیف ہونے لگی۔" سندس کا اضطراب بڑھ گیا۔

"کیوں ایسی باتیں کر رہے ہو امجد! بھلا تمہاری تکلیف مجھے کیوں نہ ہو گی؟"

"تو پھر کیوں کر لیا ایسا؟ جانتی نہ تھیں کتنی محبت کرتا تھا میں تم سے؟ تم نے محبت پہ دولت کو ترجیح دی؟" اسے دیکھ کے لگتا تھا وہ کسی بھی پل رو پڑے گا۔

سندس تو اس انکشاف پہ ششدر رہ گئی۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟" وہ منہ پہ ہاتھ رکھ کے دو قدم پیچھے ہوئی۔

"ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ میں اس انتظار میں رہا کہ تم اپنی تعلیم مکمل کر لو کچھ سمجھ دار بھی ہو جاؤ مگر مجھے اندازہ ہی نہ تھا کہ تم بہت بڑی ہو چکی ہو۔ اتنی سمجھ آ گئی ہے تمہیں کہ میں تمہیں کچھ نہیں دے سکتا جبکہ وہ امیرزادہ..."

سندس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

"چپ ہو جاؤ امجد!" وہ زور سے چیخی۔ "یہ ہے تمہیں میری ذات سے آگاہی؟ اور یہ دعوا بھی محبت کا ہے۔" اس کے لہجے میں طنز در آیا۔

"اور کیا کہوں پھر؟" وہ بے حد ٹوٹا ہوا لگ رہا تھا۔

"مجھے ڈاکٹرز بہت اچھے اس لیے لگتے تھے امجد! کہ وہ انسانیت کی خدمت کرنے والے ہوتے ہیں۔ جب ابا اپنی بیماری سے لڑتے لڑتے اس دنیا سے چلے گئے تھے تب میں نے بھی ڈاکٹر بننے کا فیصلہ کیا تھا۔ پھر ڈاکٹر مہران تو بہت قابل ہیں۔ انگلینڈ سے تعلیم حاصل کی ہے انھوں نے مگر واپس پاکستان آ گئے ہیں۔ اپنی مسیحائی سے اپنے لوگوں کے دکھ دور کرنا چاہتے ہیں۔ اگر قسمت نے مجھے کسی ایسے ہی مسیحا کی شریکِ حیات بننے کا موقع دیا ہے تو یہ میری خوش بختی تھی میں کیسے اس نعمت سے منہ پھیرتی۔ پھر تم نے کب مجھے بتایا تھا کہ..."

وہ بولتے بولتے ایک دم رک گئی اور امجد دکھ سے ہنس پڑا۔

"ہاں صحیح کہتی ہو میں نے کب بتایا تھا تمہیں مگر تم نے تو کبھی تو نہیں تھا محسوس بھی تو نہیں کیا تھا۔ ورنہ میں بھی جو کام کر رہا تھا وہ بھی بہت خاص تھا۔

تعلیم کے زیور سے آراستہ کر رہا تھا وہ بھی ان بچوں کو جنہیں۔ لیکن میں تمہیں کیوں بتا رہا ہوں بھلا کہ... میں ہمیشہ سے اس کے سامنے تھا اس نے دیکھا نہیں تو میرا نصیب۔"

وہ بوجھل آواز میں کہہ کر ایک دم پلٹا اور گھر سے نکلتا چلا گیا۔ سندس لب بھینچے کھڑی تھی۔



اس کا میڈیکل کا دوسرا سال تھا جب ڈاکٹر مہران نے اچانک ہی شادی کا مطالبہ کر دیا تھا۔ وہ سخت پریشان ہو گئی۔

"لیکن میری پڑھائی؟"

"ہو جائے گی بعد میں۔ وہ تمہیں پڑھنے سے روکے گا تھوڑا ہی۔"

اماں نے کہا مگر اس کی الجھن دور نہیں ہوئی۔ فون پہ مہران نے بھی سمجھایا مگر وہ ہنوز پریشان رہی تھی۔

اس روز اس کے دماغ میں جانے کیا سمائی کہ کالج سے واپسی پہ ڈاکٹر مہران سے روبرو بات کرنے اسپتال چلی گئی۔ ریسپشن پہ اپنے بارے میں بتا کر وہ کنفیوژ سی بیٹھی تھی کہ جب اسے اندر بلوانے کے بجائے ڈاکٹر مہران اس کے استقبال کو خود اپنے آفس سے اٹھ آئے تھے۔

"آپ اور یہاں؟ ہائی پلیزنٹ۔"

وہ خوش دلی سے ملے تھے۔ وہ سفید اوور آل میں ملبوس اس زمینی فرشتے کو عقیدت کی نگاہ سے تکنے لگی۔ جو لے اپنے آفس میں لے آئے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے منٹوں میں چائے کے ساتھ لوازمات سے ٹیبل بھر دی اور اصرار سے کھلائے گئے۔ اِدھر اُدھر کی کتنی باتیں۔ وہ تو جیسے مقصد ہی بھول گئی۔ نرم گفتار مہربان مشفق۔ اسے قدرت کے اس انتخاب پہ رشک آنے لگا۔ (اور امجد کیا جانے میں نے کیا پایا ہے۔) ان کے مہربان چہرے پہ مسکراتی آنکھیں کتنی حسین لگتی تھیں۔

زبان کی نرمی لہجے کی مٹھاس کتنی خاص تھی۔

جب وہ اپنے مریضوں کے زخموں کو سیتے ہوں گے تو بیمار ان ہاتھوں کی نرمی و گداز اور آنکھوں کے مہربان تاثر سے ہی اپنی تکلیف بھولنے لگتے ہوں گے۔

"میں بھی ڈاکٹر بنوں گی بالکل آپ کی طرح۔"

وہ بے خیالی میں کہہ گئی اور وہ ہنسنے لگے۔

"ضرور ان شاء اللہ۔"

وہ بھی ان کے ساتھ مسکرا دی۔ مگر دفعتاً" اسپتال کا پرسکون ماحول پراگندہ ہو گیا۔

چیخ و پکار، آہ و بکا، دوڑتے قدموں کی آہٹیں، افراتفری۔

"کیا ہوا؟" وہ ایک دم گھبرا گئی۔

اس سے پہلے کہ مہران جواب دیتے، دروازہ دھاڑ کی آواز سے کھلا اور ایک بدحواس نرس کی شکل نظر آئی۔ جو ڈاکٹر مہران کو اسکول میں ہو جانے والے بم دھماکے اور معصوم بچوں کے زخمی اور ہلاک ہو جانے کی ہولناک خبر سنا رہی تھی۔ زخمی بچے اور اساتذہ اسپتال لائے جا رہے تھے، ایمبولینس کی کان کو پھاڑتی ہوئی آواز وہاں تک بھی آ رہی تھی۔ وہ سراسیمہ سی اٹھ کھڑی ہوئی تو ادھ کھلے دروازے سے [illegible] جانے والے خون میں لت پت بچے پہ پڑ گئی۔

خون میں ڈوبا ہوا کرب آلود معصوم چہرہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے چلا رہا تھا۔ اس کی کربناک چیخوں پہ سندس کا دل تڑپ اٹھا، آنکھیں بھیگ سی گئیں۔

"ہاؤ ڈیئر یو! آپ کو مینرز اور ایتھکس کے بارے میں بھی کچھ پتا ہے؟ باہر دروازے پہ ڈونٹ ڈسٹرب کا ٹیگ لگا آپ کو نظر نہیں آیا؟ نان سینس۔"

سندس نے بے یقینی سے ڈاکٹر مہران کو دیکھا جن کے چہرے سے شفقت، نرمی اور حلاوت مٹ چکی تھی۔ اس کی جگہ کرختگی، نخوت اور حقارت نے لے لی تھی۔

"سوری سر! وہ بم بلاسٹ ہوا ہے اور زخمیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے تو...."

"شٹ اپ جسٹ شٹ اپ، یہاں تو ہر روز جانے کتنے بم بلاسٹ ہوتے ہیں۔ کتنے لوگ مر جاتے ہیں۔ آئے دن کے ان پے در پے حادثات سے ہم تو عادی ہیں، ہوتے ہوں گے جو ہر بار چہروں پہ ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں۔ ہم بھی انسان ہیں، زندگی پہ ہمارا بھی حق ہے، یہ کیا کہ ہر وقت خدمت خلق پہ ہی جتے رہو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

نرس متغیر چہرہ لیے دروازہ بند کر کے پلٹ گئی۔ سندس شاکڈ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ دروازہ بند ہوا تو وہ شور شرابا بھاگ دوڑ سب دروازے کے پار رہ گئے۔ کمرے کا ماحول ایک بار پھر پرسکون ہو گیا۔ ڈاکٹر مہران کے چہرے کے کھنچے ہوئے عضلات بھی دھیرے دھیرے معمول پہ آ گئے تو انہوں نے پھر سے کرسی سنبھال کر مسکرا کر سندس کو دیکھا۔ جسے ساکن و ساکت دیکھ کر کسی خوب صورت سی پتھر کی مورتی کا گمان ہو رہا تھا۔

"آپ کیوں کھڑی ہو گئیں؟ بیٹھیے نا!"

ان کا لہجہ ویسا ہی گمبھیر دھیما اور حلاوت سے بھرپور ہو گیا۔ سندس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھا۔

"آپ بھی ڈسٹرب ہو گئیں نا، بہت ان ایجوکیٹڈ اسٹاف ہے۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں شادی کے فوری بعد واپس انگلینڈ چلا جاؤں گا۔ بہت تلخ زندگی ہے یہاں کی، جسے کم از کم میں برداشت نہیں کر سکتا، بندہ کیا اپنی مرضی سے زندگی بھی نہ گزارے۔"

وہ بھناتے ہوئے انداز میں پھر سے یہی کیفیت اس سے شیئر کرنے لگے۔ سندس نے بہت سرد نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔ وہ اب سنبھل چکی تھی۔ ان کا بہت بلندیوں پہ سجا بت دھڑام سے گر کر پاش پاش ہو چکا تھا۔ صد شکر کہ خدا نے اسے بروقت آگہی عطا کی تھی۔

اس نے اپنا بیگ اٹھا کر کاندھے پہ لٹکایا اور چلنے کو تیار ہو گئی۔

"ارے آپ کہاں جا رہی ہیں؟ یہ سارا کچھ تو ابھی ویسے ہی پڑا ہوا ہے۔ بیٹھیں پلیز! میں کچھ دیر بعد خود

آپ کو ڈراپ کرنے چلوں گا۔"

ان کا پھر سے وہی روپ تھا، جس سے وہ دھوکہ کھا گئی تھی۔

"آئی ایم ساری مہران صاحب! میں رک نہیں سکتی۔" اس نے جواباً سرد مہری سے کہا تو ڈاکٹر مہران نے پھر سے کچھ کہے بغیر کاندھے اچکا دیے تھے۔

"او کے تو چلیے میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔"

"نہیں اس تکلیف کی ضرورت نہیں ہے۔"

اس نے روکھے پن سے کہا اور قدم بڑھا دیے۔

"ارے تکلیف کیسی، یہ تو عین سعادت ہو گی جناب! آپ ہمیں سمجھی کہاں ہیں ابھی۔" وہ ہنس کر کہتے اس کے پیچھے آئے، سندس نے رک کر طنزیہ نگاہوں سے اسے دیکھا پھر تلخی سے بولی تھی۔

"آپ کو لفظ سعادت کے ہجے بھی معلوم نہیں ہیں مہران صاحب! اور فکر نہ کریں میں ابھی تو سمجھی ہوں آپ کو اور بالکل صحیح سمجھی ہوں، صد شکر کہ جلدی سمجھ گئی۔"

اس کے لہجے کے طنز اور آنکھوں کی سرد مہری پہ ڈاکٹر مہران پہلی مرتبہ چونکے تھے اور اٹکے تھے۔

"کیا مطلب؟"

انہوں نے کسی قدر حیرانی سے کہا تھا۔ مگر سندس انہیں مطلب سمجھانے کو رکی نہیں تھی، بند دروازہ کھول کر نکلتی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

اس کی بات کا مطلب ڈاکٹر مہران کو تب سمجھ میں آیا جب بذریعہ ڈاک منگنی کی انگوٹھی اور دوسری چیزیں ان تک پہنچیں، وہ تلملاتے ہوئے ان کے گھر تک آئے تھے۔

"کیا مطلب ہے اس سب کا؟"

انہوں نے انگوٹھی اس کے سامنے پٹخ کر تنفر سے کہا تھا۔

"انگوٹھی اور سامان کی واپسی کا کیا مطلب ہو سکتا ہے ڈاکٹر صاحب! مجھے یہ رشتہ منظور نہیں۔"

"یہ کیا بدتمیزی ہے سندس!" وہ بھڑک کر چلائے تھے۔

"یہ بدتمیزی نہیں ہے ڈاکٹر صاحب! یہ اپنا دفاع ہے۔ میں آپ کو مسیحا سمجھ کر آپ سے عقیدت لگا بیٹھی تھی مگر آپ تو...."

"شٹ اپ۔" وہ بپھر گئے۔

"تم کیا سمجھتی ہو خود کو، کوئی حور پری ہو، ارے تمہارے جیسی لاکھوں میرے قدموں میں لوٹتی ہیں، مگر میں انہیں منہ نہیں لگاتا۔"

"تو ٹھیک ہے، ان ہی میں سے کسی ایک کو منہ لگا لیں، میرا آپ سے اب کوئی تعلق نہیں۔" اس نے سکون سے کہا اور وہ دھمکیاں دیتے غراتے چلے گئے۔

اور اماں جو اس کے اس جذباتی فیصلے پہ پہلے ہی جز بز تھیں، ڈاکٹر مہران کے تاثرات سے اور بھی گھبرا گئیں۔

"میں نے تمہیں سمجھایا بھی تھا اتنے بڑے بڑے کام مت کرو۔"

"اماں! یہ انتہائی اہم نہیں ہے، یہ فیصلہ ناگزیر تھا۔" اس نے متانت سے کہا۔ اماں بے بس سی نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

پانچ سال گزر چکے ہیں، سندس ڈاکٹر بن جانے کے بعد غریب و ناداروں کی خدمت میں جی جان سے مصروف ہے۔ اس نے شادی بھی کی ہے۔ امجد اس کے تین سالہ بیٹے کا باپ ہے اور آج بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتا ہے۔ اب تو اس کا بیٹھک اسکول بھی بہت ترقی کر گیا ہے۔ اور اماں جو سندس کے اس فیصلے پہ دل ہی دل میں اس سے خفا تھیں، آج وہ بھی سندس کو مطمئن، سرشار اور کامیاب دیکھ کر اس کے فیصلے کو برملا سراہتی ہیں۔

ضروری تو نہیں فیصلے والدین ہی اچھے کریں، کبھی بچوں کے فیصلے بھی پائیدار ہوتے ہیں کہ اس کا تعلق ذہنی صلاحیت سے ہے نہ کہ عمر اور تجربے سے۔

☼

نایاب جیلانی

روگی عشق جل سو گئے

"طلاق؟ تمہیں طلاق چاہیے۔" گلاب موتیے اور ایئر فریشنر کی خوشبو میں نہائے کمرے میں اچانک یوں لگتا تھا کسی نے گیس کے چولہے کا برنر کھول دیا ہو۔ وہ اچھل کر دور ہٹا گویا کسی دہکتے انگارے کو ہاتھ لگا لیا تھا۔ اس کے چہرے پر حیرت دکھ صدمے اور بے یقینی کے کئی رنگ ایک ساتھ جھلکنے لگے تھے۔ سومیہ کو ایک پل کے لیے خوش سا ہونے لگا۔ جمال کے چہرے پر سائے لہرا رہے تھے۔ گہری شام کے بھیانک سائے۔

[illegible] سر جھکا [illegible] آواز میں [illegible]

"تمہیں یعنی سومیہ مراد کو نکاح کے محض چھ سات گھنٹے بعد اپنے شوہر سے طلاق چاہیے؟" وہ شاید اس حیرت اور بے یقینی کے جھٹکوں سے سنبھل چکا تھا تب ہی سومیہ کے سجے ہوئے سراپے کو ایک نظر دیکھ کر چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ہاں۔" وہ بھی خود کو مضبوط ظاہر کرنے کے چکر میں بھرپور اعتماد کا مظاہرہ کرنے لگی تھی۔

"کیوں؟ وجہ پوچھ سکتا ہوں؟" جمال نے اپنی بکھری ہوئی سانسوں کو ہموار کرنے کی کوشش کی [illegible] ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہا تھا۔ اس کے [illegible] مذاق اور چہرے کے تاثرات سے [illegible]

مکمل ناول



اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا۔ [illegible] کے چلے جذبوں اور تمناؤں کی تکمیل کے احساس [illegible] سے یہ چہرہ بلش کر رہا تھا۔ مگر اب یوں لگتا تھا [illegible] کے بیٹا جمال مرسلین برف کی دیوار بن گیا ہے۔ [illegible] سرد بے حد سرد اور ہر احساس سے عاری۔

"وجہ؟" سومیہ دھک سے رہ گئی تھی۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ کوئی "وجہ" بھی بتانا ہوگی۔ اسے جو کچھ کہا گیا تھا۔ وہ سب اس نے کہہ دیا تھا۔ اور "وجہ" ابھی اسے ذہن نشین کرائی گئی تھی۔ سو کچھ تامل کے بعد وہ دھیرے سے بولی۔

"اس شادی میں میری پسند شامل نہیں۔"

"کیا تمہیں نکاح سے پہلے خبر نہیں تھی۔ عالم بے ہوشی میں دستخط کیے تھے۔" وہ یکدم زہرخند ہوا۔

"انکار کر دیتیں؟ کوئی زبردستی تو نہیں تھی۔" جمال کا رواں رواں سلگ اٹھا۔

"انکار؟" سومیہ نے پھر سے سوچنے میں کچھ وقت لیا تھا۔ "میرا انکار مجھے زمانے کی نظروں سے گرا دیتا؟"

"تو ابھی بھی تو نہیں ہو [illegible] خود پر طاری کر [illegible]

[illegible] کی وجہ [illegible]

[illegible]" وہ نظریں اسے دیکھتا تھرائے ہوئے بولا۔

"تم کسی اور کو پسند کرتی ہو؟" سومیہ کی طویل خاموشی سے اکتا کر جمال نے پوچھا۔

"جی۔" سومیہ نے سر ہلا کر جمال کے بدترین خدشات کی تصدیق کر دی تھی۔ اور اس وقت وہ جمال کو اس قدر زہر لگ رہی تھی کہ اس کا دل چاہ رہا تھا اس سجی سجائی مورت کو اٹھا کر باہر پھینک دے۔ ابھی تین لفظ اس کے منہ پر مارے۔ مگر بہت سوچ بچار کے بعد یہ غیر مناسب حل اس نے اطمینان سے ایک طرف رکھ دیے تھے۔

"مجھے دھتکارنے والی، ریجیکٹ کرنے والی سومیہ مراد بھی "بامراد" کبھی نہیں ہو سکے گی۔ ہرگز نہیں۔ کم از کم میری زندگی میں تو نہیں۔"

اس نے آخری سلگتی نظر سومیہ کے کپکپاتے وجود پر ڈالی اور غصے کے عالم میں اپنا موبائل اٹھا کر باہر چلا گیا۔ ادھر سومیہ کا سویا سویا ذہن نیند کے جھونکوں کی وجہ سے اور بھی بھاری ہو رہا تھا۔ اور وہ گھومتے دماغ سے سوچ رہی تھی کہ اس نے جمال سے کیا کیا بول دیا ہے؟

☼ ☼ ☼

"سوی! میری جان اٹھ جاؤ نا۔" شبانہ پھوپھو نے تیسری مرتبہ کمرے میں جھانک کر حلاوت سے کہا تھا۔ سوی نے کسمسا کر مندی مندی آنکھیں کھولیں۔ پھوپھو کے شفیق مہربان محبت کے رنگوں سے سجے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر سے کروٹ بدل کر بے سدھ ہو گئی۔

"سوی گڑیا! اٹھ جاؤ نا۔ دیکھو گھڑی نو بجا رہی ہے۔ ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے اور پھر مجھے کچھ دیر کے لیے کہیں جانا ہے۔" پھوپھو اب اس کے قریب بیڈ پر بیٹھ گئی تھیں۔ ان کی نرم انگلیاں سوی کے بالوں میں [illegible]

"پھوپھو [illegible]" [illegible] بھاری سی آواز میں بولی۔

"کر لیا نا گلا خراب۔" پھوپھو نے وحشت کے عالم میں بے ساختہ چیخ ماری۔ اسی لیے سوی بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔

"کیا ہوا پھوپھو؟" وہ ہراساں ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔

"ہونا کیا ہے۔ منع کیا تھا رات کو آئس کریم نہ کھاؤ۔ اب اپنی آواز بھی ڈھول جیسی کر لی ہے۔ رات کو مہمان بھی آئیں گے۔" پھوپھو کو نئی فکر لاحق ہو گئی۔

"کون سے مہمان؟" سومیہ چونکی۔

"بتایا تو تھا تمہیں۔" پھوپھو نے خفگی سے جتایا۔ "زنیرا کے جاننے والے ہیں۔ تمہارے سلسلے

میں آئیں گے۔"

"اچھا ہوا۔" سومیہ قل قل ہنسنے لگی تھی۔ اسے پھوپھو کی پریشانی کی وجہ سمجھ میں آ گئی تھی۔

"اس موقع پر لڑکیاں اوہو۔ ہو نہیں کرتیں۔" پھوپھو ناراضی سے بولیں۔

"تو کیا کرتی ہیں؟" سومیہ نے شرارت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔

"شرما جاتی ہیں۔" پھوپھو اپنے دھیان میں گم تھیں۔

"یوں اس طرح۔" سومیہ باقاعدہ دوپٹے کا کونا منہ میں دبا کر دکھایا تو پھوپھو خفا ہو کر گھورنے لگیں۔

"میں بھی تمہاری بونگیاں سننے بیٹھ گئی ہوں۔" پھوپھو سر پر ہاتھ مار کے کھڑی ہو گئیں۔

"کہاں جا رہی ہیں؟" سومیہ کو بھی بالآخر اٹھنا پڑا تھا۔ نیند تو ویسے بھی اچاٹ ہو گئی تھی۔ رات کو اس کی طبیعت اچھی خاصی بگڑ گئی تھی۔ سر میں درد تھا۔ وہ بہت دیر سے سوئی تھی تب ہی آنکھ جلدی نہیں کھل سکی۔

"مارکیٹ تک۔ کچھ سامان لاؤں [illegible] بھی [illegible]" پھوپھو کو بیوگی کے بعد اپنے شوہر کی طرف سے معقول رقم گورنمنٹ کی طرف سے ملتی تھی۔ پھوپھو کی چار بیٹیاں تھیں۔ ایک بیٹا تھا۔ بیٹیاں شادی شدہ تھیں جبکہ بیٹا اسٹڈی ویزے پر سویڈن پڑھنے کے لیے چلا گیا تھا۔ یہ اس کی پڑھائی کا آخری سال تھا۔ اور پھوپھو اس کی واپسی کے انتظار میں دن گن رہی تھیں۔

"تم ناشتہ کر لینا۔ ماسی بھی آنے والی ہے۔ اپنی نگرانی میں صفائی کروا لینا۔" پھوپھو ہدایت نامہ اسے تھما کر باہر نکل گئی تھیں۔

ماسی کے آنے سے پہلے سومیہ نے ہلکا پھلکا ناشتہ کر لیا تھا۔ پھر چھوٹے چھوٹے کاموں کے دوران وقت گزرنے کا پتا نہیں چلا تھا۔ اور پھوپھو نو بجے کی نکلی چھ بجے کے قریب واپس آئی تھیں۔

"ہائے تھک گئی ہوں۔ جوڑ جوڑ دکھنے لگا ہے۔" پھوپھو صوفے پر ڈھے گئی تھیں۔ سومیہ اسکوائش کا جگ فریج سے نکال لائی۔

"آپ تو مارکیٹ تک گئی تھیں۔ اتنی دیر سے کیوں آئی ہیں؟"

"زنیرا کی طرف چلی گئی تھی۔ بیمار تھی۔ بچے بھوک سے بلبلا رہے تھے۔ سارا گھر الٹ پلٹ تھا۔"

زنیرا باجی پھوپھو کی تیسرے نمبر والی بیٹی تھیں۔ پھوپھو اپنی تھکاوٹ کی تفصیل بتا رہی تھیں۔ اور سومیہ جمائیاں روکنے میں ہلکان ہونے لگی۔ ایک تو اسے بے تحاشا نیند آیا کرتی تھی۔ ہر وقت ذہن سویا سویا رہتا۔ سستی بھی ہر وقت اس کے گرد گھیرا تنگ کیے رکھتی تھی۔ اور پھوپھو کو اس کی بے تحاشا سونے کی عادت سے چڑ تھی۔

"تم ابھی سے سونا شروع کر دو۔"

"سچ پھوپھو! سارا دن نہیں سوئی۔" وہ ٹھنک کر بولی۔

"کیا کرتی رہی ہو پورا دن؟" پھوپھو نے ناگواری سے اس کی سرخ ہوتی آنکھوں کو دیکھا۔ "تم نے دوا بھی [illegible]"

"[illegible] سر میں درد ہو رہا ہے۔ ابھی میڈیسن لی ہوں۔ کم از کم نیند تو پرسکون آتی ہے۔ پھوپھو! یوں لگتا ہے دوائیوں کی اس بوتل کے ساتھ ہی عمر تمام ہو جائے گی۔" بے زاری سومیہ کے لہجے سے عیاں تھی۔

"مایوسی کی باتیں نہیں کرتے۔" پھوپھو نے بے اختیار ٹوکا۔

"امید کی کرن کہاں سے لاؤں؟ ہوش سنبھالتے ہی یہ دوائیاں منہ کو لگی ہیں اور چھوٹنے کا ابھی تک نام نہیں لیا۔"

"بری بات بیٹے! یوں نہیں کہتے۔" پھوپھو نے ہمیشہ کی طرح نگاہ چرا لی۔

"ارے وہ آپ کے مہمان کہاں گئے؟" سومیہ کو اچانک گھڑی دیکھ کر خیال آیا تھا۔

"ان کا پروگرام بدل گیا ہے۔" پھوپھو کے لہجے میں

واضح جھلک اتر آئی۔

"اوہو۔" سومیہ نے زیر لب تبسم کو دانتوں تلے روند ڈالا۔ "گویا انہیں میری بیماری کی اطلاع مل گئی ہے پھوپو!"

"سومی!" پھوپھو نے محبت سے ڈپٹا۔ "خبردار جو فضول بکواس کی تو۔"

"حقیقت اور سچائی اگرچہ تلخ ترین ہو۔ ایک دن سامنا تو کرنا ہوتا ہے نا۔" سومیہ نے اسی تلخ ترین انداز میں کہا۔

"تمہیں خدانخواستہ کوئی بیماری نہیں سومی!" پھوپھو ہمیشہ کی طرح اس کی تلخی کے اثر کو زائل کرنے کی کوشش میں جت گئیں۔

"کوئی بڑی بیماری نہیں۔ بس سانس ذرا سا اکھڑ جاتا ہے۔ سر درد کے عذاب میں ہر وقت مبتلا رہتی ہوں۔ نیند کا خمار کبھی اترا نہیں۔ سستی اور بے زاری کے علاوہ آج تک کوئی اور احساس چھو کر مجھے نہیں گزرا۔ ان حالات میں کوئی احمق ہی مجھ سے شادی کرے گا۔" [illegible] "پاگل [illegible]"

"دنیا میں احمقوں کی بھی کمی نہیں۔" پھوپھو شاید ماحول پہ چھائی ثقالت کے اثر کو رفع کرنے کی کوشش میں کھلکھلا کے بولیں۔

"پلیز پھوپو! مجھے شادی نہیں کرنا۔ آپ اس سلسلے کو پلیز ختم کردیں۔ آئے دن کوئی نہ کوئی منہ اٹھائے چلا آتا ہے۔" سومیہ کی آنکھیں اور بھی سرخ ہو گئی تھیں۔

"تم پہلے دوا کھالو۔" پھوپو لیٹنے سے پہلے تاکیداً بولیں۔

"آپ دوائیوں کا نسخہ لے گئی تھیں۔" سومیہ اٹھتے ہوئے مڑ کر پھوپو کی طرف دیکھنے لگی۔

"ہاں وہ شاپر میں ساری دوائیں ہیں۔ یہ کام میں بھول سکتی ہوں۔"

"کھانے میں کیا بناؤں؟" کچن کی طرف جاتے ہوئے سومیہ نے پوچھا۔

"اروی گوشت پکالو بلکہ رہنے دو میں خود ہانڈی چڑھاتی ہوں۔ تم تو بس چھوڑ دو۔" پھوپھو بولتی ہوئی سومیہ کے پیچھے چلی آئیں۔

"ہمم دیکھیے تم تو اروی کو گھول کر حلوہ بنا دوگی۔" سومیہ ہنس پڑی۔

"چل ہٹ۔" پھوپھو نے لاڈ سے اس کے کندھے پر دھپ لگائی۔ "سب کچھ سکھا کر اگلے گھر روانہ کروں گی۔"

"یہ اگلا گھر کون سا ہے؟" سومیہ نے انجان بنتے ہوئے شرارت سے پوچھا۔ اس کا موڈ خود بخود خوشگوار ہو گیا تھا۔

"جلد پتا لگ جائے گا۔" پھوپھو کا انداز دھمکی آمیز تھا۔

"آپ بھی بڑے بیٹھے میں آپ کی جان چھوڑ کر ہرگز کہیں نہیں جاؤں گی۔ چپکی رہوں گی ہمیشہ آپ کے

"تو سوڑے کی طرح؟"

"میں اس لسوڑے کے پیڑ کو کسی اور کے آنگن میں لگا آؤں گی۔" پھوپھو پیاز کاٹنے میں مصروف ہو چکی تھیں۔

"چائے بنادوں؟" سومیہ پیاز کی کڑواہٹ سے بچنے کے لیے کچن کے دروازے میں کھڑی ہو گئی۔

"رہنے دو۔ ابھی موڈ نہیں۔"

"میرا بھی موڈ نہیں۔" سومیہ دوائیوں کا شاپر اٹھا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ آناً فاناً اسے یہ دوائیوں کا چھوٹا سا شاپر کسی بھاری گٹھری کے مشابہ لگنے لگا تھا۔ وہ نیند سے بند ہوتی آنکھوں کو مسلتے ہوئے بیڈ پر ڈھے گئی۔



سومیہ حسن مراد کی اکلوتی اولاد تھی۔ بد قسمتی سے اس کی ماں سومیہ کو جنم دینے کے بعد حسن مراد سے طلاق لے کر کسی اور کا گھر بسا چکی تھی۔ اس کے والد اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ بغیر کسی بیماری کے ایک [illegible] نے اپنے شفیق بازوؤں میں چھپا لیا تھا۔

"اپنا گھر بار چھوڑ کر بھائی کے گھر محض سومیہ کی محبت اور تنہائی کے خیال سے آبسی تھیں۔ عرصہ ہوا تھا ان قصے کو ہوئے۔ مگر کبھی کبھار نادانستگی میں پھوپھو کو اس گھٹے ہوئے قصے اور شرمناک داستان سے گزر جانے کا خیال آجاتا تھا۔ جیسا کہ اس وقت پھوپھو اپنی سادگی میں سمیرا باجی کی ساس کے پوچھنے پر اندر کا ابال نکالنے لگی تھیں۔

"اچھی صورت پر مان تھا نہ سسرال کی لاج رکھی نہ بیمار ماں کے چٹے بھاٹے (سفید بالوں) کا خیال کیا۔ مراد کاروباری دوست تھا۔ گھر میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ بس پھر وہ ثمانہ کا اسیر ہو گیا اور ثمانہ اس کی شکل پر ریجھ گئی۔ مراد نے ایسی چوٹ دل کو لگائی کہ پھر چپکے سے دنیا سے ہی چلا گیا۔"

ان کے آنسو بھی پھل پھل گرنے لگے تھے۔ بھائی کی ناکام ازدواجی زندگی اور پھر بھری جوانی میں دنیا سے چلے جانا یہ ایسا غم تھا جو پھوپھو کو اکثر رلانے کا سبب بنتا اور یہ سومیہ کے لیے بھی ایسا غم تھا جو کہ ہر وقت اس پر طاری نیند کی خماری تک کو شکست دے ڈالتا تھا۔

"ایسی بے حیا عورت توبہ توبہ!" سمیرا باجی کی ساس سکینہ آنٹی نے دونوں ہاتھ کانوں کو لگا کر دانتوں تلے زبان دبائی۔ "معصوم بچی پر لمحہ بھر کو بھی ترس نہ آیا۔ ہائے کیسی ظالم ماں تھی۔" آنٹی کی ترحم بھری نظریں وقتاً فوقتاً سومیہ کی طرف بھی اٹھ رہی تھیں اور ادھر سومیہ مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی خود کو کٹہرے میں کھڑا محسوس کررہی تھی۔

"ثمانہ کے میکے سے کوئی نہ آیا اتنی بڑی بات ہو گئی۔ بچی بھی تھی۔" سکینہ آنٹی پر ہمدردی کا تپ چڑھ گیا تھا شاید اور سومیہ جی ہی جی میں بری طرح تلملانے لگی۔ "ثمانہ کے اس انتہائی قدم کا اثر میکے پر بھی ضرور پڑا ہوگا۔" اب قیاس آرائیاں شروع ہو گئی تھیں۔ [illegible] کی وجہ سے [illegible] گئی۔"

"میکے میں تھا ہی کون۔ بڈھی ماں، نشئی بھائی۔ وہ بھی کیا سومیہ کی ذمہ داری اٹھاتا۔ اسے تو اپنا ہوش نہیں تھا۔ بیوی اس کی بھلی مانس عورت تھی۔ ایک لڑکا بھی تھا۔ تاہم سومیہ کو ان کے حوالے کرنا اپنے بھائی کی اکلوتی نشانی کو نظروں سے دور کرنا مجھے گوارا نہیں تھا۔ جنت (ثمانہ کی بھابھی) سومی کو لینے آئی بھی تھی۔ شاید دنیا دکھاوے کے لیے مگر میں نے اپنی بچی کو جانے نہیں دیا۔ اس ماحول میں اور اس گھٹن زدہ گھر میں رہنا کسی آزمائش سے کیا کم تھا۔ میری سومیہ کہاں کسی گاؤں میں رہنے کی عادی ہے۔ جہاں سہولتوں کا فقدان، زندگی کی بنیادی ضروریات کے لیے روپیہ پیسہ بھی چاہیے ہوتا ہے۔ جبکہ ثمانہ کا بیک گراؤنڈ بہت کمزور تھا۔ یہ تو حسن کی دیوانگی تھی جو ثمانہ ایک چھوٹے سے گاؤں سے اٹھ کر اس گھر میں آبسی۔ مگر

اس کی بد قسمتی نے اسے عزت سے رہنے نہیں دیا۔" پھوپھو کو ماضی کا نجانے کون کون سا منظر یاد آرہا تھا۔ ان کے چہرے پر ہر رنگ اپنا اثر چھوڑنے لگا۔ ماحول خود بخود بوجھل ہو گیا تھا۔

"اتنے سالوں میں کبھی سوئی کی ہی ماموں نے پلٹ کر نہیں پوچھا؟" سکینہ آنٹی نے ایک اور تاسف بھری نگاہ سومیہ پر پھینکی۔

"نجانے زندہ بھی ہیں یا نہیں۔ ماموں تو ان دنوں میں ہی دو چار دن کا مہمان لگتا تھا نشے نے اس کی مت مار کر رکھ دی تھی۔" پھوپھو نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

"آپ کے جذبات کی دل سے قدر کرتی ہوں۔ یتیم بھتیجی کو سینے سے لگا کر رکھا ہے۔ ورنہ آج کے دور میں کون کسی کو پوچھتا ہے۔ خون سفید ہو چکے ہیں۔ بھائی دوسرے بھائی کا دشمن ہے۔ نجانے وقت نے کیا کچھ دکھانا ہے۔" سکینہ آنٹی نے ایک کٹیلی نظر بہو پر پھینکی۔ سمیرا باجی نے پہلو بدل کر منہ کے زاویے بگاڑ لیے تھے۔

"یہ کون سا احسان کیا ہے۔ میرے دل کا ٹکڑا ہے میری بھتیجی ہے۔ اپنی اولاد سے بھی زیادہ عزیز ہے۔"

پھوپھو نے سکینہ آنٹی کے دھیان کو ایک مرتبہ پھر بٹا دیا تھا جو کہ اب اپنی بہوؤں کے بخیے ادھیڑنا چاہتی تھیں۔ آنٹی کی تینوں بہوویں ان دنوں آنٹی کے محبت سے بنائے آشیانے کے حصے بخرے کرنے کی تیاریوں میں تھیں۔ بقول سمیرا باجی کے اس مرغی کے ڈربے میں کوئی کب تک رہے۔" ایک لحاظ سے سمیرا باجی بھی ٹھیک ہی کہتی تھیں۔ سب کو ہی اپنا معیار زندگی بہتر بنانے کا شوق ہوتا ہے۔

"ویسے بس! میں آپ کی ہمت صبر اور بلند حوصلے کو اکثر سراہتی رہتی ہوں۔" سکینہ آنٹی پھر سے پرجوش ہو چکی تھیں۔ پھوپھو اپنی تعریف پر انکساری سے مسکرا دیں۔ پھوپھو کی سادگی، وضع داری اور سلیقے قرینے کی تو ایک دنیا قائل تھی۔

"نہیں بہن سب میرے اللہ کا کرم ہے۔" پھوپھو کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ بیوگی کے بعد انہوں نے بہت کڑا وقت گزارا تھا۔ بہت مشکل حالات سے مقابلہ کیا تھا۔ جب کوئی اپنا بھی ساتھ دینے کو تیار نہ تھا۔ تاہم ان کی محنت، انتھک کوشش اور صبر رنگ لایا تھا۔ ان کے پانچوں بچے کامیاب تھے۔ بیٹیاں اعلا تعلیم یافتہ تھیں۔ اپنے اپنے گھروں میں خوشگوار زندگی گزار رہی تھیں۔ دو ملک سے باہر تھیں اور دو اسی شہر میں بیاہی تھیں۔ پھوپھو کا اکلوتا بیٹا ندیم بھی ذہین اور محنتی نوجوان تھا۔ سو پھوپھو کو اپنی اولاد کی طرف سے راحتیں اور سکون میسر تھا۔ بس ایک فکر تھی تو سومیہ کے مستقبل کی۔ سومیہ کا غم ہی پھوپھو کو پورے دل سے خوش نہیں ہونے دیتا تھا۔ ایک تو سومیہ کی بیماری، پھر شکل و صورت بھی واجبی سی تھی۔ اوپر سے تعلیم بھی نہ ہونے کے برابر۔ کم از کم پھوپھو کی قابل اور بے حد ذہین بیٹیوں کے سامنے سومیہ اور بھی دب کر رہ جاتی تھی۔

"سومیہ! تم نے کیوں اپنے تعلیمی سلسلے کو منقطع کر دیا ہے بیٹا؟" آنٹی نے [illegible] سومیہ سے کہا تھا۔ وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔ اس سوال کے لیے وہ ذہنی طور پر تیار نہیں تھی۔ اسی لیے چونک کر کنفیوز سی پھوپھو کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیا بتاؤں بہن!" پھوپھو کی آواز بھرا گئی۔ "میں سومیہ کے معاملے میں نجانے کیوں اتنی حساس اور وہمی ہوں، شاید اس لیے بھی کہ بچپن سے ہی اسے سانس کی تکلیف ہو جاتی تھی۔ بیٹھے بٹھائے ہاتھ پیر چھوڑ دیتی تھی۔ سانس بری طرح اکھڑ جاتا تھا۔ دھول مٹی اس کی صحت کے لیے شدید نقصان دہ ہے۔ نجانے میٹرک تک کیسے میں نے اسے اسکول جانے دیا تھا۔ کئی مرتبہ اسکول سے فون آیا "سومیہ سخت بیمار ہے۔ اس کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔ اسکول سے آکر لے جائیں۔" بس اسی وجہ سے یہ آگے پڑھ نہیں سکی۔ میٹرک کے پرچے بھی نہیں دے سکی تھی۔ ورنہ میں تو چاہتی تھی سوئی اپنے پیروں پر کھڑی

ہو جائے۔"

پھوپھو نے جو کچھ کہا اس میں جھوٹ کی ذرہ بھر ملاوٹ نہیں تھی۔ سومیہ کو اپنی بیماری کے اس نقص سے بھی شدید قسم کی چڑ تھی۔

"تو بیٹا! پرائیویٹ امتحان دے لیتیں۔" سکینہ آنٹی شاید آج فرصت سے آئی تھیں۔

"مجھے مزید پڑھنے کا کوئی شوق نہیں تھا سو اسی لیے۔" سومیہ نے پھوپھو کو کسی بھی قسم کی وضاحت سے بچا لیا تھا۔

"امی! یہ سموسے تو چکھیں۔" سمیرا باجی آنٹی کی فراٹے سے چلتی زبان کو روکنے کی ایک کوشش کی۔

"ہاں کیوں نہیں۔" آنٹی نے سلسلۂ کلام منقطع کیا۔ پلیٹ دائیں ہاتھ میں پکڑی۔ "تم بھی کچھ سومیہ سے بنانا سیکھ لو۔" خوش ذائقہ خستہ سا سموسہ نزاکت سے منہ میں رکھتے ہوئے انہوں نے بہو کو مخاطب کیا۔

"سومیہ سے۔" سمیرا باجی کو اچھو لگ گیا۔ "سومیہ سے کیا بنانا سیکھوں۔ اسے کچھ آتا بھی ہے؟"

[illegible] سومیہ نے کچھ شرمندہ [illegible]

"کیوں بہن! سومیہ کو کچھ پکانا بھی نہیں سکھایا؟" آنٹی نے طنزیہ لہجے میں کہتے ہوئے توپوں کا رخ پھوپھو کی طرف موڑ لیا۔ سومیہ اور پھوپھو دونوں ہی چونک گئی تھیں۔ پھوپھو بے چاری کیا بتاتیں کہ سومیہ کو مسالے کی خوشبو سے بھی الرجی تھی۔ چھینک چھینک کر برا حال ہو جاتا۔ سر میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگتیں۔ سو وہ سکون کی ایک گولی لے کر لمبی تان کے سو جاتی تھی۔ کبھی کبھی اسے یاسیت کے دورے پڑنے لگتے تھے اور وہ افسردگی سے سوچتی تھی کہ اس نے دنیا میں آکر سوائے سونے کے کوئی اور کام نہیں کیا۔ اگر اپنے ان ماہ و سال میں کچھ کیا تھا تو پانچ وقت کی نمازیں تھیں جو سومیہ بڑے خشوع خضوع سے ادا کرتی تھی۔

"میری بیٹی ہر فن میں طاق ہے۔ سینا پرونا سب آتا ہے۔ سلائی کڑھائی میں ماہر ہے۔ ایسے ایسے ڈیزائن بناتی ہے کہ سب دیکھتے ہی رہ جائیں۔" پھوپھو نے محبت سے سومیہ کا چہرہ دیکھا۔

"ہاں ڈریس ڈیزائننگ تو بہترین کرتی ہے۔" آنٹی نے ستائشی نظروں سے سمیرا باجی کے دیدہ زیب لباس کو دیکھا تھا۔ یہ سوٹ بلکہ ہر سوٹ سومیہ خود اپنے ہاتھوں سے سلائی کر کے سمیرا باجی اور زنیرا باجی کو بھجواتی تھی۔ ان کے بچوں کے کرتے بھی کڑھائیاں کرتی سویٹر بنتی، پچھلی سردیوں میں اس نے سمیرا باجی کو ایک شال بھی بنا کر دی تھی۔ سومیہ کو یہ مصروفیت دل و جان سے پسند تھی۔ وہ بڑے شوق اور لگن سے بچوں کے لیے کھلونے بناتی رہتی تھی۔ چاہتی تھیں سومیہ اپنی ہم عمر لڑکیوں کی طرح زندگی کے ہر رنگ سے لطف حاصل کرے۔ وہ اسے خوش دیکھنا چاہتی تھیں اور ادھر سومیہ کی بھی یہی خواہش ہوتی تھی کہ پھوپھو اس کی وجہ سے غمزدہ نہ ہوں۔

"سومیہ کی کہیں بات چلائی ہے؟" سومیہ جو آنٹی کی بے سروپا باتوں سے بے زار ہو کر کمرے سے باہر نکل رہی تھی۔ ایک پل کے لیے ٹھٹک کر رک گئی۔

"بس [illegible] آنٹی کو ہم سے کس بات کی ہڑک بے چین کرتی ہے۔" سومیہ نے جل بھن کر سوچا۔

"جہاں میرے رب کو منظور ہوا، جس کے ساتھ سومیہ کا جوڑ لکھا ہو گا، خود بخود ان ہی راستوں پر چل پڑے گا جو ہمارے گھر کی طرف آتے ہیں۔" پھوپھو نے سادگی سے جواب دیا تھا۔ اور سومیہ اس شاعرانہ قسم کے جواب کو سن کر بے اختیار ہنس پڑی۔

"سومیہ چھبیس کی ہو رہی ہے۔ یہی مناسب عمر ہے لڑکی کی شادی کی۔ بیتا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا۔" آنٹی تو ماہ و سال کا حساب کتاب کرنے لگی تھیں۔

"سومیہ کی مجھ سے بڑھ کر بھی کسی کو فکر ہو سکتی ہے؟" پھوپھو نے ناگواری چھپا کر کہا۔

"یہ بات تو ہے۔" آنٹی نے فوراً تائید میں سر ہلایا۔

"آپ جانے کی تیاری کرو بیٹی!" پھوپھو نے آنکھ

کے اشارے سے بنی کو سمجھایا، وہ خود بھی سکینہ آنٹی کی نکتہ چینی طبیعت اور بات بات کی کھوج میں لگے رہنے کی عادت سے خار کھاتی تھیں۔

"امی! اٹھ جایئے۔ رات کے سات بجنے والے ہیں۔" ہمیرا باجی نے ماں کے اشارے کو سمجھ کر سرہلا دیا تھا۔

"چلتے ہیں بیٹی! جلدی کا ہے کی ہے۔ کبھی کبھار تو میں شبانہ بہن سے ملنے کے لیے آتی ہوں۔" آنٹی کا شاید ابھی گھر جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

"امی! بچے گھر میں اکیلے ہیں۔" ہمیرا نے دانت پیس کر نرمی سے جتلایا۔

"کتنی مرتبہ کہا تھا، بچوں کو ساتھ لے چلو۔ ہمیشہ اسی طرح جلدی کا شور مچا دیتی ہو۔" انہوں نے بے زاری سے جواب دیا۔

"آپ کا اپنا گھر ہے۔ شوق سے رک جایئے۔ بلکہ کھانا کھا کر جایئے گا۔" پھوپھو کو مروتاً کہنا پڑا۔

"تمہاری ماں اتنا اصرار کر رہی ہے۔ کچھ دیر تو رک جاؤ۔" آنٹی "پھوپھو کی مروت" کے جواب میں لگاوٹ [illegible] دیورانی کا فون تھا۔ بچے اپنے آپے میں نہیں رہے تھے شاید۔ ماں کی غیر موجودگی میں بچوں نے پورا گھر تلپٹ کر دیا تھا۔ باجی کی دیورانی التجا کر رہی تھیں کہ دونوں خواتین گھر تشریف لے آئیں۔

باجی موبائل فون کان سے ہٹاتے ہی پرس پکڑ کر باہر کی طرف بھاگی تھیں۔ باجی کی پیروی میں آنٹی کو بھی بادل نخواستہ اٹھنا پڑا۔ حالانکہ ابھی وہ کھانا کھانے کے بعد چائے پینے کا ارادہ بھی رکھتی تھیں۔ سو ان کے جانے کے بعد بھی دیر تک جھنکتی رہی۔

☼ ☼ ☼

آڑھت کے اس کاروبار میں پچھلے سال کی طرح اس دفعہ بھی اسے کچھ خاص منافع نہیں ہوا تھا۔ سال کے آخر میں جمع کی ہوئی رقم تھوڑی تھوڑی کر کے بیوپاریوں کے پیٹ میں اتر چکی تھی۔ وہ کینو کا کاروبار کرتا تھا۔ پنجاب کے مختلف شہروں میں بیوپاریوں سے خریدا کینو مخصوص سبزی منڈی میں بھجوانا اسی کے ذمے تھا۔ وہ خود اپنی نگرانی میں ٹرک لوڈ کرواتا تھا۔ اس کے باوجود منشی ہیر پھیر کرنے سے باز نہیں آتا تھا۔ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہو جاتی تھی۔ اور اس گڑبڑ کے بعد لالی اپنا مخصوص پیلے اوراق والا رجسٹر اٹھائے منہ کے زاویے بگاڑے سبزی منڈی سے کچھ دور اس کے دکان نما چھوٹے سے دفتر میں داخل ہو کر رجسٹر ڈیسک پر رکھ کے منہ پھلائے بیٹھ جاتا۔ آج بھی ایسے ہی ہوا تھا۔

"منشی پھر سے اوقات دکھا گیا ہے۔ آپ اس سے دوٹوک بات کیوں نہیں کرتے جمال بھائی!" لالی کا غصہ بجا تھا۔ جمال نے سامنے رکھی ڈھیروں رسیدیں اکٹھی کر کے دراز میں ڈالیں اور پھر لالی کے لال بھبوکا چہرے کی طرف متوجہ ہوا۔

"واپس تو آلینے دو۔ ٹھیک ٹھیک حساب لوں گا۔"

"وارننگ دی تھی مگر یہ پھر بھی اپنی اصلیت دکھا گیا ہے۔" [illegible]

"آپ نے کیا حساب لینا ہے جمال بھائی!" لالی نے خفگی سے کہا۔ "وہ منشی اپنی میٹھی زبان کے جوہر دکھا کر پھر سے بری الذمہ ہو جائے گا۔"

"اب کے ایسا نہیں ہو گا۔"

"دیکھتے ہیں، آپ اس دفعہ کیا کرتے ہیں۔" لالی نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"اپنے باپ کی عمر کے آدمی کو اور کیا کہوں۔" جمال نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے رجسٹر کھول کر دیکھنا شروع کر دیا۔

"آپ کی نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھا جاتے ہیں اس قسم کے لوگ۔" لالی نے ہمیشہ والا راگ الاپا تھا۔

جمال نے سر جھٹک کر رجسٹر پر لکھی عبارت پڑھنا شروع کر دی۔

"آج کے حساب کو نہیں، پچھلے ہفتے کے حساب کو پڑھیں۔" لالی نے کرسی سے اٹھ کر رجسٹر کے اوراق

پلٹ کر ایک جگہ پر انگلی رکھ کر نشاندہی کی۔

"اٹھارہ کریٹ مالٹے کے ٹرک سے منڈی پہنچنے سے پہلے غائب ہوئے ہیں۔"

"تمہاری منشی سے بات ہوئی ہے؟" کچھ دیر سوچنے کے بعد جمال نے پوچھا۔

"نہیں۔" لالی نے نفی میں سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے۔ میں خود منشی سے آخری مرتبہ بات کروں گا۔ سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر اس کی یہی طریقے رہے تو کسی بھروسے کے آدمی کو رکھ لو اور منشی کا پچھلا حساب کلیئر کر کے چھٹی کروا دو۔ آئے دن کے یہ چھوٹے موٹے نقصان کسی روز بڑے خسارے سے دوچار کر دیں گے۔" جمال کے چہرے پر خطرناک قسم کی سنجیدگی چھائی تھی۔

"بہتر جناب۔" لالی پھرتی سے کاغذات سمیٹ کر دراز لاک کرنے لگا تھا۔

"گھر چلیں۔" جمال نے بائیک کی چابی اٹھا کر لالی کا کندھا ہلایا۔

"آپ چلیں، میں نان کباب لے کر آتا ہوں۔" [illegible] تو پکایا ہو گا۔"

"آپ کے لیے ضرور پکایا ہو گا۔ مجھ غریب کو کیوں گالیوں سے پیٹ بھروانے کے لیے ساتھ لے جا رہے ہیں۔" لالی نے بے بسی سے کہا۔

"کچھ نہیں یار!" جمال نے اس کے کندھے پر دھپ لگائی۔ "چل بیٹھ! وقت پر گھر پہنچنا ہو گا۔ یہ نہ ہو تھانیدارنی دروازہ ہی نہ کھولے۔" جمال نے لالی کو بہکانا چاہا۔

"ہم خالہ پروین کی بیٹھک میں بستر لگا لیں گے۔" لالی ہنستے ہوئے اچھل کر پیچھے بیٹھ گیا۔

لالی کے خدشات کے عین مطابق تھانیدارنی نے کھا جانے والی نظروں سے لالی کو گھورا تھا۔ اور آنکھوں ہی آنکھوں میں جمال سے پوچھا۔ "اسے پھر اٹھا لائے ہو؟" (کچھ عرصہ پہلے لالی ہوسٹل شفٹ ہو گیا تھا۔)

"لالی میرے یتیم مسکین اور معصوم سے اکلوتے یار کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی ہو۔" جمال نے تاسف سے کہا۔ لالی نے مصنوعی ناراضی خود پر طاری کر لی تھی۔

"ابھی ہاتھ کہاں دھوئے ہیں۔ آٹا گوندھتے ہوئے آئی ہوں۔" تھانیدارنی (حسنہ بیگم) نے اپنے گورے گورے ہاتھ سامنے کر دیے تھے جن پر تازہ آٹے کی باقیات سے پتا چل رہا تھا حسنہ بیگم کچن سے سیدھی گیٹ تک جھلاتی ہوئی آئی ہیں۔

"کھانا تیار ہے تو میز پر لگا دو۔" جمال نے ڈرتے ڈرتے درخواست پیش کی تھی۔ لالی اس درخواست پر تلملا اٹھا۔ اس کے یار دلدار کو محض اسی کی خاطر ایک تک چڑھی لڑکی کی خوشامد کرنا پڑ رہی تھی۔

"روٹی پکا لوں تو پھر میز پر کھانا لگا دیتی ہوں۔" خلاف توقع تھانیدارنی نے ذرا نرم لہجے میں جواب دیا تھا۔ ورنہ وہ تو ہمیشہ انگارے چبائے رکھتی تھی۔

"یا حیرت۔" ان دونوں نے ایک دوسرے کو حیرانی سے دیکھا اور [illegible]

"آج حسنہ بیگم کا موڈ خوشگوار ہے۔" لالی نے جمال کے کان میں سرگوشی کی۔

"اللہ خیر کرے۔" جمال نے دہل کر کہا۔

"میرے لیے دعا کریں کہ اللہ میری خیر کرے۔" لالی نے ڈرتے ڈرتے سالن پلیٹ میں نکالتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟" جمال نے حیرانی سے پوچھا۔

"اس چکن کی ڈش میں کہیں زہر نہ ملا ہو۔" لالی نے سرگوشیانہ کہا۔

"تھانیدارنی کم از کم مجھے زہر نہیں کھلا سکتی۔ سو تم اطمینان سے کھاؤ۔" جمال مزے سے بولا۔

"اقصان! روٹی کھا کر میری بات سننا۔" حسنہ دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی کمرے میں داخل ہوئی۔

"جی بہتر۔" لالی کھسیا کر رہ گیا۔ حسنہ پلٹ گئی تھی۔

کراہت چھپانے کی غرض سے پلیٹ پر جھک گیا۔

"تھانے دارنی نے مجھ سے کیا کہنا ہے، جمال بھائی!" لالی کے حلق میں نوالہ پھنس گیا تھا۔

"یہ تو میری جان حسنہ بیگم سے تم خود پوچھ لو۔ مجھے الہام تو نہیں ہوا۔"

"آپ بھی میرے ساتھ چلنا۔" لالی نے خوفزدہ انداز میں کہا۔

"کیوں؟"

"ذرا میرے دل کو تسلی رہے گی۔" لالی نے معصومیت کے تمام ریکارڈ توڑتے ہوئے کہا۔

"نہ میری جان! یہ پہاڑ تمہیں تنہا ہی سر کرنا ہو گا۔" جمال نے صاف دامن بچالیا۔

"اچھے یار ہو مصیبت میں ساتھ چھوڑ رہے ہو جمال بھائی!" لالی رو دینے کو تھا۔

"مرد بن کیوں عورتوں کی طرح آنسو بہانے لگا ہے۔" جمال نے لالی کو چھیڑا۔ تبھی باہر سے آواز آئی تھی۔

"لالی او لالی! کتنی روٹیاں اور کھائی ہیں۔ بس کر۔" [illegible]

[illegible] لالی نے پانی کا گلاس خالی کرکے اٹھتے ہوئے کہا۔ "ایک تو روٹی کھلاتے ہی گنتی کرنا شروع کردیتی ہے، تاکہ کھانے والے کا ہاضمہ خراب ہو جائے۔"

"مجھ پر آیت الکرسی پڑھ کر پھونک مار دو جمال بھائی!" وہ شرارت سے جمال کے قریب جھکا تھا۔ جمال نے ہنستے ہوئے لالی کے سر پر چپت لگائی۔

"آپ کہاں چل دیے۔" جمال کو اٹھتا دیکھ کر لالی سرعت سے بولا۔

"میں اماں کو دیکھنے جارہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ چلیے میں بھی تھانے دارنی کو سلامی پیش کرکے آتا ہوں۔" وہ ہنستے ہوئے باہر نکل گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

حسن آراء صرف [illegible] جمال کے اکلوتے ماموں تھانیدار شہریار [illegible] کی اکلوتی صاحبزادی تھی۔ اس کے والد کے انتقال کے بعد ماموں نے بیوہ بہن اور یتیم بھانجے کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ اس کے والد کی تھوڑی بہت زمینیں تھیں، جو قرضے میں جانے سے محض ماموں کی بہتری سے بچ گئی تھیں۔ آج اس بنجر زمین پر ہر سو ہریالی تھی اور زمین کا رقبہ بھی پہلے سے جمال کی محنت اور دیانت کی وجہ سے بڑھ گیا تھا۔

ماموں کے دست شفقت کی وجہ سے اس نے زراعت کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ان بنجر زمینوں کو آباد کیا تھا اور ہر کسان کی طرح اسے بھی اپنی زمین کے اس خطے سے محبت تھی۔

اس کے ماموں ایک عظیم انسان تھے۔ بہت ایماندار، محنتی اور اصولوں کے پکے۔ بیوی کی وفات کے بعد انہوں نے دوسری شادی نہیں کی اور حسن آراء کے لیے انہوں نے اپنی زندگی وقف کردی تھی۔ جس طرح ماموں کو اپنی بہن، بیٹی اور بھانجے سے محبت تھی ان کی وفات جمال کو بے آسرا ہونے کا احساس دے گئی تھی۔ [illegible] ذمے داریوں نے جمال کو وقت سے پہلے سمجھدار کر دیا تھا اور ان ذمے داریوں کو نبھانے میں [illegible] نے ساتھ دیا تھا۔ حالانکہ جمال لالی پر کوئی بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔

نعمان ماموں کے چچازاد بھائی کا بیٹا تھا۔ بدقسمتی سے اسے بھی بہت بچپن میں یتیمی کا صدمہ سہنا پڑا تھا۔ جب پہلی مرتبہ ماموں نعمان لالی کی انگلی تھامے گھر لے کر آئے تو انہوں نے سب سے پہلے جمال سے لالی کا تعارف کروایا تھا۔

"جمال! یہ نعمان ہے سب کا لالی۔ آج سے یہ تمہارا بھائی ہوا۔ اب یہ ہمارے ساتھ رہے گا۔" وہ لالی کے گھنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے محبت سے بول رہے تھے۔ پھر انہوں نے اسی انداز میں لالی سے کہا۔ "لالی! یہ جمال ہے تمہارا جمال بھائی۔" لالی نے زور و شور سے سر ہلا کر جمال بھائی کی انگلی تھام لی تھی۔

"جمال بھائی! آپ میرے ہو۔" لالی چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دور [illegible] کے پیچھے حسنہ بھی کھیل رہی تھی۔ اس منظر کو اس نے کافی حاسدانہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"جمال بھائی تو میرا ہے۔" جب رہا نہ گیا تو حسنہ بول ہی اٹھی۔

"نہیں، جمال بھائی اب میرا ہے۔" لالی بھی حسنہ کی ٹکر کا تھا۔ چٹاخ سے بولا۔

"میں تمہیں ماروں گی۔" حسنہ کا جلال عود آیا۔

"بری بات بیٹا!" جمال کی اماں رسوئی سے باہر نکلیں۔ "جمال تم دونوں کا بھائی ہے۔"

اماں کی بروقت مداخلت نے اس وقت تو بات دبادی تھی مگر "تاریخ گواہ" تھی حسنہ نے اول روز سے جو لالی سے شریکا لگایا تھا۔ وہ آج تک قائم و دائم تھا۔

حسن آراء کو تھانے دارنی کا خطاب محلے کے ان معصوم بچوں نے دیا تھا جو اکثر اس کے عتاب کا نشانہ بن جاتے تھے۔ اس کی غصیلی فطرت کی بنا پر بچوں کی ماؤں نے اور پھر آہستہ آہستہ سب ہی نے "تھانیدارنی" کے لقب سے پکارنا شروع کردیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"لور لور شہر کی سڑکیں ناپ کر دو ٹیلے مسٹنڈوں کے ساتھ آوارہ گردی کرکے رات کو گھر آجایا کرو اور آتے ساتھ ان بے حیا اچھلتی کودتی باندریوں کا دیدار کرنے بیٹھ جایا کرو۔"

حسنہ بڑے جارحانہ تیور لیے اماں کے کمرے سے برآمد ہوئی تھی۔ رات کے سوا سات بجے تھے۔ جمال ابھی تک گھر نہیں آیا تھا۔ لالی نے کھڑکی میں اترتی شام کو دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھری، ساتھ ہی ریموٹ کا بٹن دبا کر چینل بدل دیا۔

"میرے منہ میں خاک، کہیں آپ کی نظر تو نہیں کمزور ہو گئی۔ جمال بھائی سے کہتا ہوں۔ کسی اچھے سے ڈاکٹر سے وقت لیں۔ میں تو ملکی حالات سے باخبر رہنے کے لیے خبریں سن رہا تھا، یکایک آپ کو یہ [illegible] حسنہ بگاڑ کے انگریزی میں خبریں پڑھتی ڈیسنٹ حسینہ "باندری" دکھائی دے گئی ہے۔ اللہ آپ کے ان خوب صورت دیدوں پر رحم کرے۔"

"مجھے تمہاری اس پاگل جوانی پر رحم آجاتا ہے۔ میرے ہاتھ سے تم ضائع ہو جاؤ گے ایک دن لالی پالی اور چائے کی ٹوٹی پیالی۔" حسنہ غصے سے لال ٹماٹر ہو گئی۔

"باورچی خانے میں کھانے کے اور بھی لوازمات موجود ہوں گے۔ آپ کو بھی لال مرچیں ہی چبانے کو ملتی ہیں۔" لالی نے تاسف سے دائیں بائیں سر ہلایا۔

"میں تمہارے کسی دن اتنے ٹوٹے کروں گی کہ چیل کوؤں کو بھی نہیں ملیں گے۔" حسنہ سر سے پیر تک سلگ اٹھی۔

"ہمارے وجود کے ٹوٹے کر دیجیے گا صرف اس دل کو کچھ مت کہیے گا۔" لالی نے گویا گڑگڑا کر التجا کی۔

"کیوں؟" غصے میں حسنہ نے خواہ مخواہ پوچھ لیا۔

"اس معصوم دل میں یونیورسٹی کی حسینائیں اور ٹی وی اداکارائیں رہتی ہیں۔"

[illegible]

"توبہ توبہ اتنا بے حیا! جمال کو بتاؤں گی۔ اس پر کڑی نگاہ رکھے۔" وہ سوچتے ہوئے لالی کو گھورتی رہی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہیں جناب!" لالی [illegible] سے کھنکارا۔ حسنہ گڑبڑا کر رہ گئی۔

"ہونہہ، جانے خود کو سمجھتے کیا ہو۔"

"آپ کی طرح خود کو تھانے دار تو ہرگز نہیں سمجھتا۔" لالی جوابی حملے کرنے میں کہاں چوکتا تھا۔

"چار دن ہوسٹل میں رہتے ہو تو گھر میں بھی سکون رہتا تھا اتنے دن۔" حسنہ جھلاتے ہوئے ذہن پر زور ڈال کر یہ سوچنے لگی تھی کہ وہ اس لالی کے بچے کو آخر کیا کہنے کے لیے آئی تھی اور پھر فضول سی تکرار میں دماغ الجھانے لگی۔

"آپ کے ہوتے ہوئے کم از کم اس گھر میں سکون تلاش کرنا ناممکن ہے۔" لالی نے دہائی دی۔

"میں تم سے کہنے آئی تھی۔ اماں کی دوائی کیوں نہیں لائے؟" بالآخر حسنہ لالی کے منہ سے آنے کا اصل مقصد باہر آ گیا تھا۔

"جمال بھائی لیتے آئیں گے۔" لالی نے اطمینان سے بتایا۔

"تم صرف روٹیاں توڑنے کے لیے ہو۔" حسنہ تنفر سے بولی۔

"کہہ سکتی ہیں۔" اس ڈھیٹ پر کون سا اثر ہونا تھا۔ حسنہ ہر قسم کی بے عزتی کر کے دیکھ چکی تھی۔ اسی پل جمال بھی اندر داخل ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ تھکن تھی۔ وہ ٹرک کے ساتھ اوکاڑہ گیا تھا۔ ابھی ابھی واپسی ہوئی تھی۔ یہ ٹرک منافع کے ساتھ لوٹا تھا۔ سو اسی لیے تھکاوٹ کے باوجود اک سرشاری کی کیفیت تھی جو رگ و جاں کو مسرور کر رہی تھی۔

"اماں کی دوائی لائے؟" حسنہ نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"دوائی بھول سکتا ہوں۔"

"روٹی لگاؤں۔" حسنہ نے اس کی تھکن کے خیال سے [illegible]

"روٹی سالن لگا دے؟" کیا تندور میں؟" جمال نے حسنہ سے بھی زیادہ نرم لہجے میں پوچھا۔

"نہیں تو۔ روٹی تو میں توے پر پکا چکی ہوں۔"

"تو کیوں کھوتا۔ دستر خوان لگانا ہے۔" جمال نے بغیر جھلائے اپنے ازلی نرم لہجے میں سمجھایا۔

"تم بھی نا جمال بھائی!" حسنہ لالی کے سامنے خفت سے سرخ پڑ گئی تھی۔

"ہونہہ۔ تجھے پتا ہے۔" وہ حسنہ ہی کیا جو کچھ سمجھنے کی کوشش کرے۔

"خاک پتا ہے۔" لالی کی زبان پر پھر سے کھجلی ہونے لگی۔

"ہاں۔ ہاں، کچھ نہیں پتا تم دونوں کو تو شکر ہے عالم فاضل ہوتا۔" حسنہ غصے سے پاؤں پٹختی باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

پھوپھو صبح صبح اسے زنیرہ باجی کے گھر چھوڑ گئی تھیں۔ زنیرہ باجی کی آج بھی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ مقامی کالج میں پڑھاتی تھیں اور خرابی طبیعت کے باوجود کالج روانہ ہو گئی تھیں۔

سومیہ دونوں بچوں کے ہمراہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ وہ بچوں کو چھوٹے چھوٹے کھیل بتا رہی تھی۔ انہیں پوئمز سنا رہی تھی۔ حالانکہ بچے کافی چھوٹے تھے۔ ابھی کچھ بھی سمجھ نہیں سکتے تھے۔ بچوں کے ساتھ مصروفیت میں کافی وقت بیت گیا تھا جب بیل فون کی گھنٹی نے سومیہ کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ پھوپھو کا فون تھا۔ وہ گھر پہنچ گئی تھیں اور سومیہ سے پوچھ رہی تھیں کہ وہ اس وقت کیا کر رہی ہے۔

"بچوں کے پاس بیٹھی ہوں۔ دونوں غنودگی میں ہیں کچھ دیر تک سو جائیں گے۔"

"بچے سو جائیں گے تو پھر تم کیا کرو گی؟" ایئر پیس سے پھوپھو کی آواز ابھری۔

"یہ تو آپ بتائیں۔ میں کیا کروں؟" وہ معصومیت سے بولی۔

"[illegible]" پھوپھو [illegible] سوچتے ہوئے بولیں۔ [illegible] الماری میں دیکھنا استری کرنے والے کپڑوں کا بھی ڈھیر رکھا ہو گا۔ دل کیا تو استری کر لینا۔ خود کو مصروف رکھنا بیٹا! میں تمہیں اس لیے چھوڑ کر آئی ہوں کہ کچھ تو ماحول بدلے۔ اپنے گھر میں ہر وقت کمرے میں گھسی رہتی ہو۔ کہیں آتی جاتی نہیں ہو۔"

"ہمارا ہے ہی کون پھوپھو! جس کے گھر آنا جانا لگا رہے۔ باجیاں ہیں تو وہ بھی انتہائی مصروف۔ نجانے زنیرہ باجی کب تک آئیں گی۔" سومیہ سوئے ہوئے بچوں کو دیکھتے ہوئے آہستگی سے بولی۔

"دو بجے تک آ جائے گی۔ گھبرانا مت۔" پھوپھو نے نرمی سے تاکید کی۔ "اور کچھ کھا بھی لینا بھوکی مت بیٹھی رہنا۔"

"جی اچھا۔" سومیہ کا دل بے حد برا ہو رہا تھا۔ فون رکھنے کے بعد وہ بے دلی سے بیٹھی رہی۔ زنیرہ باجی کے گھر وہ آج سے پہلے بھی تنہا نہیں آئی تھی۔ ہمیشہ پھوپھو ساتھ ہوتی تھیں۔ پہلی مرتبہ پھوپھو نے اسے تنہا زنیرہ باجی کے گھر چھوڑا تھا اور سومیہ کے دل میں خوامخواہ کے وسوسے آ رہے تھے۔ منفی سوچوں سے چھٹکارے کی غرض سے اس نے مشین لگا کر کپڑے دھونے شروع کر دیے تھے۔

باجی کی کام والی صبح سویرے آ جاتی تھی۔ بچوں کو سنبھالنے کی ذمہ داری بھی اسی کی تھی۔ مگر آج شاید وہ چھٹی پر تھی اور شاید اسی لیے پھوپھو اسے یہاں چھوڑ گئی تھیں۔

جب تک کپڑوں کی دھلائی ہوتی رہی، وہ ساتھ ساتھ کپڑے بھی استری کرتی رہی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ کمرے میں جھانک کر بچوں کو بھی ایک نظر دیکھ آتی تھی۔ بچے ابھی تک سو رہے تھے۔ شاید باجی نے انہیں اتنی دیر تک سلانے کی عادت ڈال رکھی تھی۔

وہ باجی کے بیڈ روم میں استری شدہ کپڑے رکھ رہی تھی جب ڈور بیل بج اٹھی۔

"[illegible] آ گیا۔" سومیہ حد درجہ خوف زدہ [illegible] کے پیش نظر دروازے تک آئی تھی کہ [illegible] گھنٹی کی آواز سے بچوں کی نیند نہ خراب ہو۔

"کون؟" لاکھ چاہنے کے باوجود وہ اپنی آواز کی لرزش پر قابو نہیں پا سکی تھی۔

"میں ہوں۔ سہیل۔ دروازہ کھولو۔"

"سہیل بھائی! اس وقت۔" سومیہ نے حیران نظروں سے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔

"سومیہ تم۔" سہیل بھائی جو بہت عجلت میں دکھائی دے رہے تھے، سومیہ کو اپنے گھر میں دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

"جی۔" وہ محض سر ہلا کر رہ گئی تھی۔ اپنی اس وقت موجودگی کا بھلا کیا جواز پیش کرتی کہ پھوپھو اس کا ماحول بدلنے کی بنا پر یہاں چھوڑ گئی ہیں۔

"کس کے ساتھ آئی ہو؟" سہیل بھائی نے اپنی حیرت پر قابو پایا تھا۔

"پھوپھو چھوڑ کر گئی ہیں۔ ماسی آج چھٹی پر تھی۔ بچے تنہا تھے اس لیے۔" سومیہ نے جھجکتے ہوئے وضاحت کی۔

"زنیرہ کو تمہاری آمد کے بارے میں علم ہے؟" وہ کچھ سوچتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

"شاید پھوپھو نے بتایا تو ہو گا۔"

"بچے کہاں ہیں؟" وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے ذرا رک کر پوچھنے لگے۔ سومیہ اپنی جھونک میں سہیل بھائی کے پیچھے چل رہی تھی۔ ان کے رکنے پر اس کا سر ان کے کندھے سے ٹکرا گیا۔

"سوری۔" وہ بری طرح شرمندہ ہو گئی۔

"اٹس اوکے۔" انہوں نے کمرے کا دروازہ کھولا تو بچے بیڈ پر سوئے ہوئے نظر آئے۔ وہ کپڑوں کے ڈھیر سے بچتے بچاتے بیڈ تک گئے تھے۔

"یہ تم کن کاموں میں الجھی ہوئی ہو۔" سہیل بھائی نے کافی ناراضی سے کپڑوں کی اتنی بڑی گٹھری کی طرف دیکھا۔ "جس کا کام ہے وہ خود آ کر کرے گی۔"

"[illegible] استری تو ہو گئے ہیں۔ بس الماری میں سیٹ کرنے ہیں۔" سومیہ نے سر جھکا کر [illegible] شدہ کپڑوں کو اٹھانا شروع کر دیا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ چپکے سے چھوٹی سی گھڑی پر نگاہ بھی ڈال لیتی تھی جو کہ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھی تھی۔ ہر دفعہ غیر ارادی نظر سہیل بھائی کی طرف بھی اٹھ جاتی۔ وہ کمرے کے ساتھ ہی لیٹ چکے تھے اور دھیرے دھیرے اپنی کنپٹیاں دبا رہے تھے۔ سومیہ نے کچھ غور کیا تو خیال آیا۔ سہیل بھائی کی آنکھیں بہت سرخ تھیں۔ چہرہ بھی لال ہو رہا تھا۔ شاید ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ تب ہی وہ اس وقت گھر چلے آئے تھے۔ سومیہ نے جلدی جلدی کام سمیٹا اور باہر آ گئی۔

گھڑی نے تین بجائے تو وہ وحشت زدہ سی ہو گئی۔ باجی ابھی تک نہیں آئی تھیں۔ جبکہ سومیہ کو فکر اور بھوک نے ادھ موا سا کر دیا تھا۔ کئی مرتبہ پھوپھو کو فون کرنے کے بعد وہ مایوس سی قالین پر بیٹھ گئی تھی۔ بیل

تو مسلسل چار ہی تھی کہ پھوپھو جانے کہاں تھیں۔ شاید سو رہی تھیں یا پھر کسی کام کے سلسلے میں گھر سے باہر نکلی تھیں۔

کچھ دیر بعد گڑیا کے رونے کی آواز سنائی دی تھی۔ پھر سہیل بھائی بچی کو اٹھا کر باہر نکل آئے۔ اسے قالین پر بیٹھا دیکھ کر پہلے تو وہ ٹھٹک گئے پھر بری طرح شرمندہ ہو گئے تھے۔

"آئم سوری سومیہ! مجھے تو خیال نہیں رہا تھا کہ تم بھی یہاں ہو۔ میری طبیعت خراب تھی۔ دوا کھا کر سو گیا تھا۔ تم ہی جگا دیتیں۔ کچھ گھر میں موجود ہے یا کھانا منگوالوں۔ تم بھی ضرور بھوکی ہو گی۔ مجھے خود سے خیال ہی نہیں آیا۔"

وہ بولتے ہوئے فون اسٹینڈ کی طرف بڑھ گئے۔ گڑیا فرش پر منتقل ہو چکی تھی۔ سومیہ اس کے ریسیو کرنے سے پہلے دودھ کی بوتل اٹھا کر لے آئی تھی۔ سہیل بھائی فون سے فارغ ہو کر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اب ان کی طبیعت پہلے سے کافی بہتر لگ رہی تھی۔

"تم [illegible] نہیں۔ فرصت ہی [illegible] ہوں۔" وہ خود کلامی کے انداز میں بولتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گئے۔ سہیل بھائی کو میز پر پلیٹیں رکھتے دیکھ کر سومیہ کو کہنا پڑا۔

"میں برتن لگاتی ہوں سہیل بھائی! آپ پلیز بیٹھ جائیں۔"

"اٹس او کے' میں کر لیتا ہوں۔ یہ کون سا پہاڑ توڑنے سے بڑا کام ہے۔ تم نے پہلے ہی خوامخواہ کپڑوں کے ڈھیر دھوئے اور استری کیے ہیں۔ ماسی نے کر لینا تھے۔ کبھی کبھار آتی ہو اور فضول کاموں میں لگی رہتی ہو۔"

"میں فارغ ہی تھی سو اور کیا کرتی۔" سومیہ نے پھر سے گھڑی کی طرف دیکھا۔ چار بجنے میں کچھ ہی منٹ باقی رہ گئے تھے۔

اسی پل ڈور بیل بجنے لگی۔ سہیل بھائی باہر نکل گئے۔ واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں بڑا سا شاپر تھا۔ جس کے اوپر "فرائیڈ چکس" بڑے بڑے حروف میں لکھا تھا۔ انہوں نے شاپر سومیہ کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

سومیہ خاموشی سے کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔ وہ ڈرم اسٹکس' کباب' ایگ رول اور چپس پلیٹوں میں نکال کر لائی تو سہیل بھائی گڑیا کے ساتھ مصروف تھے۔ تنی بھی اٹھ کر آ گیا تھا۔ سہیل بھائی بچوں کو چپس کھلاتے ہوئے گاہے بگاہے سومیہ کی طرف بھی دیکھ رہے تھے۔ جو خاموشی سے کھا رہی تھی۔ وہ کھا چکی تو سہیل بھائی نے اس سے کہا۔

"زحمت نہ ہو تو مجھے چائے بنا دو۔"

"ابھی بنا کر لاتی ہوں۔" سومیہ خالی پلیٹیں اٹھا کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔ جب وہ چائے کا مگ اٹھا کر باہر آ رہی تھی تو اس نے سہیل بھائی کو فون پر مصروف پایا۔ اس نے مگ سہیل بھائی کے سامنے رکھ دیا اور خود گڑیا کو گود میں اٹھا کر سہیل بھائی کے فون بند کرنے کا انتظار کرنے لگی۔

"بھابی کب تک آئیں گی؟" سومیہ نے بے چینی سے [illegible] پوچھ لیا [illegible] اس کی واپسی رات تک ہو گی۔ شاید گیارہ بجے تک آئے۔" سہیل بھائی نے موبائل میز پر رکھتے ہوئے بتایا۔

"اتنی دیر سے کیوں؟" وہ الجھ کر بولی۔

"کیا تمہیں نہیں پتا۔" انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں۔" سومیہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"کمال ہے۔ تمہیں آنٹی نے بھی نہیں بتایا۔" وہ خود بھی حیران رہ گئے۔

"نہیں۔"

"ذیرا تو بچیوں کے ٹرپ کے ساتھ اسلام آباد گئی ہے۔" وہ بتا رہے تھے۔

"اچھا۔" سومیہ ششدر رہ گئی۔ "پھوپھو نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟"

"یہ تو پھوپھو کو ہی پتا ہونا چاہیے۔" وہ ہنس پڑے تھے۔ "تمہارے چہرے پر کیوں ہوائیاں اڑنے لگی ہیں؟"

"مجھے گھر جانا ہے۔"

"تو میں ابھی چھوڑ آتا ہوں۔" وہ نرمی سے بولے۔

"مجھے اسی وقت جانا ہے۔" سومیہ بے چینی سے اٹھی۔

"بابا! ابھی چھوڑ آتا ہوں۔ چائے تو پی لینے دو۔" انہوں نے سومیہ کو تسلی دینا چاہی۔

"مجھے آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ انکار کر دیتی' زبردستی تھوڑی تھی۔" وہ سوچوں کے تانوں بانوں میں الجھنے لگی۔

"ایک بات تو بتاؤ سومیہ!" وہ اس کا دھیان بٹانے کی غرض سے بولے۔

"جی۔" سومیہ چونک کر ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

"تم نے اسٹڈیز کیوں ڈراپ کر دی۔"

"بس ایسے ہی۔" ہمیشہ کی طرح اسے کوئی جواز نہیں سوجھا تھا۔

"ایسے ہی اپنا فیوچر داؤ پر لگا دیا۔ تمہیں آگے پڑھنے کا شوق نہیں تھا؟ کالج جاتیں' فرینڈز بناتیں' لوگوں سے ملتیں [illegible] ہے تو تمام عمر اچھی یاد کی طرح ذہن میں محفوظ رہتا ہے۔ لوگوں سے ملنا' باتیں کرنا' اپنے خیالات کا اظہار کرنا' کچھ مقابل کی باتوں کو سننا' رویوں کو سمجھنا' لہجوں کو جانچنا' نگاہ کے مفہوم جاننا' چہرے پڑھنا۔ شعور کی انگلی کو پکڑا ہوتا تو آج تم کسی مقام پر پہنچی ہوتیں۔ کیا تم نے آج تک اپنے اندر کسی کمی کو کبھی نہیں تلاشا؟" سہیل بھائی کا لہجہ کس قدر دھیما اور پر اثر تھا۔ سومیہ ان کے لہجے کے بہاؤ میں بہنے لگی۔

"سومیہ...!" سہیل بھائی نے گلا کھنکار کے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ گڑیا اور تنی کھیل میں مصروف ہو چکے تھے۔

"جی۔" وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے آہستگی سے بولی۔ "میرے اندر صرف ایک کمی نہیں۔ ایک طویل لسٹ ہے' کیا کیا بتاؤں۔ اعتماد کی کمی' اخلاق کی کمی' سب سے بڑھ کر تعلیم کی کمی۔"

"اخلاق تو تمہارا بہت اچھا ہے۔ اور تعلیم کم ہے تو کیا ہوا۔ بس دماغ کی بند کھڑکیوں کو کھول لو۔" انہوں نے نرم لہجے میں بڑی گہری بات کی تھی۔

"یہ کام بھی میرے اختیار میں نہیں۔ میرے اندر سستی اور بیزاری کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔" سومیہ نے بے بسی سے بتایا۔

"یہ تو اور بھی پریشان کن صورت حال ہے۔ تمہارے اندر بیزاری اس "گھٹن" کی وجہ سے ہے جسے کوئی روزن کوئی دریچہ نہیں مل رہا۔"

"کوئی روزن ملے بھی کیسے۔" سومیہ نے خود کو اور بھی بے بس پایا۔ ایک تو وہ اپنے دماغ میں چھڑی جنگ کسی سے بھی شیئر نہیں کر سکتی تھی۔ ایک سچی ساتھی کا ہونا کس قدر ضروری ہوتا ہے۔ سومیہ کو اس پل اپنا آپ اور بھی تنہا اور اداس لگا۔

"شادی کر لو۔" انہوں نے اطمینان سے ایک حل پیش کیا۔ "تمہارا ماحول ہی نہیں۔ یہ گھٹن زدہ ذہن ہی نہیں [illegible] ہو جائے گی۔"

"[illegible] ہے؟" سومیہ نے ایک [illegible] کا سوال بے دھیانی میں کر دیا۔

"اگر تو یہ سامنے کھیلتے دو بچے نہ ہوتے یا پھر مجھ پر شادی شدہ کا لیبل نہ لگ چکا ہوتا تو میں اپنا پرپوزل تمہارے سامنے پیش کر دیتا۔"

سہیل بھائی نے اطمینان سے کہا تھا۔ سومیہ جو سر جھکائے بیٹھی تھی ایک دم غصے سے لرز کر سہیل بھائی کی طرف دیکھنے لگی۔ سومیہ کو ان سے اس بے باکی کی امید نہیں تھی۔ وہ غصے میں کچھ بولنا چاہتی تھی مگر سہیل بھائی کی طرف دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ جو کہ بہت ہی سادہ انداز میں مسکرا رہے تھے۔ ان کے چہرے پر اجلی سی مسکان پھیلی تھی۔

"پگلی لڑکی! تم بہت معصوم ہو جھلی! یہ اللہ کی اتنی وسیع دنیا ہے۔ اور اللہ پاک نے تمہارے جوڑ کا آدمی بھی ضرور بنایا ہو گا اور وہ جو کوئی بھی ہو گا۔ بہت ہی خوش قسمت ہو گا۔ ایسے سچے موتی جیسے قیمتی لوگ

نصیب والوں کے حصے میں آتے ہیں۔" انہوں نے محبت سے کہا۔

"میں ایسی تعریفوں کے قابل نہیں ہوں۔ اتنی عام سی معمولی سی تو ہوں۔" وہ احساس کمتری کا شکار نہیں تھی مگر جھوٹ بولنا بھی اسے گوارا نہیں تھا۔ وہ سچ کہہ رہی تھی۔ اگر اس کی شکل کچھ اچھی ہوتی تو پھوپھو کے سر سے اس کا بوجھ کب کا اتر چکا ہوتا۔ وہ بے چاری اس کے غم میں گھل گھل کر آدھی ہو رہی تھیں۔

"تم میں اتنی خوبیاں ہیں... جو کہ خود تمہارے علم میں بھی نہیں۔" سہیل بھائی نے اپنی طرف لپکتی گڑیا کو گود میں اٹھا کر کندھے سے لگا لیا۔

"آپ مجھے جانتے ہی کتنا ہیں۔" وہ جھینپ کر مسکرا دی۔ اپنی تعریفوں پر اسے ہنسی آ رہی تھی۔

"تم حیران ہو گی۔ میں تو کافی عرصے سے تمہارا مطالعہ کر رہا ہوں۔"

"اچھا..." سومیہ کی آنکھیں تحیر سے پھیلتی چلی گئیں۔ "پھر کیا جانا میرے بارے میں؟"

"یہ کتاب جس کا عنوان سومیہ حسن ہے سادہ سے جتنی معصوم [illegible] انکار کرو۔" وہ سادہ سے انداز میں مسکرا دیے۔ "تم بچوں کو کپڑے چینج کروا دو پھر میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔"

سہیل بھائی اٹھ کر کمرے میں چلے گئے تھے۔



وہ بچوں سمیت باہر نکل رہے تھے جب پھوپھو سامنے سے آتی دکھائی دیں۔

"آپ کہاں رہ گئی تھیں۔" سومیہ پھوپھو کو دیکھتے ہی پھٹ پڑی۔ پھوپھو تیتی کو اٹھا کر چومتے ہوئے مسکرا دیں۔

"مجھے یقین تھا کہ میری بیٹی شدید غصے میں بھنا رہی ہو گی۔" پھوپھو نے پیار سے اسے ساتھ لگایا۔ "بور تو نہیں ہوئیں بچوں کے ساتھ اچھا وقت گزرا ہو گا۔"

"میں نے آپ کی بچی کو بور تو نہیں ہونے دیا۔"

"تم کب آئے؟" پھوپھو اب داماد کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔ "تم نے تو آٹھ بجے آنا تھا۔"

"میری آج نائٹ ڈیوٹی ہے۔ ابھی کچھ دیر تک نکلوں گا۔"

"اوہ... اچھا اچھا۔" صاف پتا چل رہا تھا۔ پھوپھو کو سہیل بھائی کی موجودگی ناگوار گزری ہے۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ آج گھر آ جائیں گے۔ خرابی طبیعت کی وجہ سے انہیں ہسپتال سے گھر آنا پڑا تھا۔ ورنہ پھوپھو سومیہ کو کبھی تنہا رہنے کی اجازت نہ دیتیں۔ وہ سومیہ کے معاملے میں بہت حساس تھیں۔

"تم خیر سے جاؤ۔ میں اور سومیہ بچوں کے پاس ہیں۔" پھوپھو نے نرمی سے کہا۔

سہیل بھائی کے جانے کے بعد پھوپھو کچن میں گھس گئی تھیں۔ رات کے لیے سالن پکانا تھا۔

سومیہ اب پرسکون سی بچوں کے ساتھ کھیلنے میں مصروف ہو گئی تھی۔ پھوپھو کی موجودگی میں ہمیشہ اسے تحفظ کا احساس رہتا تھا۔

پھوپھو کھانے کے بعد کچن سے فارغ ہو کر باہر نکلی تھیں۔ اتنی دیر تک بچے سو چکے تھے۔ پھوپھو نے سومیہ سے پوچھا۔

"روٹی بنا دوں؟ یا کچھ دیر بعد کھاؤ گی۔"

"ابھی بھوک نہیں ہے۔" سومیہ نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ حیرت سے سوچ رہی تھی کہ پورا دن اسے ہلکا سا سر درد بھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ پہلے کی نسبت آج وہ خود کو فریش محسوس کر رہی تھی۔ سب سے زیادہ حیرانی اس بات پر تھی کہ اسے نیند کے جھونکوں نے نہیں ستایا تھا ورنہ تو ہر وقت ہی ذہن غنودگی کی زد میں رہتا تھا۔ سانسیں بھی ہموار چل رہی تھیں۔ یعنی آج کے دن وہ خود کو ہر لحاظ سے فٹ محسوس کر رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ایک دم وہ اور بھی ہلکی پھلکی سی ہو گئی۔ اپنے مزاج کی اس تبدیلی نے سومیہ کو ورطۂ حیرت میں ڈال کر رکھ دیا تھا۔

"سومی! کیا سوچ رہی ہو۔" پھوپھو نجانے کب اس

کے قریب آ کر بیٹھ گئی تھیں۔ سومیہ کو قطعاً احساس تک نہیں ہوا۔

"کچھ نہیں۔" وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔

"سارا دن کیا کرتی رہیں؟" پھوپھو نے ناقابل فہم سے انداز میں پوچھا۔ سومیہ نے تفصیل سے بتایا۔

"سہیل کب آیا تھا؟" انہوں نے لہجے کو سرسری سا بنا کر پوچھا۔

"شاید دو بجے کے قریب۔" سومیہ نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"مجھے خبر نہیں تھی۔ سہیل گھر آ جائے گا۔ ورنہ میں تمہیں کبھی نہ بھیجتی۔" وہ خود کلامی کے سے انداز میں گویا ہوئی تھیں۔

"ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔"

"ہونہہ، پتا نہیں۔" پھوپھو نے سر جھٹکا۔ "کوئی بات تو نہیں کی سہیل نے؟" کچھ دیر سوچنے کے بعد پھوپھو نے بے چینی چھپاتے ہوئے پوچھ ہی لیا۔

"کیسی بات؟" سومیہ نے حیرانی سے پھوپھو کی طرف دیکھا۔ نجانے کون سی بات پھوپھو پوچھنا چاہ رہی تھیں۔ "سہیل بھائی نے تو کافی ساری باتیں کی تھیں [illegible] کیا کرتی۔"

"کسی بھی قسم کی فضول بات؟" حالانکہ وہ اچھی طرح سے جانتی تھیں کہ ان کا یہ داماد کس قدر تہذیب یافتہ اور شائستہ مزاج ہے مگر مرد کا بھلا کیا بھروسہ کسی بھی وقت بدل سکتا ہے۔ وہ اپنے خدشات سومیہ تک پہنچا نہیں سکتی تھیں۔

"نہیں" سہیل بھائی بھلا فضول بات کیسے کر سکتے ہیں۔" سومیہ نے شدت سے نفی میں سر ہلایا۔

"ہاں یہ بات تو ہے۔" پھوپھو نے تائیدی انداز میں ہنکارا بھرا۔ "خیر چھوڑو آئندہ احتیاط کروں گی۔ میری بیٹی! تم سیدھی سادی ہو۔ مجھے خود ہر پہلو پر غور کرنا چاہیے تھا۔"

تقریباً گیارہ بجے کے قریب زنیرا باجی گھر آ گئی تھیں۔ سومیہ رات رکنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

"پھوپھو! گھر چلیں۔" اس نے کوئی تیسری مرتبہ پھوپھو کو ٹہوکا دیا۔

"اتنی رات کو... صبح چلے جانا۔" زنیرا باجی برتن سمیٹتے ہوئے بولیں۔

"تو اور کیا۔ اس پہر میں تو کبھی تمہیں ہمراہ لے کر گھر سے نہ نکلوں۔" پھوپھو جمائی روکتے ہوئے سونے کے لیے اٹھ گئی تھیں۔

سومیہ بھی دودھ کا گلاس ختم کر کے پھوپھو کے پیچھے چلی آئی۔ پھوپھو سونے کی تیاریوں میں تھیں اور نجانے کیوں سومیہ کو بھی پلنگ پر لیٹتے ہی نیند نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

"سومیہ کے لیے کوئی مناسب رشتہ دیکھیں امی۔" نجانے رات کا کون سا پہر تھا جب ہلکی ہلکی سرگوشی نما آوازوں نے سومیہ کو جگا دیا تھا۔

"دیکھ تو رہی ہوں... کہیں بات بنے تب نا۔" پھوپھو کی آواز میں بے بسی نمایاں تھی۔ آئے دن آنے والے مہمانوں سے پھوپھو بے چاری بھی شاید عاجز آ چکی تھیں۔

"بات بنتی نہیں بنائی جاتی ہے۔" زنیرا باجی کا انداز ناقابل فہم تھا۔

"کیا مطلب؟" پھوپھو کو غصہ آ گیا۔

"آپ اگر ہر رشتے میں معمولی سی کمی دیکھ کر ریجیکٹ کرتی رہیں گی تو پھر سومیہ کی شادی کا خیال بھی دل سے نکال دیں۔"

"تو کیا بازو سے پکڑ کر گھر سے دھکیل دوں۔ ایسے ویسے کسی کلرک، ڈسپنسر کے ہاتھ میں بچی کا ہاتھ تھما دوں۔" پھوپھو کو اور بھی غصہ آ گیا۔

"پچھلے دنوں جو سہیل کے ایک کولیگ ڈاکٹر کا پرپوزل آیا تھا اسے خواہ مخواہ آپ نے ریجیکٹ کیا تھا۔ سہیل بھی باتوں باتوں میں طنز کرتے رہتے ہیں کہ شاید آنٹی سومیہ کی شادی کرنا ہی نہیں چاہتیں۔" زنیرا باجی کی آواز میں ایک ٹھہراؤ تھا۔

"سہیل نے اس طرح کہا؟" پھوپھو کو گویا یقین نہیں آیا تھا۔ "اس نچے ڈاکٹر کی پانچ چالاک بہنوں کے بیچ اپنی بچی کو کھپا ڈالتی۔"

"اگر آپ اسی طرح زرا زرا سی بات پر کٹ جھتی کر کے اچھے بھلے رشتوں کو جواب دیتی رہیں گی تو سہیل کے علاوہ ارد گرد رہنے والے لوگ بھی پوچھنے لگیں گے۔" باجی نے تحمل سے سمجھانا چاہا۔

"کون سے لوگ؟" پھوپھو چونکیں۔ سومیہ نے سختی سے آنکھیں بھینچ لی تھیں تاکہ پھوپھو اور باجی اسے سوتا ہی سمجھتی رہیں۔

"سکینہ آنٹی.... سمیرا کی ساس۔" باجی نے ناگواری سے بتایا۔ "وہ بھی پچھلے دنوں میری عیادت کے لیے آئی تھیں تو پوچھ رہی تھیں۔"

"اس عورت کو تو چسکے لینے کی لت لگ چکی ہے۔" پھوپھو ناراضی سے بولیں۔ "ایسی بھی بھاری نہیں میری بچی مجھ پر۔" سومیہ بے بسی سے آنکھیں موندے اس محبت اور اپنائیت کو دل میں جذب کرتی رہی۔

پھوپھو کے علاوہ اس کا بھری دنیا میں تھا ہی کون۔ اس نے اپنا ہر رشتہ پھوپھو میں ہی تلاشا تھا۔

"سومی! میری بچی نیند نہیں آ رہی کیا؟" سومیہ کی پلکوں کی لرزش نے شاید پھوپھو کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ [illegible] رات رکنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔"

پھوپھو نے محبت سے اس کی پیشانی پر ذرا سا آگے ہو کر ہاتھ رکھا تھا۔ ناچار سومیہ کو آنکھیں کھول کر بتانا پڑا تھا کہ وہ کب سے جاگ رہی ہے۔ وہ نہ بھی بتاتی تب بھی پھوپھو جانتی تھیں کہ سومیہ آنکھیں بند کیے سوتی بن رہی ہے۔



لالی لمبے سے بانس پر کپڑا لپیٹے جالے اتار رہا تھا۔ پھر میز پر چڑھ کے پنکھا صاف کرنے لگا۔

"تھانے دارنی جی! مجھ سے عالم بالا میں جو خطائیں ہوئی ہیں۔ میری روح نے آپ کی روح کو جو" اور "خدانخواستہ تکلیف پہنچائی ہے۔ طعنے دیے ہیں۔ طنز کیے ہیں۔ ان سب کا بدلہ ایک ہی دفعہ لے لیں پلیز! کیوں آئے دن سولی پر چڑھا رہی ہیں۔"

لالی کی آواز پورے گھر میں گونج رہی تھی۔ جمال نے ہنستے ہوئے سر جھٹکا اور اخبار چہرے کے سامنے پھیلا لیا۔

"تم سولی پر نہیں میز پر کھڑے ہو۔" اس نے اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے لالی کو گھورا۔

"میری روح نے آپ کا کیا بگاڑا تھا جو آپ اوپر سے ہی میرے ساتھ شریکا لگا کر آئی ہیں۔"

"تم بھٹکی ہوئی بدروح ہو۔" وہ خربوزے کھاتے ہوئے برجستہ بولی۔

"ایک بات کہوں۔ اگر آپ کے صحت مند وجود کو نظر نہ لگے تو۔" لالی نے شرارت سے آنکھیں نچائیں۔ جمال نے آنکھوں کے سامنے سے اخبار ہٹا کر لالی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب دونوں "جنگ" کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔

"دیکھو۔" حسنہ خربوزوں کی طرف متوجہ تھی۔

"آپ کا اور عابدہ پروین کا سائز ایک ہو رہا ہے۔ مت اتنا کھایا کریں۔ رحم کریں اس پہاڑ سے وجود پر۔" "لالی چھلانگ لگا کر نیچے اترا تھا۔"

"تم خود کیا ہو افتخار ٹھاکر!" حسنہ جل بھن کر بولی۔

"میں افتخار ٹھاکر ہوں۔" لالی کی صدمے کی شدت سے آواز پھٹ گئی۔

"تو اور کیا ہو۔" حسنہ نے نخوت سے کہا۔

"دوسروں کو دیکھ کر جلنا چھوڑ دو تو تھوڑا سا ماس تم پر بھی چڑھ جائے گا۔"

"مجھے چربی خود پر چڑھا کر کوئی ایوارڈ نہیں لینا۔" لالی مزے سے بولا۔ اسی پل کمرے سے اماں کی آواز آئی تھی۔ بہت سالوں سے اماں صرف بستر کی ہو کر رہ گئی تھیں۔ انہوں نے بولنا بھی بہت کم کر دیا تھا۔ ایک ہزار ایک بیماری کے ساتھ جنگ کرتے کرتے بالآخر وہ تھک چکی تھیں۔ یہ تو حسنہ تھی جس نے اپنی اکلوتی پھوپھی کو سنبھال رکھا تھا۔ ان کی تیمارداری، دیکھ بھال، کھلانا پلانا، نہلانا دھلانا سب حسنہ کے ذمہ تھا اور جمال اسی لیے حسنہ کا ہمیشہ احسان مند رہا تھا۔

"کیا بات ہے پھوپھی! کچھ چاہیے کیا؟" حسنہ پھوپھی کے نحیف سے کپکپاتے ہاتھ پر اپنا گداز ہاتھ رکھ کر پوچھنے لگی۔

"جمال کدھر ہے؟"

"جمال بھائی تو باہر ہیں۔"

"اسے بلاؤ۔" وہ کھانستے ہوئے بمشکل بولیں۔

"اچھا پھوپھی! ابھی بلاتی ہوں۔" حسنہ جھپاک سے باہر نکل آئی۔ "جمال بھائی! او جمال بھائی!" حسنہ نے برآمدے میں کھڑے ہو کر ہانک لگائی تھی۔

"کیا بات ہے حسنہ!" جمال نے نرمی سے پوچھا۔

"پھوپھی یاد فرما رہی ہیں۔"

"اماں نے مجھے نہیں یاد کیا۔" لالی کو ہر بات میں ٹانگ اڑانے کا شوق تھا۔

"نہیں۔" حسنہ نے رکھائی سے جواب دیا۔ جمال اماں کے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ حسنہ اور لالی بھی پیچھے ہی چلے آئے۔

اماں بستر پر چت لیٹی رو رہی تھیں۔ ان کے گدلے آنسو جھریوں زدہ بیمار چہرے پر گم ہو رہے تھے۔ کمرے کا ماحول سوگوار تھا۔ اسی حساب سے لالی بھی اپنی چونچال بھول گیا۔ فوراً اماں کے سرہانے بیٹھ کر ان کا سر دبانے لگا تھا۔

"اماں! میری پیاری اماں! کیوں پریشان ہوتی ہیں۔ کیوں غم کرتی ہیں۔ میں ہوں نا۔" وہ اماں کے ہاتھ تھام کر لبوں سے لگا کر رقت بھری آواز میں بولا۔ "آپ اماں! آپ ہماری فکر نہ کریں۔ تھانیدارنی جی ہمارا خیال رکھتی ہیں۔ ہفتے میں ایک دفعہ گوشت پکا دیتی ہیں۔ باقی کا پورا ہفتہ اپنے کھیتوں کی سبزیاں یا دالیں کھلاتی ہیں۔ کبھی کبھی دل کرتا ہے آپ کے ساتھ ہی پلنگ پر بستر لگا کر لیٹ جاؤں۔ یخنی، سوپ، فروٹ، جوس اور نجانے کیا کیا کھانے کو ملے گا۔ بس اماں آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔"

"تاکہ تم اماں کی جگہ بستر سنبھال لو۔" حسنہ نے تڑخ کر کہا۔

"اللہ نہ کرے۔" اماں دہل سی گئیں۔ "میرا مولا تم سب کو بھی جیتا جاگتا رکھے، سوائے بیماری کے، زندگی دے۔ یہی دعا ہے میری تو ہر وقت اللہ سے۔" "اماں! میں جانتا ہوں آپ کو کون سا غم کھائے جا رہا ہے۔" لالی ایک دم جذباتی ہو گیا۔

"آپ چاہتی ہیں جمال بھائی شادی کر لیں۔ ہمارے لیے ایک اصلاحی شخصیت والی بھابھی لے آئیں۔ ابھی بھی آپ نے جمال بھائی کو اسی لیے بلایا ہے۔ اماں! میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ مگر یہ جمال بھائی نہیں کریں گے۔ اسے آپ کی ذرا سی خواہش پوری کرنا کے تو سر کرنے کے برابر لگتا ہے اور یہ اس پہاڑ یعنی شادی کے پہاڑ پر نہیں چڑھنا چاہتا مگر میں اماں! آپ کا لالی اس نیک کام کے لیے بالکل تیار ہے۔ اگر ابھی بھی نکاح چاہتی ہیں۔ تب بھی لالی دل و جان سے تیار ہے۔ ابھی سہرا منگوا لیں، مولوی کو بلوا لیں۔ دو دیگیں بھی پکالی لے آئیں گے۔ باقی کا جو کام ہے وہ جمال بھائی سے تا بس۔"

"بس بھی کرو لالی!" لالی کی فراٹے سے چلتی زبان کو جمال کی بلند آواز نے بریک لگایا تھا جبکہ اماں کے بیمار چہرے پر بڑی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"بولنے دو نا میرے پتر کو۔ اسی کے دم سے تو رونق ہے۔" اماں نے محبت سے لالی کی طرف دیکھ کر کہا۔ لالی اپنی تعریف پر پھولے نہیں سما رہا تھا۔ جبکہ حسنہ لالی کی اس تعریف پر جل بھن گئی تھی۔

"اماں کوئی اہم بات کرنا چاہتی ہیں؟" جمال نے اماں کو یاد دلایا۔

"جی اماں! بولیے آپ میں سن رہا ہوں۔"

"جمال پتر! تو اب کوئی فیصلہ کر ہی لے۔" اماں نے التجائیہ کہا تھا اور یہ التجا تو وہ ایک ہزار ایک مرتبہ کر چکی تھیں۔

"کون سا فیصلہ!" لالی کے ساتھ ساتھ باہر نکلتی حسنہ بھی ٹھٹک کر رک گئی۔

"تم نے وعدہ کیا تھا پتر! ایک دفعہ جانے میں کیا حرج ہے۔" اماں لرزیدہ آواز میں کہہ رہی تھیں۔ "میری زندگی میں اسے لے آ پتر! میں آخری دفعہ اسے دیکھنا

چاہتی ہوں۔ بے آسرا، یتیم بچی نجانے کہاں رل رہی ہوگی۔ میں اس کی صورت دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"اماں! ایک سو مرتبہ آپ کے بتائے پتے پر جا چکا ہوں مگر وہ مکان بیچ کر کہیں جا چکی ہیں۔" جمال نے جھنجلا کر کہا۔

"تو اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتا ہے کہ وہ مکان بیچ کر چلی گئی ہیں۔ کہیں ان کے ساتھ کوئی حادثہ تو نہیں پیش آگیا۔" وہ خوف زدہ لہجے میں بولیں۔

"اماں! آپ بھی تو کئی مرتبہ جا چکی ہیں..... مگر گھر پر تالا لگا ہوتا ہے۔ بہت عرصہ تک وہ تالا اسی مکان کے گیٹ پر لگا رہا۔ اب کچھ عرصے سے وہاں کوئی اور لوگ آگئے ہیں۔" جمال نے تفصیلاً بتایا۔

"تم ان ہی لوگوں سے اس کا اتا پتا پوچھ لیتے۔" انہوں نے آس بھری نگاہ سے بیٹے کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"اماں! آپ کو یقین نہیں آسکتا۔ میں کئی مرتبہ وہاں گیا ہوں مگر بے فائدہ۔ کچھ پتا نہیں چل سکا کہ انہیں زمین کھا گئی ہے یا آسمان نگل گیا ہے۔" جمال نے ناگواری سے کہا۔

[illegible] حسن آرا نے جمال کے جانے کے بعد بے چینی سے پوچھا۔

"اللہ بخشے، جمال کی دادی کی۔"

باہر سے ایک دم شور کی آواز سنائی دی تھی۔ پھر بوا حمیدن کمرے میں داخل ہوئیں۔

"لو جی، اب تو خیر نہیں۔ میں چلتا ہوں۔" لالی نظر بچا کر باہر کی طرف بھاگا۔

"لو بس بس دیا، ذرا ادھر تو آ۔" بوا کی نظر بھی بلا کی تیز تھی۔ لالی کو مڑنا پڑا۔

"کسی رشتے کے متعلق مت بتائیے گا بوا! میرا کم از کم آپ کی بتائی کسی لڑکی سے شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔"

"لو اور سن لو۔" بوا فوراً برا مان گئیں۔ "اتنی پیاری لڑکی ہے۔ گھرانہ بھی بہت اچھا ہے۔ بات تو میں نے جمال کے لیے کی ہے مگر وہ تو مانتا ہی نہیں۔ اسی لیے میں تو چاہتی ہوں لالی کی بات چلا دوں۔" بوا سرگوشیوں میں اماں سے مخاطب تھیں۔ آواز اتنی بلند تھی کہ لالی اور حسنہ دونوں تک بآسانی پہنچ گئی۔

"بوا! میں نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ کئی مرتبہ تو بتا چکا ہوں۔" لالی جھنجلا کر بولا۔

"مگر کیوں؟" اماں کی آنکھوں میں اداسی اتر آئی۔ دونوں میں سے کوئی ایک بھی تو شادی کے لیے رضامند نہیں ہو رہا تھا۔ ورنہ ان کی تو خواہش تھی کہ حسنہ کی ان دونوں میں سے کسی ایک سے.....

"میں شادی کا رس گلہ کھا کر پچھتانا نہیں چاہتا۔" لالی نے کمال اطمینان سے کہا تھا۔ حسنہ قل قل کرتی میدان میں اتر آئی۔

"تم نے محاورے کو الٹا کر دیا ہے۔ ویسے تو بڑے پڑھے لکھے بنتے ہو۔" حسنہ کو بھی طنز کرنے کے لیے کسی خاص موقع کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔

"یہ ماڈرن دور ہے۔ لڈو کا زمانہ عرصہ ہوا لد گیا۔" لالی نے شرٹ جھاڑ کر نادیدہ سی سلوٹوں کو تلاشتے ہوئے کہا۔

"لڑکی بیچاری ہے پیاری۔" بوا اب تعریفوں کے پل باندھنا شروع کر چکی تھیں پیش کی طرح۔ "اور ایسے ہیرے اپنے گھر میں ہی بھلے۔" لالی نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"سچ کہہ رہی ہوں۔ ایسی لڑکی تم کو کہیں نہ ملے گی۔" بوا نے بغیر برا مانے پچکارتے ہوئے کہا۔

"تو میں کون سا لڑکی ڈھونڈنے کی مہم پر نکلنے والا ہوں۔" وہ لالی ہی کیا جو بات کو سمجھ جائے۔

"نیک، سمجھدار اور بے زبان سی بچی۔" بوا ٹھنڈی آہ بھر کر بولیں۔ "جس کھونٹے سے باندھو گے۔ خاموشی سے بندھ جائے گی۔ اُف تک نہ کہے گی۔"

"تو صاف لفظوں میں بات کریں نا کہ لڑکی گونگی ہے۔" لالی فوراً ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔

"خدا نخواستہ گونگی کیوں ہونے لگی۔" بوا پھر سے برا مان گئیں۔ "میں تو کہتی ہوں تمہارا یہ لڑکا بہت تیز

ہے۔ اس کو تو رہنے ہی دو۔ جمال ہی ٹھیک ہے۔ اس کے سلسلے کو آگے بڑھاؤ۔"

"پھر بوا! دعا کیجئے تب نا۔" اماں بے بسی سے بولیں۔

"ویسے تو تڑ تڑ زبان چلتی ہے۔ بھائی کو شادی کے لیے رضامند نہیں کر سکتے۔" بوا نے توپوں کا رخ لالی کی طرف موڑا۔

"کر سکتا ہوں مگر کروں گا نہیں۔" لالی کا اطمینان قابل دید تھا۔

"وہ کیوں؟" بوا حیران ہوئیں۔

"اس لیے کہ پہلے حسن آرا بیگم کو اس گھر سے نکالنے کی تیاری کریں۔ آپ کیوں چاہتی ہیں بوا کہ ہماری بیویاں تھانے دارنی جی کے ہاتھوں جلد ہی اس جہان سے کوچ فرما جائیں۔" لالی کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

"تم لوگوں کو نہ دھکے دے کر نکال دوں۔ خبردار کسی نے میرے خلاف سازش کرنے کی کوشش کی۔" حسنہ جلبلا کر پلٹ آئی تھی۔

"ادھر تو آپ کا کوا بگلا ہوا ہے۔ تم لوگ نہ دیکھیں ان تینوں کی شادیاں۔" بوا تاسف سے سر ہلا کر اماں سے مخاطب ہوئیں۔

"خدا نخواستہ تم کیوں نہ دیکھیں گی۔ ہمارے تو پوتوں کی شادیاں بھی اماں ضرور اٹینڈ کریں گی کیوں حسنہ!" لالی نے پاس کھڑی حسنہ کو ٹہوکا دیا۔

"تو اور کیا۔" حسنہ نے بھی بے خیالی میں سر ہلا دیا۔

"مگر مجھے نہ یہ سعادت حاصل کرنے دینا۔" بوا کے انداز میں ملال ہی ملال تھا۔

"کیوں نہیں..... آپ جلد جمال بھائی کے ولیمے کا زردہ کھائیں گی بوا۔" لالی نے بوا کو پچکارا۔

"کیا لڑکی ڈھونڈ بھی لی۔" صدمے سے بوا کی آواز پھٹ کر رہ گئی۔ جیسے بٹورے کا سنہری اور نیلا پیلا موقع ہاتھ سے نکلنے والا تھا۔

"لڑکی ڈھونڈنے ہی تو نکلنے والا ہوں۔" لالی نے گویا دھماکہ کیا تھا۔ اماں اور حسنہ نے بیک وقت لالی کی طرف دیکھا تھا۔

"کیا مطلب؟" سب کی آنکھوں میں سوال ہی سوال تھے۔

"فائنل ایگزامز سے فارغ ہو لوں، مطلب پھر بتاؤں گا۔" لالی نے پراسرار انداز میں کہا۔

"اس چھوکرے کی چھوڑو، میری بات سنو۔" بوا نے اماں کو پھر سے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"تھانیدارنی کو ایک مرتبہ میرے ساتھ بھیجو۔ لڑکی پسند نہ آئی تو زبردستی کاہے کی ہے۔"

"بوا! اپنی لڑکیاں تو آپ خود ہی ناپسند کر آتی ہو۔ پہلے ان کی تعریفوں میں زمین آسمان ایک کرتی ہو اور پھر بات بننے سے پہلے تمہیں ان میں کوئی خرابی نظر آجاتی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے۔ تمہیں بھی سموسے پکوڑوں کا چسکہ لگ گیا ہے۔" یہ جرأت تھانیدارنی کے علاوہ کوئی اور بھلا کر سکتا تھا۔ بوا کو کچھ نہ سوجھا تو حسنہ کی طرف سے ہونہہ کہہ کر رخ موڑ گئیں۔

اگلی صبح جمال تو کوہاٹ جانے کے لیے نکل گیا تھا جبکہ لالی کا قیام ان دنوں پھر سے ہوسٹل میں تھا۔

امتحان سے فارغ ہو کر ہی لالی نے گھر کی راہ دیکھی تھی۔

"شہر میں ڈیرا لگا کر ہی بیٹھ گئے تھے۔" حسنہ نے لوہے کا پھاٹک کھولتے ہوئے کہا۔

"آپ نے تو شکرانے پڑھے ہوں گے۔ نیاز تقسیم کی ہوگی۔ مگر میں پھر بھی آگیا ہوں۔ اپنی پیاری اماں کی خاطر۔" ماربل کے گرد آلود فرش پر چلتے ہوئے لالی نے اپنے ازلی لاپروا انداز میں کہا۔

"ہائی واوٗ، تھانیدارنی جی! آج کیا گھر کی صفائی نہیں کی؟"

"نہیں۔" حسنہ رکھائی سے بولی۔ یہ رکھائی تو اس کے مزاج کا ایک حصہ بنتی جا رہی تھی۔

"وجہ پوچھ سکتا ہوں۔" وہ اس کے برابر چلتے ہوئے بولا۔

"میری مرضی۔"

"اپنی مرضی کا ہمیشہ دھیان رہتا ہے۔ کبھی کسی دوسرے کی مرضی پر بھی نظر رکھ لیا کریں۔" لالی نے سادہ سے انداز میں کہا۔

"یہ او کھی باتیں مجھ سے نہ کیا کرو۔" حسنہ نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

"او سوری! میں ہمیشہ کیوں بھول جاتا ہوں کہ آپ نے الف انار کے قاعدے تک کو نہیں پڑھا۔"

لالی نے ہمیشہ کی طرح اس کی کند ذہنی پر چوٹ کی۔ حسنہ کا کبھی اسکول میں دل ہی نہیں لگا تھا۔ رو رو کر پورا اسکول سر پر اٹھا لیتی تھی۔ ماسعی لاڈلی بچی کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ فوراً "تمام" لوٹا کر گھر لے آتے۔ یوں حسنہ بیگم ب بکری تک تو پہنچ ہی نہیں سکی تھیں۔

"خود تو بڑے تیر مار لیے ہیں۔" حسنہ نے بھی بدلہ اتارنا چاہا۔

"عنقریب دیکھ لیجئے گا۔ ایک دوست کے توسط سے مجھے تو ابھی سے جاب کی آفر ہو گئی ہے۔" لالی جان بوجھ کر اترایا۔

"تو کیا تم مستقل شہر میں شفٹ ہو جاؤ گے۔" حسنہ [illegible] منہ سرا [illegible] نے اپنی پلیٹ میں لے لیا۔

"اب، کیوں سوئی پھنس گئی ہے۔"

"بک بک نہ کرو۔"

"تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟"

"ایک ہزار ایک مسئلے ہیں۔ کون کون سا بتاؤں۔" لالی غم زدہ سا بولا۔ "خیر آپ مجھے پہلے سے کچھ کمزور دکھائی دے رہی ہیں۔ خدا خیر کرے میری جدائی نے رنگ دکھایا ہے یا پھر مجھے تو لگتا ہے ڈائٹنگ وائٹنگ کا کوئی چکر نظر آرہا ہے۔"

"مجھے کیا پاگل کتے نے کاٹا ہے۔ جو اعظم امریکہ اور افریقہ کی ماڈلوں کی طرح سوکھ سوکھ کر کانٹا ہو جاؤں۔ ڈٹ کے روٹی کھاتی ہوں۔ اور ڈائٹنگ کے لیے مجھے کسی شے کی لوڑ (ضرورت) نہیں پڑتی۔ میں پہلے ہی بڑی وائٹ ہوں۔"

"چار کریموں کے فارمولے کا کمال ہے۔" لالی اس کی وائٹنگ کی وضاحت پر مسکراہٹ چھپانے کے لیے قدرے جھک گیا۔

"میں نہیں فارمولے کو مانتی۔" حسنہ کو غصہ آگیا۔

"پچھلے دنوں جب میں آیا تھا تو پھوپی بھی گھاس کاٹنے اور گوبر کے اپلے بنانے کا طریقہ پوچھنے تو نہیں آئی تھیں۔" وہ بھی لالی تھا۔ اس کے اسٹاک میں باتوں کا انبار کبھی کم نہیں ہو سکتا تھا۔

"تو کسی کو بتا کر دینے کا یہ مطلب تو نہیں کہ بندہ خود بھی کریموں سے منہ رگڑتا رہے۔" حسنہ نے ناراضی سے وضاحت کی۔ "میں تو پیدائشی گوری ہوں۔"

"آپ پیدائشی پھیکا شلجم ہیں' میں تسلیم کرتا ہوں' مگر اس پھیکے شلجم جیسے گالوں پر اترتی سرخیوں کا راز کیا ہے۔ اب اپنوں سے کیا پردہ مجھے تو کم از کم بتا دیجئے۔" لالی نے معنی خیزی سے حسنہ کے چہرے کو بغور دیکھا۔ حسنہ سچ مچ گھبرا گئی۔

"تو کیا میرا راز فاش ہو گیا۔" وہ فق چہرہ لیے گم صم بیٹھی رہ گئی تھی جبکہ لالی گنگناتے ہوئے اماں کے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"جمال بھائی! تم سے ایک بات کرنا تھی۔"

"تو تمہیں اجازت کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟" جمال آج بہت مصروف تھا۔ حساب کتاب میں الجھا ہوا تھا۔

"میں دریاؤں کے رخ موڑنے والا ہوں۔" جمال کو اپنے کام میں مصروف دیکھ کر لالی نے جتا کر کہا۔

"تو موڑو یار! مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب اتنا انوکھا کام کرنے کا ارادہ کر لیا ہے تو میں تمہیں روکوں گا نہیں۔ موجوں نے نگلنے کی کوشش کی تو جمال بھائی کو مت پکارنا۔" وہ رجسٹر پر لفظ گھسیٹتے ہوئے بولا تھا۔

"جمال بھائی!" لالی نے ناراضی سے اسے دیکھا۔

"بولو کیا کہتا ہے؟" جمال نے سارے کاغذات دراز میں پٹخے۔ "سارا حساب غلط کروا دیا ہے۔"

"جا رہا ہوں میں۔" لالی نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے تیسری مرتبہ یہ الفاظ دہرائے تھے۔

"یہ لے کمینے اپنے والی پرچی' جا اور جا کر اس گھر کی بالکنی سے جوتے کھا۔ اپنی ٹھکانے والی سے بھی زیادہ تنگ چڑھی عورت ہے۔ ہڈیاں پسلیاں ٹوٹ گئیں تو اطلاع کر دینا میں ایمبولنس لے کر آجاؤں گا۔" جمال نے ایک مڑا تڑا کاغذ کا ٹکڑا والٹ میں سے نکال کر لالی کی طرف پھینکا جسے سینے سے لگا کر وہ مزے سے گنگنایا۔ ساتھ میں پرچی پر نگاہ دوڑائی۔ "مسز شبانہ اختر۔"

"یہ تو تم تھے جمال بھائی! شریف' نیک گو اور ادب لحاظ والے' دیکھنا در اس بالکنی کے نیچے نہ چھوڑ کر آیا تو نام بدل دینا۔" لالی سینہ ٹھونک کر بولا اور پرچی جیب میں ٹھونس لی۔

"اس شریف عورت کو تنگ کرنے کا کوئی مقصد بھی ہے' اس بے چاری سے ایک ہی خطا سرزد ہوئی ہے کہ اس نے میری مرحومہ پھپھو کا مکان خرید لیا ہے۔ وہاں جانا نرا بے کار ہے۔ ان لوگوں کو اس کا کچھ پتا نہیں یار! کسی کو خوامخواہ تنگ نہیں کرتے۔ یہ تو اماں کی ضد تھی جو میں دو' تین مرتبہ چلا گیا تھا۔ ورنہ وہاں جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔" جمال نے بلا کی سنجیدگی سے کہا۔

"تو ایک کوشش مجھے بھی کر لینے دیں۔" لالی بھی یکایک سنجیدہ ہو چلا تھا۔

"او کے' ایک کے بجائے ایک لاکھ کوششیں شوق سے کرو۔" جمال پھر سے اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا تھا جبکہ لالی کچھ سوچتے ہوئے سر ہلا کر پلٹ گیا۔

☼ ☼ ☼

اگلی صبح حسنہ دروازے میں کھڑی اسے جی جان سے تیار ہوتا دیکھ رہی تھی۔

"تھانیدار نی کی آمد آمد ہے۔" لالی اسے دیکھ چکا تھا' اسی لیے شوخی سے بولا۔

"تم جا رہے ہو؟" بالآخر کافی دیر چپ چاپ کھڑے رہنے کے بعد حسنہ نے پوچھ ہی لیا۔

"ہاں۔"

"آؤ گے کب؟"

"یہ تو پتا نہیں۔ البتہ اپنے مقصد میں کامیابی کے بعد ہی آؤں گا۔" لالی کا انداز دو ٹوک سنجیدہ تھا۔

"اگر کامیابی نہ ہوئی تو۔"

"آنا تو پھر بھی ہے نا۔ مقصد میں ناکامی کے بعد میرا خودکشی کا ارادہ نہیں ہے۔" لالی نے اطمینان سے ہاتھ جھاڑے۔

"کہیں تم شادی کرنے تو نہیں جا رہے چھپ چھپا کے۔" وہ اپنے خدشے کو زبان دیے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ لالی اب کے بری طرح ٹھٹک گیا تھا۔ حسنہ کے لب و لہجے کی افسردگی' چہرے کی بے رونقی اور سرخ آنکھیں کچھ اور ہی داستان سنا رہی تھیں۔

"اور اگر ایسی بات ہے تو تم اس طرح سے شادی نہ کرو۔" وہ انگلیاں مروڑتے ہوئے سنجیدہ ہو کے بولی۔

"تو پھر کس طرح سے کروں؟" لالی یکایک گویا ساتویں آسمان پر پہنچ گیا تھا۔ آنکھوں کی جگمگاہٹ ستاروں کو مات دینے لگی۔

"ٹھیک طریقے سے' دنیا کے دستور کے مطابق' بڑوں کی شمولیت کے ساتھ اسی طرح تو سب کو دکھ ہوگا۔" وہ سارا جلال بھول گئی تھی۔ لہجے کا ہمیشہ والا کھردرا پن بھی مفقود تھا۔ نرم انداز میں بولنے کی وجہ سے آواز کا بھاری پن بھی غائب ہو گیا تھا۔

"کس کس کو دکھ ہوگا؟" لالی نے مسکراہٹ چھپا کر پوچھا۔

"اماں کو' جمال بھائی کو اور......"

"اور کسے؟" لالی نے بے چینی سے پوچھا۔ حالانکہ اسے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ جان تو وہ گیا ہی تھا۔

"چچا نہیں۔"
"اچھا تو پھر دنیا کے دستور کے مطابق کیسے شادی کروں۔" لالی نے بلا کی سنجیدگی سے پوچھا۔ "رشتہ بھجواؤں اس کے گھر، مگر کون لے کر جائے گا؟ اماں تو ظاہر ہے جا نہیں سکتیں۔"
"تم، میں اور کون۔"
"آپ جائیں گی بجنی آپ۔" لالی چلا اٹھا۔
"تو اور کیا، جمال بھائی کے لیے لڑکی دیکھنے بھی تو جاتی رہی ہوں۔" وہ اپنی آزردگی چھپانے میں ہلکان ہو رہی تھی۔
"مگر میں آپ سب کو اس زحمت سے بچانا چاہتا ہوں۔"
"سرکاری طریقے سے شادی کرلو گے؟" نہایت یاسیت سے پوچھا گیا۔ سرکاری طریقے سے مراد شاید کورٹ میرج تھی۔
"میں ایسا بھی بے حیا نہیں ہوں۔" لالی برا مان گیا۔
"تو پھر؟" وہ رو دینے کو تھی۔ لالی کو اس کی پتلی حالت پر ترس آیا۔
"مجھوں... تو میں اماں کے ایک کام سے جا رہا ہوں۔ کورٹ میرج کرنے نہیں۔ اس لیے آپ فکر اور غم میں سوکھ سوکھ کر کانٹا مت ہو جایئے گا۔ اللہ آپ کو ہمیشہ اسی طرح موٹی تازی اور ہری بھری رکھے، رب راکھا! چلتا ہوں اب۔" لالی ہنستے ہوئے بیگ کندھے پر ڈال کر گنگناتے ہوئے باہر نکل گیا تھا جبکہ حسنہ تلملا کر رہ گئی۔
"کمینہ، رذیل، ڈرامہ کر رہا تھا اتنی دیر سے۔" وہ زیر لب بڑبڑائی، پھر محض اسے سنانے کے لیے بلند آواز میں بولی۔
"یہ منہ اور مسور کی دال، تمہیں بھلا گھاس کس نے ڈالنی ہے۔ بڑا آیا کورٹ میرج کرنے والا، ہونہہ۔"
"ہونہہ، ہونہہ کا کوئی فائدہ نہیں تھانے دارنی جی! بات تو اب کھل چکی ہے۔" لالی پھر سے پلٹ آیا تھا کہ ادھار کا قائل تو وہ بھی نہیں تھا۔
"کون سی بات؟" حسنہ بھی اب سنبھل چکی تھی، اسی لیے تنک کر بولی۔
"آپ میرا منہ مت کھلوایئے۔"
"تمہاری جیسی دیکھنے کا مجھے کوئی شوق نہیں۔" حسنہ چولہے کے نل کھولتے ہوئے سکون سے بولی۔
اعصاب پر دھرا بوجھ تو ہٹ ہی چکا تھا۔ سو وہ اب مطمئن ہو چکی تھی۔ جب سے اس نے لالی کے کہیں جانے کے بارے میں سنا تھا، کئی خدشات پھن پھیلائے سامنے آ گئے تھے۔
"واپسی پر جواب دوں گا، ابھی مجھے جلدی ہے عزیز چلتا ہوں۔" لالی نے اک گہری نگاہ سے حسنہ کو سر تا پا دیکھ کر ہونٹوں کو سکیڑا اور پلٹ گیا، جبکہ حسنہ دریچے پر ہاتھ رکھے ہنسی اور پھر ہنستی چلی گئی۔ لالی اونچی آواز میں چلتے چلتے گانا گا رہا تھا۔ بلکہ گانے کی پسلیاں توڑ رہا تھا۔

"ہر کسی سے جسے تو چھپاتی رہی
بے خودی میں مجھے تو بتلاتی رہی
ہاں بلاتی رہی
بیچ بیچ بلاتی رہی
جو بلاتی رہی
ونڈو دکھاتی رہی

***

"جمال بھائی! محبت کیا ہوتی ہے؟"
گھر سے وہ سیدھا جمال کے دفتر اسے خدا حافظ کہنے گیا تھا اور آتے ساتھ ہی ایک بے تکا سوال داغ دیا۔
جمال کو یہ سوال بے تکا ہی لگا تھا۔ کیونکہ وہ بڑی سنجیدگی سے اسے سمجھا رہا تھا کہ وہ اپنے ارادے سے باز آ جائے۔ بقول جمال کے وہ عورت کافی خطرناک اور چالاک دکھائی دیتی ہے، یہ نہ ہو کہ لالی کسی بڑی مصیبت میں پھنس جائے۔ مگر لالی نے سر ہلاتے ہوئے ہمیشہ کی طرح ہانکنا شروع کر دیا تھا۔
"بتاؤ نا۔" لالی نے لاڈ سے اصرار کیا۔
"مجھے کیا پتا۔ میں ادھر بیٹھ کر محبت کی تشریح ہی تو کرتا رہتا ہوں۔" جمال بھنا کر بولا۔
"تم نے کبھی محبت کی جمال بھائی! یار! سچ سچ بتانا۔" لالی سنجیدگی سے اسے دیکھنے لگا۔
"نہیں... میرے پاس اتنا فالتو وقت نہیں ہے۔"
"تم تو بہت بور قسم کے ہو یار! نصیب پھوٹ جائیں گے اس لڑکی کے جس کی تمہارے ساتھ شادی ہوگی۔" لالی نے منہ بگاڑ کر کہا۔
"جس سے شادی ہوگی، اس سے محبت کرلوں گا، اس کے نصیب نہیں پھوٹیں گے۔"
"واہ، یہ ہوئی نا بات، ویسے تم ہو چھپے رستم۔" لالی کھل اٹھا۔
"اب دفع بھی ہو جا، بس نکل جائے گی۔"
"جاتا ہوں، تم محبت کے ٹاپک پر غور کرنا۔" لالی نے یاد دہانی کروائی۔
"پہلے مجھے یہ بتاتا جا، آج سویرے سویرے اپنی محبوبہ کا چہرہ تو نہیں دیکھ لیا۔" جمال شک بھری نگاہ سے اسے دیکھنے لگا۔
"تم کو کیسے پتا چلا۔" لالی کا رنگ یک دم فق ہو گیا۔
"بتا کون ہے وہ گل اندام؟" جمال نے اس کی گردن دبوچ لی تھی۔
"تمہارے ابا جی، گل اندام، ارے اوے وہ تو..." لالی پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔
"بتا بھی دے۔" جمال دہاڑا۔
"آٹے کی بوری ہے وہ تو۔" لالی گردن چھڑا کر جمال کو حیران پریشان چھوڑ کے باہر کی طرف بھاگا تھا۔
"آٹے کی بوری۔" جمال سوچتا ہی رہ گیا۔ "یہ کون سی خاتون ہیں جسے میں نہیں جانتا۔" جمال کی سوچوں کا دھارا دوسری طرف بہنے لگا تھا پھر ایک دم وہ ٹھٹک سا گیا۔
"آٹے کی بوری، دودھ بھری کٹوری۔"
"حسن آرا، بھینس کا چارہ۔"
دور بہت دور سے آتی لالی کی معصوم سی آواز نے جمال کو ششدر کر دیا تھا۔ گزرے وقت کا دریچہ وا ہوا تھا اور کچھ یادیں ہوا کے جھونکے کے ساتھ اندر داخل ہو گئیں۔
"جمال بھائی! بہت مارتی ہے تھانے دارنی۔" لالی روتا ہوا اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا تھا۔
"تم بھی مار لیا کرو، بڑے ہو اس سے۔" جمال نے لالی کو پچکارا۔
"وہ بہت موٹی ہے، اس کا ہاتھ بھاری ہے، میرے منہ پر طمانچہ مارا ہے، دیکھو تو گال پھول گیا ہے۔" لالی سوں سوں کرتا رہا۔
"تو اب میں کیا کر سکتا ہوں۔ اسے سمجھاؤں گا۔"
جمال سوچ میں پڑ گیا۔ لالی نے اس کا کندھا ہلایا۔
"دیکھنا میں اس سے کیسے بدلہ لیتا ہوں۔" لالی کے ارادے خطرناک تھے۔
"کیسے بدلہ لو گے۔" جمال حیران ہوا۔
"ایسے۔" لالی نے کہنا شروع کیا۔ "آٹے کی بوری، دودھ بھری کٹوری، حسن آرا بھینس کا چارہ۔"
لالی نے باقاعدہ تالیاں پیٹ کر تان لگائی۔ اور واقعی حسن آرا اس گیت کو سن کر چڑ جاتی تھی۔ اسے لالی پر اور بھی غصہ آتا تھا۔ جس نے اس کے نام کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ پھر حسنہ کی تخریبی سرگرمیوں اور بچوں پر جارحانہ تشدد کی بنا پر سب نے اسے تھانے دارنی کا خطاب دے ڈالا۔ جو کہ حسنہ کو جی جان سے پسند آیا۔ خود کو تھانے دارنی کہلوا کر وہ فخر محسوس کرنے لگی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ مرحوم والد صاحب پھر سے زندہ ہو گئے ہیں۔ یہ حوالہ اسے بہت عزیز تھا چاہے لوگوں نے جس نظریے سے بھی اسے تھانیدارنی کہنا شروع کیا تھا۔ تاہم وہ اپنے زاویہ نظر سے دیکھتی تھی اور دل ہی دل میں بہت مسرور ہوتی۔
"تھانیدار کی بیٹی ہوں۔ تھانے دارنی کہلواؤں گی۔" وہ اپنی ہم جولیوں کو فخر سے بتاتی۔ حالانکہ کوئی اور تو نہ سہی لیکن وہ اور لالی دونوں حسنہ کو ستانے کی غرض سے "تھانے دارنی جی" کہتے تھے۔
"تو کیا لالی حسنہ سے۔" جمال کچھ عجیب سی کیفیات کا شکار سوچوں کے بھنور میں پھنس کر رہ گیا۔ "ہوں، ایسا کچھ ہو جائے تو غلط بھی نہیں۔"

***

"بڑی بدبخت عورت تھی۔ اپنے جگر کے ٹکڑے کا بھی خیال نہیں آیا۔ ظالم بچی کو بلکتا چھوڑ کر رات کے اندھیرے میں بھاگ گئی تھی۔ میرا بھائی مارے غیرت کے ہمیشہ کے لیے پردہ پوش ہوگیا۔"

پھوپھو سسک سسک کر رو رہی تھیں۔ مہمان خواتین کے چہروں پر تاسف جھلکنے لگا۔ کچھ دیر پہلے یہ دو خواتین سومیہ کو دیکھنے کے لیے آئی تھیں۔ پھوپھو نے ہمیشہ کی طرح ان کی خاطر مدارت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ پھر باتوں باتوں میں آنے والی خواتین نے سومیہ کی ماں اور باپ کی غیر موجودگی کے بارے میں پوچھا تھا۔ ایک اسی ذکر سے سومیہ خوف زدہ رہتی تھی، مگر یہ حوالہ قبر تک اس کے ہمراہ تھا۔ اسے یقین تھا اگر وہ مرجاتی تب بھی لوگوں نے کہنا تھا 'یہ سومیہ مراد ہے، جس کی ماں رات کے اندھیرے میں اپنے شوہر کے دوست کے ساتھ بھاگ گئی تھی' بے چاری سومیہ۔"

"سومیہ کے والد کا انتقال ہوگیا ہے اور والدہ...؟" طنطنے والی اس عورت نے نخوت سے پوچھا۔

"[illegible] بات [illegible]" ایک پل کے لیے سومیہ کی طرح پھوپھو کا رنگ بھی فق ہوگیا تھا۔ پھر انہوں نے بہت سوچ بچار کے بعد کہنا شروع کیا۔

"جس رشتے کی بنیاد جھوٹ پر رکھی جائے وہ کبھی پایہ تکمیل تک نہیں پہنچتا۔ ہم شریف خاندانی لوگ ہیں۔ میری بیٹیاں سب اچھے گھروں میں بیاہی گئی ہیں۔ سومیہ کے لیے بھی میں کسی ایسے گھرانے کی خواہش مند ہوں، میری سومیہ بہت معصوم اور سادہ ہے۔ ہم نے بچوں کو نیکی، سچائی، ایمان داری کے سبق پڑھائے ہیں، انہیں اچھے برے میں تمیز کرنا سکھایا ہے، اخلاق، کردار میں ہماری بیٹی کی مثال نہیں ملتی۔"

"تو کیا سومیہ کی والدہ..." دوسری خاتون نے معنی خیزی سے پھوپھو اور سومیہ کو دیکھا اور پھوپھو نے بڑے صبر اور حوصلے سے اس تلخ حقیقت کا پردہ فاش کردیا تھا۔ دونوں خواتین کے چہرے متغیر ہوگئے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے مزید کچھ دیر بیٹھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ ان کے جانے کے بعد پھوپھو بھی پھوٹ پھوٹ کر رودیں۔

"اگر میں انہیں سچ نہ بتاتی تو شاید بات بن ہی جاتی۔"

"آپ نہ بتاتیں تو کوئی اور بتاتا۔ میرے خیال میں آپ نے جو کیا ہے، بہتر کیا ہے۔" سومیہ ہمیشہ کی طرح پھوپھو کی دلجوئی کرنے لگی تھی۔

"نہ جانے تمہاری قسمت میں کیا لکھا ہے میری بچی!" پھوپھو دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے رنجیدگی سے بولیں۔

"اللہ بہتر کرے گا۔" سومیہ نے بڑے ضبط سے آنسو پی لیے۔ بہت چھوٹی عمر سے اسے لوگوں کے رویوں کو سمجھنا آگیا تھا۔ جب بھی کبھی اس کی ماں کا ذکر چھڑتا تو اک لمبی کہانی کی شروعات ہوجاتی۔ کوئی ترحم اور ترس کی کیفیات کا شکار ہوجاتا تو کوئی تمسخرانہ نظروں سے دیکھتا۔

آہستہ آہستہ سومیہ نے لوگوں سے ملنا ترک کردیا تھا۔ وہ تنہائی پسند ہوگئی تھی۔ جب بھی کوئی گھر میں آتا وہ اپنے کمرے میں بند ہوجاتی تھی۔ اسے لوگوں کے ہجوم سے وحشت ہونے لگی تھی۔ وہ محفلوں سے کترانے لگی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ باجیوں کے سسرال بھی کم کم جاتی تھی۔ تمام عمر اسے ایک ہی خوف نے جکڑے رکھا تھا اور وہ خوف تھا ماں کی کردار کشی کا۔ جب بھی کوئی اس کی ماں پر کیچڑ اچھالتا تھا، سومیہ کو لگتا وہ خود گندگی میں لتھڑ گئی ہے، کیچڑ سے لت پت ہوگئی ہے۔

"سومی! تو دل برا نہ کر یوں خاموش ہو کر نہ بیٹھ، میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔" پھوپھو نے اسے اپنے مہربان وجود میں بھینچ لیا۔

"پھوپھو! آپ ٹینشن مت لیں، سب ٹھیک ہوجائے گا۔ اس دنیا میں ہر مسئلہ کا حل شادی نہیں ہے۔ اگر میں کچھ پڑھ جاتی تو..." سومیہ لب کچل کر

آپ ہی سوگئی تھی۔

"سومیہ! کو فون کرو۔ میں نہیں جاؤں گی میلاد پر۔ دل گھبرا رہا ہے۔" پھوپھو نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"آپ چلی جائیں پھوپھو! کچھ طبیعت سنبھل جائے گی، دل بہل جائے گا۔" سومیہ نے بعد اصرار پھوپھو کو جانے کے لیے تیار کیا تھا۔

"گھبرانا مت میں جلدی آؤں گی۔ سالن تو رکھا ہے فریج میں، روٹی پکا کر کھالینا۔ تمہارا دودھ بھی فریج میں رکھا ہے، یاد سے پی لینا۔" پھوپھو ہزار تاکیدیں کرکے روانہ ہوئی تھیں۔ سومیہ اثبات میں سر ہلاتی رہی۔

پھوپھو کے جانے کے بعد سومیہ ٹی وی آن کرکے بیٹھ گئی تھی۔ ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی جب دروازے کی گھنٹی بجی۔ سومیہ کو اٹھ کے گیٹ تک جانا ہی پڑا تھا۔

"کون ہے؟" اس نے پوچھا۔

"جی... میں ہوں، دروازہ تو کھولیں۔" دوسری طرف سے مردانہ آواز سنائی دی۔

"آپ کون ہیں؟" سومیہ نے حیرانی سے اپنا سوال دہرایا۔

"میں لقمان احمد ہوں، کوٹھ اوڈو سے آیا ہوں۔" شائستہ سی آواز دوبارہ ابھری۔ سومیہ اور بھی حیران ہوئی تھی۔ یہ عجیب و غریب کوٹھ کا نام اس نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔

"آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

"محترمہ! کیا یہ حسن مراد صاحب کا گھر ہے؟" لقمان نے ہوا میں تیر چلایا تھا۔ اسے ہرگز امید نہیں تھی کہ حسن مراد کا نام سن کر خاتون دروازہ کھول دیں گی مگر اس کی حیرت اس وقت دوچند ہوگئی تھی جب اس نے سامنے کھڑی سانولے سے چہرے والی ایک لڑکی کو بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو لیے دیکھا تھا۔

"آپ... آپ حسن مراد صاحب کو جانتے ہیں؟" سومیہ کی آواز کپکپا کر رہ گئی تھی۔ بہت سالوں بعد ایک طویل عرصہ گزر گیا تھا جب کوئی اجنبی اس کے باپ کے حوالے سے دروازے پر آیا تھا ورنہ پھوپھو کے نام سے ہی اب اس گھر کی پہچان باقی تھی۔ کوئی بھی آتا تو شاہدہ اختر صدیقی کا نام لے کر ہی اگلے تعارف کے مراحل طے کرتا۔ نیم پلیٹ پر بھی سرور صدیقی لکھا تھا۔ آج کتنی مدت بعد کسی نے حسن مراد کا نام لیا تھا۔

"یہ حسن مراد کا گھر ہے؟" اجنبی کے ان الفاظ نے سومیہ کو سراپا آنسو بنا دیا تھا۔

"آپ انہیں جانتے ہیں؟"

"جی... میں انہیں جانتا ہوں۔ کیا آپ مجھے اندر آنے دیں گی۔" وہ شائستگی سے اجازت لے رہا تھا۔ "مجھے گیٹ پر کھڑے ہو کر بات کرنا کچھ مناسب نہیں لگ رہا ہے۔"

"آئیے پلیز۔" سومیہ سامنے سے ہٹ گئی تھی۔ اندر جانے کے بجائے سومیہ نے کین کی کرسی اٹھا کر صحن میں رکھ دی۔ لالی ایک نگاہ میں سارے گھر کا جائزہ لے کر بیٹھ گیا تھا۔

"گھر تو بہت اچھا بنایا ہے حسن صاحب نے۔" لالی کی آنکھوں میں ستائش تھی۔

"آپ ابو کو کیسے جانتے ہیں؟" سومیہ خود پر قابو پا چکی تھی۔ اسی لیے نرمی سے پوچھنے لگی۔

"ہوں... تو لقمان احمد! تم ٹھیک جگہ پہنچے ہو۔ نہ جانے یہ جمال بھائی اتنا عرصہ کہاں جھک مارتا رہا ہے اور وہ ہٹلر خاتون مالک مکان بھی دکھائی نہیں دے رہیں۔" لالی نے دل ہی دل میں سوچتے ہوئے خودکلامی کی۔

"آپ اس مکان میں دوبارہ کب شفٹ ہوئی ہیں؟" لالی نے ایک اور تیر ہوا میں چلایا تھا۔

"یہ ہی تین، چار سال پہلے۔" سومیہ نے سادگی سے بتایا۔

"پہلے یہاں کون تھا؟" وہ سرسری سا لہجہ بنا کر پوچھنے لگا۔

"کچھ عرصہ تو گھر لاک ہی رہا ہے، پھر کرائے پر دے دیا تھا۔" وہ ابھی ابھی سی بتانے لگی۔

"اور آپ لوگ کہاں رہتی تھیں؟"

"ہم کسی اور جگہ رہتے تھے۔" سومیہ نے مختصراً کہا۔

"اوہ، تو جب اماں ایک، دو مرتبہ یہاں آئی تھیں تب یہ لوگ اس جگہ سے چلے گئے تھے۔ بہت سال روپوش رہنے کے بعد دوبارہ یہاں آئی ہیں۔ اس خیال میں کہ اب کس نے گڑے مردے اکھاڑنے ہیں۔" لالی محض سوچ کر رہ گیا۔

"کیا آج سے پہلے کوئی حسن مراد صاحب یا ان کی صاحبزادی کے بارے میں پوچھنے کوئی نہیں آیا؟"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں، میں کچھ بھی نہیں۔" سومیہ سچ مچ گھبرا گئی تھی۔ "کیا ضرورت تھی جذباتی کیفیت میں اس اجنبی کو اندر لانے کی۔" وہ خوف زدہ سی سوچنے لگی۔

"میری بات کا جواب نہیں دیا آپ نے۔"

"شاید کوئی نہیں، یا پھر پھوپھو کو پتا ہوگا۔" سومیہ نے شانے اچکائے۔

"پھوپھو کہاں ہیں؟" ایک اور سوال۔

"وہ بازار گئی ہیں۔"

"آپ کب تک آئیں گی؟"

"ابھی آنے والی ہیں۔" سومیہ نے لاپروا بنتے ہوئے بتایا۔

"میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟" لالی نے درخواست کی۔

"سومیہ۔" وہ انگلیاں مروڑتے ہوئے بولی۔

"میں بہت جلد دوبارہ آؤں گا سومیہ جی! خوشی اس بات کی ہے کہ میں ٹھیک جگہ پہنچا ہوں۔ اگر آپ خود کو حسن مراد کی بیٹی ماننے سے انکار کر دیتیں تو..."

"مگر میں حسن مراد کی بیٹی ہوں۔ انکار کیوں کروں گی۔" سومیہ اس کی بات کاٹ کر حیرانی سے بولی۔

"اوکے، اب میں چلتا ہوں۔" لالی مزید اس کے بولنے سے پہلے اٹھ کر چلا گیا تھا، حالانکہ سومیہ اس سے پہلے بھاگتی ہوئی آئی تھی۔

"بات تو سنئے۔" وہ پکارتی ہی رہ گئی۔ دروازہ بند ہو چکا تھا۔ سومیہ سر تھامے کرسی پر ڈھے گئی۔

"یہ کون تھا؟ کیوں آیا تھا؟ یا اللہ! کوئی چور، ڈاکو نہ ہو۔ گھر کی لوکیشن دیکھ گیا ہے۔ رات کو ڈاکہ ڈالنے نہ آجائے، یا اللہ! ہمیں محفوظ رکھنا، میرے اللہ ہماری حفاظت فرمانا۔" وہ زور و شور سے دعائیں مانگنے میں مصروف تھی۔ پھوپھو جلد ہی لوٹ آئی تھیں۔ سومیہ نے انہیں اس اجنبی مہمان کے بارے میں بتایا۔

"تم میں اتنی عقل بھی نہیں سومیہ! کیوں اسے اندر لے کر آئی تھیں۔ تمہیں اکیلا دیکھ کر کوئی نقصان پہنچا جاتا۔ ڈکیتی کر لیتا، کچھ بھی ہو سکتا تھا، کسی کا کیا بھروسا۔" پھوپھو پہلی مرتبہ اس پر چلا رہی تھیں۔ "تم سے ایسی کسی غیر ذمہ داری کی مجھے توقع تو نہیں تھی۔"

"پھوپھو! مجھے معاف کر دیں۔" وہ بری طرح شرمندہ تھی۔

"کیا معاف کروں، اگر تمہیں کچھ ہو جاتا، میری برسوں کی ریاضت مٹی میں رل جاتی۔" پھوپھو ناراضی سے گویا ہوئیں۔

"سوری پھوپھو!" سومیہ کے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

"اب رو کیوں رہی ہو؟" پھوپھو کو اور بھی غصہ آگیا۔

"آپ خفا جو ہو رہی ہیں۔" وہ معصومیت سے بولی۔

"اچھا، بس کرو۔" پھوپھو کا دل بھر آیا تھا، اسے آنسو بہاتا دیکھ کر۔

"آپ نے مجھے معاف کر دیا؟"

"ہاں۔ مگر آئندہ ایسی غلطی ہرگز نہ کرنا۔" پھوپھو نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "کچھ اور تو نہیں بولا تھا وہ۔"

"نہیں۔" سومیہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"نہ جانے واپس اس گھر میں آنے کا میرا یہ فیصلہ درست بھی ہے کہ نہیں۔ اب پتا نہیں کون کون اٹھ کر حسن مراد کا پوچھتا چلا آئے گا۔" پھوپھو کے چہرے پر تفکر تھا۔ جو کہانی اختتام پذیر ہو گئی تھی۔ پھر سے

دہرائی جائے گی۔" پھوپھو کے خدشات بھی درست تھے۔

"ہم یہاں نہ ہی آتے، یہ گھر تو ویسے بھی منحوس ہے۔" سومیہ تلخی سے بولی۔

"ایسے نہیں کہتے بیٹا۔" پھوپھو فوراً ٹوک گئیں۔

"کتنے شوق سے ابو نے امی کے لیے یہ گھر بنوایا ہوگا اور امی نے ان کے ساتھ کیا کیا۔" نفرت سے سومیہ کا روم روم سلگ اٹھا۔

"پھوپھو! بیٹی اپنا دل نہ جلاؤ۔"

"پھوپھو! امی کو لمحہ بھر کے لیے بھی میرا خیال نہیں آیا تھا۔ اب بھی نہ جانے وہ کہاں ہوں گی، کس شہر میں ہوں گی، یا شاید کسی دوسرے ملک چلی گئی ہوں، کیا پتا اسی شہر میں موجود ہوں۔" سومیہ ہونٹ کاٹتے ہوئے تلخی سے بول رہی تھی۔

"سنا تو تھا، کسی دوسرے ملک چلی گئی ہے۔ ایسی عیاش عورتوں کا کیا بھروسہ، دوسرے والے کے پاس بھی ٹکی ہوگی یا نہیں۔" پھوپھو تنفر سے کہتی رہیں۔

"[illegible] کرو اس موضوع کو۔ تمہیں میلاد کی تفصیل تو بتائی نہیں، بڑا وسیع انتظام کیا تھا سمیرا نے۔"

"اچھا۔" سومیہ نے بے دھیانی میں کہا۔

"تمہیں سب ہی پوچھ رہے تھے، سکینہ تو جان کو آرہی تھی، سومیہ کو کیوں نہیں لائیں۔"

"آپ نے پھر کیا بتایا؟" سومیہ اب بھی کسی سوچ میں گم تھی۔

"سب ہی جانتے ہیں، تم کہیں نہیں آتی جاتیں۔ نہ جانے بار بار کریدتے کیوں ہیں لوگ۔"

"کیا مطلب؟" سومیہ چونکی۔

"چھوڑو، رہنے دو۔"

"بتائیے نا پھوپھو!" اس نے اصرار کیا۔

"تمہارا دل برا ہوگا۔" پھوپھو تذبذب کا شکار تھیں۔

"میں بہت حقیقت پسند ہوں۔ آپ بتا دیں پھوپھو۔"

"سمیرا کی نند کہنے لگی۔ سومیہ احساس کمتری کا شکار ہے۔ چار لوگوں میں بیٹھنے کا سلیقہ نہیں ہے اسے۔ اسی لیے کہیں بھی آتی جاتی نہیں۔" پھوپھو نے جھجکتے ہوئے اس کے اصرار پر بتایا۔

"تو ٹھیک ہی کہتی ہے۔" سومیہ لاپروائی سے بولی۔

"ہونہہ، نہ جانے لوگ خود کو سمجھتے کیا ہیں۔" پھوپھو بھری بیٹھی تھیں۔ سمیرا بلقیس کی نند پھوپھو کو ویسے بھی پسند نہیں تھی۔

"پھوپھو! مجھے نیند آرہی ہے۔ میں سونے جا رہی ہوں۔" سومیہ اٹھ کر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا سر بہت بھاری ہونے لگا تھا۔

"بیٹا! یاد سے دوائی کھا کر سونا۔" پھوپھو نے تاکید کی تھی۔



"تم باقاعدہ کس ڈاکٹر سے چیک اپ کرواتی ہو؟" سہیل بھائی اور بلقیس دونوں بہت عرصے بعد ادھر اکٹھے آئے تھے۔ سہیل بھائی کی اپنی بہت سی مصروفیات تھیں۔ وقت کی کمی کے باعث وہ اپنے بچوں کے لیے بہت کم وقت نکال پاتے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد سب پھر سے لاؤنج میں جمع تھے۔ جب اچانک سہیل بھائی نے گفتگو کا رخ بدل کر سومیہ کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا جو کہ ہمیشہ کی طرح چپکے سے اٹھ کر جانے والی تھی۔

"جی!" سومیہ اچھل کر پلٹی۔ باقاعدہ تو وہ کبھی چیک اپ کروانے نہیں جاتی تھی۔ البتہ رپورٹس وغیرہ دکھا کر پھوپھو خود دوائیں لے آتی تھیں۔

"ریاض حسین، سومیہ کے معالج ہیں۔ ان ہی کے مشورے کے مطابق دوائی لاتی ہوں۔" سومیہ کے بجائے پھوپھو نے جواب دیا۔

"ہوں، وہ اچھے ڈاکٹر ہیں۔ خوب شہرت رکھتے ہیں۔" سہیل بھائی مطمئن ہو کر سر ہلانے لگے تھے۔

"اور کیا مصروفیت ہے سومیہ تمہاری؟"

"کچھ نہیں بھائی جان۔" ہمیشہ کی طرح سومیہ پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔

"کوئی شارٹ کورس ہی کرلو۔" سہیل بھائی نے فلسفانہ مشورہ دیا۔

"ہاں... سومیہ! تم کوئی کورس کیوں نہیں کرلیتیں یہ تو بہترین مصروفیت ہے۔" زنیرا باجی نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

"سوچوں گی۔" سومیہ نے جان چھڑانی چاہی۔

"بس سوچتی ہی رہنا۔" باجی نے خفگی سے کہا۔

"سمیرا کی نند کا رشتہ طے ہوگیا ہے۔" پھوپھو کو اچانک خیال آیا تو بتانے لگیں۔

"اچھا۔" باجی کو حیرت ہوئی۔ "کہاں...؟"

"دور کے رشتے دار ہیں سکینہ کے۔" پھوپھو نے مزید بتایا۔

"واہ مولا! فرح جیسی بھی اپنے گھر بار کی ہونے لگی۔ مجھ سے بھی چار سال بڑی ہے۔" باجی کے چہرے پر ملال چھا گیا۔ "بھلا سومیہ میں کیا کمی ہے" مگر پھر بھی وہ سوچتی رہ گئیں۔

"اللہ میری بچی کے حصے کی خوشیوں سے جلد ہی اسے بھی نواز دے۔" پھوپھو آبدیدہ ہوگئیں۔

"خوشیاں دستک دے کر لوٹ جاتی ہیں۔ اگر ان کا استقبال نہ کیا جائے تو۔" سہیل بھائی نے عام سے لہجے میں جتایا۔ پھوپھو نگاہ چرا گئی تھیں جبکہ سومیہ اٹھ کر باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔ باجی بھی اس کے پیچھے آگئی تھیں۔ سومیہ نے برتنوں کے ڈھیر کو دھوتے ہوئے باجی کو بولتے ہوئے سنا۔

"آخر تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟ کافی دنوں سے سوچ رہی تھی تم سے اس موضوع پر بات کروں گی مگر وقت ہی نہیں مل سکا کچھ دیر کے لیے ہی یہاں آجاتی۔"

"مسئلہ کیسا مسئلہ؟" سومیہ حیران ہی تو رہ گئی۔

"ہر اچھے رشتے میں کیڑے نکالنے بیٹھ جاتی ہو۔ ادھر امی کی آنکھ میں بھی کوئی بندہ نہیں جچتا۔ آخر تم چاہتی کیا ہو...؟" باجی گویا سارے حساب بے باق کرنا چاہتی تھیں۔ سومیہ کچھ پل کے لیے باجی کا چہرہ دیکھتی رہی۔

"آپ کے خیال میں میرے پاس کون سا آپشن ہے جو میں بلاوجہ کسی بھی رشتے کو ریجیکٹ کروں گی۔"

"تو پھر اس دیر کی وجہ؟"

"یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔ شاید اللہ کو ابھی منظور نہیں۔" وہ سادگی سے کہتے ہوئے برتنوں کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"تمہاری یہ "مظلومیت" تمہیں ایک دن کسی بڑے نقصان سے دوچار کروے گی۔ اسی لیے میں چاہتی ہوں کہ۔" زنیرا باجی نے ترشی سے کہا۔

"مظلومیت۔" سومیہ زیر لب بڑبڑائی۔ "میں کچھ بھی نہیں۔"

"اتنا انجان کیوں بنتی ہو۔" باجی تنگ ہو اٹھیں۔ "ڈاکٹر اظہر کے پرپوزل کو محض اس بنا پر ناپسند کرنا کہ وہ بھری پری فیملی سے تعلق رکھتے ہیں۔ سوائے حماقت کے کچھ نہیں۔"

"میں نے ناپسند کیا تھا؟" سومیہ ٹھٹک گئی۔ "آپ بھی اچھی طرح سے جانتی ہیں کہ پھوپھو کو ان کا گھر بار پسند نہیں آیا تھا۔ بھلا میرے پاس کوئی ایسا اختیار ہے...؟"

"تم بااختیار کیوں نہیں ہو جاتیں۔" باجی آج انہونی باتیں ہی تو کررہی تھیں سومیہ زچ ہوگئی۔

"میں کیا کروں...؟"

"اپنے فیصلے خود کرو۔ دوسروں کی طرف دیکھنا چھوڑ دو۔ تمہارے پاس کچھ اختیارات ہیں۔" باجی نے اس کے شانے پر بازو ڈال کر نرمی سے کہا۔

"کیسے اختیارات؟" سومیہ سچ گھبرا گئی۔

"کم از کم امی کو اپنی پسند ناپسند سے تو آگاہ کرسکتی ہو۔ وہ تمہاری محبت میں فیصلہ نہیں کرپارہیں۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ وہ کیا کریں۔ تم ان کا ساتھ دو۔ انہیں سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"اچھا۔" سومیہ نے ہونق پن سے سر ہلا دیا۔

"سومیہ! تم مجھے بہت عزیز ہو اور مجھے لگتا ہے تمہارے ساتھ کچھ غلط ہورہا ہے۔" زنیرا باجی کے چہرے پر تفکر کا جال بنا ہوا تھا۔

"اور یہ غلط کون کر رہا ہے یا کرنا چاہتا ہے؟" یہ پوچھنے کا سومیہ میں نہ حوصلہ تھا نہ جرات۔

"سہیل تمہارے بارے میں بہت متفکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ تم نے اپنی تعلیم کو ادھورا کر کے اچھا نہیں کیا۔ کتنا سمجھایا تھا تمہیں میں نے کہ میٹرک کے پرچے دے لو۔"

زنیرا باجی تأسف سے کہہ رہی تھیں۔ سومیہ ہونٹ کچلتے ہوئے بے اختیار بیتے وقت کو سوچنے لگی۔ ماضی کے کسی ایک بھی لمحے نے سومیہ کو کوئی اچھی یاد ہرگز نہیں سونپی تھی۔ ہر طرف دکھ، تنہائی، آنسو اور خوف ہی تو تھا جس نے ہمیشہ اسے لوگوں سے دور ہی رکھا۔

یہ اس وقت کی بات تھی جب وہ پرانے محلے میں رہتے تھے۔ پھوپھو کی اردگرد کے پڑوسیوں سے بہت دوستی تھی۔ گھر میں ہر وقت میلہ سا لگا رہتا تھا۔ کوئی آرہا ہے، کوئی جارہا ہے۔ پھوپھو کسی کو اچار بنا کر دے رہی ہیں۔ کسی کو سویٹر کے نمونے سکھا رہی ہیں۔ کسی کو انگوری کی ترکیب پوچھنا ہوتی۔ کوئی سلائی سیکھنا چاہتا۔ [illegible] نہیں۔ پھوپھو کا بیٹا ان دنوں دوسرے شہر میں زیر تعلیم تھا۔ کبھی کبھار ہی گھر آتا تھا۔ سو روک ٹوک کس نے کرنا تھی۔

لڑکپن کا دور گزر رہا تھا۔ ہائی اسکول کی چار دیواری کے باہر اس کی ہم عمر لڑکیوں نے بہت سی مصروفیات ڈھونڈ لی تھیں۔ وہ برسات کے دن تھے۔ گلیاں، بازار پانی اور کیچڑ سے لت پت تھے۔ ایسے ہی جاڑے کی ایک صبح پھوپھو نے اسے اپنے کمرے میں بلوایا۔ وہ اسے کافی دیر زمانے کی اونچ نیچ کے بارے میں سمجھاتی رہی تھیں۔

"دیکھو بیٹی! آج وہ وقت آگیا ہے کہ میں تمہیں کچھ "سچائیوں" کے بارے میں بتا دوں۔ کچھ باتوں کو تم خود بھی اب تک جان گئی ہو گی کہ ہم کچھ نہ بھی بولیں، کچھ نہ بھی کہیں۔ کچھ بھلا دینا چاہیں۔ مگر لوگ نہ بھولتے ہیں نہ بھولنے دیتے ہیں۔ بہت سے لوگ اس قصے سے واقف ہیں۔ سب جانتے ہیں۔ ثمانہ نے حسن اور تمہارے ساتھ کیا کیا تھا۔ اپنے عیش و آرام کی خاطر اس نے جو رسوائیاں خریدی ہیں۔ ان کے کچھ چھینٹے تمہارے وجود پر بھی پڑیں گے۔ جو بدنامی کی فصل ثمانہ تمہارے لیے "بو" کر چلی گئی ہے۔ اسے کاٹنے کا وقت قریب آگیا ہے۔ لوگوں کی باتیں، رویے تمہیں چھلنی کریں گے مگر بیٹا خود کو مضبوط رکھنا۔ اس معاشرے کے قوانین بڑے سخت ہیں۔ ایک فرد واحد کی غلطی کی سزا نسلوں کو بھگتنی پڑتی ہے اور جب کوئی عورت ایسا انتہائی قدم اٹھاتی ہے تو پھر آئندہ آنے والی نسلوں پر اس کے بد اثرات بھی ضرور پڑتے ہیں۔"

وہ چپکے چپکے رو رہی تھی۔ اس کے آنسو گالوں پر بہتے ہوئے فرش پر گر رہے تھے۔ پھوپھو نے جو کہا تھا۔ سچ کہا تھا۔ اپنی ماں کے سارے بھگتان سومیہ کو بھگتنے پڑے تھے۔ یہ اللہ کا شکر تھا۔ اس کا کوئی لمبا چوڑا تو کیا مختصر بھی خاندان نہیں تھا۔ سوائے پھوپھو کے اس دنیا میں اس نے اپنا کوئی ہمدرد رشتے دار نہیں دیکھا تھا۔ اس میں بھی اللہ کی کوئی بہتری تھی۔ خاندان کی کسی نفرت کا اسے سامنا کرنا نہیں پڑا تھا۔ البتہ نجانے ان پڑوسیوں کو ایک رات میں کیا ہو گیا۔ اس کی ہم جماعت لڑکیوں نے ان کے گھر آنا چھوڑ دیا۔ جو اس کے ہمراہ اسکول جاتی تھیں انہوں نے اسکول جاتے ہوئے اب ان کے گیٹ پر بیل دینا چھوڑ دی تھی۔ اسکول فیلو اور کلاس فیلو اسے دیکھتے ہی سرگوشیوں میں نجانے کیا کیا باتیں کرنے لگتی تھیں۔

ایک دن میتھس کی ایک ٹیچر اپنی ساتھی ٹیچر کو بتا رہی تھی۔

"اتنے سالوں سے یہ لوگ ہمارے محلے میں رہ رہے ہیں۔ ہم ان کے بارے میں جان ہی نہیں سکے۔"

"کیا؟" دوسری ٹیچر نے دلچسپی سے پوچھا۔

"سومیہ کی ماں گھر سے بھاگ گئی تھی۔" اس نے سرگوشی نما آواز میں بتایا۔

"تمہیں کس نے بتایا ہے؟" اردو کی مس حنا نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

"پورے محلے میں آگ کی طرح یہ خبر پھیل چکی ہے۔"

"سچی بات ہے، ایسی باتیں کبھی نہیں چھپ سکتیں۔" میتھس کی ٹیچر نے تأسف سے کہا۔

"پھر بھی آخر کسی نے تو بات کی ہوگی۔" مس حنا نے بے چینی سے پوچھا۔

"بات گھر سے نکلے تب ہی پھیلتی ہے۔" میتھس کی ٹیچر سنجیدگی سے کہنے لگیں۔

"گھر سے کس نے نکالی؟" سب نے حیرانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"سومیہ کی پھوپھی ہمارے گھر آئی تھیں۔ باتوں باتوں میں سومیہ کی ماں کا قصہ چھڑ گیا۔ بس جذبات میں آکر انہوں نے سچائی بتا دی۔ بہت رو رہی تھیں بے چاری۔ میری امی کے ساتھ ان کی بہت دوستی ہے نا۔ پھر یہاں سے بات نکلتی چلی گئی۔ ویسے بھی ایسی باتیں بھلا کب تک چھپائی جا سکتی ہیں۔"

سب اب تأسف کا اظہار کر رہی تھیں مگر سومیہ سے پھر کچھ اور سنا ہی نہیں گیا۔ سہیلیاں تو کیا استانیوں نے بھی اسے ترحم بھری نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی دوستوں کی ماؤں نے اپنی بیٹیوں کو سومیہ سے کلام کرنے کے لیے منع کر دیا۔ وہ تنہا اسکول جانے لگی تھی۔ مگر اب محلے کے آوارہ لڑکوں تک بھی بات پہنچ گئی تھی۔ وہ اس کے راستے میں کھڑے ہو جاتے۔ تمسخر اڑاتے، قہقہے لگاتے۔ اسے چھیڑنے کی کوشش کرتے۔

"ہائے بھگوڑی ماں کی اتنی بھولی سوئی بیٹی۔"

"یہ سادگی اور معصومیت دکھا کر ماں کے عیب دھونے ہیں، بادشاہو۔" سومیہ کو لگتا تھا اس کے وجود کے چیتھڑے اڑ رہے ہیں۔ وہ لمحہ لمحہ مرتی گئی۔ پھر ایک دن اس نے اسکول بھی نہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ سب نے اسے بہت سمجھایا تھا۔ باجیاں بہت ناراض ہوئیں۔ وہ چاہتی تھیں سومیہ کم از کم میٹرک کے پرچے تو دے لیتی۔ مگر سومیہ کی ناں، ہاں میں نہ بدلی۔ تین سال مزید اس محلے میں رہنے کے بعد انہوں نے مکان بدل لیا تھا مگر یہ تین سال سومیہ کے لیے کسی عذاب سے کم نہیں تھے۔

نئے گھر میں شفٹ ہوتے ہی یکے بعد دیگرے باجیوں کی شادیاں ہو گئیں۔ سب کچھ آہستہ آہستہ معمول پر آگیا تھا مگر سومیہ کے لیے زندگی صرف ایک نقطے پر ٹھہر گئی تھی۔ کچھ عرصہ مزید گزرا تو پھوپھو سومیہ کو لے کر اپنے گھر میں آگئیں۔ مگر اب بھی نجانے کون کون پرانے زخم ادھیڑنے آجاتا تھا۔ البتہ اس کالونی کے لوگ دوسروں کی زندگیوں میں مداخلت کرنے والے نہیں تھے۔ سب اپنے آپ میں مگن رہتے۔ کوئی کسی دوسرے کی ٹوہ میں بے چین نہیں ہوتا تھا۔



صرف کچھ دن بعد ایک عجیب واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ دو خواتین کسی گاؤں سے سومیہ کے رشتے کی غرض سے آئیں۔ ان میں ایک تو ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ البتہ چہرے مہرے سے کافی چالاک لگتی تھی۔ اور دوسری کافی صحت مند گوری چٹی بائیس تیئیس سالہ لڑکی تھی۔ انہوں نے سومیہ کو دیکھا اور پسند کر لیا۔ پھوپھو کو بصد اصرار اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ جاتے ہی حسنہ نامی لڑکی کے کئی فون آئے۔ ناچار پھوپھو نے زنیرا باجی اور سہیل بھائی کو ان کے گھر بھیج دیا۔ خود وہ پیر میں موچ آجانے کی وجہ سے جا نہیں سکی تھیں۔ زنیرا باجی واپس آئیں تو بہت خوش تھیں۔ سہیل بھائی بھی مطمئن نظر آرہے تھے۔

"امی! گاؤں کے سب ہی گھروں میں اچھا گھر ہے ان لوگوں کا۔ دو منزلہ، جدید انداز میں بنا ہوا۔ میرے ذہن میں کچھ اور ہی تصور تھا۔ کچا پکا گھر، صحن میں بندھے جانور، گندگی، غلاظت، تاہم ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ لڑکا بھی اکلوتا ہے۔ آڑھت کا کاروبار ہے۔ تعلیم یافتہ اور بہت شائستہ مزاج ہے اس کا۔ سہیل کو تو بہت

بھی پسند آیا ہے۔ اماں اس کی بہت پیار سے چلنے پھرنے سے قاصر کرنے تک محدود ہے۔ امی! ہر لحاظ سے بہترین رشتہ ہے' آپ ہاں کریں۔ کیونکہ سب سے بہترین چیز یہ ہے کہ وہ سومیہ کو بہت چاہ سے مانگ رہے ہیں۔

زنیرا آپی بہت مسرور تھیں۔ سب سے بڑی بات سہیل بھائی اس رشتے کے حامی تھے۔ سو بالی کے معاملات بہت تیزی سے نمٹائے گئے۔ انہیں جہیز کی ضرورت نہیں تھی۔ سختی سے منع کر دیا گیا تھا۔ مگر پھر بھی پھوپھو کچھ نہ کچھ بنانا چاہتی تھیں۔

دوسری طرف بھی شادی کی دھوم دھام سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ لالہ کی مصروفیات دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ پورے گھر کو روشنیوں سے سجایا جا رہا تھا۔ جبکہ جمال ابھی تک حیران تھا۔ اسے لالی کی کسی بات پر یقین نہیں تھا۔ وہ یقین کرتا بھی کیسے' وہ خود اس "مہم" پر پچھلے چار پانچ سالوں سے خود کو کھپا رہا تھا۔ اور اب لالی صرف ایک ہی ملاقات میں اس کی پھوپھی کی گمشدہ بیٹی کو نہ صرف دریافت کر چکا تھا بلکہ بات بھی شادی کے معاملات تک پہنچا لیے تھے۔ اماں بہت خوش تھیں۔ اور لالی سے تو کچھ زیادہ ہی خوش تھیں۔ حسنہ بھی بہت مسرور دکھائی دیتی تھی۔ اس کے خیال میں سومیہ کے آنے کے بعد وہ جمال اور لالی سے زیادہ بہتر مقابلہ کر سکتی تھی۔

سومیہ سے شادی کے لیے اماں نے اس کی رضامندی کے متعلق پوچھا تھا۔ جمال کو سومیہ تو کیا کسی بھی لڑکی سے شادی پر اعتراض نہیں تھا۔ بس وہ چاہتا تھا۔ دو چار سال تک شادی کو ملتوی کر دیا جائے۔ مگر اماں کو اب مزید دیر گوارا نہیں تھی۔ سو شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ مگر وہ اپنی چند الجھنوں کو خفیہ طریقے سے دور کر چکا تھا۔

ایک تو لالی کا کہنا سو فیصد سچ تھا کہ سومیہ حسن مراد اور ثمانہ مراد کی بیٹی ہے۔ اور دوسرا یہ کہ چند سال پہلے ہی یہ لوگ "حسن منزل" دوبارہ شفٹ ہوئے تھے مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا۔ سومیہ اتنا عرصہ کس کے ساتھ رہی ہے۔ کون اس کی سرپرستی کرتا رہا تھا۔ وہ اماں سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا تھا۔ چند اور الجھنوں کو رفع کرنا چاہتا تھا۔ اتفاق کی بات تھی اسی رات اماں سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع مل گیا۔

"اماں! سب سے قریبی تعلق تو آپ کا تھا سومیہ سے' تو ابا اور آپ سومیہ کو لینے کیوں نہ گئے؟ آپ کا حق بنتا تھا کہ سومیہ کو فوراً "لینے روانہ ہو جاتیں۔"

"ادھر کفن دفن سے فراغت کے بعد سومیہ کو لینے ہی تو گئے تھے مگر حسن کے گھر تالا لگا ہوا تھا۔ آس پڑوس سے پوچھا تھا۔ ہر در کھٹکھٹایا کہ حسن کی چھ ماہ کی بچی کا کچھ پتا چل سکے۔ مگر حسن کے پڑوسی جو کرائے دار تھے وہ سننے میں آیا تھا کہیں دوسرے سامان ٹرک میں لوڈ کروا کے کہیں چلے گئے ہیں۔ حسن کا اپنے اس پڑوسی کے علاوہ اور کسی کے ساتھ ملنا ملانا نہیں تھا۔" اماں تھکی تھکی آواز میں کھانستے ہوئے یادداشت کے خانے کھنگالتے ہوئے بتانے لگیں۔

"ابا نے دوبارہ کوشش نہیں کی؟"

"اسے بھلا ضرورت کیا تھی کوشش کرنے کی۔ اس نے تو ہزار بار شکر ادا کیا تھا کہ سومیہ کی ذمہ داری سے جان چھوٹ گئی۔ اسے اپنی اولاد وبال لگتی تھی۔ بھانجی کو کیسے پالتا۔ یہ تو میرے بھائی کا جگرا تھا ہم دونوں پر اپنی چھایا کر لی۔ ہر کوئی تو بھائی شہریز جیسا نہیں ہو سکتا۔" اماں کو اپنے مرحوم بھائی یاد آ گئے تھے' اسی لیے وہ رونے لگی تھیں۔

"جنت! او جنت! یہ کیا بدشگونی کر رہی ہو۔ خیر سے بچے کا بیاہ ہے۔ اور تم آنسو بہا رہی ہو۔" حمیدن بوا غلط موقع پر انٹری مارنے کی شوقین تھیں۔ جمال کچھ اور بھی پوچھنا چاہتا تھا مگر بوا کی موجودگی کے خیال سے خاموش رہا۔

☼ ☼ ☼

برات والے دن بہت رونق تھی۔ دونوں طرف کے انتظامات بہت شاندار تھے۔ مہندی والی رات پھوپھو بہت دیر سومیہ کے پاس بیٹھی رہی تھیں۔ بار بار

ان کی آنکھیں بھر آتیں۔

دل کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ سومیہ خود نجانے کتنی مرتبہ رو چکی تھی۔ آنے والے لمحات اسے خوف زدہ کر رہے تھے۔ اس کے دل میں وسوسوں کی پکڑ دھکڑ پورے دل سے خوش نہیں ہونے دے رہی تھی۔ کئی مرتبہ سومیہ کا دل چاہا تھا کہ وہ اپنے خدشات کسی سے شیئر کرے۔ سبای سے یا پھر پھوپھو سے۔

"تم کچھ کہنا چاہتی ہو سومی!" پھوپھو اس کے لرزتے ہونٹوں میں چھپے سوال کو سمجھ کر نرمی سے پوچھنے لگیں۔

"جی۔" وہ سر جھکا کر بولی۔

"کیا؟" پھوپھو نے پیار سے پوچھا۔

"پھوپھو! میں چاہتی تھی کہ آپ انہیں سب کچھ بتا دیں۔" لرزتے لہجے میں سومیہ نے کہہ دیا۔

"کیا بتا دوں؟" پھوپھو حیران ہوئیں۔ "اور کسے بتا دوں۔"

"جمال کے گھر والوں کو۔"

"کیا؟" وہ چونک گئیں۔

"میری اماں کے متعلق۔" وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوئی۔ "پھوپھو! میں نہیں چاہتی کہ کل انہیں جب میری ماں کے ماضی کے بارے میں خبر ہو تو انہیں اس رشتے پر پچھتانا پڑے۔ آپ اچھی طرح سے جانتی ہیں کہ کتنی مرتبہ لوگ مجھے اسی وجہ سے ریجیکٹ کر کے گئے تھے کہ میری ماں کردار کی ہلکی تھی اور شاید ماں والی خوبیاں مجھ میں بھی موجود ہوں۔"

"اب یہ ممکن نہیں۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ سب کچھ طے پا چکا ہے۔ کل برات آئے گی۔ تم جانتی ہو کہ تمہاری شادی میرے سارے بوجھ اتار دے گی پھر ندیم بھی کچھ مہینوں تک مجھے اپنے پاس بلوانے والا ہے میں ہر فکر سے آزاد ہو کر جانا چاہتی ہوں۔ تم بھی بے کار کی فکریں پالنا چھوڑ دو۔ خوش رہو اور اچھی اچھی باتیں سوچو۔" پھوپھو اس کی پیشانی چوم کر اٹھ گئیں۔

دوسرے دن بارات اپنے مقررہ وقت پر پہنچ گئی تھی۔ نکاح خیر و خوبی ہو گیا۔ مبارک سلامت کا شور اٹھا۔ سہیل بھائی اور زنیرا آپی مہمانوں سے مل رہے تھے۔ مبارکیں وصول کر رہے تھے۔

"جنت نے غیروں میں بیٹا بیاہا ہے؟" مہمان خواتین میں سے کسی بڑی بی نے پوچھا۔

"غیرے کہاں؟ اپنی ثمانہ کی بیٹی ہے۔" کسی دوسری خاتون نے بڑے جوش کے عالم میں بتایا۔

"ثمانہ کی بیٹی۔" کئی عورتیں جہاں ٹھٹک کر ایک دوسرے کو حیرت بھری نظروں سے دیکھنے لگی تھیں وہیں پھوپھو کے قدم گویا زمین نے جکڑ لیے۔ وہ وحشت بھری آنکھوں سے مہمان خواتین کو دیکھ رہی تھیں۔

"ثمانہ کی بیٹی۔ ثمانہ کی بیٹی۔" وہ زیر لب بڑبڑائیں۔ "ثمانہ کا یہاں کیا ذکر۔ یہ لوگ ثمانہ کو کیسے جانتے ہیں؟ ثمانہ ان کی کیا لگتی ہے؟ سومیہ کو میں نے کہاں بیاہ دیا! بغیر جانچ پڑتال کیے بغیر جانچے پرکھے یہ میں نے کیا کر دیا ہے۔" وہ وحشت زدہ سی جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئیں۔

"جمال ثمانہ کا بھتیجا ہے نا۔" ایک اور عورت وضاحت کر رہی تھی۔

"ثمانہ کا بھتیجا۔" پھوپھو کے دماغ پر ہتھوڑے برسنے لگے۔ وہ لرزتے قدموں سے چلتی ہوئی شامیانے سے باہر آ گئی تھیں۔ ان کا پورا وجود پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ وہ خود کو رعشہ زدہ کوئی عمر رسیدہ عورت تصور کرنے لگی تھیں محض لمحہ بھر میں۔

"سومیہ' حسن مراد کی بیٹی ہے۔ اس نے مجھے بتایا اور میں نے یقین کر لیا۔ ہمیں کسی اور تصدیق کسی اور وضاحت یا پھر کسی سرٹیفکیٹ کی ضرورت نہیں۔ آج تمہیں یقین آ گیا ہے نا؟ میں نے کچھ اور ذرائع سے بھی انفارمیشن لی ہیں۔ یہ مناسب موقع نہیں۔ تفصیل گھر جا کر بتاؤں گا جمال بھائی! ابھی تو سالیوں کے نرغے میں اسٹیج پر بیٹھے ہو۔ اچھا میں ذرا شامیانے سے باہر نکلا ہوں۔ ہاں' ہاں گھر جا کر بھی یہ بات بتا سکتا تھا تاہم میں نے سوچا یہ "مہم" چونکہ میری وجہ سے کامیابی

سے جتنا پیار ہوگئی ہے تو مجھے اس کے بدلے میں کیا ملے گا؟ اچھا تم بھی گھر جاکر سوجاؤ۔ ٹھیک ہے۔" آنا ہوں یار! انار اتنی کیوں ہوتے ہیں۔"

وہ کوئی نوجوان تھا۔ جو موبائل کان سے لگائے بڑے خوشگوار موڈ میں کسی سے باتیں کررہا تھا۔

"ابھی تمہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں۔ سومیہ کے ساتھ ایک عجیب و غریب کہانی بھی اس کے ہمراہ آئے گی۔ میں بھی حیران ہوا تھا۔ تم بھی حیران ہوگے۔ میں نے بہت محنت کے بعد بہت کچھ معلوم کیا ہے۔ سب کچھ بتاؤں گا مگر ابھی نہیں۔ ابھی تو میں رواں دریا کی موجوں کو دیکھ رہا ہوں۔ دیکھو اس دریا میں طغیانی کب آتی ہے۔"

اب وہ موبائل جیب میں پھنسا کر شامیانے کے داخلی دروازے سے اندر چلا گیا تھا جبکہ شبانہ اختر کی رہی سہی ہمتیں بھی جواب دے گئیں۔ انہیں کچھ بھی پتا لگے ہوں گے اگلا قدم کل تیار کرتے ہیں۔ پھر وہ متفکر ہوکر گھر کی طرف بڑھ گئی تھیں جہاں سومیہ دلہن بنی بیٹھی تھی۔ اسے ... ہوا تھا۔ بہت جلد کرنا تھا ورنہ...

✿ ✿ ✿

جانے دن کا کون سا پہر تھا جب دروازے پر زور دار دستک ہوئی۔ سومیہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی تھی۔ اصلی گلابوں سے بنی خوشنما لڑیوں کو پیچھے ہٹا کر اس نے وحشت کے عالم میں ارد گرد نظر دوڑائی۔ پہلے تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا مگر پھر آہستہ آہستہ اس کا سویا سویا ذہن بیدار ہوگیا۔ یوں لگا جیسے تھکن کی رات والی کیفیت کا اثر ایکدم غائب ہوگیا۔ وہ اپنی بکھری ہمتوں کو مجتمع کرنے کے بعد بھی بے دم سی بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں رات کا ایک ایک منظر دیکھ رہی تھیں۔

"میں نے جمال سے کیا کہا تھا۔" بہت سوچنے کے بعد بھی اسے کچھ یاد نہیں آیا۔ مسلسل دماغ پر زور ڈالنے کی وجہ سے سر میں ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ ہمیشہ اس پر مسلط رہنے والی خودی اس وقت غائب تھی۔ شاید اسی لیے بھی کہ وہ تمام رات سوتی رہی تھی۔ یا سوئی جاگتی کیفیت میں تھی۔ سومیہ کو یوں لگ رہا تھا۔ یہ رات ایک خواب تھی۔ وہ خواب کے سفر پر رواں دواں تھی اور اسی خواب کے زیر اثر وہ جمال سے مخاطب تھی۔ جمال اس سے کچھ سوال کررہا تھا۔ کچھ پوچھ رہا تھا۔ مگر اس نے بھی تو جمال سے کچھ کہا تھا۔ کیا؟ یہ اب سومیہ کو بھول چکا تھا جو دوائی کھا کر وہ اپنے گھر سے یہاں تک آئی تھی۔ اس کا اثر اتنا شدید تھا کہ سومیہ اپنی سدھ بدھ بھول گئی تھی۔

دروازے پر ایک دفعہ پھر زور دار دستک ہوئی تھی۔ اگرچہ دروازہ لاک نہیں تھا مگر کسی نے کھولنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سومیہ وہ ابھی تک رات کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ ایک مرتبہ پھر عجیب سے احساسات نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اس نے دروازہ کھولنے کے بجائے چپکے سے کنڈی چڑھادی تھی۔ پھر اپنا سوٹ کیس گھسیٹ کر کپڑے نکالنے لگی۔ دروازہ اب بھی وقفے وقفے سے بج رہا تھا۔ پھر وہ برش کراس سے بال بنانے لگی۔ پھر دوپٹہ اوڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے دیکھنے والے دو چہرے آنکھوں میں شرارت لیے نظر آئے۔

"تھینک گاڈ! آپ نے دروازہ تو کھولا۔" لالی نے بے اختیار چھت کی طرف دیکھ کر ہاتھ بلند کیے۔

"میں تو سمجھ رہا تھا۔ آپ سوسائیڈ (خودکشی) کرچکی ہیں۔ حالانکہ میرا بھائی اتنا بھی برا نہیں۔ خیر! آپ کو زندہ سلامت دیکھ کر پیٹ میں ہلچل مچ گئی ہے۔ تھانیدارنی جی! آپ ذرا فٹافٹ اپنے خوبصورت ہاتھوں سے ناشتا بنا کر لائیں۔ سومیہ جی کو بھی بھوک لگ رہی ہوگی۔"

لالی کی زبان فراٹے بھر رہی تھی۔ تھانیدارنی کو غصہ آگیا۔

"بولے جاتے ہو۔ بولے جاتے ہو کسی اور کو باری نہیں لینے دیتے۔"

"تو آپ پہلے گولڈ میڈل حاصل کرلو۔ ستارہ جرات لے لو۔" لالی نے بازو سے پکڑ کر حسنہ کو آگے کیا۔

سومیہ کے لبوں پر بھولی بسری سی مسکان پھیل گئی۔

"گڈ مارننگ!" حسنہ نے مسکراتے ہوئے سومیہ کو گلے لگایا۔ "تم اٹھ گئی ہو۔ میں تمہارے لیے ناشتا لاتی ہوں۔ مگر اس سے بھی پہلے تم پھوپھو سے مل لو۔ رات تو تم بھی تھکی ہوئی تھیں اور انہوں نے بھی سرسری سا دیکھا تھا۔ اب صبح سے بے چین ہیں کہ سومیہ کو دیکھوں۔"

"پھوپھو کہاں ہیں؟ کس طرف جانا ہے؟" سومیہ نے نرمی سے پوچھا۔ وہ ان زہریلی سوچوں سے پیچھا چھڑانے اور اپنا دھیان بٹانے کی غرض سے بولی۔

"وہ تمہاری پھوپھو نہیں ہیں سومیہ! میرے ساتھ آؤ۔ وہ انتظار کررہی ہیں تمہارا۔ جمال بھائی بھی وہیں ہیں۔ میں ابھی اصلی دیسی گھی سے پراٹھے بنا کر لاتی ہوں۔"

حسنہ اس کا ہاتھ تھامے ایک راہداری کی طرف بڑھ گئی تھی۔ اماں کے کمرے کا دروازہ کھول کر اسے اندر بھیجنے کے بعد وہ کسی کے "تھانیدارنی جی" پکارنے پر واپس پلٹ گئی تھی۔ سومیہ نے اماں کے کمرے میں قدم رکھا تو سامنے بیٹھے جمال کو دیکھ کر اس کی سانسیں الجھنے لگیں۔ اسے یوں محسوس ہورہا تھا۔ وہ کام آخری ایک بس ابھی ہوجائے گا۔ جمال نے گہری کاٹ دار طنزیہ نظر اس کی طرف اچھالی۔ سومیہ کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہوگئے تھے۔

"آؤ میری دھی رانی! میری بچی! ادھر آؤ میرے پاس۔" اماں نے والہانہ انداز میں اپنے بازو اسے دیکھتے ہی پھیلا لیے تھے۔ وہ رات کے ساتھ نہیں جاسکی تھیں تاہم رات کو بھی انہوں نے سومیہ کا اسی انداز میں استقبال کیا تھا۔ سومیہ کسی معمول کی طرح ان کی کھلی بانہوں میں سماگئی۔ ایک لمحے کو تو اسے جمال کی موجودگی بھی بھول گئی تھی۔

"رات کو ٹھیک سے نیند تو آگئی تھی۔ نیا ماحول نئی جگہ۔ گاؤں میں تمہاری پہلی رات تھی نا۔ گھبرائیں تو نہیں۔" وہ بڑی محبت سے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لیتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

"کوئی ایسی ویسی نیند آئی۔ مجھے تو لگتا ہے پچھلے کئی سالوں سے رت جگا ستا رہا تھا جو یہاں آکر سونے کی کسر پوری کی گئی ہے۔" جمال اس کے بے سدھ سوجانے پر شاید طنز کررہا تھا۔ سومیہ بری طرح شرمندہ ہوگئی۔ ایک دفعہ پھر اس کی سوچیں منتشر ہوگئیں۔

"میں نے رات کو بھلا ان سے کیا کہا تھا؟" وہ سوچتی رہ گئی تھی۔ اماں نے اسے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

"حسنہ نے ناشتہ کروادیا ہے؟"

"ابھی تو محترمہ باہر تشریف لائی ہیں۔" جمال نے پھر طنز کا تیر پھینکا۔

"یہ کمرے میں نہیں سوئے تھے۔ پھر نجانے رات کو کہاں چلے گئے تھے۔" سومیہ نے بے اختیار سوچا۔

"پتر! فکر مت کرنا۔ یہاں سب تمہارے اپنے ہیں۔ حسنہ تمہاری بہن ہے۔ لالی چونچال طبیعت رکھتا ہے۔ مگر ہے بہت اچھا ادب لحاظ والا۔ اسی نے تو مجھے بتایا تھا کہ وہ ثمانہ اور حسن کی بیٹی کو ڈھونڈ چکا ہے۔ ورنہ اس جمال نے تو مجھے مایوس ہی کر ڈالا تھا۔ جب بھی تڑپ کے پوچھتی کہ بچی کو کب لاؤ گے؟ ناکام ہی لوٹ کر آیا۔ لالی میرا بڑے کام والا ہے۔ چند دنوں میں تمہارا اتا پتا معلوم کرکے آگیا تھا۔ سرکاری نوکری کے لیے امتحان دے رکھا ہے۔ لالی نے۔ تمہاری شادی سے دو دن پہلے اس کا پرچہ تھا خیر سے نوکری لگ گئی تو پھر"

"اماں! میں کون ہوں؟" اس کے لبوں سے سسکاری بر آمد ہوئی۔

"تم ثمانہ کی بیٹی ہو۔ ثمانہ میری چچازاد بہن تھی میں تمہاری سگی ممانی ہوں پتر!" اماں اسے بانہوں میں بھینچے بھرائی آواز میں کہہ رہی تھیں۔

"تمہاری ماں سے وعدہ کررکھا تھا۔ زبان دی تھی۔ آج وہ وعدہ پورا ہوا۔ میں نے اپنا عہد نبھا دیا۔ میں سرخرو ہوئی۔ اللہ تم دونوں کی جوڑی سلامت رکھے۔" پھوپھو کہہ رہی تھیں۔

"کیسا وعدہ؟" سومیہ کو لگا۔ وہ چکرا کر گر جائے گی۔

"آپ میری سگی ممانی ہیں؟"

✿ ✿ ✿

"مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے؟" سومیہ خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کپکپاتی آواز میں بولی۔

"ابھی کچھ اور بھی کہنے کی حسرت موجود ہے۔ جو کچھ رات کو کہا ہے' اس سے دل نہیں بھرا۔" جمال فون پر کسی آڑھتی سے بات کر رہا تھا' موبائل جیب میں رکھتے ہوئے طنزیہ انداز میں بولا۔

"آپ میری بات سن لیں۔" سومیہ رو دینے کو تھی۔ پشیمان' شرمندہ' الجھی الجھی' کھوئی کھوئی سی۔ جمال کو لمحہ بھر کے لیے وہ ایب نارمل لگی تھی۔

"رات سے تمہاری ہی تو سن رہا ہوں۔ اپنی ماں کی "خوشی" کا خیال نہ ہوتا تو اب تک نجانے کیا کر چکا ہوتا۔ عرصہ دراز بعد اماں کو خوش دیکھ رہا ہوں۔ اور اماں کی وجہ سے تمہاری بے حیائی کا اعتراف سن کر بھی خاموش ہوں۔ ابھی سارا کچا چٹھا کھول دوں تمہارا تو دو کوڑی کی رہ جاؤ گی سب کی نظروں میں۔" جمال نے ایک سلگتی نگاہ اس پر ڈالی تھی اور پھر اٹھ کر اس کے قریب چلا آیا۔ "جب کوئی اور تمہیں پسند تھا تو پھر یہ شادی کا ناٹک کیوں کیا؟"

"اب میری بات... جمال پلیز آپ ایک دفعہ خاموشی سے سن لیں۔" سومیہ اس کے قدموں میں بیٹھ کر کپکپاتی آواز میں بولی۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ جمال کے پیروں پر رکھ دیے۔ جمال ششدر رہ گیا تھا۔

"میں اپنا اعتبار کھو چکی ہوں۔ اتنا تو میں جانتی ہوں کہ اب آپ کو میری کسی بات پر اب یقین نہیں آئے گا۔ مگر پھر بھی مجھ بدبخت کو وضاحت کا ایک موقع ضرور دیں۔"

جمال کو اپنے پیروں پر کچھ نمی کا احساس ہوا تھا۔ اس نے جھک کر دیکھا' وہ آنسو تھے۔ سومیہ کے بارش کی بوندوں کی مانند گرتے آنسو۔ جمال کو کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ وہ جھنجلا کر سومیہ پر جھکا تھا۔

"اٹھو' یہ کیا احمقانہ حرکت ہے۔" جمال نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا۔ "جو کہنا ہے۔ یہاں بیٹھ کر کہو۔" جمال نے اسے پلنگ پر بٹھایا۔

"میں نہیں جانتی' وقت میرے ساتھ کیا کرے گا۔ کوئی بھی نہیں جانتا۔ اگر کوئی جان جائے تو... مگر کوئی جانتا بھی کیسے؟ عمر بیت جاتی ہے اور کوئی کسی کو بھی نہیں جان پاتا۔ اور مجھے تو ایسا دعوا شروع سے ہی نہیں تھا۔ تمام عمر ایک "خوف" کی کیفیت میں خود کو ایک کمرے تک محدود کیے رکھا تھا۔ صرف ایک طعنے کا خوف۔ کسی کی ایک جتاتی نگاہ کا خوف۔ تمسخر اڑاتی اس مسکراہٹ کا خوف جو کسی بھی جاننے والے کے لبوں پر مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھتی تھی۔ کوئی مجھے ثمانہ کی بیٹی کے حوالے سے طعنہ دے۔ کوئی یہ نہ کہہ دے "دیکھو یہ ہے ثمانہ کی بیٹی۔ وہ جو رات کے اندھیرے میں بھاگ گئی تھی۔ اسے بلکتا چھوڑ کر۔ جسے اپنے شوہر کے دوست سے محبت ہو گئی تھی اور جس نے رشتوں کی حرمت کا بھی پاس نہیں رکھا تھا۔ ایسی بے کردار "عورت" کی بھلا کون عزت کرتا ہے؟

آج تک میں نے اپنی ماں کے حوالے سے جو بھی سنا تو سب مجھے دھیرے دھیرے ابنارمل بناتا رہا تھا۔ مجھے لگتا تھا میں پاگل ہو جاؤں گی۔ میں جب اپنی ماں کے متعلق سوچتی تھی میری سانس گھٹنے لگتی۔ میرا دم الجھنے لگتا۔ مجھ پر دورے کی کیفیت طاری ہونے لگتی۔ میری عزیز از جان پھوپھو نے اس کیفیت کو ایک بیماری سمجھ لیا۔ وہ میری دوائیں ڈھونے پر مامور ہو گئیں۔

"سومیہ کے سر میں درد ہے۔ اسے گولی دے دو۔"

"سومیہ کو نیند نہیں آتی۔ اسے گولی کھلا دو۔"

"سومیہ کا سانس اکھڑنے لگا ہے۔ اسے کالی بوتل والی دوا پلا دو۔"

ان ہی باتوں کے درمیان میری زندگی گزری ہے۔ میں نے بھی کسی سائے کی تلاش میں باہر کے درختوں کی چھایا کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ کیا تھا جو حسن مراد کی بیٹی کے آنگن میں کوئی درخت نہیں تھا۔ چڑھتا سورج اگر اسے سلگاتا تھا تو کیا ہوا۔ وہ تھوڑی دیر تپش سے بچنے کے لیے اپنی ماں کی طرح کوئی بدنامی کیوں مول لیتی۔ اسے جلنا منظور تھا۔ مگر بھسم ہونا نہیں۔

پر مجھے لگتا ہے۔ میں نے کل رات عمر بھر کی ساری ریاضت مٹی میں رول دی ہے۔ میں نے آپ سے جو کچھ کہا وہ غلط تھا۔ جھوٹ تھا۔ سومیہ ہر الزام سے بری ہے۔ ہر جھوٹ سے پاک ہے۔ سومیہ نے جو کہا غلط کہا۔ جھوٹ کہا۔ میری زندگی میں آپ کے سوا کوئی نہیں۔ آپ کے نام نے مجھے معتبر کیا ہے۔ مجھے ایک ذلت بھری زندگی سے آزاد کیا ہے۔ میں تمام عمر آپ کی تابع دار رہوں گی۔ آپ میری بات کا یقین کریں۔ آپ کو رب رحیم کا واسطہ۔"

وہ تڑپ تڑپ کر رو دی تھی۔ سومیہ نے جو کچھ اس سے کہا تھا۔ کسی بھی غیرت مند مرد کے لیے وہ باتیں ناقابل برداشت تھیں۔ پوری رات وہ نفرت کے دہکتے الاؤ میں خود کو جھلستا محسوس کرتا رہا تھا۔ اس کے اندر ایک طوفان اٹھنے کی مخصوص آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ مگر اس وقت تمام شور جادو کی چھڑی سے گہری نیند سو گیا تھا۔

سومیہ خاموش ہو گئی تھی۔ بس اس کی سسکیوں کی ہلکی آوازیں سناٹے کو چیر رہی تھیں۔

"سومیہ! چپ ہو جاؤ اور مجھے ساری بات بتاؤ۔" جمال نے اس کے پیٹرے حتی خبر سنانے کو چپ تے ہوئے کہا۔ سومیہ نے اسے دیکھا اور حیران رہ گئی۔

"تو میرے پروردگار نے جمال کے دل کو بدل دیا ہے۔" وہ دھک دھک کرتے دل سے سوچتی رہی۔ اس کے چہرے پر پہلی اجنبیت غائب ہونے لگی تھی اور کچھ نرم نرم تاثرات ابھرنے لگے تھے۔ سومیہ نے جمال کو کہتے سنا۔ وہ شاید دوبارہ اپنے الفاظ دہرا رہا تھا۔

"سومیہ! تم مجھے بتاؤ۔ جو کچھ رات کو تم نے مجھ سے کہا تھا۔ اس کا اسکرپٹ کس نے لکھا۔ کس نے تمہارے ہاتھ میں تھمایا تھا۔ بتاؤ سومیہ! اور تم اپنی ماں کے بارے میں ایسے الفاظ..."

"مجھے تو... مجھے وہ سب کس نے بولنے کے لیے کہا۔"

سومیہ سوچ میں گم ہونے لگی تھی اور پھر اس کا دل گویا کسی نے مٹھی میں لے کر بھینچ ڈالا۔ اس کے ہونٹ نیم وا ہوئے تھے اور پھر اس نے جمال کو سب بتانا شروع کر دیا۔

✲ ✲ ✲

وہ دلہن بنی جائے نماز پر بیٹھی ہاتھ دعا کے انداز میں بلند کیے رو رہی تھی۔ جب دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ سومیہ نے آنسو بھری نگاہوں سے اندر آنے والے وجود کو دیکھا اور پھر جائے نماز اٹھا کر خود بھی لہنگا سنبھالتی اٹھ گئی۔

"میری بچی!" پھوپھو نے اسے ساتھ لپٹا کر رونا شروع کر دیا تھا۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔ اور یہ رونا ایک بیٹی کے رخصت ہونے پر نہیں آرہا تھا۔ بات تو کچھ اور تھی جسے سن کر سومیہ پر ایک قیامت گزر گئی۔

"ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے میری بچی! یہ لوگ تو فراڈ نکل آئے ہیں۔ لڑکے کا آڑھت کا کاروبار نہیں' ہیروئن کا کاروبار کرتا ہے۔ نشہ بیچتا ہے۔ ہائے ہمارے نصیب!"

"پھوپھو! آپ کیا کہہ رہی ہیں۔" سومیہ کے دل کی دھڑکن رک رک کر چلنے لگی۔

"ہاں میری بچی۔ میں تمہارے نصیب پھوٹ رہی ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔ میں تمہارے لیے بہتر فیصلہ نہیں کر سکی۔" پھوپھو تڑپ تڑپ کر رو دیں۔

"اب کیا ہو گا پھوپھو؟" سومیہ وحشت زدہ سی بولی۔

"ہونا کیا ہے۔ ہماری بدنصیبی۔" پھوپھو نے اپنا کریبان ڈالا۔ "اب اگر خود کو بچانا چاہتی ہو تو میری بچی کچھ ہمت سے کام لو۔ ذرا دل کو مضبوط کرو۔ بہادری سے ان حالات کا مقابلہ کرو۔"

"مگر کیسے؟" سومیہ کے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ اسے سچ مچ کوئی خوشی راس نہیں آئی تھی۔

"تمہیں رخصت کرنا میری مجبوری ہے۔ عزت کا سوال ہے۔ کس کس کو جواب دیتی پھروں گی۔ لوگ وضاحتیں مانگیں گے۔" پھوپھو نے اپنے بال نوچ لیے۔

"مجھے کیا کرنا ہوگا؟" وہ خوف زدہ سی بولی۔

"کچھ نہیں۔" پھوپھو رونا بھول کر سوچ میں پڑ گئیں۔ اور سوچ تو انہوں نے شاید پہلے سے رکھا تھا۔ نرمی سے پیار سے انہوں نے سومیہ کو ایک ایک بات سمجھا دی۔

"اپنی عزت کی حفاظت تمہیں خود کرنا ہے۔ خود کو بچاؤ سومیہ! میں بھی تمہیں اس جہنم میں رہنے نہیں دوں گی۔ ایسے دو نمبر آدمی کے ساتھ زندگی گزارنا دوزخ میں جلنے کے برابر ہے۔ میں تمہیں جلد واپس لے آؤں گی۔ خلع کا کیس کرکے جان چھڑوالیں گے۔ بس تم ثابت قدم رہنا۔"

"ٹھیک ہے پھوپھو! آپ نے جو کہا میں نے سمجھ لیا۔" وہ جذباتی ٹوٹ پھوٹ کا شکار اثبات میں سر ہلاتی گئی۔ اٹھنے سے پہلے پھوپھو نے اپنے ساتھ لایا دودھ کا گلاس اسے تھما کر بولیں۔ "یہ دودھ پی لو تم نے کھانا بھی نہیں کھایا۔"

"جی اچھا۔" سومیہ کا دل ہرگز نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر پھوپھو نے زبردستی اسے دودھ پلوا دیا۔ اسی پل زنیرا باجی کمرے میں داخل ہوئیں۔

"امی! [illegible] کے لیے کھڑے ہیں۔"

"ہاں۔ ہاں، تم سومیہ کو لے کر باہر آؤ۔" پھوپھو بوکھلا کر روتے ہوئے باہر نکل گئی تھیں۔ جبکہ زنیرا باجی نے محبت سے سومیہ کے سراپے کی طرف دیکھا۔

"اتنا روپ آیا ہے کہ میں بتا نہیں سکتی۔ اتنا سادگی سے رہنے کا ایک فائدہ تو ہوا ہے۔ جمال کی آج خیر نہیں۔ تمہیں دیکھتے ہی اپنے حواس کھودے گا۔"

زنیرا باجی شرارت سے کہہ رہی تھیں۔ اور سومیہ نے سچ مچ جمال کے حواس اڑانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔



جمال نے مزید کوئی وضاحت طلب نہیں کی تھی۔ ولیمہ بخیر و خوبی نپٹ گیا۔ زندگی اپنے معمول پر آگئی تھی۔ جمال کا رویہ بھی سومیہ سے یکسر بدل چکا تھا۔ وہ اس کا ایک اچھے شوہر کی طرح خیال رکھتا تھا۔ اماں اسے دیکھ دیکھ کر جیتی تھیں۔ حسنہ جیسی بہن اور لالی جیسے بھائی کی موجودگی میں سومیہ گویا ہر غم بھول گئی تھی۔ اسے یوں لگتا تھا کوئی صدمہ، کوئی غم، کسی بھی قسم کی بیماری اسے چھو کر نہیں گزری۔

وہ حسنہ کے ساتھ برابر کام کرواتی تھی۔ باورچی خانے کا کام بھی وہ مل جل کر کرتی تھیں۔ کبھی وہ حسنہ کے ساتھ مشین لگواتی۔ کبھی دونوں مل کر گندم صاف کرتیں۔ کبھی صفائی ستھرائی میں مصروف رہتیں۔ کبھی دودھ لینے والی عورتوں اور لڑکیوں کی محفل میں بیٹھ کر چہکنے لگتیں۔

سومیہ کو اپنی پہلے والی زندگی خواب لگتی تھی۔ سست، بیزار اور روکھی پھیکی زندگی۔

اب نہ تو اسے نیند کے جھونکے ستاتے تھے۔ نہ سر درد تڑپاتا تھا۔ نہ بلاوجہ سانس اکھڑنے لگتا۔ نہ دماغ ہمیشہ کی طرح سویا سویا رہتا۔ بیزاری اور سستی بھی اڑن چھو ہو گئی تھی۔ وہ سارے کام جھٹ پٹ کرلیتی تھی۔

پھر رات کو جمال کے آنے سے پہلے خود کو سنوارتی۔ اماں بھی اسے ہر وقت دلہن بنا ہی دیکھنا چاہتی تھیں۔ حسنہ کی بھی یہی خواہش ہوتی۔

تین دن ہو چکے تھے مگر پھوپھو نے دوبارہ کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ حالانکہ وہ تو اسے جلد واپس لانا چاہتی تھیں وہ بھی ہمیشہ کے لیے۔ سومیہ کو بے چینی تھی کہ پھوپھو کو جمال کے بارے میں سب کچھ بتا دے۔ یہ کہ پھوپھو کو کسی دشمن نے غلط بیانی کرکے جمال سے بدگمان کرنا چاہا تھا۔ ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ سومیہ اللہ کا شکر ادا کرتے نہیں تھکتی تھی کہ وہ کوئی غلط قدم نہیں اٹھا سکی اور نہ ہی جمال نے جذبات میں کوئی انتہائی فیصلہ کرلیا تھا ورنہ نجانے اس کا کیا بنتا۔

ادھر کے رواج کے مطابق دلہن کے میکے والے ولیمہ والے روز نہیں آتے تھے۔ یعنی ولیمہ میں شرکت نہیں کرتے تھے۔ مگر پھوپھو تو ولیمہ کے بعد بھی نہیں آئی تھیں۔ زنیرا باجی اور سمیرا باجی نے بھی رابطہ

نہیں کیا تھا۔ سومیہ روزانہ ہی جمال کے موبائل سے گھر کا نمبر ٹرائی کرنے کی کوشش میں ہلکان ہوتی رہتی مگر کوئی فون نہیں اٹھاتا تھا۔ کئی مرتبہ اس نے سہیل بھائی کے نمبر پر بھی کال کی تھی مگر ان کا نمبر بھی بند تھا۔

سومیہ کی پریشانی فطری تھی۔ تاہم اپنی جھجک کی وجہ سے وہ میکے جانے کے لیے جمال سے نہیں کہہ سکی تھی اور ویسے بھی جمال سیزن کی وجہ سے بہت مصروف تھا۔ رات کو بھی لالی اور جمال دونوں بہت دیر سے آتے تھے آج بھی ایسے ہی ہوا۔ ادھر بیل ہوئی ادھر سومیہ نے لپک کر گیٹ تک جانا چاہا۔

"سومیہ جی! تم رہنے دو۔ میں دروازہ کھولتی ہوں۔" تھانیدارنی اپنے جلالی موڈ میں گیٹ تک گئی تھی۔

"سومیہ کی وجہ سے صرف جمال بھائی کو اندر آنے کی اجازت ہے۔ تم چلتے پھرتے نظر آؤ۔ یہ کوئی طریقہ ہے آدھی رات کو گھر چلے آنا۔ وہ بھی منہ اٹھا کر۔"

"تو کیا ماسٹر کو منڈی میں ہی چھوڑ آتے۔" لالی [illegible] کیونکہ [illegible] پابندی لگ رہی تھی۔ "کاش میری بھی شادی ہوئی ہوتی۔" لالی نے ٹھنڈی آہ بھری۔ پھر وہ جمال کے شانے سے چپکا۔

"پہلے ہی سردی بہت ہے۔ ٹھنڈی آہیں مت بھرو۔ مجھے برف کا بلاک نہیں بننا۔" جمال نے اسے پرے دھکیلا۔

"یہی میری عزت ہے۔ شادی کرواتے ہی آنکھیں بدل لیں۔ مت بھولو اگر میں نہ ہوتا تو سومیہ جی تمہیں کبھی نہیں ملتیں۔"

"سومیہ کو اللہ نے میرے نصیب میں لکھا تھا۔ کسی نہ کسی موڑ پر اس نے ٹکرا ہی جانا تھا۔" جمال نے لالی کو بری طرح چڑایا۔

"لوگ بھی بلا کے بے مروت ہوتے ہیں۔" لالی نے دہائی دی۔ "سب اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہیں میرے خالی پیٹ کا کسی کو خیال یا احساس۔"

"روٹی پکا چکی ہوں۔ کیوں ندیدے بنتے ہو۔" حسنہ نے ناک چڑھائی۔

"میں 'روٹی' کی بات نہیں کر رہا مسٹی عقل والی۔" لالی نے اپنا سر پیٹا۔

"کیوں مرے جا رہے ہو۔ پہلے نوکری تو لگ جانے دو۔" جمال اس کی بات کے پس منظر سے واقف تھا۔

"اماں خود بھی یہی چاہتی ہیں مگر۔" جمال نے لالی کے کان میں سرگوشی کی۔

"تم سچ کہہ رہے ہو جمال بھائی!" لالی کو گویا ہفت اقلیم کی دولت مل گئی تھی۔ "یہ آٹے کی بوری ہمیشہ کے لیے میری ہو جائے گی۔" وہ ایکدم چہکا تھا۔

"گوبر کھا کر آئے ہو۔" حسنہ کچن سے کفگیر ہاتھ میں پکڑے برآمد ہوئی۔

"خود نہیں کھائے آپ کے لیے لایا ہوں۔" لالی نے جگمگاتی آنکھوں سے حسنہ کی طرف دیکھا تھا۔ وہ اس کی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے کچن میں غروب ہو گئی تھی۔

"توبہ کتنا بے غیرت ہے۔ جمال بھائی کے سامنے گھور گھور کر دیکھتا ہے۔" حسنہ نے بری طرح دھڑکتے دل سے سوچا۔ [illegible]

"تم اماں کے پاس جاؤ گی؟" کھانے کے بعد سومیہ جمال کو دودھ دے کر واپس جانے لگی تو اس نے سومیہ کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔

"اماں کے پاس جارہی ہوں۔" سومیہ نے ہنستے ہوئے جتایا تھا کیونکہ جمال کے منہ کے زاویے بگڑنے لگے تھے۔ اماں کا نام سن کر چپ سادھ گیا۔

"جلدی آنا۔ پھر مجھے سونا بھی ہے۔" دو تین مرتبہ تاکید کی گئی تھی۔

"مگر آج تو میں اماں کے کمرے میں سوؤں گی۔" سومیہ شرارتاً بولی۔

"کیوں؟" وہ چیخ پڑا تھا۔ "اماں کے پاس حسنہ سو جائے گی۔"

"مگر کب تک۔ وہ لالی بہت اتاؤلا ہو رہا ہے۔" لگے ہاتھوں سومیہ نے بے چین لالی کا پیغام ایک دفعہ پھر جمال تک پہنچا دیا۔

"لالی میرے ہاتھوں ضائع ہو جائے گا۔" جمال بھی

فیس بڑھا۔ اس نے بھی کہہ دیا تھا کہ جب تک نوکری نہیں لگتی۔ شادی تو کیا منگنی بھی نہیں ہونے دے گا۔"
حالانکہ اماں بہت بے چین تھیں حسنہ اور لالی کی شادی کے سلسلے میں۔

"میں ابھی آتی ہوں سوئیے گا مت۔" سومیہ ہنستے ہوئے باہر نکل گئی تھی۔ اماں اپنے کمرے میں تنہا تھیں۔ حسنہ دوسرے کمرے میں ٹی وی دیکھ رہی تھی۔

وہ اماں کا سر دباتے ہوئے چھوٹی چھوٹی باتیں کرنے لگی تھی۔ جب اچانک اماں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں لے کر چوم لیا۔

"تم ہو بہو ثمانہ جیسی ہو۔ ویسی ہی عادتیں اسی کے جیسا مزاج۔ ویسی مسکراہٹ۔ بولنے کا انداز بھی وہی۔ یوں لگتا ہے میری آنکھوں کے سامنے ثمانہ چلتی پھرتی ہے۔"

"اچھا۔" سومیہ پھیکے سے انداز میں مسکرا دی۔ اماں کے سر پر اس کے نرم ہاتھوں کی گرفت بھی ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ "تم کہاں چلی گئی تھیں۔ سومیہ میں نے تمہارا بہت انتظار کیا 'چھوٹا' ثمانہ نے وعدہ جو کیا تھا۔" اماں کہہ رہی تھیں۔ ان کی نظریں اس کے چہرے پر تھیں۔

"حسن ثمانہ کی سادگی پر مرمٹا تھا۔ تمہارے جیسا ہی بھولا بھالا سا چہرہ تھا اس کا۔ سادہ سی آنکھیں 'تیزی طراری' تو اسے چھو کر نہیں گزری تھی۔" اماں شاید ماضی کے دریچے میں جھانکنے لگی تھیں۔

"حسن اپنے کسی دوست کے ساتھ ہمارے گھر آیا تھا۔ تمہارے نانا کے گھر' ان کی گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ اور طوفانی بارش میں انہیں رات کے لیے پناہ چاہیے تھی۔ ابا جی اللہ بخشے بڑے رحم دل انسان تھے۔ مہمان نوازی میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ وہ حسن کو اور اس کے دوست اختر کو گھر لے آئے تھے۔ بس حسن نے ثمانہ کو دیکھا اور گھر کی دہلیز پکڑلی۔ ابا جی سے ہاں کروا کر ہی دم لیا تھا اس نے۔ پھر شادی ہو گئی' ثمانہ شہر چلی گئی۔ حسن نے اسے بہت چاہا' بے پناہ محبت دی۔"

"اور انہوں نے ابو کے ساتھ کیا کیا؟" سومیہ کے لبوں سے اک دہکتا لاوا برآمد ہوا۔ اماں بری طرح ٹھٹک کر سومیہ کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔ جو شدت غم و غصے سے لرز رہی تھی۔

"کیا کیا تھا؟" اماں نے حیرانی سے پوچھا۔

"آپ کو علم نہیں یا پھر؟" سومیہ ان سے بھی زیادہ حیران ہوئی۔

"کس بات کا علم نہیں۔" اماں نے حیرت پر قابو پا کر سومیہ کے پل بھر میں زرد ہوتے چہرے کی طرف دیکھا۔

"یہی کہ امی ابو کے کسی دوست کے ساتھ بھاگ گئی تھیں۔" سومیہ نے گویا اپنے ہی پرخچے اڑا دیے تھے۔ کتنا اذیت ناک تھا اس موضوع پر گفتگو کرنا۔

"تمہیں کس نے بتایا ہے؟" وہ حق دق رہ گئی تھیں۔ انہیں کھانسی کا طویل دورہ پڑ گیا۔ سومیہ ان کی کمر سہلانے لگی۔ پانی پلایا۔ انہوں نے تھوڑی چینی پھانکی تب ان کی طبیعت کچھ سنبھلی۔ "مجھے پھوپھو نے بتایا تھا۔ ان سب لوگوں نے بتایا تھا جو اس حقیقت سے واقف تھے۔" سومیہ سر جھکائے آنسو پیتے ہوئے بتا رہی تھی۔

"پھوپھو کون؟ شبانہ بیگم۔" اماں پوچھ رہی تھیں۔

"شبانہ بیگم وہ ہی ہیں نا' جو تمہیں گھر کے پچھواڑے سے اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ بقول ان کے گھریلو ملازمہ تمہیں لے کر فرار ہو گئی تھی۔ پھر اس نے تمہیں گھر کے پچھواڑے پھینک دیا۔ شبانہ خاتون کی نظر پڑی اور وہ بلکتی ہوئی چھ ماہ کی بچی کو اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئیں۔"

"کیا مطلب؟ یہ آپ سے کس نے کہا۔" سومیہ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

"مجھ سے تو نہیں البتہ حسنہ اور ہوا سے شبانہ نے یہ بات کہی تھی اور پھر لالی کو بھی انہوں نے یہ ہی بتایا تھا۔" اماں کو جو کچھ معلوم تھا انہوں نے کہہ دیا۔

"مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔" سومیہ دنگ رہ گئی۔ "شبانہ پھوپھو میری سگی پھوپھو ہیں۔ ابو کی سگی بہن ہیں۔"

"حسن کی تو کوئی بہن تھی ہی نہیں۔ وہ اکلوتا تھا۔ مجھے سب یاد ہے۔ اس کے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ شادی میں بھی اس کے چند ایک دوستوں نے شرکت کی تھی۔" اماں نے اس کے کپکپاتے ہاتھ تھام کر جو اس انکشاف پر زرد پڑ گئی تھی۔ "تو کیا شبانہ پھوپھو سب جھوٹ۔"

"ابو کی وفات کے بعد آپ کی امی سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ آپ کو نہیں خبر کہ امی کہاں ہیں؟"

"ملاقات بھلا کیسے ہوتی۔" اماں کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ "اور وہ اس وقت جہاں ہے مجھے کیوں نہیں معلوم ہو گا۔"

"امی کہاں ہیں ممانی؟" سومیہ کے لبوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر لفظ ادا ہوئے۔

"اپنے آبائی قبرستان میں 'اپنے شوہر کے پہلو میں۔" اماں کے الفاظ نے سومیہ کو سرتاپا جھنجوڑ دیا تھا۔

"یعنی امی تو کیا میری امی اس دنیا میں نہیں ہیں۔"

"حسن اور ثمانہ دونوں ایک ساتھ ٹریفک حادثے میں جاں بحق ہوئے تھے پھر ایک ساتھ جنازے اٹھے تھے ان کے۔ تم سے جس نے بھی کہا' جھوٹ کہا۔ ارے ثمانہ کی پیری ہوتی جیسا بھی کوئی نہیں۔" اماں آنسو پونچھتے ہوئے کہہ رہی تھیں جبکہ سومیہ کے ضبط کے سارے ٹانکے ادھڑ گئے۔

"میری مری ماں پر بہتان لگائے جاتے رہے۔ گندگی اچھالی جاتی رہی اور میں خاموش رہی۔ کسی کا منہ بھی نہیں توڑ سکی۔ کسی کو بتا ہی نہیں سکی۔" وہ تڑپ تڑپ کر رو دی۔

"شبانہ بہن سے کسی نے غلط بیانی کی ہو گی۔" اماں اسے ساتھ لگائے خود بھی رو رہی تھیں۔

"سومیہ کو گھریلو ملازمہ نے گھر کے پچھواڑے میں پھینک دیا تھا۔ اور راہ چلتی یہ عورت ترس کھا کر اسے گھر لے گئی۔ جس کی چار بیٹیاں تھیں۔ بے روزگار شوہر تھا۔ مکان کرائے کا تھا اور بھوک اور افلاس نے جس کی مت مار رکھی تھی۔" دروازہ دھاڑ سے کھل گیا تھا۔ پہلے جمال اندر داخل ہوا تھا۔ اس کے پیچھے لالی اور حسنہ تھے۔ جمال کہہ رہا تھا۔

"یہ عورت بہت بڑی اداکارہ ہے۔ دھوکے باز اور فریبی ہے۔ تحقیق اور تفتیش نے جو کچھ ثابت کیا ہے آپ کو بھی بتاتے ہیں۔ سومیہ کی سرے سے کوئی پھوپھی نہیں۔ ایک بات تو واضح ہو گئی۔ مزید وضاحت بھی کرتا ہوں۔ مگر پلیز سومیہ اپنے آپ کو سنبھالو۔ صبر سے کام لو۔ ہمت پکڑو۔ تمہیں شبانہ بیگم کے گریبان تک پہنچنا ہے۔"

جمال نرمی سے اس کا سر تھپتھپا رہا تھا۔ پھر اس نے کہنا شروع کیا۔

"جو کچھ مجھ تک پہنچا ہے اس سب کا کریڈٹ لالی کو جاتا ہے۔ بقول لالی کے وہ سومیہ سے پہلی ملاقات کے بعد ہی ٹھٹک گیا تھا۔ پھر اس نے اپنی تفتیش کے دائرے کو وسیع کیا۔ اس نے مختلف ذرائع سے معلومات اکٹھی کرنا شروع کیں۔ جس جس محلے میں شبانہ بیگم فیملی سمیت رہ کر آئی تھیں وہاں تک گیا۔ لوگوں سے ملا' خواتین سے رائے لی' سومیہ کے بارے میں پوچھتا رہا اور پھر شبانہ بیگم کے سارے کچے چٹھے کو کھول کر لوگوں کو ان کی اصلیت بتاتا رہا۔ شبانہ بیگم کون ہے؟ ٹھہریے' ابھی وضاحت کرتا ہوں۔"

جمال' سومیہ کے قریب بیٹھ گیا تھا۔ کمرے میں بلا کا سکوت تھا۔ حسنہ بھی ساکت تھی جبکہ لالی مطمئن۔

☆ ☆ ☆

حسن مراد کے برابر میں مکان کرائے پر لیتے ہوئے اختر نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ بہت جلد اس کے وارے نیارے ہونے والے ہیں۔

اختر' شبانہ کا میاں حسن کا ہم راز دوست تھا۔ بلکہ اپنی چرب زبانی اور ہوشیاری کے باعث حسن جیسے بے

ضرور بندے کو باتوں میں الجھا کر اور اپنی غربت کی داستان سنا کر پیسے بٹور لیا کرتا تھا۔ حسن نے ہی اپنے اس دوست کو برابر والا مکان کرائے پر لے کر دیا تھا۔ اختر اپنے بیوی بچوں کو بھی لے آیا۔ حالانکہ شبانہ کا خیال تھا حسن اور ثمانہ انہیں اپنے گھر کا اوپر والا حصہ رہنے کے لیے دے دیں گے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو کرائے کے جھنجٹ سے بھی بچ جاتیں۔ مگر ایسا کچھ ہوتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اوپر سے حسن جس طرح معمولی سی صورت والی ثمانہ پر فدا تھا۔ شبانہ جل جل کر کوئلہ ہوتی۔ اسے ثمانہ کے نصیب پر رشک آتا۔ ایک وہ خود بھی اچھی خاصی خوش شکل تھی مگر غربت کی چکی میں پستے پستے اس کی خوب صورتی ماند پڑ گئی تھی۔

ہوا کچھ یوں ایک صبح ثمانہ تیار ہو کر شبانہ کی طرف آئی۔ وہ اپنے میکے جا رہی تھی۔ کھڑے کھڑے اس نے شبانہ سے کہا۔

"بھابھی! سوی کو گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ طبیعت ٹھیک نہیں اس کی۔ سفر میں اور زیادہ بیمار ہو جاتی ہے۔ اماں بہت بیمار ہیں۔ ان کو ایک نظر دیکھنے جا رہی ہوں۔ جلد لوٹ آؤں گی۔ ویسے تو آیا ہے بھروسے والی عورت ہے لیکن آپ بھی خیال رکھیے گا۔" ثمانہ اور حسن دونوں چلے گئے تھے۔ شبانہ حسد سے ثمانہ کو دیکھتی رہی اور سوچتی رہی۔

دوپہر تک اسے خیال ہی نہیں آیا تھا کہ بچی کو اک نظر دیکھ آئے۔ پھر سوچا ثمانہ شاید آ کر آیا کے بتانے پر ناراض ہو کہ اس کے کہنے کے باوجود شبانہ بچی کو دیکھنے نہیں گئی۔ اسی غرض سے وہ گھر سے نکلنے والی تھی جب اختر افتاں و خیزاں گھر میں داخل ہوا۔

"شبانہ! سنو بات سن۔"

"ہوا کیا ہے؟" شبانہ نے بے زاری سے پوچھا۔

"وہ حسن اور ثمانہ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ دونوں موقع پر ختم ہو گئے ہیں۔" اختر نے پھولی سانسوں سمیت بتایا۔ "حسن کی دکان پر ابھی ابھی اطلاع آئی ہے۔ نماز جنازہ گاؤں میں ہی ادا ہو گی۔ تم بھی تیاری کرو، چلتے ہیں۔"

"چلتے کہاں ہیں، بے عقل! میری بات سن۔" شبانہ کے شاطر دماغ نے منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ سب سے پہلے آیا کو چند سو دے کر اس کا منہ بند کیا اور بچی کو گھر پر بڑی بچی کے پاس چھوڑا۔ پھر سارے گھر کا قیمتی سامان ٹرک پر لوڈ کروا لیا۔ لاکر توڑ کر قیمتی زیورات نکالے، روپیہ پیسہ اکٹھا کیا اور سومیہ کو لے کر کسی اور محلے میں چلے گئے۔ اتنا تو شبانہ کو علم ہی تھا کہ حسن کے آگے پیچھے کوئی نہیں، تاہم ثمانہ کا ایک نشئی بھائی ضرور تھا مگر اس سے بھلا انہیں کیا خوف محسوس ہو سکتا تھا۔ سو وہ اطمینان سے حسن کی چلتی دکان "آنا فانا" مہنگے داموں بیچ کر روپیہ بینک میں رکھوا چکے تھے۔ مکان کو ویسے بھی انہوں نے تالا لگوا دیا تھا۔ سننے میں آیا تھا ثمانہ کی بھابھی دو تین مرتبہ سومیہ کا پتا کرنے آئی ہے۔ مگر مکان کی طرف اس نے بھی دھیان نہیں دیا تھا۔ حالانکہ وہ لوگ با آسانی قبضہ کر سکتے تھے۔

کچھ عرصہ مزید گزر گیا۔ اختر کو اپنی دکان میں گھاٹا پڑا اور موٹر سائیکل سے گرنے کی وجہ سے اس کے دماغ پر چوٹ آئی اور وہ [illegible] ہو گیا۔ اس صورت حال میں بھی شبانہ قطعاً نہیں گھبرائی تھی۔ سوچ بچار کے بعد اس نے دکان بیچی اور سرمایہ محفوظ کر لیا۔ بینک میں کافی رقم موجود تھی کہ حسن کی کپڑے کی دکان سے خوب منافع آ رہا تھا اور وہ مہنگے داموں فروخت ہوئی تھی۔ ثمانہ کے زیورات بھی کافی بھاری تھے، سو وقت بہت اچھے طریقے سے گزرنے لگا۔ کچھ سالوں بعد حسن کا مکان اس نے کرائے پر دے دیا تھا۔ ماہانہ کرایہ بھی ملنے لگا تھا۔ سو وہ بچوں کو پڑھانے اور اچھی تعلیم دلانے کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

سومیہ نے لڑکپن کی حدود کو چھوڑا تو شبانہ نے اپنا اگلا منصوبہ تیار کر لیا۔ وہ اسے احساس کمتری کا شکار کر کے رکھنا چاہتی تھی کہ کبھی وہ شبانہ کے سامنے سر اٹھا کر نہ کھڑی ہو جائے۔ سومیہ کو معمولی سی ڈسٹ الرجی کی تکلیف تھی جسے اس نے بڑھا چڑھا کر مشہور کرنا شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ محلے میں ثمانہ کے متعلق جھوٹی افواہیں پھیلانا شروع کر دیں۔ اسے نیند کی

گولیوں کا عادی بنا دیا۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی ہر صلاحیت کو مفلوج کرنا چاہا تھا۔ سومیہ لوگوں کے رویوں سے خوف زدہ ہو کر تعلیم ادھوری چھوڑ چکی تھی۔ شبانہ کی ایک اور خواہش پایہ تکمیل تک پہنچی۔

اپنی بیٹیوں کو وہ بیاہ چکی تھی۔ بیٹے کا مستقبل بھی محفوظ کر لیا تھا۔ اب وہ سومیہ کے لیے رشتے کی تلاش میں تھی۔ وہ بھی دنیا دکھاوے کے لیے۔ وہ فی الحال سومیہ کی شادی نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے ہر مسلمان عورت کے سامنے ثمانہ کا قصہ لے کر بیٹھ جاتی۔ یہ معاملہ اسی طرح جاری و ساری تھا مگر پھر شبانہ کے بیٹے نے اسے اپنی شادی کی اطلاع دی۔ سو وہ دبئی میں تھا، وہاں اس کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ ایک بندہ مارا گیا۔ اسے رقم چاہیے تھی۔ سومیہ کو باتوں میں الجھا کر اس نے مکان کے کاغذات پر سائن کروا لیے تھے۔ اب اسے سومیہ کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ اسی لیے آنے والے پہلے رشتے کو اس نے منظور کیا تھا۔ مگر یہیں سے اس کی بدبختی کا آغاز ہو گیا۔ سومیہ اس کی ہزار کوششوں کے باوجود اپنوں میں چلی گئی۔ شبانہ کو لگتا تھا اس کا کوئی راز کھل جائے گا۔ وہ جان جائے گی کہ اس کی ماں کسی کے ساتھ بھاگی نہیں تھی بلکہ ایک حادثے میں وفات پا گئی ہے۔ سو وہ سومیہ کو رخصت کرنے کے "فوراً" بعد ہی سامان سمیٹ کر اس گھر سے نکلنے کی تیاریوں میں لگ گئی۔ اس لیے کہ مکان تو اس نے خالی کرنا ہی تھا کیونکہ وہ جتنے پہلے اس نے مکان کو فروخت کر دیا تھا۔ اب اس نے دبئی جانا تھا۔ تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ ویزے اور پاسپورٹ وغیرہ کے ابتدائی کام بھی ہو گئے تھے۔



لالی کی نوکری کیا لگی، اماں نے پورے گاؤں میں مٹھائی تقسیم کی تھی۔ مبارک باد دینے والی عورتوں کی لائن لگ گئی تھی۔ حسنہ کے قدم زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ لالی علاقے کا تحصیل دار بن گیا تھا۔ حسنہ ہم جولیوں کے درمیان بیٹھی خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ آج اسے کسی بات پر غصہ نہیں آ رہا تھا بلکہ مسکراہٹ کے شگوفے پھوٹ رہے تھے۔ لالی نے حسنہ کو ہنستے دیکھ کر دل تھام لیا۔

"تمہارے وارثی جی! مت اتنا مسکرائیں۔ یہ نہ ہو مجھے شادی سے پہلے ہی ہارٹ اٹیک ہو جائے۔"

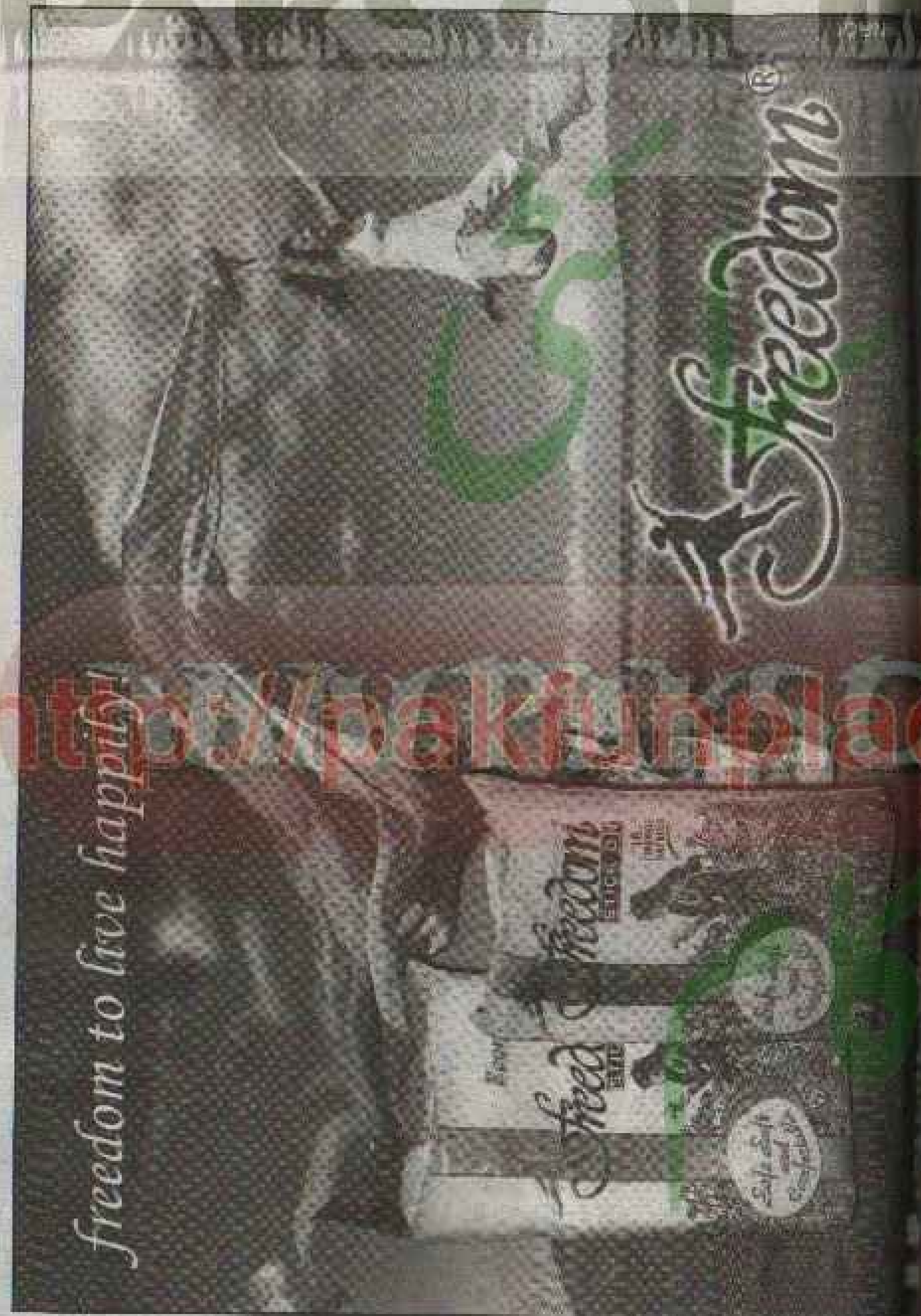
"تمہارے وارثی نہیں تحصیل دار لکھو۔ اب حسنہ کی حیثیت بدل گئی ہے۔" سومیہ مسکراتے ہوئے کمرے سے برآمد ہوئی تھی۔

"یہ تو آپ نے سچ کہا۔" لالی نے پہلی مرتبہ حسنہ کو چڑانے کے بجائے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

حسنہ اور سومیہ دونوں ہی بے اختیار ہنس پڑی تھیں۔ گاؤں کی عورتیں ابھی تک آ جا رہی تھیں۔ سارا دن مصروفیت میں گزرا تھا۔ اب فراغت کے بعد سومیہ اپنے کمرے کے دریچے میں کھڑی تھی۔ وہ اپنے بچپن اور لڑکپن کو سوچ رہی تھی۔ اس کی زندگی کس طرح ایک عذاب مسلسل میں گزری تھی کہ کوئی اسے اس کی ماں کے حوالے سے طعنہ نہ دے۔ اذیت سے دوچار نہ کرے۔ اپنی زندگی کے کتنے ہی ماہ و سال اس نے اسی خوف کی نذر کر دیے تھے۔ اس کے ساتھ اتنا کچھ ہوا اور وہ صبر سے جھیلتی رہی تھی۔ وہ ایک مرتبہ شبانہ سے ضرور ملنا چاہتی تھی۔ اس کا گریبان پکڑ کر جھنجوڑنا چاہتی تھی۔

اسے یقین نہیں آتا تھا کہ جس عورت کو وہ فرشتہ سمجھ کر پوجتی رہی ہے وہ اس قدر لالچی، خود غرض اور اس قدر ڈھونگی ہو گی۔

"میری ماں کی پاکیزگی پر کیچڑ اچھالنے والی، خدا کبھی تمہارا بھلا نہ کرے۔" اس کے دکھے دل سے ایک ہی بددعا نکلتی تھی۔ پھر ایک دن اس نے جمال سے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔ جمال اسے حسن منزل لے آیا تھا۔ مکان کو اب تالا نہیں لگا تھا، بلکہ مکان کے نئے مالک اسے آباد کر چکے تھے۔ سومیہ تو محض اپنے باپ کے آشیانے کو اک نظر دیکھنے کے لیے آئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ شبانہ اس گھر میں کہاں ہو گی۔ سنسان، مانوس دیواروں کو دیکھنے کے بعد سومیہ، جمال کی ہمراہی



کی پلٹ آئی تھی۔ جانے سے پہلے اس نے آخری مرتبہ پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔ اس کے دل سے اک ہوک اٹھی تھی۔

"اے اس گھر کے نئے مکینو! اللہ کرے یہ جگہ تم لوگوں کو راس آ جائے۔ تم یہاں سے خوشیاں ہی سمیٹو، غم تم لوگوں کو چھو کے نہ گزریں۔ میں تمہیں ایک بات بتاؤں، یہ گھر میرے ماں، باپ اور مجھے راس نہیں آیا تھا، مگر میری دعا ہے کہ تمہارا آشیانہ سدا سلامت رہے۔"

"سومی! اب گھر چلنا ہے۔" جمال پوچھ رہا تھا۔

"نہیں۔ اس پتے پر لے چلیں۔" وہ زنیرا باجی کے گھر جانا چاہتی تھی۔ جمال نے اس کی خواہش کا احترام کیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ زنیرا باجی کے سامنے کھڑی تھی۔ باجی بھی حیران اور ششدر تھیں۔ وہ اس کا سامنا کرنے کا حوصلہ کہاں رکھتی تھیں بھلا۔

"سومی! تم۔"

"کیا میں یہاں نہیں آ سکتی؟" سومیہ کے لہجے میں عجیب سی کاٹ تھی۔ زنیرا باجی پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

"کچھ مت کہنا سومی۔ اللہ کا واسطہ ہے کچھ مت کہنا۔" انہوں نے سومیہ کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

"میں کچھ کہنے ہی تو آئی ہوں۔ اگر آپ سننا نہیں چاہتیں تو آپ کی مرضی مگر میں۔"

"نہیں سومی! تمہیں کچھ کہنے کی، بتانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں تو کیا ہم سب جان چکے ہیں۔ حقیقت کیا تھی۔ سچائی کیا تھی؟ تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں بتاتی ہوں برائی کا پھل کیا ہوتا ہے۔ کسی کے لیے گڑھا کھودیں تو خود ہی گرنا بھی پڑتا ہے۔ برا اگر برائی کے انجام کو جان جائے تو وہ برائی کرے ہی کیوں؟ تمہارے ساتھ برا کرنے والے انجام پذیر ہوئے۔" باجی نے آنسو پونچھ کر سومیہ کے سپاٹ چہرے کی طرف دیکھا۔

"امی نے مکان بیچا تو ہم دونوں بہنیں حیران ہو گئیں۔ یہ مکان تو حسن ماموں کا تھا۔ کل تک ہم بھی حسن مراد کو اپنا سگا ماموں ہی سمجھتی تھیں مگر امی نے کچھ بھی بتانا گوارا نہیں کیا۔ جمعہ کو ان کی فلائٹ تھی اور ابھی شب ہی سے ندیم کے مرنے کی اطلاع آ گئی۔ ہمارا اکلوتا جوان بھائی پردیس میں مر گیا۔ ہم اس کا چہرہ بھی نہ دیکھ سکے۔ امی تو صدمے سے دیوانی ہو گئیں۔ ندیم کی آخری رسومات ادا کر لیں۔ امی میرے گھر میں موجود تھیں۔ ایک دن امی نے مجھے بتایا کہ وہ مکان کو بیچ کر سارا پیسہ ندیم کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر چکی تھیں جو کہ اب اس کی بیوہ ہتھیا چکی تھی۔ پھر امی نے اپنے سارے گناہ خود ہی تسلیم بھی کر لیے۔ امی نے بتایا انہیں ان کے اعمال کی سزا ملی ہے۔ وہ سارا دن جائے نماز پر بیٹھی روتی رہتیں۔ کئی مرتبہ میں نے کہا کہ ہم آپ کو سومیہ کے پاس لے چلتے ہیں۔ آپ اس سے معافی مانگیں۔ آپ کا دل پرسکون ہو جائے گا۔ مگر یہ انہیں گوارا نہیں تھا۔ وہ تمہارا سامنا نہیں کر سکتی تھیں۔"

کچھ دن مزید گزرے تو سہیل کی امی ہمارے پاس رہنے کے لیے آ گئیں۔ انہیں امی کا وجود کھٹکنے لگا تھا۔ ایک دن امی خود ہی روز روز کی بے عزتی سے بچنے کے [illegible] گھر سے نکل گئیں۔ سمیرا کی طرف [illegible] تو وہ بھی رکھنے سے انکاری ہو گئی۔ اس کے سسرال کا معاملہ تھا۔ اب امی اندرون شہر کے ایک محلے میں کسی کے گھر نوکرانی کی حیثیت سے رہ رہی ہیں۔ لوگوں کے برتن دھوتی ہیں۔ نہ ان کے پاس ہنر تھا، نہ تعلیم اور اب پیسہ بھی نہیں رہا تھا۔ ایک شاطر دماغ تھا جو آخر کب تک ساتھ دیتا۔ ہم اس سارے قصے میں انجان تھیں۔ ہمیں معاف کر دینا سومیہ! ہمیں بددعاؤں سے بہت خوف آتا ہے۔"

زنیرا باجی خاموش ہو گئی تھیں۔ سومیہ بغیر کچھ کہے اٹھ گئی۔ اس کا چہرہ اب بھی سپاٹ تھا۔ اس کی خاموشی نے زنیرا کو باور کروا دیا تھا کہ وہ اپنے دل کے زخم اور گھاؤ نہیں بھول سکتی۔ سومیہ نے کہا تو صرف اتنا۔

"اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔"

وہ دہلیز عبور کر کے باہر نکل آئی تھی کہ جمال اس کے انتظار میں باہر کھڑا تھا۔ سومیہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو گئی۔

☆☆

نفیسہ سعید

اِک مالا جو ٹوٹ گیا

لکڑی کا گیٹ چرچر کی آواز کے ساتھ کھلتا گیا وہ نہایت خاموشی سے اندر داخل ہو گئی قبرستان میں گھپ اجالا پھیلا [illegible] ا تھا لیکن چاروں طرف ایک ہو کا عالم طاری تھا جھینگروں کے بولنے کی آوازنے ماحول کو کچھ اور ہیبت ناک بنا دیا تھا قریب ہی مسجد سے فجر کی اذان کی آواز سنائی دے رہی تھی ایک ایسی آواز جو انسان کو بھلائی کی جانب بلا رہی تھی۔

آؤ بھلائی کی طرف

افسانہ

اس نے خاموشی سے اپنا جوتا اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیا اور اپنی چادر کو اچھی طرح سر پر اوڑھ کر نہایت احتیاط سے قبروں کے درمیان جگہ بناتی ہوئی آگے کی جانب بڑھتی چلی گئی کچھ ہی دیر میں وہ اپنی مطلوبہ قبر تک پہنچ چکی تھی یہ ایک سفید سنگ مرمر کی قبر تھی اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی پانی کی بوتل اور پھولوں کا بھرا تھیلا قبر کے قریب ہی زمین پر رکھا اور نہایت ہی عقیدت و احترام سے کتبے پر لکھا ہوا نام زیر لب پڑھا اور اس کی نیلی آنکھیں فوراً ہی پانی سے [illegible] بھر گئیں [illegible] اس نے اپنے [illegible] سے ایک [illegible] کپڑا نکال [illegible] سے ساری قبر کو اچھی طرح صاف کیا جو اس کا روز کا معمول تھا پھر کل کے سوکھے ہوئے پھول سمیٹے اور ان کی جگہ تازہ گلاب کی پتیوں سے قبر کو ڈھک دیا بوتل کا سارا پانی بھی اس نے قبر کے درمیان میں چھڑک دیا اس سارے عمل کے دوران وہ مسلسل زیر لب قرآنی آیات کا ورد کرتی رہی اور پھر تمام عمل سے فارغ ہو کر قبر کے پاؤں کی جانب بیٹھ کر گھٹی گھٹی آواز میں رونے لگی۔

"ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا میں نے تمہیں دھوکہ دیا تمہارے اعتماد کا خون کیا میں تمہاری گناہ گار ہوں۔"

دھیمی سی آواز میں کیا جانے والا اعتراف جرم جو صرف وہی سن سکتی تھی یا اس کا اللہ جو دلوں کے حال بغیر کہے ہی جانتا ہے کم از کم اس قبر میں موجود شخص کو اس کے اعتراف جرم سے کوئی نفع یا نقصان پہنچنے والا



نہ تھا کیونکہ وہ اعتماد ہی تو تھا جس کے ہاتھوں وہ زندگی جیسی خوبصورت اور قیمتی شے گنوا چکا تھا زندگی کی ہاری ہوئی بازی جو کسی کے اعتراف جرم سے واپس آنے والی نہ تھی جانے کتنی ہی دیر وہ اسی طرح زمین پر بیٹھی بے آواز روتی رہی پھر آہستہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی زمین پر رکھا اپنا ہینڈ بیگ اور جوتا اٹھایا اور خاموش آواز میں روتی ہوئی قبروں کے درمیان جگہ بناتی باہر کی جانب چل دی سامنے ہی ٹیکسی ڈرائیور ٹیکسی کی پشت سے ٹیک لگائے غالباً" اسی کا انتظار کر رہا تھا اسے آتے دیکھ کر اس نے جلدی سے پچھلی جانب کا دروازہ کھول دیا وہ نڈھال سی پچھلی سیٹ پر ڈھے گئی ڈرائیور نے جلدی سے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

وہ واپسی کے راستوں سے اچھی طرح واقف تھا کیونکہ پچھلے دو سالوں سے وہ یہ ذمہ داری سرانجام دے رہا تھا حالانکہ اتنے عرصے میں وہ یہ تک نہ جان سکا تھا کہ مرنے والے کا میڈم سے کیا رشتہ تھا لیکن اتنا ضرور جانتا تھا کہ یہ رشتہ اتنا قریبی ضرور ہے جس نے دو سالوں سے میڈم کو ہلکان کر رکھا تھا اور میڈم ساری دنیا سے چھپ کر منہ اندھیرے اس قبر پر اپنی محبت کا چراغ سا جلانے آتی ہے۔

☼ ☼ ☼

وہ آج بھی اسی مخصوص جگہ پر کھڑی تھی کالی چادر میں ڈھکی ہوئی اور نہ جانے کیوں ہمیشہ کی طرح اس کے قریب سے گزرتے ہوئے مرتضیٰ شاہ کی گاڑی کی رفتار خود بہ خود کم ہو گئی اس لڑکی میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور تھی جو مرتضیٰ جیسے بلند کردار کے حامل شخص کو تھوڑی دیر کے لیے سہی اس کی جانب متوجہ ضرور کرتی تھی بلاشبہ وہ ایک حسین ترین لڑکی تھی سرخ و سفید رنگ نیلی آنکھیں اور متناسب سراپا جو چادر میں سے بھی چھلکتا تھا لیکن مرتضیٰ کو متوجہ اس کے حسن نے نہ کیا تھا وہ ایک ذمہ دار پولیس آفیسر تھا پڑھا لکھا اور ایماندار پولیس کی اکثریت سے قدرے مختلف شخصیت کا حامل ایک ایسا پولیس افسر جو معاشرے میں پھیلی برائیوں کا سدباب کرنے کا عزم لے کر اس فیلڈ میں آیا تھا۔

نہ جانے کیوں شروع دن سے ہی وہ لڑکی مرتضیٰ کو کچھ پر اسرار سی لگی تھی اسے دیکھ کر مرتضیٰ کو محسوس ہوتا کہ کوئی نہ کوئی ایسا اسرار ضرور ہے جو اس لڑکی میں پوشیدہ ہے اور آج کئی ماہ گزر جانے کے باوجود مرتضیٰ اس اسرار کو ڈھونڈ نہ پایا تھا لیکن ان چند ماہ میں اتنا فرق ضرور پڑا تھا کہ اب وہ لڑکی بھی مرتضیٰ کی خبر رکھنے لگی تھی مرتضیٰ جو کہ قریبی تھانے میں ہی تعینات تھا اور یہ وقت عام طور پر اس کے تھانے جانے کا ہوتا تھا کبھی جو اس کی شفٹ تبدیل ہوتی تو بھی وہ اکثر اوقات اس وقت تھانے ضرور آتا تھا اور پھر یہ اسٹاپ بھی اس کے راستے میں پڑتا تھا لیکن جانے وہ لڑکی کیا تھی جب بھی وہ اس کے پاس سے گزرتا ہوا اپنی گاڑی کی رفتار کم کرتا اس لڑکی کو بھی کن انکھیوں سے اپنی جانب ہی تکتا ہوا پاتا اچانک مرتضیٰ کا موبائل بجنے لگا۔

یس کا بٹن دباتے ہی مرتضیٰ نے گاڑی میں بجنے والے ڈیک کی آواز قدرے کم کر دی۔

"جی اماں السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام بیٹا کہاں ہو؟" رابعہ نے رابطہ ہوتے ہی بے قراری سے سوال کیا۔

"اماں صبح تو آپ کو بتایا تھا آج میری پیشی تھی کورٹ جانا تھا۔"

"مجھے تو بتایا تھا لیکن تمہارے بابا کو کون بتائے ان کی آج ڈاکٹر نسیم لطف سے اپائنٹمنٹ تھی اور تم جانتے ہو تمہارے بغیر وہ ہسپتال جانے والے نہیں ہیں۔"

مرتضیٰ نے ایک نظر باہر بھاگتے دوڑتے ٹریفک پر ڈالی اور دل ہی دل میں حساب لگایا وہ تقریباً" تیس منٹ تک گھر پہنچ سکتا تھا۔

"بابا سے کہیں تیار ہو جائیں میں آدھے گھنٹے تک پہنچ رہا ہوں۔"

مرتضیٰ نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے موبائل آف کر دیا۔

☼ ☼ ☼

مصطفیٰ صاحب کے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی سب سے بڑا زیاد پھر مرتضیٰ ہانیہ اور سعاد۔ زیاد اور ہانیہ شادی شدہ تھے جبکہ مرتضیٰ کا رشتہ اپنی کزن سے طے تھا اور سعاد ابھی تعلیم حاصل کر رہا تھا یوں تو مصطفیٰ صاحب کو اپنی تمام اولاد ہی بے حد عزیز تھی لیکن جو دلی لگاؤ اور الفت انہیں مرتضیٰ سے تھی وہ کسی اور کے حصے میں نہ آئی تھی یہی وجہ تھی کہ ان کے بڑے بیٹے زیاد اور اس کی بیوی ماہم کو ہمیشہ اپنے سسر سے یہ گلہ رہتا کہ وہ مرتضیٰ کی محبت میں انہیں بھلا دیتے ہیں لیکن یہ ایک قدرتی عمل تھا مصطفیٰ صاحب باوجود کوشش کے بھی زیاد کو اتنی اہمیت نہ دے پاتے جتنی وہ مرتضیٰ کو دیتے تھے اور نہ صرف مصطفیٰ صاحب بلکہ خاندان کا ہر فرد مرتضیٰ سے بے حد محبت کرتا تھا اور اس کی ایک وجہ مرتضیٰ کا اپنا اخلاق بھی تھا اس کا رویہ ہر ایک سے نہایت ہی پیار و محبت والا ہوتا اگر کسی کو آدھی رات کو بھی مرتضیٰ سے کام پڑتا تو اس نے کبھی منع نہ کیا تھا وہ ایک زندہ دل اور ہنس مکھ شخص ہونے کے علاوہ یاروں کا یار تھا لیکن یہ بھی ایک اٹل حقیقت تھی کہ اپنی نوکری کے حوالے سے وہ ایک حساس شخص تھا دوسرے لفظوں میں اسے ایک سخت گیر پولیس آفیسر کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔

اس نے اپنے عہدے سے کبھی ناجائز فائدہ نہ اٹھایا تھا یہاں تک کہ دوستی اور رشتہ داری کے ناتے بھی اس نے کبھی کسی شخص کو کوئی ایسا فائدہ نہ پہنچایا تھا جس سے اس کی ساکھ کو نقصان پہنچنے کا خدشہ ہوتا یہی وجہ تھی کہ اپنی فرض شناسی کے ناتے وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ میں عزت و قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا اپنی اسی فرض شناسی اور دیانت داری کی بدولت جہاں اسے اتنی محبت نصیب تھی وہاں اس سے نفرت کرنے والوں کی بھی کوئی کمی نہ تھی مرتضیٰ جو اپنے حلقہ احباب میں ایک نرم دل اور ہنس مکھ شخص کی حیثیت سے جانا جاتا تھا اپنے دشمنوں میں سخت گیر اور پتھر دل آفیسر کی حیثیت سے مشہور تھا یہی وجہ تھی کہ مرتضیٰ جس بھی علاقہ میں تعینات ہوتا وہاں موجود جرائم پر جلد ہی قابو پالیتا۔

☼ ☼ ☼

نہ جانے کیا بات تھی کہ جب مرتضیٰ اس لڑکی کو اسی مخصوص مقام پر دیکھنے کا عادی ہو گیا تھا تو وہ لڑکی ایک دن اچانک ہی غائب ہو گئی اور اس لڑکی کے بارے میں یہ جاننے کا فطری تجسس کہ وہ کون تھی اور اس بس اسٹاپ پر کھڑی اتنی ان فٹ کیوں دکھائی دیتی تھی۔ مرتضیٰ کے دل میں ہی رہ گیا اور اب بھی جانے کیوں اس مقام سے گزرتا ہوا وہ پل دو پل ٹھہرتا ضرور تھا اور اس لڑکی کو وہاں نہ پا کر مایوس ہو جاتا ہر روز گھر سے نکلتے وقت جانے کیوں وہ اس لڑکی کی ایک جھلک دیکھنے کی امید لے کر نکلتا لیکن اسے وہاں نہ پا کر اس کی یہ امید دم توڑ جاتی۔

☼ ☼ ☼

"کمال ہے تم ابھی تک گھر پر ہی ہو۔"

رابعہ بیگم نے فون پر ہانیہ کی آواز سنتے ہی حیرت سے گھڑی کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی امی ثاقب آج ہی آفس کے کام سے اسلام آباد گئے ہیں مما اور سویرا ایک گھنٹہ کا کہہ کر ڈرائیور کے ساتھ گئی ہیں ابھی تک نہیں آئیں اب بتائیں میں کیا کروں؟"

ہانیہ نے تمام تفصیل بتاتے ہوئے آخر میں بے بسی سے دریافت کیا۔

"ارے تو تم مرتضیٰ کو فون کر دیتیں وہ آ کر لے جاتا چلو اب جلدی کرو مہمان آنے والے ہوں گے تمہارے بھائی صاحب اور بھابھی تو مہمانوں کا سن کر ہی غائب ہو گئے ہیں بھلا بتاؤ اب میں اکیلی جان کیا کیا دیکھوں۔"

رابعہ بیگم نے عادتاً" تفصیلی جواب دیتے ہوئے کہا۔

"لیکن امی اچھا نہیں لگتا اس کی اپنی بھی ذاتی مصروفیات ہوتی ہیں ایسے میں بلاوجہ اسے تنگ کیے جاؤ۔"

"باؤلی ہوگئی ہو کیا؟" رابعہ بیگم نے خفگی سے دریافت کیا۔

"تم مرتضیٰ کو جانتی نہیں ہو جو یہ سب سوچ رہی ہو پہلے کبھی اس نے تمہارے کسی کام کو منع کیا ہے؟ جو اب کرے گا میرا بیٹا بڑا ہی محبت والا اور فرمانبردار ہے اللہ اسے لمبی زندگی دے اور زندگی کی تمام خوشیاں نصیب کرے وہ تو کبھی غیروں کو منع نہیں کرتا تم تو اس کی اکلوتی اور لاڈلی بہن ہو۔"

رابعہ بیگم نے دل میں موجود اپنے بیٹے کی محبت کو لہجے میں سموتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے امی میں ابھی مرتضیٰ کو فون کرتی ہوں اللہ حافظ۔"

اور تقریباً "تیس" منٹ بعد ہی مرتضیٰ شاہانیہ کو گھر چھوڑ کر واپس اپنی ڈیوٹی پر جا چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

محبت میری دھڑکن ہے
کہ جس سے دل یہ زندہ ہے
محبت میری آنکھوں میں بسی ہے
جو تم کو چھوتی ہیں اس میں دنیا میں زندہ ہیں
محبت میرے رستوں کا نقش بن کر
ہمیشہ میرے دل کے آئینے میں نقش رہتی ہے

اور جب مرتضیٰ اس لڑکی کو تقریباً "بھلا چکا تھا وہ ایک دم ہی اچانک اس کے سامنے آگئی کراچی کے حالات پچھلے کئی دنوں سے خراب چل رہے تھے ایسے میں صدر میں ہونے والے دو لسانی گروہوں کے درمیان جھگڑا اس قدر بڑھ گیا کہ دونوں اطراف سے کی جانے والی فائرنگ میں کچھ لوگ زخمی اور شاید کچھ ہلاک بھی ہوگئے اور ایسے ہی افراتفری اور بھگدڑ کے عالم میں جب مرتضیٰ اور پولیس فورس کے دیگر اہل کار حالات پر قابو پانے کی سرتوڑ کوششیں کررہے تھے اچانک ہی وہ مرتضیٰ کو نظر آگئی وہ لڑکی آج بھی کالی چادر اوڑھے ہوئے نہایت ہی گھبراہٹ کے عالم میں سڑک کے کنارے کھڑی غالباً" کسی سواری کی تلاش میں تھی مرتضیٰ جانتا تھا کہ اس ہنگامہ آرائی کے باعث اس کو سواری کا ملنا نا صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ مرتضیٰ کو صرف ایک لمحہ لگا فیصلہ کرنے میں اس نے اپنے اسسٹنٹ نوید حیدر کے کان میں کچھ کہا اور جلدی سے روڈ کراس کرکے اس لڑکی تک جا پہنچا۔

"ایکسکیوز می مس آجائیں میں آپ کو کسی محفوظ مقام تک چھوڑ دوں۔"

یقیناً" اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو بھی مرتضیٰ کا رویہ ایسا ہی ہوتا کیونکہ وہ عورت کا احترام کرنا جانتا تھا۔ مرتضیٰ کے اچانک قریب جاکر بولنے سے وہ لڑکی ایک دم گھبرا گئی لیکن جیسے ہی اس کی نظر مرتضیٰ پر پڑی جانے کیوں وہ پرسکون سی ہوگئی اور پھر خاموشی سے چلتی ہوئی اس کی گاڑی تک پہنچی اس لڑکی کا یہ عمل اس بات کی نشاندہی کرتا تھا کہ وہ مرتضیٰ کو پہچان چکی ہے۔

☼ ☼ ☼

مرتضیٰ نے اپنی ذاتی کوششوں سے لینڈ مافیا کے ایک بڑے گروہ کو بے نقاب کیا اور جلد ہی اس گروہ کی پشت پر موجود بڑے لوگوں تک جا پہنچا مرتضیٰ کے اس کارنامہ کو تمام اخبارات نے نمایاں طور پر شائع کیا اور اس ایک بڑی کامیابی کے بعد وہ پے در پے کئی بڑی کامیابیاں حاصل کرتا چلا گیا لینڈ مافیا کے بعد اس کا اگلا قدم منشیات فروش تھے اس کے بعد اس نے کار لفٹروں کے ایک بڑے گروہ کو گرفتار کیا اور جیسے جیسے مرتضیٰ کامیابی کا ایک زینہ طے کرتا ویسے ویسے اس کے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا یہاں تک کہ مرتضیٰ کو آفس اور اس کے موبائل فون پر دھمکی آمیز پیغامات بھی ملنے لگے جس کا اس نے کوئی نوٹس نہ لیا کیونکہ وہ اللہ پر بھروسہ رکھنے والا ایک بہادر شخص تھا جسے یقین تھا کہ موت ہمیشہ اپنے مقرر کردہ وقت پر ہی آتی ہے اس سے ایک لمحہ نہ آگے نہ پیچھے۔

"کہاں ہو یار آج کل تو سوائے اخبار اور ٹی وی کے کہیں نظر ہی نہیں آتے۔" جواد نے فون پر رابطہ ہوتے ہی شکوہ شروع کردیا۔

"بس یار تھوڑا سا مصروف تھا۔"

"ہاں بھئی اب تو تم ایک معروف شخصیت بن گئے ہو ہم جیسوں کو کہاں پوچھو گے۔" جواد نے مصنوعی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"او بھائی کیا ہوگیا ہے کیوں فضول بول رہے ہو میں کون سا منسٹر بن گیا ہوں جو تم سے مل نہیں رہا۔"

"اچھا چل چھوڑ یہ بتا شام کو تو فارغ ہے۔"

"ہاں آج میرا آف ہے کیوں خیریت۔"

"بس تو پھر شام کو آجا کیماڑی چلتے ہیں کڑاہی کھانے میں فرزند اور احتشام کو بھی بلا لیتا ہوں یونیورسٹی کے زمانے کی یاد تازہ کریں گے۔"

مرتضیٰ نے تھوڑی دیر رک کر اپنی شام کی مصروفیات پر نظر ڈالی۔

"ٹھیک ہے یار میں سات بجے تک پہنچ جاؤں گا۔"

"یاد رکھنا بھولنا مت ورنہ تیری خیر نہیں۔" جواد نے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھولتا شہزادے آجاؤں گا۔" مرتضیٰ نے ہنستے ہوئے فون بند کردیا۔

اپنی عام زندگی میں وہ ایسا ہی تھا ہنس مکھ اور لاابالی اپنی اتنی مصروفیات میں سے بھی وقت نکال کر دوستوں اور فیملی والوں کے ساتھ ہر جگہ جانے کو تیار رہتا اس کے والدین اور بہن بھائی اس کی زندگی کا محور تھے وہ اپنی بہن شاہانیہ اور چھوٹے بھائی سعد سے بے حد محبت کرتا تھا محبت تو وہ زیادہ سے بھی کرتا تھا لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ زیاد کا رویہ شروع دن سے ہی اس سے کھنچا کھنچا تھا وہ سمجھتا تھا کہ گھر والے مرتضیٰ کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں جب کہ بڑا ہونے کے ناتے اس کی اہمیت کم ہے۔ کچھ تو یہ اس کے اپنے دماغ کا فتور تھا کچھ اس کی بیوی نائمہ نے بھی اس مسئلہ کو خوب ہوا دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اوپر والے فلور میں رہنے کے باوجود وہ میاں بیوی مہمانوں کی طرح نیچے آتے اور مرتضیٰ سے بہت

کم ہی بات کرتے لیکن مرتضیٰ اپنی صاف دلی کے سبب ہمیشہ ان سے خوش دلی سے بات کرتا اور جب بھی کبھی زیادہ گو اس سے کوئی کام پڑتا وہ کبھی منع نہ کرتا اور یہ ہی اس کی اعلا ظرفی کا ثبوت تھا۔



وہ جلدی جلدی ناشتا کر رہا تھا کہ مصطفیٰ صاحب واک سے واپس آگئے اور مرتضیٰ کو دیکھ کر ڈائننگ ٹیبل ہی کی جانب چلے آئے۔ مرتضیٰ نے انہیں دیکھ کر کرسی سے کھڑا ہونا چاہا لیکن مصطفیٰ صاحب نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے بٹھا دیا۔

"کیا بات ہے یار ناشتا تو آرام سے کرو۔"

"دراصل بابا آج مجھے ایس۔پی کے آفس جانا تھا نو بجے کا ٹائم تھا اور گھر پر ہی ساڑھے آٹھ ہو گئے ہیں۔" مرتضیٰ نے آخری لقمہ منہ میں ڈالتے ہی کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"چائے تو پی لو۔"

"نہیں بابا وہیں آفس میں پی لوں گا آپ بتائیں کوئی کام تھا مجھ سے۔" وہ بولا وہ اندازہ تو تھا مصطفیٰ صاحب کے چہرے سے ہی اندازہ لگا چکا تھا کہ انہیں کوئی کام ہے۔

"ہاں اتم فارغ کب تک ہو گے۔"

"دوپہر تک ہو جاؤں گا کیوں خیریت؟"

"ہاں بیٹا تمہارے تایا کی طبیعت کچھ ناساز ہے میں دیکھنے گیا تھا وہ تمہیں یاد کر رہے ہیں فارغ ہو کر ایک چکر ان کے گھر کا لگا لینا۔"

"ٹھیک ہے بابا میں شام میں ہی چلا جاؤں گا۔" مرتضیٰ نے جلدی جلدی گاڑی کی چابی اور اپنا موبائل اٹھاتے ہوئے کہا اور پھر جانے کیا سوچ کر وہ واپس پلٹا۔

"آپ چلیں گے میرے ساتھ؟"

"نہیں بیٹا میں تو کل ہی گیا تھا تم ہو آنا۔" شاہ صاحب نے بیٹے کو محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"سر آپ کے لیے فون آیا تھا۔" مرتضیٰ کے آفس میں داخل ہوتے ہی اسے نوید حیدر نے اطلاع دی۔

"میرا فون۔" مرتضیٰ کو قدرے حیرت ہوئی کیونکہ اس کا سیل نمبر تقریباً سب کے پاس تھا اس کے آفس میں بھی کسی کا فون نہ آیا تھا یہاں تک کہ اس کے مخبر بھی اس سے رابطہ اس کے سیل نمبر پر ہی کرتے تھے مگر پھر بھی بہرحال۔ مرتضیٰ نے ہاتھ میں موجود فائل اور کیپ الماری میں رکھتے ہوئے دریافت کیا۔

"کوئی لڑکی تھی۔"

"لڑکی۔" یہ اس کے لیے مزید حیرانی کی بات تھی کیونکہ اس کی بہن اور بھابھی نے بھی کبھی اس کے آفس فون نہ کیا تھا یہاں تک کہ اس کی منگیتر اور کزن ثمامہ کا فون بھی ہمیشہ اس کے سیل پر ہی آتا تھا پھر یہ کون لڑکی ہو سکتی تھی۔

"کیا کہہ رہی تھی۔"

"کچھ نہیں سر بس آپ کا پوچھا اور فون بند کر دیا۔"

"ہو سکتا ہے کسی کو میری مدد کی ضرورت ہو۔" مرتضیٰ کے دماغ میں سب سے پہلا خیال یہ ہی آیا۔

"بہرحال اگر دوبارہ فون آئے تو میرا سیل نمبر دے دینا۔" مرتضیٰ نے نوید حیدر کو ہدایت دیتے ہوئے کہا۔



مرتضیٰ جیسے ہی گھر میں داخل ہوا لاؤنج سے آنے والی آوازوں کو سن کر خوشگوار حیرت میں گھر گیا لاؤنج کا گلاس ڈور دھکیل کر جیسے ہی وہ اندر داخل ہوا سامنے ہی صوفے پر پھوپھو عالیہ تشریف فرما تھیں لیکن وہ جسے دیکھنے کے لیے مرتضیٰ کی آنکھیں ترس گئی تھیں کہیں نظر نہ آئی پھوپھو سے ملنے کے بعد وہ وہیں صوفے پر ٹک کر بیٹھ گیا۔

"اکیلی آئی ہیں۔" بظاہر اس کا انداز سرسری سا تھا۔

"صاف صاف پوچھ لیں بھائی کس کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں ہم کچھ نہیں کہیں گے۔" سعاد نے شرارت سے کہا۔

مرتضیٰ لاؤنج میں موجود بھابھی کی موجودگی سے پہلے ہی خائف ہو رہا تھا اوپر سے سعاد کی شرارت قبل اس کے کہ وہ کوئی صفائی پیش کرتا اچانک ہی اسے ایسا لگا جیسے پورے لاؤنج میں روشنی پھیل گئی ہو ثمامہ پنک اور گرے سوٹ میں ملبوس ہانیہ کے ساتھ اندر داخل ہوئی اور مرتضیٰ کو دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر خوبصورت سی مسکان پھیل گئی ثمامہ کی اس خوبصورت مسکراہٹ نے مرتضیٰ کی تھکن کو پل بھر میں ہوا کر دیا۔

پھوپھو اور ثمامہ کو آئے ہوئے تقریباً ہفتہ ہو چلا تھا لیکن مرتضیٰ اس پورے ہفتے میں انہیں بالکل ٹائم نہ دے پایا تھا وجہ اس کی آفیشل مصروفیات تھیں یہ ہی وجہ تھی کہ آج اس نے دل ہی دل میں پکا ارادہ کر لیا تھا کہ وہ ثمامہ کو ڈنر کروانے باہر لے کر جائے گا۔

"تیار رہنا آج ہم ڈنر باہر کریں گے۔"

ثمامہ کو مسیج سینڈ کرنے کے بعد مرتضیٰ نے اپنے کام جلدی جلدی نمٹانے شروع کر دیے تاکہ وقت پر گھر پہنچ جائے ابھی وہ جانے ہی والا تھا کہ فون پر آنے والی کال نے اس کی توجہ کھینچ لی۔

نوید کالنگ — اسکرین پر جگمگا رہا تھا۔

"ہاں کیا بات ہے۔" مرتضیٰ نے یس کا بٹن دباتے ہی دریافت کیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ نوید اسے بلاوجہ کال نہیں کرتا اور یقیناً اس کی اس وقت کی جانے والی کال کا کوئی نہ کوئی خاص مقصد ضرور ہوگا

"سر آپ فوراً اس پتے پر پہنچ سکتے ہیں۔"

مرتضیٰ کا اندیشہ درست ثابت ہوا ضرور کوئی بات تھی "پتا بتاؤ۔" اور نوید حیدر سے پتا معلوم کرنے کے بعد تقریباً تیس منٹ میں وہ اس مقام پر موجود تھا لکڑی کا دروازہ ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکے نے کھولا۔

"نوید حیدر سے ملنا ہے۔"

مرتضیٰ نے لڑکے کی جانب دیکھ کر کہا اور لڑکا اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے خاموشی سے اندر کی جانب چلا گیا مرتضیٰ دروازہ عبور کر کے جیسے ہی اندر داخل ہوا سامنے ہی کرسی پر سفید شلوار قمیص میں ملبوس نوید موجود تھا جب کہ اس کے سامنے چارپائی پر ایک نہایت ہی بدحال غریب عورت سر جھکائے بیٹھی تھی مرتضیٰ کو دیکھتے ہی نوید اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"سر یہ خاتون اپنے تین عدد بچوں کے ساتھ ایک بردہ فروش گروہ سے بچ کر آئی ہے۔"

مرتضیٰ نے اس عورت پر ایک تنقیدی نظر ڈالی اور نوید کی چھوڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا نوید کے مطابق اس عورت کا نام کلثوم تھا جو لوگوں کے گھروں میں کام کاج کر کے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتی تھی اس کا شوہر بھی اس کی ساتھ بنگلوں پر کام کرتا تھا کہ اچانک ہی وہ بیمار پڑ گیا اور بیماری کی ہی حالت میں کچھ عرصہ بعد فوت ہو گیا شوہر کی بیماری کے سبب پرانے گھروں کا کام چھوٹ گیا نہایت ہی پریشانی کے عالم میں اس کے شوہر کے دوست افضل خان نے اسے اور اس کی بچیوں کو کہیں کام دلانے کا وعدہ کیا اور پھر چند روز بعد ہی اسے پانچ ہزار کی رقم ایڈوانس دیتے ہوئے تاکید کی کہ کل صبح تیار رہنا میں تم لوگوں کو لینے آؤں گا جہاں سرونٹ کوارٹر میں تمہاری رہائش کا انتظام کر دیا گیا ہے۔

مجبور عورت نے افضل خان پر اندھا اعتماد کرتے ہوئے گھر کی چابی مالک مکان کے حوالے کی اور جو ضروری سامان تھا لے کر گھر سے نکل آئی اور نئی ٹاؤن کے اسٹاپ پر افضل خان نے اسے اور اس کے بچوں کو شربت پلایا جسے پیتے ہی انہیں کچھ ہوش نہ رہا جب آنکھ کھلی تو خود کو ایک بے علاقے میں قید پایا جہاں اس جیسے اور بھی لوگ تھے کلثوم اپنی دو بیٹیوں اور ایک بیٹے کو لے کر وہاں سے کس طرح نکلی یہ ایک الگ داستان تھی اس وقت اصل مسئلہ کلثوم کی بڑی بیٹی تھی کلثوم کی سولہ سالہ بیٹی عائشہ جو آنکھ کھلنے پر اس نجی جیل خانے میں موجود نہ تھی بحالت مجبوری کلثوم اپنے دوسرے بچوں کو لے کر وہاں سے نکل آئی تھی لیکن

اب اپنی بڑی بیٹی کے لیے کلثوم کی بے قراری دیکھی نہ جاتی تھی کلثوم کا کہنا تھا کہ وہاں پولیس اس کی بچی کی بازیابی کے لیے کسی بھی قسم کی کارروائی سے انکاری تھی کیونکہ وہ علاقہ ایک نامی گرامی جاگیردار کی ملکیت تھا جو نا صرف حکومتی پارٹی میں شامل تھا بلکہ اپنے علاقہ کا ایم پی اے بھی تھا جس کی رسائی اوپر تک تھی جہاں کلثوم جیسی لاوارث عورتوں کی کوئی پہنچ نہ تھی۔

کلثوم اور اس کے بیتیموں بچوں کو دیکھ کر مرتضیٰ کا دل لرز اٹھا کلثوم کی دونوں بیٹیاں جن کی عمریں بالترتیب بارہ اور دس سال کی تھیں بے حد خوفزدہ اور سہمی ہوئی تھیں جبکہ کلثوم کا پندرہ سالہ بیٹا اپنی ماں اور بہنوں کے مقابلے میں کافی حوصلہ مند تھا ایک سماجی رہنما کے ذریعہ اس خاندان کی رسائی پہلے نوید حیدر اور پھر مرتضیٰ شاہ تک ہوئی مرتضیٰ اس عورت کو تسلی دلاسا دینے کے بعد اس عزم کے ساتھ وہاں سے اٹھا کہ اس عورت کی بیٹی کو بردہ فروشوں کے اس گروہ سے نجات دلانا اس کا اولین فرض ہے۔

❋ ❋ ❋

کراچی کا موسم بھی بیسل کے لوگوں کی طرح بڑا روکھا ہوتا ہے نہ بہار کی آمد کا پتا چلتا ہے اور نہ ہی برسات کھل کر برستی ہے ہاں تو سردیوں کی طویل راتوں کا عرصہ بھی بڑا ہی مختصر ہوتا ہے عام طور پر ایک خشک اور گرم موسم ہی ہر طرف دکھائی دیتا ہے۔

ان دنوں بھی شاید ایسا ہی کوئی موسم تھا خشک اور گرم جب اچانک ملنے والی اس خبر نے مرتضیٰ شاہ کے چاروں طرف ہرے بھرے پھول کھلا دیے اور اسے پتا چلا کہ بہار تو اس موسم کا نام ہے جب دلوں میں محبت کے پھول کھلے ہوں اس شام جب تھکا ماندہ مرتضیٰ گھر داخل ہوا تو گھر میں غیر معمولی چہل پہل دیکھ کر حیران رہ گیا ہانیہ اور ثاقب کے علاوہ تایا اور تائی جان بھی آئے ہوئے تھے مرتضیٰ پر انکشاف ہوا کہ کچھ ناگزیر حالات کی بنا پر اس کا اور ثمامہ کا ایمرجنسی میں جمعہ کو نکاح کیا جا رہا ہے جبکہ رخصتی تایا ابا ایک ماہ بعد متوقع تھی اور یہ ایسی خبر تھی جسے سنتے ہی مرتضیٰ شاہ کا دل خوشی سے جھوم اٹھا اور اس نے اپنے رب کا شکر ادا کیا جس نے اس کی دلی خواہش کو بن کہے ہی پورا کر دیا۔

پھوپھو عالیہ اپنے شوہر کی وفات کے بعد سے ہی اپنی دو سالہ بیٹی ثمامہ کے ساتھ اپنے سسرال پنڈی میں رہتی تھیں بیس سال کا طویل عرصہ انہوں نے اپنے سسرال میں بڑا پرسکون گزارا ان کے سسر نے اپنے جوان بیٹے کی وفات کے بعد عالیہ بیگم کو وہی مان اور رتبہ دیا جو شوہر کی زندگی میں ان کے پاس تھا ان کے سسر کی زندگی میں ہی مرتضیٰ اور ثمامہ کا رشتہ طے کر دیا گیا تھا جس پر کسی کو بھی کوئی اعتراض نہ تھا لیکن اب کچھ عرصے سے ان کی دیور کا بیٹا اسد ثمامہ میں غیر معمولی دلچسپی لینے لگا تھا جس کی بنا پر ان کے دیور کا تقاضا تھا کہ ثمامہ کا رشتہ مرتضیٰ سے ختم کر کے اسد سے طے کیا جائے روز بہ روز بڑھتے ہوئے اس تقاضے سے عالیہ گھبرا گئیں کیونکہ وہ مرتضیٰ اور ثمامہ کے درمیان پسندیدگی سے بخوبی واقف تھیں ان ہی حالات میں بھائی کی بیماری کا بہانہ کر کے وہ کراچی آ گئیں جیسے ہی ان کے دونوں بھائیوں کو صورت حال کا اندازہ ہوا فوری طور پر نکاح کا فیصلہ کیا گیا۔

آج مرتضیٰ بہت خوش تھا گھر میں ہونے والی نکاح کی اس تقریب کی اس نے دل کھول کر تیاری کی تھی پورا لان پھولوں اور روشنیوں سے جگمگا رہا تھا مرتضیٰ نے آج کی اس رسم نکاح کے لیے ثمامہ کا سوٹ خود جا کر خریدا تھا جو شاکنگ پنک اور اورنج کلر کے حسین کنٹراسٹ میں تھا یہاں تک کہ آج کے دن کے لیے اس نے اپنی بہن اور ماں کے علاوہ بھابھی کو بھی خود شاپنگ کروائی تھی آج وہ بہت خوش تھا اور اپنی اس خوشی کو سب کے ساتھ منانا چاہتا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس خوبصورت موقع پر کسی کی بھی دل آزاری ہو ٹھیک ایک ماہ دس دن بعد اس کی رخصتی کی تاریخ رکھی گئی تاکہ اس وقت میں کچھ تیاری کے علاوہ ثمامہ کے ددھیال والوں کو بھی منا کر شرکت کے لیے آمادہ کیا جاسکے کیونکہ مصطفیٰ صاحب کا خیال تھا کہ ثمامہ کی

رخصتی کے لیے اس کے چچاؤں کی دعاؤں کا ہونا بھی ضروری ہے اور یقیناً یہ ان کی ایک اچھی سوچ تھی جس پر سارا خاندان ان ہی متفق تھا۔

❋ ❋ ❋

کبھی ہم قربتوں میں فاصلوں کے ساتھ جیتے ہیں
کبھی ہم فاصلوں میں قربتوں کی آنچ کو محسوس کرتے ہیں
جسے ہم ہجر کہتے ہیں وہ جانے کب کہاں کیسے؟
ادائے وصل کا عنوان ہو جائے
جسے ہم وصل کہتے ہیں کسی پر کیف لمحے میں ابد تک کی جدائی کا
آغاز ہو جائے
کوئی کچھ کہہ نہیں سکتا۔

مرتضیٰ کے موبائل پر آنے والا یہ انجان پیغام جانے کس کا تھا ہو سکتا ہے کسی نے غلطی سے بھیج دیا ہو یہ سوچتے ہوئے مرتضیٰ نے اس نمبر پر کال بیک تو نہ کی لیکن اس نمبر کو اپنے پاس محفوظ ضرور کر لیا اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ ایک پولیس افسر ہونے کے ناطے تجسس اس کی فطرت میں شامل ہو چکا تھا۔

میری زیست کے سب رنگوں میں
اور چاہت کے ہر عنوان میں جاناں
یہی سچ ہے اک آخری
کہ تم سا کوئی دوسرا نہیں ہے

میسج ثمامہ کو بھیج کر اس نے مسکراتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں اور چھم سے ثمامہ کا دلہن بنا سراپا اس کے تصور میں آ گیا اس کے مہندی سے سجے ہاتھ اور شرمائے روپ کا تصور ذہن میں آتے ہی مرتضیٰ کی نیند اڑ گئی اور کروٹیں بدلتے بدلتے اچھی خاصی رات بیت گئی اور ابھی شاید اس کی آنکھ ہی لگی تھی کہ شب کے اس آخری پل میں مرتضیٰ کے موبائل پر آنے والی کال نے اسے بے چین نیند سے بیدار کر دیا پہلے تو اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ یہ میوزک کی آواز کہاں سے آ رہی ہے لیکن جیسے ہی اس کے حواس مکمل طور پر بیدار ہوئے فون بند ہو چکا تھا اس سے قبل کہ وہ فون اٹھا کر نمبر چیک کرتا فون کی مخصوص ٹون پھر سے بجنے لگی اسکرین پر کوئی انجان نمبر تھا۔

"السلام علیکم۔" مرتضیٰ نے یس کا بٹن دباتے ہی اپنی گمبھیر آواز میں کہا۔

"مبارک ہو۔" دوسری جانب کوئی لڑکی تھی نہایت دلکش آواز اور مدھم لہجہ لیکن یہ ثمامہ ہرگز نہ تھی مرتضیٰ اٹھ کر بیٹھ گیا رات کے تین بجے ایک لڑکی کا فون اور اس پر یہ احساس کہ یہ آواز پہلے کہاں سنی ہے۔

"جی کون؟ میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔" مرتضیٰ نے قدرے ناگواری سے کہا۔

"آپ جانتے ہی نہیں تو پہچانیں گے کیسے لائبہ بات کر رہی ہوں۔"

کھنکتی ہوئی ہنسی کے ساتھ جواب آیا۔

"دراصل آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا۔"

"میرا شکریہ مگر کیوں۔؟"

اس نے سوالیہ انداز میں دریافت کیا۔

"آپ کو شاید یاد نہیں کچھ عرصہ قبل آپ نے مجھے اپنی گاڑی میں لفٹ دی تھی۔ صدر کے بس اسٹاپ سے۔"

فون پر لڑکی کی دلکش اور مدھم آواز سنتے ہی مرتضیٰ کے ذہن میں یک دم ہی کالی چادر میں لپٹی وہ خوبصورت سی لڑکی آ گئی لاشعوری طور پر ہی سہی مرتضیٰ نے کچھ عرصہ تو اس لڑکی کو قابل توجہ جانا تھا۔

"اس او کے کوئی بات نہیں بس یا کوئی اور بات۔" مرتضیٰ نے سوالیہ انداز میں بات کو ادھورا چھوڑ دیا۔

"میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"مجھ سے۔" مرتضیٰ نے استفہامیہ لہجہ میں دریافت کیا۔

"کیوں؟"

"ایک تو آپ نے میری مدد کی اس کا شکریہ اور دوسرا آپ کے نکاح کی مبارک باد دینے کے لیے۔"

"آپ کو شاید یاد نہیں آپ کچھ دیر قبل فون پر ہی میرا شکریہ بھی ادا کر چکی ہیں اور مجھے مبارک بھی دے دی ہے۔"

مرتضیٰ نے اپنی آواز کو حتی الامکان کرخت بناتے ہوئے کہا۔

"دیکھیں مس لائبہ میں خاصا پریکٹیکل بندہ ہوں ایک تو میرا پروفیشن مجھے اس طرح کی دوستیاں پالنے کی اجازت نہیں دیتا اور دوسرا میری منکوحہ اور گھر والے اس بات کو پسند نہیں کرتے اس لیے میں امید کرتا ہوں کہ آپ دوبارہ مجھے فون نہیں کریں گی۔"

دوسری طرف مکمل طور پر خاموشی تھی لیکن آنے والی سانس کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ لائن پر ہے۔

"لائبہ آپ میری بات سن رہی ہیں نا۔"

"جی۔" دوسری طرف سے آنے والی آواز نہایت ہی دھیمی تھی۔

"بہرحال اگر کبھی زندگی میں آپ کو میری مدد کی ضرورت پڑی تو ضرور مجھے پکاریے گا ہو سکتا ہے میں آپ کے کسی کام آسکوں۔"

دوسری طرف سے خاموشی سے فون رکھ دیا گیا اور باقی کی ساری رات مرتضیٰ نے لائبہ کو ہی سوچتے ہوئے گزار دی۔



کلثوم کی بڑی بیٹی کا ہنوز کوئی سراغ نہ ملا تھا مقامی پولیس کی مدد کے بغیر مرتضیٰ اس علاقہ تک رسائی حاصل نہ کر سکتا تھا اور مقامی پولیس کے پاس وہ ہی اختیارات کی کمی کا رونا جب کہ کلثوم دھمکیوں سے خوفزدہ ایک کمزور عورت مرتضیٰ چاہتا تھا کہ یہ عورت میڈیا کے سامنے آکر خود ساری حقیقت دنیا کو بتائے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ میڈیا کے ذریعے کی جانے والی تشہیر کی بدولت ہی یہ معاملہ جلد حل ہو سکے گا اور بالآخر مرتضیٰ اور نوید حیدر کے بہت سمجھانے اور ہمت بندھانے پر کلثوم میڈیا کے سامنے آکر کچھ بتانے پر آمادہ ہوئی اور اس سلسلے میں ایک مقامی این جی او کی آرگنائزر بیگم زارا ملک نے بھی مرتضیٰ کا بہت ساتھ دیا اور آج اسی سلسلے میں صبح دس بجے کلثوم کو ایک ٹی وی چینل کے دفتر پہنچنا تھا اور اس سلسلے میں مرتضیٰ اسے پہلے ہی سب کچھ اچھی طرح سمجھا چکا تھا لیکن پھر بھی وہ کلثوم کی طرف سے مطمئن نہ تھا۔ ایسے میں جب گیارہ بجے کے قریب نوید نے اسے فون کر کے متعلقہ آفس میں کلثوم کے بحفاظت پہنچ جانے کا بتایا تو مرتضیٰ کو ایک گونا گوں اطمینان حاصل ہوا۔

"جسم فروشی "یقیناً" ایک گھناؤنا جرم ہے جسے کچھ عورتیں اپنی مرضی سے اپناتی ہیں جبکہ زیادہ تر عورتوں کو مجبور کر کے ان کی کسی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اس گھناؤنے اور گھٹیا ترین کاروبار سے منسلک کیا جاتا ہے اور میں کوشش کروں گا ایسی ہی کچھ مجبور اور بے بس عورتوں تک پہنچنے کی جو یہ گھناؤنا پیشہ چھوڑنا چاہتی ہوں لیکن ان کے پیچھے موجود چند بڑے ہاتھ انہیں اس برائی کو چھوڑنے نہیں دیتے اور میں آپ کے اس پروگرام کے ذریعے ایسی ہی مجبور اور لاچار عورتوں سے اپیل کروں گا کہ وہ مجھ سے رابطہ کریں ہو سکتا ہے کہ میں ان کی بروقت مدد کر کے انہیں مزید گندہ آلودہ زندگی سے بچا سکوں۔"

کلثوم کی بیٹی کی بازیابی کے بعد مرتضیٰ شاہ کی ایک پریس کانفرنس جس کی میڈیا نے بھرپور انداز سے کوریج کی مرتضیٰ کے دائیں طرف کلثوم اور اس کی بیٹی عائشہ تھیں جبکہ بائیں جانب نوید حیدر اس موقع پر بولے جانے والے مرتضیٰ شاہ کے الفاظ اس کے اندرونی حال کی مکمل عکاسی کر رہے تھے جو صرف سستی شہرت کمانے کے لیے نہیں بلکہ حوا کی بیٹی کی اس بے حرمتی پر درد سے بھرے ہوئے تھے۔

عائشہ ضرور بازیاب ہوئی تھی لیکن اس وڈیرے تک قانون کے ہاتھ نہ پہنچ سکے تھے اور اسی کا مرتضیٰ کو دکھ تھا اور اب مرتضیٰ چاہتا تھا کہ جسم فروشی اور بردہ فروشی جیسے کاروبار سے منسلک صرف ایک وڈیرہ نہیں بلکہ تمام بڑے لوگ بے نقاب ہونے چاہئیں یہاں تک کہ ان کی سرپرستی کرنے والے پولیس کے اعلا افسران کو بھی ان کے کیے کی سزا ملنی چاہیے لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس ملک کے اندھے قانون کے سامنے مرتضیٰ کی حیثیت آٹے میں نمک سے زیادہ کچھ نہیں اس کے باوجود وہ اپنے ارادوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے پرعزم تھا۔



اس دن صبح سے ہی موسم خوشگوار تھا اور ہلکی ہلکی بوندا باندی وقفہ وقفہ سے جاری تھی مرتضیٰ موسم کو مکمل طور پر انجوائے کرتا ہوا آہستہ آہستہ گاڑی ڈرائیو کرتا اپنے آفس کی جانب جا رہا تھا کہ اچانک ہی زینب مارکیٹ کا سگنل کراس کرتے ہی اسے کچھ دور لائبہ کھڑی دکھائی دی جو آج بھی اسی کالی چادر میں لپٹی تھی بہت ممکن تھا کہ مرتضیٰ اسے نظر انداز کر کے گزر جاتا لیکن اچانک ہی رونما ہونے والے اس چھوٹے سے واقعے نے مرتضیٰ کو بریک لگانے پر مجبور کر دیا لائبہ کے ساتھ کھڑے ہوئے لمبے سے نوجوان کو مرتضیٰ نے دور سے ہی دیکھ لیا تھا وہ نوجوان لائبہ کے بالکل قریب کھڑا آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہا تھا لیکن ظاہری طور پر نوجوان لائبہ کا کوئی جاننے والا معلوم ہوتا تھا۔ بات کرتے کرتے اچانک ہی اس نوجوان نے لائبہ کو بازو سے پکڑ کر کھینچنا شروع کر دیا۔

صبح صبح اس منظر کو دیکھنے والا وہاں کوئی بھی نہ تھا سوائے چند ایک راہ گیروں کے جن کے نزدیک یہ سب تماشے سے زیادہ اہمیت کا حامل نہ تھا لیکن مرتضیٰ جیسا شخص اپنے سامنے سب ہوتا دیکھ کر نظر انداز کرنے کا قائل نہ تھا اسی لیے وہ بیچ سڑک پر گاڑی کو روک کر تیزی سے باہر نکلا مرتضیٰ کو اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر اس نوجوان نے فوراً ہی لائبہ کا بازو چھوڑا اور پاس ہی کھڑی ٹیکسی میں بیٹھ کر فرار ہو گیا اس ہنگامے کے سبب لائبہ کی چادر گر چکی تھی اس کے لمبے گولڈن بال کھل کر اس کی پشت پر بکھر گئے تھے اور وہ زمین پر بیٹھی زاروقطار رو رہی تھی مرتضیٰ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے اس نے بازو سے پکڑ کر لائبہ کو کھڑا کیا اور جھک کر زمین پر گری ہوئی اس کی چادر اٹھا کر اس کے کندھے پر ڈالی۔

"آجائیں میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔"

لیکن لائبہ پر اس کے ان الفاظ کا کوئی اثر نہ ہوا وہ وہیں کھڑی روتی رہی مجبوراً مرتضیٰ کو بازو تھام کر لائبہ کو اپنی جانب متوجہ کرنا پڑا اور مرتضیٰ کے بازو تھامتے ہی وہ یک دم اس کے گلے لگ گئی اب اس کے رونے کی رفتار میں شدت آچکی تھی۔

"پلیز لائبہ سڑک پر تماشا نہ کریں آجائیں میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں جہاں آپ جانا چاہیں۔"

مرتضیٰ نے گھبراتے ہوئے اسے خود سے دور کیا ابھی بھی لائبہ نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑی سڑک پر اس وقت ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا مرتضیٰ نے جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھولا لائبہ خاموشی سے اندر بیٹھ گئی مرتضیٰ نے گاڑی اسٹارٹ کی کچھ دیر کی خاموشی کے بعد مرتضیٰ نے لائبہ پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی رونے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں اور وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین نظر آرہی تھی مرتضیٰ نے فوراً ہی ونڈ اسکرین وائپر چلانا شروع کر دیا جہاں بارش میں مزید تیزی آگئی تھی۔

"یہ نوجوان کون تھا؟"

اس نے باہر کی جانب نظر ڈالتے ہوئے سرسری سے انداز میں سوال کیا لائبہ نے کوئی جواب نہ دیا وہ خاموشی سے کھڑکی سے باہر تک رہی تھی۔

"لائبہ میں آپ سے پوچھ رہا ہوں کون تھا یہ لڑکا؟"

لائبہ نے صرف ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔

"میرا شوہر۔"

"تم شادی شدہ ہو۔" مرتضیٰ نے بے یقینی سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"بس گاڑی روک دیں مجھے یہیں جانا ہے۔"

لائبہ نے اس کی بات کا جواب دیے بغیر تیزی سے کہا مرتضیٰ نے باہر کی جانب نظر ڈالی وہ اس وقت ایم اے جناح روڈ پر تھا اس نے سائیڈ پر کر کے گاڑی

روک دی اور اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتا لائبہ نے تیزی سے دروازہ کھولا اور سامنے دکھائی دینے والی گلی میں داخل ہو گئی اور وہ جانے کتنی دیر تک اسی جگہ گم سم سا کھڑا رہتا اگر پیچھے سے آنے والی بس کا تیز ہارن اسے گاڑی کو حرکت دینے پر مجبور نہ کر دیتا۔

☼ ☼ ☼

اسے آج ایس پی کے آفس جانا تھا اس سلسلے میں صبح ہی باجوہ صاحب کے پی اے کا فون آیا تھا مرتضیٰ نے پہلے آفس جا کر اپنے نئے کیس کی فائل الماری میں رکھ کر لاک کی اور پھر ایس پی کے آفس جانے کے لیے باہر نکل آیا آفس کا دروازہ کھولتے ہی ایئر فریشنر کی بھینی بھینی مہک مرتضیٰ کے نتھنوں سے ٹکرائی "آجاؤں سر۔" مرتضیٰ نے اجازت طلب کرتے ہوئے کہا۔

"آجاؤ۔"

باجوہ صاحب نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر اپنی نظر سامنے رکھے کمپیوٹر پر جما دی کمپیوٹر انچارج سرفراز چوہان بھی ان کے قریب کھڑا تھا۔

"خیریت ہے سر آج آپ صبح صبح کمپیوٹر آن کر کے بیٹھے ہیں کوئی خاص خبر ہے۔" مرتضیٰ نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔

"خیریت ہی تو نہیں ہے اسی لیے تو تمہیں بلایا ہے بہتر ہے جو کمپیوٹر میں دیکھ رہا ہوں تم بھی دیکھ لو۔" یہ کہہ کر باجوہ صاحب نے کمپیوٹر کے مانیٹر کا رخ مرتضیٰ کی جانب کر دیا اور اسکرین پر نظر آنے والے مناظر نے اسے حیرت زدہ کر دیا وہ یک دم اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اسکرین پر مرتضیٰ اور لائبہ کی تصاویر تھیں جو آج صبح اس وقت کھینچی گئی تھیں جب وہ لائبہ کی مدد کے خیال سے زیب النساء اسٹریٹ پر موجود تھا۔

"یہ یہ سب کیا ہے؟" وہ یک دم بوکھلا گیا۔

"یہی تو میں تم سے پوچھ رہا ہوں یہ کیا ہے؟" باجوہ صاحب نے ایک گہری نظر مرتضیٰ کے چہرے پر جماتے ہوئے کہا۔

"تم جانتے ہو یہ لڑکی کون ہے؟"

"نہیں سر میں تو صرف۔"

"یہ لڑکی مشہور کال گرل ہے لیلیٰ.... کال گرل کا مطلب تو سمجھتے ہو نا۔" باجوہ صاحب نے اس کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے کہا۔

"کال گرل او میرے خدایا۔"

آج کا دن مرتضیٰ شاہ کے لیے انکشافات کا دن تھا صبح سے ہونے والا دوسرا اہم انکشاف جس کا تعلق بھی لائبہ کی ذات سے ہی تھا۔

"جی برخوردار اور میرا تمہیں بہترین مشورہ یہ ہے کہ آئندہ اس لڑکی سے دور رہنا اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ آگے تم خود سمجھدار ہو ایک عام پولیس آفیسر کو شاید اس طرح کے اسکینڈل سے کچھ فرق نہ پڑے لیکن تم شاید اس بات کو پسند نہ کرو کیونکہ اس طرح کے اسکینڈل نا صرف تمہاری فیملی بلکہ نوکری کے لیے بھی خطرناک ہیں اور جس کیس پر تم آج کل کام کر رہے ہو یہ اسکینڈل اس پر بھی بری طرح اثر انداز ہوگا۔"

ایس پی صاحب نے کافی وضاحت سے مرتضیٰ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"میری بات سمجھ رہے ہو نا۔"

"جی سر۔" اس کا دماغ تو ابھی تک لفظ کال گرل میں ہی الجھا ہوا تھا۔

"اور مرتضیٰ شاہ ہمیشہ میری یہ بات یاد رکھنا جس طرح ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے بالکل اسی طرح ہر کامیاب مرد کی تباہی و بربادی کے پیچھے بھی یقیناً ایک عورت ہی کا ہاتھ ہوتا ہے تمہارے جیسے بہادر اور ایماندار لوگ جن کا تعلق خواہ کسی بھی محکمے سے ہو جب بکتے نہیں ہیں تو پھر ان کے کیریئر کے خاتمے کے لیے اسی طرح کی عورتوں کو استعمال کیا جاتا ہے اور تم تو ماشاء اللہ خود سمجھدار ہو ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنے والے۔" باجوہ صاحب نے اپنی بات کے اختتام پر مرتضیٰ کی جانب تائید طلب نظروں سے دیکھا۔

"جی سر میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں یہ یقینی طور پر ایک جال ہے جس میں مجھے پھنسانے کی کوشش کی جا رہی ہے بہرحال آئندہ میں احتیاط کروں گا۔"

"اور ہاں اپنے دشمن کو کمزور مت سمجھنا تمہارا واسطہ اس دفعہ ایک نہایت شاطر دشمن سے پڑا ہے جس نے محض دو سے تین گھنٹوں میں تمہاری تصاویر نیٹ پر ڈال کر براہ راست مجھے انفارم کیا ہے اب یہ سوچو کہ اگر یہ تصاویر نیٹ کے بجائے کسی بھی نیوز پیپر کی زینت بن جاتیں تو۔"

اس سے آگے کا تصور کرتے ہی مرتضیٰ شاہ کو جھرجھری سی آ گئی۔

"بہرحال اب تم جا سکتے ہو اور ہاں یاد رکھنا یہ تمہارے لیے محض ایک تنبیہ تھی۔"

"اوکے سر اللہ حافظ۔"

وہ شیشے کا دروازہ دھکیلتا ہوا بڑی خاموشی سے باہر نکل آیا اور پھر سارا دن اس کا دماغ الجھا ہی رہا لائبہ کے لیے لفظ کال گرل مرتضیٰ کے اعصاب پر ہتھوڑا بن کر برس رہا تھا وہ جب بھی لائبہ کا تصور کرتا کالی چادر میں لپٹا سراپا اس کے ذہن کے پردہ اسکرین پر ابھر آتا [illegible] عورت کے ظاہری سراپے سے دھوکہ بھی کھا سکتا ہے پھر وہ سوچتا شاید لائبہ کا تعلق بھی عورتوں کی اس صنف سے ہو جو مجبوری کے پیش نظر اس گھناؤنے پیشے کو اپنائے ہوئے ہیں بہرحال جو بھی تھا ایک مرد ہونے کے ناتے لائبہ کی آنکھوں میں پسندیدگی کے جذبات وہ دیکھ چکا تھا وہ جانتا تھا کہ محبت کرنا کسی بھی طوائف یا کال گرل کا بھی ذاتی حق ہے لیکن جب وہ ان تصاویر کا سوچتا تو اس کا دماغ الجھ جاتا یقیناً "یہ کارنامہ لائبہ کے شوہر کا تھا کیونکہ صبح اس مقام پر ان دونوں کے علاوہ تیسرا شخص صرف وہی تھا جانے کیا بات تھی مرتضیٰ کا دل لائبہ کو قصوروار ماننے سے منکر تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ آفس جانے کے لیے گھر سے نکلا ہی تھا کہ نوید حیدر کا فون آ گیا۔

"سر کہاں ہیں آپ؟"

"آفس جا رہا ہوں کیوں خیریت؟"

"نہیں سر خیریت نہیں ہے یوسف کو تو جانتے ہیں نا آپ۔"

یوسف مرتضیٰ کا ایک مستند مخبر تھا جس کی دی ہوئی اطلاعات پر جب بھی کبھی مرتضیٰ نے کوئی کارروائی کی ہمیشہ کامیابی اس کا مقدر بنی آج کل یوسف بھی مرتضیٰ کے کیس پر بڑی خاموشی سے کام کر رہا تھا اور اسی سلسلے میں اس کے پاس شاید کچھ اہم اطلاعات بھی تھیں جس کے سلسلے میں وہ مرتضیٰ سے ملنا چاہتا تھا کل رات ایک بجے آنے والی اس کی فون کال پر مرتضیٰ نے اسے آج شام اپنے مخصوص مقام پر پہنچنے کا سگنل دے دیا تھا۔

"کیا ہوا ہے یوسف کو۔" بے چینی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

"سر آپ سرکاری اسپتال پہنچ جائیں میں وہیں ایمرجنسی کے باہر آپ کو ملوں گا۔"

نوید حیدر نے اسپتال کا نام بتا کر فون بند کر دیا اور پھر تیزی سے ڈرائیو کرتے ہوئے تقریباً پون گھنٹے میں مرتضیٰ اسپتال پہنچ چکا تھا گاڑی پارک کر کے وہ تیزی سے بھاگتا ہوا ایمرجنسی تک پہنچا اس سے قبل کہ وہ اندر داخل ہوتا جانے کہاں سے اس کے سامنے حاجی نور خان آ گیا یوسف کراچی شہر کی ایک کچی آبادی کا رہائشی تھا اور نور خان اس آبادی کی ایک جانی پہچانی سیاسی اور سماجی شخصیت تھی جس کا ذکر یوسف کئی بار کر چکا تھا نور خان نا صرف ایک ٹرانسپورٹر تھا بلکہ اپنے علاقہ کا ناظم بھی رہ چکا تھا اور ایک دو سماجی تقریبات میں اس کی اور مرتضیٰ کی ملاقات ہو چکی تھی اسی ناتے وہ دونوں ایک دوسرے کو پہچانتے تھے۔

"خیر ہے مرتضیٰ صاحب یہاں بھی کوئی مجرم پکڑنے آئے ہیں۔"

نور خان نے مرتضیٰ سے مصافحہ کرتے ہوئے ازراہ مذاق پوچھا۔

"نہیں حاجی صاحب یہاں میں اپنے ایک دوست کی عیادت کے لیے آیا ہوں اور آپ یہاں ایمرجنسی میں خیریت ہے۔"

مرتضیٰ نے دور تک نوید کو تلاش کرتے ہوئے نور خان کو جواب دیتے ہوئے سوال کیا۔

"ہم بھی آپ ہی کے دوست کی عیادت کے لئے آئے ہیں۔"

نور خان کے جواب سے مرتضیٰ کو حیرت کا جھٹکا لگا کیونکہ پولیس کے مخبر عام لوگوں سے چھپ کر کام کرتے ہیں اور وہ تو کبھی نور خان کے علاقے میں یوسف سے ملنے بھی نہیں گیا تھا تو پھر۔

"آپ میرے دوست کو کیسے جانتے ہیں؟" مرتضیٰ نے گہری نظروں سے نور خان کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"ارے بھئی آپ تو خواہ مخواہ مشکوک ہوگئے ہیں میں تو مذاق کر رہا تھا اصل میں یوسف میرے ہی علاقہ کا ہے پچھلی رات جانے کس بات پر گھر والوں سے جھگڑا ہوا اپنے فلیٹ کی کھڑکی سے کود کر خودکشی کرلی میرے ہی بندے نے اسے سب سے پہلے دیکھا تھا سڑک پر زخمی پڑے ہوئے ہے اٹھا کر اسپتال پہنچایا۔"

نور خان نے کچھ جذباتی سی نظروں سے مرتضیٰ کی جانب دیکھتے ہوئے وضاحت کی اور وہ چاہتے ہوئے بھی نور خان سے یہ دریافت نہ کر سکا کہ یوسف کا جھگڑا گھر میں کس سے ہوا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یوسف گھر میں اکیلا رہتا ہے اور اس کے گھر والے اندرون سندھ کے کسی علاقہ میں رہائش پذیر تھے جبکہ یوسف کی کراچی میں رہائش کی وجہ تلاش معاش تھی اس سے قبل کہ نور خان کچھ اور کہتا اچانک ہی مرتضیٰ کی نگاہ ایمرجنسی کے اندر کھڑے نوید حیدر پر پڑ گئی۔

"ایکسکیوز می..." کہتا ہوا مرتضیٰ نور خان کو وہیں چھوڑ کر تیزی سے اندر کی جانب بڑھا نوید حیدر نے مرتضیٰ کو دیکھتے ہی سامنے والے بیڈ کی جانب اشارہ کر دیا جہاں ڈاکٹرز اور پیرامیڈیکل اسٹاف کی ایک ٹیم موجود تھی۔

"کیسی کنڈیشن ہے مریض کی۔" مرتضیٰ نے آگے بڑھ کر قریب کھڑی لیڈی ڈاکٹر سے سوال کیا۔

"ہی از ویری سیریس گردن کی ہڈی ٹوٹ چکی ہے۔"

لیڈی ڈاکٹر نے مرتضیٰ پر ایک نظر ڈالتے ہوئے پیشہ ورانہ سنگدلی سے جواب دیا۔

"اس کے گھر والوں کو اطلاع دی ہے۔" مرتضیٰ کا اگلا سوال نوید سے تھا۔

"نہیں سر اس کے پاس موبائل نہیں تھا فی الحال ہمارے پاس اس کے گھر والوں سے رابطہ کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔"

اس سے قبل کہ نوید حیدر جواب دیتا قریب ہی کھڑا ہوا مقامی تھانہ کا کانسٹیبل بول اٹھا۔

"ٹھیک ہے میرا خیال ہے کہ تم نور خان سے بات کرو ہو سکتا ہے اس کے پاس رابطہ کا کوئی ذریعہ ہو۔"

مرتضیٰ نے ایمرجنسی کے باہر کھڑے نور خان اور اس کے ساتھیوں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے نوید حیدر کو ہدایت کی۔

"اور ہاں اس کے علاج میں کوئی کوتاہی نہ ہو۔"

مزید ہدایت دیتا ہوا وہ باہر کی جانب نکل گیا جانے وہ کون سی اہم خبر تھی جو یوسف اسے دینا چاہتا تھا اور جس کی پاداش میں یوسف کا یہ حشر کیا گیا کتنے بھی عینی شاہدین کیوں نہ ہوں لیکن مرتضیٰ کم از کم اتنا ضرور جانتا تھا کہ یہ کیس خودکشی کا نہیں ہے یوسف کی مخدوش حالت نے اسے دلی صدمے سے دوچار کیا تھا۔

"سر آپ کا فون ہے۔"

اس نے جیسے ہی آفس میں قدم رکھا ہیڈ کانسٹیبل نے اسے دیکھتے ہی اطلاع دی وہ کوئی بھی جواب دیئے بغیر تیزی سے فون کی جانب لپکا۔

"ہیلو۔"

"جی سر کیسی طبیعت ہے آپ کے یوسف کی۔"

"آپ کون؟" مرتضیٰ نے اپنے لہجہ کو حتی الامکان نارمل رکھتے ہوئے دریافت کیا۔

"سر آپ کے لئے ایک مشورہ تھا ہم جیسے شریف آدمیوں کی پگڑیوں کو اچھالنے کا سلسلہ بند کردیں تو

آپ کے حق میں اچھا ہو گا ورنہ وہ جو کہتے ہیں نا کہ کیچڑ میں پتھر پھینکو تو چھینٹے خود پر بھی پڑتے ہیں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کا اجلا لباس بھی بدبودار ہو جائے۔"

مرتضیٰ کے سوال کا جواب دیے بغیر مخاطب نے اپنی بات تیزی سے مکمل کی اور فون بند کر دیا فون یقینی طور پر کسی پی سی او سے کیا گیا تھا اور فون کرنے والا ضرور کوئی ایسا شخص تھا جسے مرتضیٰ کے موجودہ کیس سے نقصان پہنچنے والا تھا بہر حال یہ تو طے تھا کہ مرتضیٰ ایسی گیدڑ بھبکیوں سے ڈرنے والا نہ تھا اور اپنے مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچانا ہے اس کا اولین فرض تھا۔

☼ ☼ ☼

شادی کی تیاریاں زور و شور سے شروع ہو چکی تھیں گھر والے روز ہی شاپنگ کے لیے بازار جا رہے تھے لیکن مرتضیٰ کی مصروفیات اسے اجازت نہ دے رہی تھیں کہ وہ ایک بار بھی شمامہ کے ساتھ جا کر شاپنگ کر سکے آج بھی اسے بازار جانے کے لیے رابعہ بیگم نے کہا تھا لیکن اس نے منع کر دیا کیونکہ اس کی [illegible] عادت نہ تھا کہ وہ یوسف کو زندگی اور موت کی کشمکش میں چھوڑ کر بازار گھومتا پھرے آج اسے کی نائٹ ڈیوٹی تھی اور اتفاق کی بات تھی کہ تھانے میں مصروفیت بھی کچھ زیادہ ہی تھی اس لیے ابھی تک وہ اسپتال نہ جا سکا تھا اس وقت بھی وہ کسی کیس کی فائل ہی دیکھ رہا تھا جب اسے یوسف کی موت کی اطلاع دی گئی یہ خبر سن کر اسے حقیقی معنوں میں صدمہ پہنچا فی الوقت اس کا اسپتال پہنچنا ممکن نہ تھا لہذا اس نے نوید حیدر کو فون کر کے فوری اسپتال پہنچنے کی ہدایت کرتے ہوئے کہا کہ

"وہ یوسف کے گھر والوں کے ساتھ ہر ممکن تعاون کرتے ہوئے اس کی میت گاؤں بھجوانے کا فوری انتظام کرے۔"

یوسف کی جواں سال موت نے اسے دلی طور پر دکھ پہنچایا اسی لیے جب صبح وہ گھر جانے کے لیے نکلا تو اس کا دل بہت بوجھل تھا تھانے سے باہر نکلتے ہی اس نے فیصلہ کیا کہ پہلے وہ اس کے گھر نہیں جائے گا جہاں یوسف رہائش پذیر تھا تاکہ معلوم ہو سکے کہ وہاں کون سے فلیٹ تھا جس کی کھڑکی سے یوسف نے چھلانگ لگا کر خودکشی کی کی ہو سکتا ہے آس پاس کے لوگوں سے ہی کوئی کار آمد بات معلوم ہو سکے یہ خیال ذہن میں آتے ہی اس نے فون کر کے نوید کو ہدایت کی کہ وہ ایک گھنٹہ تک یوسف کی جائے رہائش پر پہنچ جائے۔

مرتضیٰ اپنے خیالات میں الجھا ہوا آہستہ آہستہ گاڑی چلاتا شہری آبادی کو پیچھے چھوڑتا ہوا کچی آبادی کی جانب جا رہا تھا جب نجان آبادی سے کچھ آگے بنے ہوئے اپارٹمنٹ (جو ابھی تک مکمل طور پر آباد نہ ہوئے تھے) کے گیٹ سے اچانک ہی ایک برقعہ پوش عورت نکل کر روڈ پر بھاگنے لگی عورت ننگے پاؤں تھی اور نہ جانے ایسی کون سی افتاد اس پر آ پڑی کہ وہ صبح سویرے اس حالت میں روڈ پر بھاگی جا رہی تھی گو ممکن تھا کہ مرتضیٰ اس عورت کو نظر انداز کر کے گزر جاتا اس کو تو پچھلے کچھ تجربات سے وہ کافی سبق سیکھ چکا تھا لیکن اچانک ہی اس نے ایک موڑ مڑتے ہوئے اس کی جانب دیکھا تو ذرا سے فاصلے پر نظر آنے والے منظر نے اسے یک دم بریک لگانے پر مجبور کر دیا۔

مین روڈ پر کوئی شخص اس عورت کو بری طرح پیٹ رہا تھا جبکہ اس کے ساتھ کھڑے مزید دو افراد بڑی دلچسپی سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے مرتضیٰ نے گاڑی کو تیزی سے ریورس کیا اور ڈیش بورڈ سے ریوالور اٹھا کر باہر نکل آیا مرتضیٰ کو ریوالور کے ساتھ آتا دیکھ کر دونوں تماشائی بھاگ گئے جبکہ اس عورت کو پیٹنے والے شخص کو مرتضیٰ پکڑ چکا تھا عورت زمین پر بیٹھی بری طرح رو رہی تھی اس کے سر سے اسکارف اتر چکا تھا اور گولڈن بال چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے اس عورت کی اس حالت نے مرتضیٰ سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب کر دی اور اس نے اس شخص کو بری طرح پیٹ ڈالا جو سر بازار ایک عورت کے سر سے چادر کھینچنے کا مرتکب ہوا تھا قبل اس کے کہ مرتضیٰ اس شخص کو جان سے ہی مار دیتا کہ اپنے قریب ابھرنے والی آواز سن کر اس کے ہاتھ ایک دم رک گئے کسی نے اسے بازو سے تھام کر روکنے کی کوشش کی تھی۔

"پلیز سر چھوڑ دیں اسے۔"

آواز سن کر اسے حیرت کا شدید ترین جھٹکا لگا اس نے فوراً ہی پلٹ کر دیکھا وہ یقیناً "لائبہ" تھی جسے وہ یوسف کی پریشانی میں یکسر فراموش کر چکا تھا اس کے ہاتھ رک چکے تھے لیکن اس نوجوان کا گریبان ابھی بھی مرتضیٰ کے ہاتھ میں تھا جسے آگے بڑھ کر لائبہ نے چھڑوایا۔

"کیوں پیٹ رہے تھے تم اسے بیچ سڑک پر۔"

مرتضیٰ نے اپنے رکنے کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا مرتضیٰ کو یاد آ گیا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جسے مرتضیٰ نے پہلی بار زینب مارکیٹ سے کچھ آگے دیکھا تھا۔

"یہ میری بیوی ہے اور میں اس کے ساتھ کچھ بھی کروں آپ کون ہوتے ہیں مجھے پوچھنے والے۔" نوجوان نے مرتضیٰ کی جانب تکتے ہوئے سوال کیا۔

"جو کچھ کرنا ہے گھر کے اندر کرو اگر آئندہ مجھے روڈ پر اس طرح کا ڈرامہ کرتے نظر آئے تو تمہیں نقص امن میں اندیشہ کے تحت اندر کر دوں گا یاد رکھنا۔"

مرتضیٰ نے غصے سے پھنکارتے ہوئے جواب دیا نوجوان کچھ دیر کھڑا اسے دیکھتا رہا پھر یک دم پلٹا اور لائبہ کو گھسیٹتا ہوا واپس اپنے اپارٹمنٹ کی جانب چل دیا اپنے شوہر کے ساتھ خاموشی سے چلتی ہوئی لائبہ نے پلٹ کر ایک نظر مرتضیٰ پر ڈالی اور وہ نظر مرتضیٰ شاہ کے دل کے اندر تک اتر گئی۔

☼ ☼ ☼

آج کا سارا دن بے تحاشا مصروفیت کی نذر ہو گیا تھا پہلے کورٹ پھر یوسف کی ڈیڈ باڈی اس کے گاؤں بھجوانا اور اس کے بعد تھانے میں اپنے فرائض کی انجام دہی یقینی طور پر مرتضیٰ بے تحاشا تھک چکا تھا اور فوراً گھر جا کر آرام کرنا چاہتا تھا لہذا جیسے ہی اپنی ڈیوٹی بھگتا کر وہ گھر پہنچا تو گھر میں پھیلے ہوئے سناٹے کو دیکھ کر اسے یاد آیا آج بڑے بابا کے گھر کوئی دعوت تھی جس کی اطلاع تائی جی نے خود مرتضیٰ کو فون کر کے دی تھی لیکن مرتضیٰ نے اپنی مصروفیات کے سبب معذرت کر لی تھی وہ شمامہ کو بھی اپنے نہ آنے کی اطلاع دے چکا تھا ابھی اسے گھر آئے بمشکل پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ باہر کال بیل بج اٹھی۔

"یہ کون آ گیا۔" مرتضیٰ نے نہانے کے لیے باتھ روم کی جانب بڑھتے ہوئے سوچا اور پھر تولیہ کندھے پر ہی ڈال کر باہر کی جانب چل دیا کیونکہ پر ہمیشہ موجود رہنے والا فرید خان آج ڈیوٹی پر نہ آیا تھا جبکہ سکینہ گھر والوں کے ساتھ ہی گئی ہوئی تھی لہذا مرتضیٰ کو خود ہی باہر کا گیٹ کھولنا تھا باہر نوید موجود تھا جس کے ہاتھ میں شام کے چند اخبارات تھے۔

"خیریت کوئی خاص خبر ہے۔"

مرتضیٰ نے نوید کے ستے ہوئے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے سوال کیا اتنی دیر میں نوید اندر داخل ہو چکا تھا اس نے مرتضیٰ کی بات کا کوئی جواب نہ دیا مرتضیٰ نے گیٹ بند کر دیا اور نوید کو لیتا ہوا اندر کی جانب چل دیا نوید لاؤنج میں رکھے ہوئے صوفہ پر بیٹھ گیا۔

"تم بیٹھو میں چائے کا کچھ کرتا ہوں۔"

"نہیں سر میں چائے نہیں پیوں گا بس آپ یہ خبر دیکھ لیں پھر میں واپس جاؤں گا۔"

نوید نے تھکے تھکے انداز میں اخبار کھول کر اس کے سامنے کر دیا یقیناً "وہ مرتضیٰ ہی تھا کسی شخص کو بیچ سڑک پر بری طرح پیٹتا ہوا" اور دوسری تصویر میں اس کا بازو تھامے کھڑی لائبہ اور نیچے لگی بظاہر ایک چھوٹی سی خبر۔

"ایک پولیس افسر نے اپنی معشوقہ کی خاطر اس کے شریف شوہر کو سر عام پیٹ ڈالا۔"

عام افراد کے لیے اخبار میں شائع ایک چھوٹی سی خبر کتنے خطرناک نتائج کی حامل تھی اس کا اندازہ مرتضیٰ نے ایک پل کے ہزارویں سیکنڈ میں ہی لگا لیا

اس نے بے اختیار نوید حیدر کی جانب دیکھا۔
"اب کیا ہوگا۔" نوید حیدر کے چہرے پر یہ سوال واضح طور پر درج نظر آرہا تھا۔ ایک ایسا سوال جس کا جواب مرتضیٰ کے پاس بھی نہ تھا۔
"تم گھر جاکر آرام کرو اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" مرتضیٰ نے نوید کے قریب ہی صوفہ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
"دراصل یار میں ایک برقعہ پوش لڑکی کی مدد کے خیال سے رکا تھا میرا یقین کرو اگر وہ برقعہ میں نہ ہوتی تو یقیناً میں وہاں کبھی بھی نہ رکتا۔" مرتضیٰ نے اپنی صفائی دیتے ہوئے کہا۔
"بہرحال اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"
مرتضیٰ کا ہوشیار، شاطر اور خطرناک دشمن اس کی پشت پر بڑی کامیابی سے دوسرا وار کرچکا تھا اور اب مرتضیٰ پر فرض تھا کہ اس کا قرض سود سمیت اسے لوٹاتا اور یقیناً وہ ایسا ہی کچھ کرنے کا ارادہ کرچکا تھا۔

☆ ☆ ☆

صبح حسب معمول مرتضیٰ کی باس کے آفس میں پیشی تھی جہاں باجوہ صاحب نہایت ہی غصے کے عالم میں شام کے اخبار کھولے بیٹھے تھے مرتضیٰ جانتا تھا کہ صفائی میں کچھ بھی کہنا بے کار ہے اس لئے خاموشی سے ان کی ہر بات سنتا رہا اور پھر یس سر کی گردان کئے چلا گیا باہر نکلتے ہی شامہ کا فون آگیا وہ جانتا تھا کہ یہ خبر شامہ تک بھی پہنچ چکی ہے اس لئے اس نے نہایت خاموشی سے فون ریسیو کیا اور شامہ کو اپنے ساتھ پیش آنے والا پورا واقعہ مکمل جزئیات کے ساتھ سنا دیا چونکہ شامہ ایک سمجھ دار اور سلجھی ہوئی لڑکی تھی اس لئے اسے سمجھانے میں مرتضیٰ کو زیادہ وقت نہ لگا اور وہ جلد ہی ساری بات سمجھ گئی اور فون بند کرنے سے قبل مرتضیٰ کو اپنا بہت زیادہ خیال رکھنے کا کہا شامہ کا لہجہ اس بات کا گواہ تھا کہ وہ مرتضیٰ کے لئے دلی طور پر پریشان ہوئی ہے اور اس کی پریشانی نے مرتضیٰ کے دل میں اس کی محبت اور قدر میں مزید اضافہ کردیا یقیناً"

مرتضیٰ کا ساتھ ایسی ہی لڑکی دے سکتی تھی جو اس کی تمام پروفیشنل مجبوریاں سمجھ سکے اور شامہ یقینی طور پر ایسی ہی ایک لڑکی تھی۔
شام میں جب مرتضیٰ گھر پہنچا تو سامنے ہی برآمدے میں کرسی پر بیٹھے مصطفیٰ صاحب دکھائی دیئے۔
"السلام علیکم" مرتضیٰ ان ہی کی جانب آگیا۔
"وعلیکم السلام کیا بات ہے آج تم کچھ جلدی گھر نہیں آگئے۔"
پتہ نہیں مصطفیٰ صاحب نے طنز کیا تھا یا مرتضیٰ کو ہی ایسا محسوس ہوا بہرحال وجہ جو بھی تھی اپنے باپ کو مطمئن کرنا مرتضیٰ کے اولین فرائض میں شامل تھا اسی لئے جواباً اس نے اپنے پچھلے دنوں کی مصروفیات کا احوال من و عن سنا دیا اسی گفتگو کے دوران رابعہ بیگم بھی آئیں اور خاموشی سے دونوں باپ بیٹا کے لئے چائے رکھ کر چلی گئیں جو کہ مرتضیٰ کے لئے خاصی حیرت کی بات تھی۔
"یہ امی کو کیا ہوا؟" مرتضیٰ نے بے اختیار ہی سوچا۔
"مجھے کیوں اس طرح نظر انداز کررہی ہیں۔" اور جلد ہی اسے اپنی سوچ کا جواب بھی مل گیا۔
"یہ اخبار میں تمہاری تصویر آئی ہے۔" مصطفیٰ صاحب نے اپنے سامنے ٹیبل پر رکھے ہوئے اخبارات سے ایک اخبار الگ کرکے اس کی جانب بڑھایا اس جانب تو مرتضیٰ کا خیال ہی نہیں گیا تھا وہ تو مطمئن تھا کہ اتنا غیر معروف اخبار تو کبھی اس کے گھر آیا ہی نہیں تو بابا جان کو کیسے پتہ چلے گا۔
"یہ اخبار میں نے خود نہیں خریدا بلکہ ابھی کچھ دیر قبل کوریئر سروس کا ایک نمائندہ ہمارے گھر پہنچا کر گیا ہے اور تمہاری خبر کے گرد باقاعدہ رنگین حاشیے لگا کر اسے ہائی لائٹ کیا گیا ہے۔" مصطفیٰ صاحب شاید مرتضیٰ کے دل کا حال جان چکے تھے اسی لئے تفصیلی وضاحت کرتے ہوئے بتایا جواب میں مرتضیٰ نے کل صبح پیش آنے والا واقعہ پوری جذئیات کے ساتھ سنا ڈالا لیکن اس کے بعد جو کچھ مصطفیٰ صاحب نے بتایا وہ

اس کے لئے زیادہ حیران کن تھا۔
"یہ اخبار کی خبر کو تو شاید میں اتنی اہمیت نہ دیتا لیکن اصل مسئلہ تو آج صبح گھر کے نمبر پر آنے والا کسی اجنبی شخص کا فون تھا جس نے تمہاری امی سے شکایت کی ہے کہ تم اس کی بیوی کو ورغلانے کا سبب بن رہے ہو وہ شخص نہایت خوف زدہ تھا اس کا کہنا تھا کہ تم اپنے عہدے کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے تنگ کررہے ہو۔" مرتضیٰ نے کچھ کہنا چاہا لیکن مصطفیٰ صاحب نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔
"میں جانتا ہوں کہ تمہارے آس پاس دوست کم اور دشمن زیادہ ہیں اسی لئے باپ ہونے کے ناتے میرا تمہیں بہترین مشورہ بلکہ حکم ہے کہ معاشرے میں جو کچھ جیسے ہورہا ہے ویسے ہی ہونے دو اس اس معاشرے میں تبدیلی چند لوگوں کی کوشش سے نہیں آسکتی کیوں دریا میں رہتے ہوئے مگرمچھوں سے بیر باندھ رہے ہو یقین مانو اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا الٹا ہمارا نقصان ہی ہوگا۔"
دکھ مصطفیٰ صاحب کے لہجے میں بول رہا تھا اور اسی لئے مرتضیٰ نے دل ہی دل میں پکا عہد کرلیا کہ اب برائی کا سدباب کرنے والے قدموں کو روکنا نہیں ہے۔

☆ ☆ ☆

مرتضیٰ کو کچھ دن قبل اپنے موبائل پر ایک میسج موصول ہوا تھا جو غالباً کسی لڑکی کا تھا جس نے ایک پتہ دیتے ہوئے مرتضیٰ سے مدد کی درخواست کی تھی لیکن ان دنوں مرتضیٰ خود لائبہ اور یوسف کے چکر میں بری طرح الجھا ہوا تھا اسی لئے چاہتے ہوئے بھی اس پیغام کو قابل توجہ نہ جانا لیکن اب اچانک ہی رات کے آخری پہر موصول ہونے والے اسی طرز کے ایک پیغام نے مرتضیٰ کی تمام حسیات کو بیدار کردیا اور صبح بیدار ہوتے ہی مرتضیٰ نے نوید حیدر کے ساتھ خود جاکر اس بنگلہ کو چیک کیا جس کا پتہ دو دفعہ مرتضیٰ کو موبائل کے ذریعہ دیا گیا تھا آس پاس سے لی جانے والی معلومات کے مطابق یہ بنگلہ غیر قانونی سرگرمیوں کا مرکز رہا تھا یہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی تھیں بنگلہ کی مالک جیا خان بظاہر ایک پارلر چلاتی تھی لیکن پارلر کی آڑ میں وہ لڑکیوں کا کاروبار کرتی تھی جس کی پشت پناہی اعلا حکومتی عہدیدار کرتے تھے مرتضیٰ کے لئے اتنی اطلاع ہی کافی تھی اس نے فوراً متعلقہ تھانہ فون کرکے موبائل منگوائی اور پھر خود نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ بلا خوف و خطر بنگلہ میں گھستا چلا گیا اور جلد ہی وہاں موجود تمام لڑکیوں کو مرتضیٰ نے ایک بڑے ہال میں جمع کیا ان میں ہی شاید وہ لڑکی بھی تھی جس نے مرتضیٰ کو مدد کے لئے پکارا تھا لیکن اس وقت اس لڑکی کی تلاش مرتضیٰ کا مقصد نہ تھا۔
مرتضیٰ کی اس کارروائی کی جیا آنٹی کو سخت چراغ پا کیا اور اس نے فوراً ہی اپنے تعلقات کی ڈوریاں ہلانی شروع کردیں لیکن اس سے قبل کہ مرتضیٰ کو کسی کا فون آتا اس نے اپنا موبائل آف کردیا یہ لڑکیاں پاکستان کے مختلف علاقوں سے نوکری کے بہانے یہاں لائی گئیں تھیں اور پھر انہیں مجبور کرکے جسم فروشی جیسے گھناؤنے کاروبار سے منسلک کردیا گیا تھا کسی بھی اعلا افسر کی مداخلت سے قبل وہاں میڈیا والے پہنچ چکے تھے اور ایسا یقیناً مرتضیٰ شاہ کے ایما پر کیا گیا تھا کیونکہ وہ میڈیا کی موجودہ طاقت سے بہ خوبی واقف تھا۔
وہاں سے بازیاب ہونے والی اکثر لڑکیوں کو ان کے گھر پہنچادیا گیا تھا کچھ "دارالامان" چلی گئیں کیونکہ ان کے گھر والوں نے انہیں قبول کرنے سے انکار کردیا تھا جیا آنٹی کو فوری طور پر کسی اہم شخصیت کے فون آنے پر چھوڑ دیا گیا تھا ویسے بھی جیا آنٹی کو تھانے میں رکھنے کا کوئی فائدہ نہ تھا کیونکہ ان جیسی عورتوں کی ڈوریاں اور کہیں سے ہلائی جاتی ہیں اور ان کی واقفیت ایک تھانے تک سے زیادہ نہیں ہوتی اور مرتضیٰ کا مشن ان ہاتھوں کی تلاش تھا جو ان کٹھ پتلیوں کو نچاتے تھے۔

☆ ☆ ☆

آج اس کی نائٹ ڈیوٹی تھی وہ موبائل پر پورے

علاقے کا گشت لگانے کے بعد ابھی ابھی تھانے پہنچا تھا گرمی کی شدت سے اس کے یونیفارم کی شرٹ پسینے سے بھیگ چکی تھی اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی فل اسپیڈ سے پنکھا چلا دیا۔

"گل شیر۔"

"جی صاحب۔" سولہ سترہ سالہ گل شیر مرتضیٰ کا رکھا ہوا ملازم لڑکا تھا جو مرتضیٰ کی ڈیوٹی کے اوقات میں یہیں موجود ہوتا تھا اور بھاگ بھاگ کر اس کے سارے کام سرانجام دیتا تھا۔

"یار جلدی سے ٹھنڈا پانی تو پلاؤ۔"

مرتضیٰ نے اپنی شرٹ کے بٹن کھول دیے اور کرسی کو پیچھے کے نیچے کر کے بڑی آرام دہ حالت میں بیٹھ گیا گل شیر فوراً" ہی ٹھنڈے پانی کی بوتل لے کر واپس آگیا۔

"صاحب اب تو کافی رات ہو چکی ہے آپ بھی اندر کمرے میں اے سی چلا کر آرام کریں۔"

"تم جاؤ میں یہیں ٹھیک ہوں۔" مرتضیٰ نے دوسری کرسی کھینچ کر اس پر اپنی ٹانگیں پھیلائیں اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں نہ جانے کیوں آج کل جب بھی وہ آنکھیں بند کر کے شمع کو تصور میں لانے کی کوشش کرتا لاشعوری طور پر بند آنکھوں کے پیچھے لائبہ کا چہرہ آجاتا ابھی بھی ایسا ہی ہوا۔

"صاحب آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔"

کانسٹیبل نے گھنٹی بجا کر مرتضیٰ کو متوجہ کیا۔

"کون ہے اندر بھیج دو۔" اس نے جلدی سے کھڑے ہو کر اپنے یونیفارم کو درست کرتے ہوئے کہا۔

"کوئی خاتون ہیں باہر ٹیکسی میں بیٹھی ہیں اندر آنے سے انکاری ہیں۔"

"تو۔" اس کا انداز قدرے ناگواری لیے ہوئے تھا۔

"آپ کو باہر بلا رہی ہیں۔" کانسٹیبل نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

"نوید سے کہو دیکھے جا کر کون ہے؟" مرتضیٰ دوبارہ کرسی پر بیٹھ چکا تھا اور کسی قسم کا کوئی رسک لینے کو تیار نہ تھا۔

"نوید صاحب تو شاید گھر چلے گئے ہیں ویسے بھی صاحب انہوں نے آپ ہی کا نام لیا ہے۔"

"تو ٹھیک ہے جو کوئی بھی ہے اسے کہو اندر آ کر بات کرے۔"

"میرا خیال ہے سر آپ آن ڈیوٹی ہیں اور اس وقت اگر کوئی ضرورت مند آپ کو پکارے تو آپ کا جواب انکار میں نہیں ہونا چاہیے۔"

برقعہ میں ملبوس اس کی صرف آنکھیں ہی دکھائی دے رہی تھیں لیکن آواز بلاشبہ لائبہ عرف لیلیٰ کی تھی۔

"بیٹھ جائیں اور پھر بتائیں کیا پرابلم ہے آپ کے ساتھ۔"

کانسٹیبل مرتضیٰ کے اشارے پر باہر جا چکا تھا۔

"آپ کو جبار خان کے خلاف کامیاب کارروائی کی مبارک باد دینی تھی ویسے اب آپ اس سے ہوشیار رہیے گا اس کا رابطہ بڑے خطرناک لوگوں سے ہے۔"

"ابھی تو فی الحال مجھے آپ سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔" مرتضیٰ نے ایک نظر لائبہ کے چہرے پر ڈالی جو اب اپنا نقاب ہٹا چکی تھی۔

"ویسے میں پوچھ سکتا ہوں آج کی اس ملاقات کی تشہیر آپ اخبار کے ذریعے کریں گی یا نیٹ پر تصاویر ڈالیں گی ویسے میرا خیال ہے کہ اب میری اور آپ کی یہ ملاقات ٹی وی کے ذریعے نشر کی جائے گی۔"

"نہیں سر ایسا کچھ نہ ہوگا بشرطیکہ آپ اپنے ماتحت عملے کو میری آمد کی اطلاع نہ دیں۔" مرتضیٰ اس کی بات سمجھ نہ پایا۔

"سر یہ ایک ایڈریس ہے یہاں بھی کچھ اغوا شدہ لڑکیاں ہیں جو اندرون شہر سے لائی گئی ہیں اور جلد از جلد انہیں باہر بھیجنے کی تیاری کی جا رہی ہے اگر ممکن ہو تو ان کی مدد ضرور کیجیے گا۔"

لائبہ نے ایک کاغذ کا ٹکڑا مرتضیٰ کی جانب بڑھایا

جسے اس نے خاموشی سے تھام لیا یہ ایڈریس اس کے قریبی علاقہ کا ہی تھا۔

"اس کا مطلب ہے مجھے پہلے بھی ایس ایم ایس تم نے کیے تھے۔"

"جی سر۔"

"مگر کیوں؟ تم کیوں میری مدد کرنا چاہتی ہو جب کہ تم خود اسی کارواں کا حصہ ہو۔"

"اسی لیے سر کہ میں خود تو برباد ہو چکی ہوں لیکن یہ نہیں چاہتی کہ دوسری شریف لڑکیوں کی زندگی بھی میری طرح ایک گالی بن جائے اگر تباہ ہونے سے قبل کوئی ایک لڑکی بھی میری بدولت بچ جائے تو مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہیے۔"

لائبہ کی آواز بھرا گئی اور اس کا یہ بھیگا ہوا لہجہ مرتضیٰ کے دل میں اتر گیا۔

"تم خود کیوں کرتی ہو یہ سب چھوڑ کیوں نہیں دیتیں۔"

"نہیں چھوڑ سکتی آپ جانتے ہیں شاہ جی میری بیوہ ماں اور بہنیں یہ سمجھتی ہیں کہ میں شہر میں اپنے شوہر کے ساتھ ایک خوشحال زندگی گزار رہی ہوں اور میرا شوہر ہے۔" اس نے نفرت سے زمین پر تھوکا۔

"عورتوں کا دلال اس نے تو مجھے نہ چھوڑا کسی اور عورت کو کیسے بخشے گا بہرحال شاہ جی اب میں چلتی ہوں بڑی مشکل سے آپ تک پہنچی ہوں ہو سکے تو میرا یہ کام بھی ضرور کیجیے گا۔" لائبہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بات سنو تم پتہ ہے مجھے ایس ایم ایس بھی کر سکتی تھیں پھر کیوں اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر یہاں تک آئی ہو۔"

"صرف آپ سے ملنے" "آپ کو دیکھنے آپ جانتے ہیں؟" وہ دھیما سا ہنسی۔

"اگر آپ کو کچھ دن نہ دیکھوں تو سمجھیں مر ہی جاؤں گی میں۔"

مرتضیٰ کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلا وہ کسی بت کی مانند اپنی جگہ بیٹھا رہ گیا اچانک لائبہ جاتے جاتے واپس پلٹی۔

"شاہ جی میں آپ سے محبت کرنے لگی ہوں ایک ایسی محبت جس کا کچھ حاصل نہیں لیکن مجھے کچھ چاہیے بھی نہیں میں تو آپ کی محبت کی طلب گار بھی نہیں ہوں۔" وہ ہولے سے ہنسی ایک ایسی ہنسی جو آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔

"بات سنو لائبہ۔" مرتضیٰ خود پر اختیار کھو بیٹھا۔ "چھوڑ دو یہ سب۔" "چھوڑ دوں پر کس کے لیے۔"

"میرے لیے میں تمہیں سہارا دوں گا کیونکہ میں جانتا ہوں تم ایک اچھی لڑکی ہو۔" جانے اس پل مرتضیٰ کو کیا ہو گیا تھا وہ بے اختیار ہی اپنا آپ ہار گیا تھا۔

"میرے لیے لفظ "اچھی لڑکی" اتنا قیمتی ہے کہ ساری زندگی اس کے سہارے گزار لوں گی لیکن آپ کا سہارا مجھے اس دلدل سے باہر نہیں نکال سکتا جس میں میں گوڈے گوڈے دھنس چکی ہوں جانتے ہیں شاہ جی آپ میرا سہارا بن بھی نہیں سکتے کیونکہ میرے آس پاس تو بڑے ہی کانٹے ہیں جو آپ کو چھلنی چھلنی کر دیں گے۔"

"تم صرف ہاں کر دو لائبہ میں سب کچھ بھگت لوں گا۔" مرتضیٰ اس کے مقابل کھڑا ہو چکا تھا۔

"سب کچھ کیسے بھگتیں گے شاہ جی جانتے ہیں میں ایک شادی شدہ عورت ہوں۔" لائبہ نے جیسے مرتضیٰ کے جلتے ہوئے جذبات پر پانی انڈیل دیا یہ تو اس نے سوچا ہی نہ تھا۔

"مجھے فراز بھٹی کبھی طلاق نہ دے گا میں تو سونے کا انڈہ دینے والی مرغی ہوں اس کے لیے پھر کیا آپ میری خاطر کورٹ جانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔" اس نے مرتضیٰ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے سوال کیا اور جواب مرتضیٰ کے چہرے پر درج تھا لائبہ نے برقع کے اسکارف سے اپنی آنکھیں صاف کیں اور پھر اپنا چہرہ مکمل طور پر ڈھک لیا اور بے اختیار ہی مرتضیٰ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"بھول جائیں شاہ جی جو میں نے آپ سے کہا تھا بھلا کوئی طوائف بھی کبھی محبت کر سکتی ہے؟ ہم تو پیسے

کی خاطر ہر رات محبوب بدلنے والے لوگ ہیں ویسے بھی شمامہ ایک اچھی اور محبت کرنے والی خاندانی لڑکی ہے اسے دھوکا نہ دیں اور ہاں شاہ جی میرا آپ کو ایک قیمتی مشورہ ہے کبھی کسی طوائف پر اعتبار مت کیجئے گا بے شک وہ طوائف میں ہی کیوں نہ ہوں۔"

یہ سب کہہ کر وہ رکی نہیں اور نہ ہی اس نے پلٹ کر دیکھا بلکہ جلد ہی وہ دروازے کی چوکھٹ پار کرکے کالی رات کا حصہ بن گئی یہ جانے بغیر کہ اس کے پیچھے کھڑا شخص جو فقط شاہ جی پر اپنا سب کچھ ہار گیا تھا اب شاید اس کا مردہ دل کسی کی بھی محبت کے لئے دوبارہ کبھی زندہ نہ ہو سکے شاید کبھی نہ کیونکہ ایک طوائف کی محبت اس کی زندگی کا روگ بن چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

ستارے ٹوٹ جاتے ہیں
کبھی سنگ سفر بھی آدمی سے روٹھ جاتے ہیں
وفا کو بے وفا اور بے وفا کو باوفا ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے
کوئی کچھ کہہ نہیں سکتا۔

آنے والا مختصر سا پیغام کس کا تھا، بنا نام کے ہی جان چکا تھا۔

"کس کا میسج ہے؟" شمامہ نے سیب کے چھلکے اتار کر پلیٹ میں رکھے اور پلیٹ مرتضیٰ کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"ایک دوست کا۔" اس نے مختصر سا جواب دے کر آنکھیں موند لیں۔

وہ پچھلے ایک ہفتے سے اسپتال میں تھا اسی دن صبح لائبہ کی دی ہوئی اطلاع کے مطابق مرتضیٰ نے مکمل تیاری کے ساتھ اس بنگلے پر چھاپہ مارا تو میڈیا کی پوری ٹیم اس کے ساتھ تھی اور اس چھاپے میں جہاں اس نے ان معصوم لڑکیوں کو بازیاب کیا جو جلد ہی عرب ممالک اسمگل ہونے والی تھیں وہیں مرتضیٰ کو ایک اہم سیاسی شخصیت بھی اسی بنگلے پر موجود مل گئی جو یقیناً "مرتضیٰ کے لئے ایک بڑی کامیابی تھی وہ شخص جس کا نام چوہدری دلاور تھا مرتضیٰ کے ہمراہ میڈیا کی آمد کو مس کر گیا اور فوری طور پر مرتضیٰ کو مختلف طرح کے لالچ دیے کہ اسے میڈیا کے سامنے پیش نہ کرے بلکہ خاموشی سے یہاں سے نکل جانے دے لیکن مرتضیٰ نے اپنی آنکھیں اور کان مکمل طور پر بند کرلئے تھے رشوت میں ناکام ہو کر وہ شخص یعنی چوہدری دلاور دھمکیوں پر اتر آیا لیکن مرتضیٰ ان دھمکیوں سے ڈرنے والا نہ تھا کامیاب چھاپہ، پھر ایک کامیاب پریس کانفرنس آج کا دن مرتضیٰ کے کیریئر کا ایک بہترین دن تھا ایسے میں جب وہ آدھی رات کو کامیابی کے نشے میں سرشار گھر کی طرف واپس آرہا تھا کہ اچانک مخالف سمت سے آنے والے تیز رفتار ٹرک نے مرتضیٰ کی گاڑی کو بری طرح روند ڈالا وہ تو قسمت اچھی تھی کہ اس نے اپنی جانب بڑھتے اس ٹرک کو چند سیکنڈ قبل ہی دیکھ لیا تھا لہٰذا فوری طور پر اپنے بچاؤ کی کوشش کرتے ہوئے گاڑی کو فٹ پاتھ پر چڑھا دیا تھا لیکن پھر بھی گاڑی اور مرتضیٰ کو کافی نقصان پہنچا تھا مرتضیٰ کی ٹانگ میں دو جگہ سے فریکچر ہوگیا تھا جس کی بنا پر وہ پچھلے دس دن سے اسپتال میں داخل تھا۔

مرتضیٰ کے گھر والے حادثے کی اطلاع ملتے ہی فوری طور پر سرکاری اسپتال آگئے تھے جہاں سے جلد ہی مصطفیٰ صاحب نے اپنے ذاتی خرچے پر مرتضیٰ کو ایک مہنگے پرائیویٹ اسپتال میں منتقل کروا دیا تھا مرتضیٰ کی شادی کی تاریخ بھی فی الفور ایک ماہ آگے کردی گئی تھی اور یہ خبر مرتضیٰ نے بڑے بے تاثر چہرے کے ساتھ سنی مرتضیٰ جو کچھ عرصہ قبل شمامہ کے ساتھ کا جلد از جلد خواہش مند تھا اب جانے کیوں یہ خواہش مرتضیٰ کے اندر ہی کہیں دم توڑ چکی تھی کبھی شمامہ کے بن گزرنے والا ایک ایک پل مرتضیٰ کے لئے سوہان روح تھا اور آج۔۔۔ جو کبھی شمامہ مرتضیٰ کی نظروں کے سامنے ہوتی تو اسے اپنا پور پور شمامہ کی محبت میں ڈوبا ہوا محسوس ہوتا لیکن جیسے ہی شمامہ اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوتی جانے کیسے اس کے خیالوں میں لائبہ کا بسیرا ہو جاتا۔

ابھی بھی وہ لائبہ کا ہی سوچ رہا تھا کہ جانے کس حال میں ہوگی کہ اچانک سیل کی طرف سے ملنے والے پیغام نے مرتضیٰ شاہ کو زندگی کی نوید سنا دی اس پیغام کے ملنے سے کچھ دیر قبل ہی حاجی نور خان بھی مرتضیٰ کی عیادت کے لئے اسپتال آئے تھے اور ان کی آمد نے مرتضیٰ کو کافی حیران کیا تھا کیونکہ مرتضیٰ کے خیال میں ان کا مرتضیٰ سے کوئی ایسا قریبی تعلق نہ تھا جس کی بنا پر وہ مرتضیٰ کی عیادت کے لئے اسپتال آنے کی زحمت کرتے اور اگر وہ آہی گئے تھے تو یہ یقیناً "ان کا بڑا پن تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ وہی لڑکی ہے نا جس کی نیٹ پر آپ کے ساتھ تصاویر آئی تھیں۔"

وہ گھر آچکا تھا پلستر کھل گیا تھا لیکن ابھی چلنے میں تھوڑی دشواری تھی ایسے میں شمامہ اکثر ہی اس کے پاس ہوتی اس کا ہر دم خیال رکھتی اور سچ تو یہ تھا کہ شمامہ کی اس بے لوث محبت اور خدمت نے مرتضیٰ کو بھی بہت شرمسار کیا تھا اور ابھی ایک ماہ میں اس نے لائبہ کو بھلانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی جبکہ لائبہ کی طرف سے بھی مکمل خاموشی تھی اس کا کوئی پیغام مرتضیٰ کے نام نہ آیا تھا مرتضیٰ نے شمامہ کے ہاتھ میں پکڑا ہوا اخبار خاموشی سے تھام لیا اور وہ پولیس والے لائبہ اور ایک اجنبی نوجوان تصویر میں موجود تھے۔

"مشہور کال گرل لیلیٰ اپنے عاشق عباس نیازی کے ساتھ سی ویو پر سرعام رنگ رلیاں مناتے ہوئے گرفتار۔ گرفتاری کے وقت دونوں نشہ کی حالت میں تھے۔"

مرتضیٰ نے اخبار پر ایک نظر ڈال کر تاریخ دیکھی اور دل ہی دل میں حساب لگایا یہ خبر دو دن قبل کی تھی۔

"میں تھوڑی دیر سونا چاہتا ہوں۔" شمامہ سمجھ گئی کہ اس وقت اسے مکمل تنہائی درکار ہے سو بغیر کوئی جرح کیے خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل گئی مرتضیٰ نے اسے دور تک جاتے دیکھا اور اس کے باہر نکلتے ہی اپنا سیل اٹھالیا نوید حیدر سے رابطہ ہوتے ہی اسے متعلقہ تھانے پہنچنے کی ہدایت دیتے ہوئے یہ بھی واضح کیا کہ لائبہ کی رہائی اس کا بنیادی مقصد ہے اور شام کو ملنے والی نوید حیدر کی رپورٹ کے مطابق لائبہ کو تو اسی رات کسی اہم شخصیت کے ایما پر چھوڑ دیا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو چکا تھا شام کو مقامی ہوٹل میں اس کی اور شمامہ کی رسم حنا تھی جس کی تمام تیاری اس نے خود اپنی نگرانی میں کروائی تھی اب وہ دلی طور پر عہد کر چکا تھا کہ لائبہ نامی ورق اسے اپنی کتاب زندگی سے پھاڑ دینا ہے کیونکہ اسی میں اس کی اور شمامہ کی بھلائی تھی اسی عہد کے ساتھ شام سے ہی وہ ہوٹل میں موجود تھا پورے ہال کو گیندے اور گلاب کے پھولوں کے حسین امتزاج سے سجایا گیا تھا کیونکہ عصر اور مغرب کے درمیان مایوں کی رسم تھی اور پھر رسم حنا شمامہ پیلے اور ریڈ لباس میں ملبوس ہوٹل پہنچ چکی تھی مایوں کی رسم میں صرف خاندان ہی کے افراد مدعو تھے جو تقریباً "تمام کے تمام ہوٹل پہنچ چکے تھے اور تھوڑی ہی دیر میں رسم کا باقاعدہ آغاز ہونے والا تھا جب مرتضیٰ کے موبائل پر کسی انجان نمبر سے پیغام آیا۔

"مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔" بنا نام کے ہی وہ جان سکتا تھا کہ پیغام بھیجنے والا کون ہے۔

"کیوں؟ خیریت؟" مرتضیٰ نے مختصر سا جواب پیغام لکھ کر بھیج دیا۔ پیغام بھیجنے کے بعد اس نے کافی دیر انتظار کیا لیکن کوئی جواب نہ آیا مغرب کی نماز پڑھتے ہی مایوں کی رسم کا آغاز کردیا گیا۔

ہر طرف بھرپور رونق تھی سب ہی لوگ اس رسم کو بھرپور انداز سے انجوائے کر رہے تھے ہر طرف روشنیاں اور خوشبو بکھرے ہوئے تھے سعاد اور اس کے دوست مل کر ہنگامہ ڈال رہے تھے شمامہ کے تمام ددھیال والے بھی سب رنجشیں بھلائے شمامہ کے سرپرست ہونے کا بھرپور حق ادا کر رہے تھے سب کچھ ٹھیک تھا لیکن جانے کی بات تھی مرتضیٰ کا دل اس شور

ہنگامے سے گھبرا رہا تھا اسے لگ رہا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہے لیکن کیا وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا اسی شور ہنگامے میں رات کے دس بج گئے اب مہندی کے مہمان بھی آنا شروع ہو چکے تھے مایوں کے بعد مہندی کی رسم کا آغاز ہو چکا تھا اس ایک پیغام کے بعد لائبہ کا کوئی دوسرا پیغام نہ آیا تھا لیکن جانے کیوں مرتضیٰ کے دل کی بے چینی کم ہونے میں نہ آ رہی تھی وہ سفید شلوار قمیص میں ملبوس نظر لگ جانے کی حد تک خوبصورت لگ رہا تھا۔

ثمامہ بھی رسم حنا کے لیے لباس تبدیل کر کے اسٹیج پر آ چکی تھی اب وہ گرین چوڑی دار پاجامے اور ریڈ شرٹ کے ساتھ جامہ وار کا بڑا سا ریڈ اور گرین خوبصورت کڑھائی والا دوپٹہ اوڑھے ہوئے تھی ثمامہ کے دائیں طرف ہانیہ موجود تھی جو جانے ثمامہ کے کان میں کیا کہہ رہی تھی وہ بڑی بے دھیانی کے عالم میں سے سارا منظر دیکھ رہا تھا کہ اچانک ہی اس کا موبائل بج اٹھا اسکرین پر آنے والا نمبر قطعی اجنبی تھا اس سے پہلے کہ وہ فون ریسیو کرتا موبائل فون خاموش ہو چکا تھا تبھی وہ فون ہاتھ میں لیے باہر آ گیا اور اسکرین پر موجود مس کال کو ری ڈائل کیا چند سیکنڈ کے بعد فون ریسیو کر لیا گیا۔

"ہیلو۔" دوسری طرف یقیناً لائبہ تھی۔

"کیا بات ہے؟" مرتضیٰ نے نہایت ہی دھیمی آواز میں سوال کیا۔

"پلیز شاہ جی میری مدد کریں مجھے اس زندان سے نکالیں وہ بے غیرت مجھے دوبئی کے کسی شیخ کو بیچ رہا ہے پلیز مرتضیٰ شاہ مجھے اس عذاب سے بچا لو ورنہ یاد رکھنا میں خودکشی کر لوں گی کیونکہ اس سے زیادہ اذیت میں اب نہیں سہہ سکتی۔"

لائبہ نے گھٹی گھٹی آواز میں روتے ہوئے کہا مرتضیٰ اس وقت ایسی کسی صورت حال کے لیے خود کو تیار نہ پا رہا تھا لیکن جانے کیسے اس کے منہ سے خود بخود یہ الفاظ ادا ہوئے۔

"اپنا ایڈریس میسج کرو میں آتا ہوں۔"

اور اگلے پانچ منٹ میں اسے سپر ہائی وے پر بنے ہوئے یونیورسل ہائٹس کا ایڈریس موصول ہو چکا تھا مرتضیٰ خاموشی سے ہال میں واپس آ گیا اور جیسے تیسے اس نے مہندی کی رسم کی ادائیگی کروائی کھانا شروع ہونے میں ابھی مزید گھنٹہ لگ سکتا تھا ایسے میں وہ سعاد کو کھانے کے سلسلے میں کچھ ضروری ہدایات دیتا ہوا باہر آ گیا پارکنگ میں کھڑی ہوئی اپنی گاڑی نکالی اور ہائی وے پر جانے والی روڈ کی طرف ڈال دی سردیوں کے دن تھے اور رات بارہ بجے بھی شہر پر کالی حد تک سناٹے کا راج تھا کئی سڑکوں پر اسٹریٹ لائٹ بند ہو چکی تھیں۔

"میں جیسے ہی پہنچوں تم تیار ہو کر باہر آ جانا میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" لائبہ کو میسج سینڈ کر کے وہ تیزی سے یونیورسل ہائٹس کی جانب بڑھ گیا پوری بلڈنگ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی شاید لائٹ نہیں تھی یا پھر ابھی بلڈنگ میں آبادی کم تھی گیٹ سے اندر داخل ہونے کے لیے اس نے باہر موجود سیکیورٹی گارڈ کو اپنا پولیس کارڈ دکھایا اور لائبہ کے بتائے ہوئے اپارٹمنٹ کے سامنے پہنچ کر اس کے موبائل پر فون کیا۔

"جلدی سے باہر آ جاؤ۔" فوراً ہی دروازہ کھول کر لائبہ باہر آ چکی تھی۔

"شاہ جی پلیز پانچ منٹ کے لیے اندر آ جائیں میں اپنا بیگ لے لوں۔"

وہ برقعہ میں ملبوس تھی غالباً اس کی تیاری مکمل تھی اور نہ چاہتے ہوئے بھی مرتضیٰ شاہ نے اپنے قدم اندر رکھ دیے اور یہ ہی اس کی زندگی کی سب سے بڑی اور شاید آخری غلطی تھی۔

"آپ اندر کمرے میں چلیں میں باتھ روم سے ہو کر آتی ہوں ایسا نہ ہو عین ٹائم پر میرا شوہر آ جائے اس لیے پلیز شاہ جی اندر چلے جائیں۔"

مرتضیٰ کو تذبذب کی کیفیت میں گرفتار دیکھ کر اس نے بڑے ملتجانہ انداز میں کہا اور مرتضیٰ تیزی سے اندر کمرے میں داخل ہو گیا لیکن کمرے کا دروازہ

کھولتے ہی اس کے قدم اپنی جگہ ساکت ہو چکے تھے اور سامنے موجود شخصیات کو دیکھتے ہی مرتضیٰ کو حالات کی سنگینی کا اندازہ ہو چکا تھا یقیناً مرتضیٰ شاہ کو مکمل پلاننگ سے گھیر لیا گیا تھا وہ تیزی سے واپسی کے لیے پلٹا تو دروازے پر ریوالور کے ساتھ فراز بھی ایستادہ تھا اب مرتضیٰ کے لیے کوئی راہ فرار نہ تھا۔

"آئیے آئیے انسپکٹر صاحب محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے جی آپ جیسے شاطر بندے بھی اس محبت نامی چڑیا کے ہاتھوں دھوکہ کھا سکتے ہیں یقین تو نہیں آتا۔" نور خان نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

"کیا بکواس ہے یہ؟ کیوں بلایا ہے مجھے تم لوگوں نے اس طرح دھوکے سے۔"

مرتضیٰ نے اپنے لہجہ کو حتی الامکان مضبوط بناتے ہوئے کہا وہ نور خان کے اطراف کھڑے ہوئے اسلحہ بردار گارڈز کو دیکھ چکا تھا جن کے سامنے اس کی کمر سے لگا ریوالور کوئی حیثیت نہ رکھتا تھا۔

"جلدی کیا ہے یار مرنے سے پہلے سب کچھ بتا دیں گے دیکھو بھی ہم نے تو تمہاری جوانی پر بھی ترس کھایا بڑی کوشش کی تمہیں سمجھانے کی پر تم کہاں پیچھا تو باز ہی نہ آئے اب بتاؤ بھلا منشیات نہ بیچو چلو نہیں بیچتے گاڑی چوری نہ کرو نہیں کرتے پلاٹوں پر قبضہ نہ کرو عورتوں کا دھندا بند کرو جوئے خانہ نہ چلاؤ اب یار اگر ہم کچھ نہیں کریں تو ہمیں کھانے کو کون دے گا تمہارا باپ اب بندہ اگر غلطی سے اسپیشل برانچ میں آ ہی گیا ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہ ہوا کہ دوسروں کا روزی رزق بھی بند کر دو۔"

نور خان کے برابر بیٹھے ہوئے چوہدری دلاور نے تمسخر سے مرتضیٰ کو گھورتے ہوئے کہا اور مرتضیٰ تو غصے کی شدت سے اپنے حواس ہی کھو بیٹھا تھا دھوکہ اور وہ بھی ایک عورت کے ہاتھوں کیا کوئی عورت پیسے کے لیے اس قدر بھی گر سکتی ہے اس کے ساتھ ہی مرتضیٰ کی آنکھوں میں ثمامہ کا خوبصورت عکس جھلملانے لگا۔

"آ جا میری بلبل تو نے تو آج کمال ہی کر دیا شاباش ہے تجھے شاباش۔"

مرتضیٰ نے بے اختیار مڑ کر دیکھا اور ساکت ہی رہ گیا نہایت ہی عریاں لباس اور بے تحاشا میک اپ میں وہ یقیناً لائبہ ہی تھی جس کے ساتھ آنے والی ہستی پر نظر پڑتے ہی مرتضیٰ کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے جسم سے جان ہی نکال دی ہو سچ ہے محبت سے بڑھ کر کوئی دھوکہ نہیں اور آج مرتضیٰ کو بھی یقین آ ہی گیا تھا کہ پولیس والے کا کوئی سچا دوست نہیں ہوتا۔

اے کاش اس کا ریوالور ہی اس کے ہاتھ میں ہوتا لیکن شاید اس نے تو کسی ایسی صورت حال کا سوچا بھی نہ تھا اور میرے اللہ تو کیا میرا وقت آخر آ گیا۔

مرتضیٰ شاہ کو جیسے یقین ہی نہ آیا اس نے اپنے چاروں جانب نظر دوڑائی وہ بری طرح پھنس چکا تھا بالکل ایسے جیسے چوہے دان میں پھنسا ہوا چوہا مرتضیٰ شاہ جیسے بہادر شخص کے مقدر میں ایسی موت اس نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا وہ اس طرح بغیر کسی مقابلے کے بزدلی کی موت مارا جائے گا۔

"اے میرے اللہ مجھے آج ایک موقع اور دے دے میری زندگی میں بس تھوڑا سا اضافہ کر دے بے شک موت برحق ہے اور ہر بشر نے اس کا ذائقہ چکھنا ہے لیکن اتنی بزدلی کی موت بغیر کسی سے مقابلہ کیے نہیں میرے اللہ نہیں۔"

لیکن شاید دعا کی قبولیت کا وقت گزر چکا تھا مرتضیٰ نے کسی احساس کے تحت اپنی آنکھیں بند کر لیں "اے کاش آج مجھے اختیار ہوتا تو کم از کم اس لڑکی کو زندہ نہ چھوڑتا تو مرتضیٰ شاہ یہ طے ہے آج تم اس حال میں اس دنیا سے جاؤ گے کہ حالت نزع میں تمہارے پاس کوئی تمہارا اپنا نہ ہو گا اے میرے پروردگار میں نے تو زندگی میں کبھی بھی کسی کا برا نہ چاہا تھا پھر میرے ساتھ ہی یہ سب کیوں ہوا۔"

اسے سوچنے پر بھی یاد نہ آیا کہ کبھی زندگی میں اس نے کسی شخص کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہو جس کی بددعا نے مرتضیٰ کو اس اذیت ناک موت کے قریب پہنچا دیا ہو۔

کہ میرے پروردگار آج کے دن تو نے یہ میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔"

لاشعوری طور پر اپنے رب سے کیا جانے والا ایک شکوہ اس کے دل میں ابھرا لیکن فوراً ہی اس نے توبہ بھی طلب کرلی۔

"مجھے معاف کرنا میرے مالک میں بھول گیا تھا کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے نہ اس سے ایک لمحہ آگے نہ پیچھے اور کسی کی دعا یا بددعا میری زندگی پر اختیار نہیں رکھتی میری زندگی پر صرف تیرا ہی اختیار ہے اور شاید آج تیری دی ہوئی مہلت زندگی ختم ہوگئی ہے۔"

مرتضیٰ نے دل ہی دل میں کلمہ کی ادائیگی کی اسے دونوں طرف سے کسی نے جکڑ لیا تھا اور کمرے میں موجود تمام اسلحہ کا رخ مرتضیٰ کی جانب تھا۔

"اگر ہمت ہے تو اسلحہ رکھ کر مقابلہ کرو۔" اس نے ایک آخری کوشش کی۔

"نہ جی ہمارے میں ہمت ہی نہیں ہے۔"

چوہدری نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے ایسے کہا گویا مرتضیٰ کی بات کا لطف لیا ہو۔

"بس خانی صاحب اب یہ کھیل ختم کریں، بڑا کمر جی بندے کو ہمارا الو دھندا ہی ماٹھا کرکے رکھ دیا ہے اس بے وقوف آدمی نے۔"

مرتضیٰ کچھ نہیں سن سکا تھا اس کے کانوں میں اپنی ماں اور بہن کی آوازیں آرہی تھیں اسے اپنا باپ اور بھائی بری طرح یاد آرہے تھے دلہن بنی شمامہ کا روپ اس کا دل چیر رہا تھا۔

"یاد رکھنا ہر کامیاب مرد کی تباہی کے پیچھے بھی ایک عورت کا ہی ہاتھ ہوتا ہے۔" ایس پی باجوہ کے الفاظ مرتضیٰ کے کانوں میں گونج رہے تھے اور وہ کچھ بھی بولنے سے قاصر ہوچکا تھا پھر کسی نے گولی چلائی اسے کچھ پتا نہ چلا صرف اس کے دماغ میں ایک پگھلا ہوا سیسہ سا اتر گیا آخری لمحوں میں جو آواز اس کے کانوں نے سنی وہ یقیناً "نوید حیدر" کی تھی۔

"بڑا سخت جان ہے یہ ایک گولی دل میں بھی ماردیں تو اچھا ہے گا ویسے بھی بے چارے نے دل ہی کے ہاتھوں دھوکہ کھایا ہے۔" اور پھر جانے کہاں سے جان کنی کی اذیت کے عالم میں مرتضیٰ کے کانوں میں یاسین شریف کی آواز ابھری جو یقیناً" رابعہ بیگم کی تھی مرتضیٰ کی تکلیف میں کمی واقع ہورہی تھی۔ "مرتضیٰ کے لبوں سے ادا ہونے والا آخری لفظ اور پھر مرتضیٰ نے اپنی جان اس اللہ کے سپرد کردی جس کی وہ امانت تھی بے شک انسان کی حیثیت پانی کے ایک بلبلے سے زیادہ کچھ نہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ موت اپنے مقرر کردہ وقت اور مقام پر ہی آتی ہے شاہ عبداللطیف بھٹائی نے کیا خوب فرمایا ہے۔

انسان کی بساط ہی کیا ہے
حباب جو پھوٹ گیا
ایک پرندہ جو اڑ گیا
سانس کا ایک سلسلہ جو ٹوٹ گیا

٭ ٭ ٭

اور وہ رات یقیناً" مرتضیٰ شاہ کے گھر والوں کے لیے ایک قیامت کی رات تھی ایک ایسی حسین اور روشن شام کی رات اتنی بھیانک بھی ہوسکتی ہے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مہندی کا فنکشن ختم ہونے کے بعد سب گھر والے رات تقریباً دو بجے تک گھر واپس آچکے تھے اور جانے کیوں گھر پر مرتضیٰ کو نہ پاکر مصطفیٰ صاحب کو خواہ مخواہ ہی غصہ آنے لگا۔

"تم تو کہہ رہے تھے کہ مرتضیٰ گھر پر ہے۔"

انہوں نے فوراً" ہی سعاد سے باز پرس کی سعاد خود بھی حیران تھا کیونکہ مرتضیٰ نے اپنی ساری زندگی کوئی بھی ایسا غیر ذمہ داری کا کام نہ کیا تھا نہ ہی وہ کبھی بغیر ڈیوٹی کے اتنی رات گھر سے باہر رہا تھا اور آج کل تو ویسے بھی وہ چھٹیوں پر تھا سعاد سمجھ نہیں پارہا تھا کہ مرتضیٰ نے اس سے غلط بیانی کیوں کی۔

"فون کرو اسے کہاں ہے۔"

"اس کا فون بند جارہا ہے۔" زیاد جو جانے کب سے مرتضیٰ کا نمبر ملا رہا تھا مصطفیٰ صاحب کے قریب آکھڑا ہوا۔

"بس آج اس کی نوکری کا آخری دن ہے تمہیں نہیں کروائی یہ پولیس کی نوکری اپنے ساتھ بزنس میں لگائیں گے۔"

رابعہ بیگم جانے کب وہاں آکھڑی ہوئی تھیں جبکہ ہانیہ حارث اور بچوں کے ساتھ گھر جاچکی تھی اور بھابھی فدک کو لے کر اوپر اپنے پورشن میں چلی گئی تھیں۔

"تھانے فون کرو ہوسکتا ہے کوئی ایمرجنسی ہوگئی ہو۔"

جانے کیوں مصطفیٰ صاحب کا دل ہول رہا تھا ایسے جیسے کچھ ہونے والا ہو وہ بے خبر تھے نہیں جانتے تھے کہ اپنی قیمتی متاع حیات لٹا چکے ہیں ایسے میں جانے رابعہ بیگم کو کیا ہوا جھٹ وضو کیا اور دو رکعت نماز نفل کی ادائیگی کے بعد قرآن شریف کھول کر یاسین شریف پڑھنے بیٹھ گئیں ہاں تھیں شاید اسی لیے اور غالباً" یہ ہی وہ وقت تھا جب مرتضیٰ عالم نزع میں تھا۔

"وہ تھانے بھی نہیں گیا۔"

زیاد نے نوید حیدر کا نمبر ملاتے ہوئے اطلاع دی تیسری بیل پر ہی فون اٹھا لیا گیا شاید زیاد کا نمبر اس کے لیے انجان تھا لیکن مرتضیٰ کے بارے میں وہ بھی لاعلم تھا بقول اس کے رات بارہ بجے سے ہی مرتضیٰ کا فون بند جارہا تھا اس کا کہنا تھا کہ اسے مرتضیٰ سے کچھ آفیشل کام تھا اسی لیے فون کیا لیکن فون بند ہونے کے سبب "سمجھا کہ صاحب مہندی کے فنکشن میں مصروف ہوں گے اسی لیے ہی فون بند جارہا ہے" نوید حیدر سے بات ہونے کے بعد گھر کا ہر فرد پریشان ہوچکا تھا تھوڑی ہی دیر میں مرتضیٰ کی گمشدگی کی اطلاع سارے خاندان کو ہوچکی تھی اور تقریباً" تمام ہی لوگ وہاں آپہنچے تھے یہاں تک کہ نوید حیدر بھی آگیا تھا اور پھر اسی کے مشورے پر مرتضیٰ کی تلاش کا عمل مختلف اسپتالوں سے شروع کیا گیا نوید، زیاد، اسد اور سعاد نے تقریباً" ہر اسپتال کی ایمرجنسی چیک کرلی مرتضیٰ کے تھانے والے بھی تلاش کے اس عمل میں شامل تھے اور تقریباً" فجر کے وقت مرتضیٰ کی گاڑی سی ویو سے اس حالت میں ملی کہ اس کا آئی ڈی کارڈ اور بیلٹ اندر ہی تھا اس اطلاع کے ملتے ہی رابعہ بیگم غش کھاکر گر گئیں جبکہ شمامہ اور ہانیہ خاندان کی دیگر خواتین کے ساتھ مسلسل آیت کریمہ کا ورد کررہی تھیں اور بالآخر مرتضیٰ کی تلاش کا سفر عصر کے وقت ختم ہوا آخرکار مرتضیٰ شاہ مل ہی گیا لیکن کسی اسپتال کی ایمرجنسی سے نہیں بلکہ مردہ خانے سے جہاں عام حالات میں جانے کا کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا اور یہ سب نوید حیدر کی بدولت ممکن ہوا۔

مرتضیٰ کے جوان جسم سے ابھی بھی خون جاری تھا کون کہہ سکتا تھا چوبیس گھنٹے قبل یہ ہنستا بولتا خوب صورت جوان اس حال میں بھی مل سکتا ہے ہر آنکھ اس کی جوان موت پر اشکبار تھی سچ ہے موت زندگی کی تلخ حقیقت ہے جس تک پہنچنے کے لیے ہر بشر کو اتنا ہی لمبا سفر طے کرنا پڑتا ہے جتنا اس کے نصیب میں ہو۔

٭ ٭ ٭

تاریخ گواہ ہے کہ میر جعفر اور میر صادق جیسے غدار آج بھی ہماری صفوں میں نوید حیدر کی شکل میں موجود ہیں ہمارے ہر محکمے میں کوئی نہ کوئی نوید حیدر ضرور مل جاتا ہے ہر ظالم کا ساتھ دیتے وقت بھول جاتا ہے کہ کبھی اس ظلم کی زد میں وہ بھی آسکتا ہے کیونکہ بندہ ظلم کرکے بھول جاتا ہے اور بے شک اس کا مالک یہ ظلم اور ظالم کو ضرور یاد رکھتا ہے۔

مرتضیٰ شاہ کا وہ سفر جو اس نے حق کی راہ میں اکیلے ہی شروع کیا تھا اس کے جانے کے بعد بھی رکا نہیں ہاں البتہ ذرا سا وقفہ ضرور آیا سعاد نے میڈیکل کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر سی ایس ایس کا امتحان پاس کیا اور پھر مصطفیٰ صاحب کی فرمائش پر اپنے لیے محکمہ پولیس کو منتخب کیا۔ شمامہ نے لاء کی تعلیم مکمل کرکے لاوارث عورتوں کے لیے ایک این جی او بنائی اور اپنی زندگی کو فلاحی کاموں کے لیے وقف کردیا مصطفیٰ صاحب نے بہت کوشش کی وہ سعاد سے شادی کرلے لیکن اس کی نا کبھی بھی ہاں میں تبدیلی نہ ہوئی وہ عورتوں کے مقدمے مفت میں لڑتی اور ہر حال میں

انھیں انصاف دلانے کی کوشش کرتی مرتضیٰ کی ناگہانی موت کے صرف چھ ماہ بعد اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر چھپی۔

”نواز گوٹھ کی معروف سیاسی اور سماجی شخصیت نور خان کو ان کے دو بیٹوں اور ایک داماد سمیت اس وقت گولیاں مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا جب وہ اپنے ڈیرے کے باہر دوستوں میں بیٹھے تھے۔“

بظاہر ایک معمولی سی خبر کا افسوسناک پہلو یہ تھا کہ نور خان اپنے خاندان کے تمام مردوں سمیت مارا گیا کوئی نہیں جانتا تھا کہ نور خان کے اجلے لباس پر جانے کتنے بے گناہوں کے ساتھ ساتھ مرتضیٰ کے خون کے چھینٹے بھی پڑے تھے۔

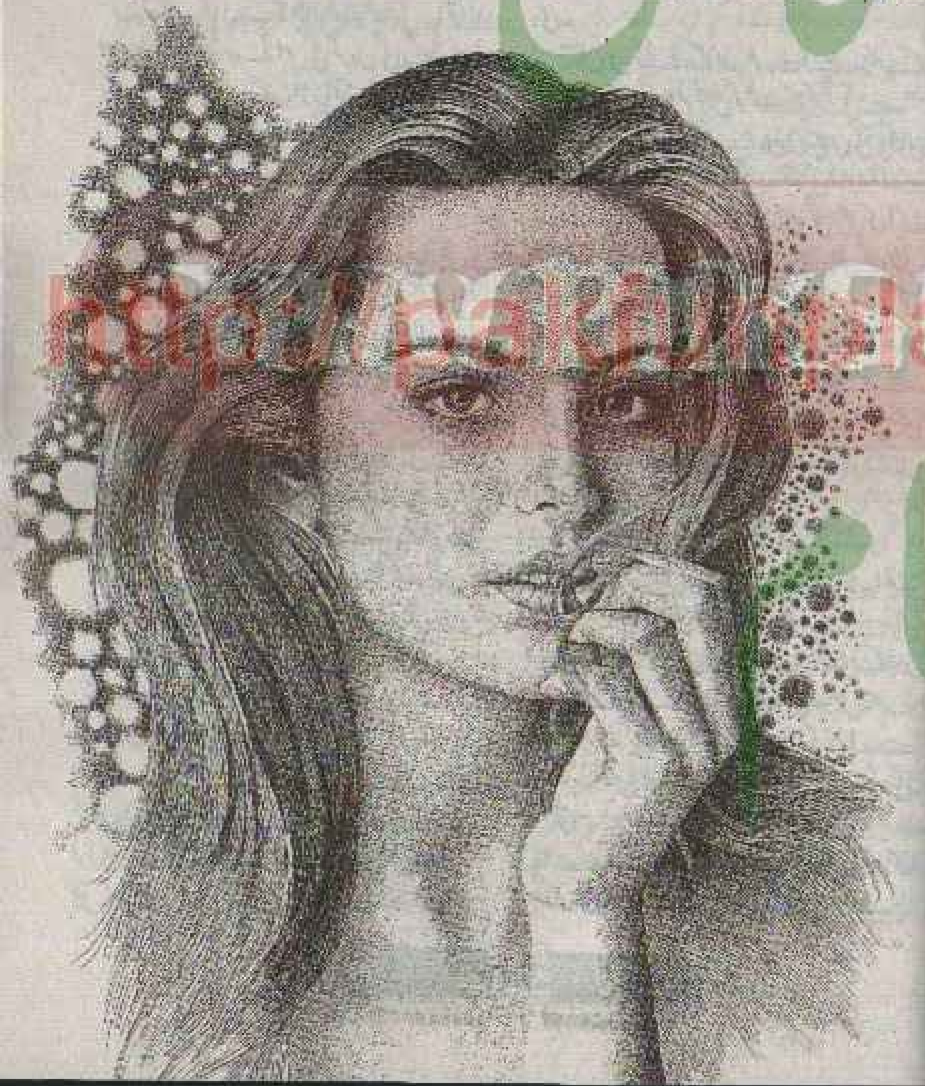
نوید حیدر کی تیرہ سالہ بیٹی اسکول واپسی پر اغوا کرلی گئی بعد میں اس کی ملنے والی لاش نے نوید حیدر کو ذہنی طور پر مفلوج کردیا جو بھی اس سے ملنے جاتا وہ ہر ایک سے معافی طلب کرتا کوئی نہیں جانتا تھا کہ نوید حیدر کے قلب پر کون سا بوجھ ہے اور پھر زندگی کی طرف واپسی آتے ہی اس نے پولیس کی ملازمت چھوڑ کر اپنے گاؤں میں رہائش اختیار کرلی وہ ہر وقت اپنے گناہوں کی معافی اس پروردگار سے طلب کرتا تھا جو بڑا غفور الرحیم ہے ظلم کرتے وقت وہ بھول گیا تھا کہ ایک مسلمان کی جان، مال، عزت و آبرو دوسرے مسلمان پر حرام ہے تو کس طرح کسی بے گناہ کو دھوکہ دے کر موت کے گھاٹ اتارنے والے کو اللہ تعالیٰ معاف کرے گا، لیکن پھر بھی بے شک اس کی ذات بخشنے والی ہے وہ بڑا رحیم و کریم ہے شاید وہ نوید حیدر کو معاف کردے بے شک بندہ اللہ کو بھول جاتا ہے لیکن اللہ اپنے بندے کے ہر عمل پر نظر رکھتا ہے اور پھر اس کا کیا ہوا مکافات عمل کی صورت میں اسے واپس بھی ضرور ملتا ہے اور یہ قانون قدرت ہے۔ مرتضیٰ کی ناگہانی موت کے صرف ایک سال بعد لائبہ کا نام نہاد شوہر کسی آرمی افسر سے گاڑی چھیننے کی کوشش کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں گرفتار کرلیا گیا اور پھر اس کے کیس کی مناسب پیروی نہ ہونے کے سبب ایک طویل المیعاد جیل اس کا مقدر بن گئی اور ان نام نہاد خداؤں کے ہاتھوں غلامی کی زندگی بسر کرنے والی لائبہ کے مقدر میں پروانہ آزادی لکھ دیا گیا۔ کچھ عرصہ کی گمنامی کے بعد اس نے شہر کے ایک پوش علاقہ میں پارلر کھول لیا جہاں کا زیادہ تر عملہ ایسی مجبور اور بے بس لڑکیوں پر مشتمل تھا جن کا کوئی سہارا نہ تھا لائبہ نے پارلر ہی کے ایک کمرے میں ان کی رہائش کا انتظام بھی رکھا لیکن اس سب کے باوجود اس کے دل کو سکون حاصل نہ تھا مرتضیٰ کی یاد جب بھی اسے ستاتی وہ بے حال ہوجاتی ایسے میں وہ کئی کئی گھنٹے مختلف درگاہوں پر گزارتی روزانہ مرتضیٰ کی قبر پر حاضری اور اس سے معافی کی طلب لائبہ کی زندگی کا حصہ بن گئی۔ نیند کے لیے وہ سلیپنگ پلز کا سہارا لیتی لیکن پھر بھی اسے نیند نہ آتی۔ پچھتاوے اسے زہریلے ناگ بن کر ڈستے بے شک اس کی پچھلی زندگی مکمل طور پر گناہوں سے عبارت تھی لیکن ان تمام گناہوں پر مرتضیٰ کی محبت، اس کے اعتماد اور اس کی جان کا قتل سب سے بھاری تھا۔ جس نے لائبہ کی زندگی سے سکون کا ایک ایک لمحہ چھین لیا تھا۔ اور ایسے میں سکون کی تلاش کے لیے اس نے اللہ سے لو لگائی۔ شروع شروع میں وہ صرف مغرب اور فجر کی نماز پڑھنے لگی لیکن کچھ ہی عرصہ بعد نماز پنجگانہ اس کی زندگی کا لازمی حصہ بن گئی اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرنے کے لیے وہ حالت سجدہ میں کئی کئی گھنٹے گزار دیتی اس کے دل کو یقین تھا کہ جس دن اس کی توبہ قبول کرلی گئی اس دن وہ پرسکون ہوجائے گی۔ اور یہ دن کب آئے گا وہ نہیں جانتی تھی۔ لیکن پھر بھی اس کا دامن تھامے وہ دن رات اس بارگاہ میں سجدہ ریز تھی جہاں سے کوئی خالی ہاتھ نہیں لوٹایا جاتا اور یہ بھی شاید مرتضیٰ کی موت کے بعد ایک کامیابی تھی جس نے لائبہ جیسی عورت کے دل پر لگے قفل کو توڑنے میں ایک اہم کردار ادا کیا سچ ہے اللہ جسے چاہے ہدایت دے اور نیکی کے راستے کی طرف موڑ دے بے شک وہ غالب حکمت والا ہے۔

✡

صبا السلام

دو ہوس

”میں مروں گا تو چین آئے گا، تنگ آ گیا ہوں“ ”اماں! تم مجھے مار کر چھوڑو گی۔“ میں نے مسالہ بھون کر ابھی گوشت اس کے اندر ڈالا ہی تھا کہ پڑوس سے اونچا اونچا بولنے کی آواز آنے لگی۔ یہ آواز ہمارے پڑوس



سے تقریباً" بھرے بھرے دن آئی تھی۔ میں نے گوشت کو بھوننا شروع کیا اور ساتھ ساتھ پانی کا چھینٹا بھی ڈالتی جا رہی تھی۔ تیز گرم برتن پر پانی پڑنے سے اچانک تیز آواز اٹھتی اور پھر دھیمی پڑ جاتی مگر پڑوس کے جھگڑے کی آواز دھیمی پڑنے کے بجائے تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے ہنڈیا کے نیچے آنچ ہلکی کی اور ڈھکن ڈھانپ کر صحن میں آگئی۔

سارے صحن میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ جلتے صحن سے گزر کر میں دیوار تک پہنچی اور دیوار کی درمیان کی درز سے آنکھ لگا کر ہمسائیوں کے گھر کا نظارہ کرنے لگی۔ آپا زینب کا بیٹا اونچا اونچا بول رہا تھا اور اس طرح بولتے ہوئے اس کی گردن کی رگیں پھول رہی تھیں۔ منہ سے کف اڑ رہا تھا۔ آپا زینب پورے صحن میں کہیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ میں کچن میں آ گئی اور ہنڈیا بلا کر دھنیا اور ہری مرچیں کاٹنے لگی جو سالن میں ڈالنا تھیں۔

ابھی یہ کام مکمل بھی نہ ہوا تھا کہ موٹر سائیکل کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی صحن کا [illegible] اٹھا کیونکہ زینب کا بیٹا عرفان اپنی ماں سے لڑ جھگڑ کر دکان پر چلا گیا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی جو سوا گیارہ بجا رہی تھی۔ میں نے برنر بند کیا اور کمرے میں چلی آئی۔ جولائی کی اس جلتی دوپہر میں پنکھے کی ہوا بھی رحمت معلوم ہوتی ہے۔ میرے دونوں پیارے بچے ٹیوشن پڑھنے کے بعد اپنی پھپھو کے گھر چلے گئے تھے جو پچھلی گلی میں ہی تھی۔ اور انہوں نے بارہ بجے تک واپس آنا تھا۔ پسینہ خشک کرنے کے بعد میں نے واش روم کا رخ کیا اور جی بھر کر نہانے کے بعد جب ڈریسنگ روم میں آئی تو بارہ بجنے میں صرف پندرہ منٹ باقی تھے۔

میں نے ابھی پہلی روٹی توے پر ڈالی ہی تھی کہ بیرونی دروازے کی گھنٹی بج اٹھی بچے آگئے تھے۔ ان کو کھانا کھلانے کے بعد میں ان کے سارا دن کی روداد سننے لگی اور پھر ڈیڑھ بجے تک وہ سو گئے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں میرا یہی معمول تھا کہ بچوں کو اذانوں کے وقت اٹھا دیتی۔ وہ نماز کے بعد اپنا ہوم ورک کرتے ناشتہ کرنے کے بعد ٹیوشن چلے جاتے۔ اشعر کے آفس کا بھی وہی ٹائم تھا۔ وہ بچوں کو چھوڑ کر خود آفس چلے جاتے۔

ان کے جانے کے بعد میں پورا گھر سمیٹتی۔ صفائیاں کرتی اور کھانا تیار کر کے بارہ بجے تک فارغ ہو جاتی پھر کھانا کھانے کے بعد بچوں کو سلا دیتی۔ بچے بھرپور نیند لینے کے بعد سر شام اٹھتے تو تازہ دم ہوتے۔ کھیلتے کودتے اور ٹی وی دیکھتے۔ میں بھی ان کے ساتھ ہر سرگرمی میں شریک ہوتی۔ اسی طرح سارا دن گزر جاتا۔ میں نے دونوں بچوں کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔

"ماں بن جانے کے بعد عورت اپنے روز مرہ کے کام بھی بچوں کے ٹائم ٹیبل کو ملحوظ رکھ کر کرتی ہے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے دونوں بچوں کی پیشانی چوم لی اور وضو کے لیے اٹھ گئی۔ ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد میں بچوں کے ساتھ لیٹنے ہی لگی تھی کہ ایک خیال نے مجھے چونکا دیا۔ سلیپر پیروں میں ڈال کر واپس صحن کی طرف بھاگی اور اسی درز سے دیکھا۔ سارا صحن خالی پڑا تھا۔ میں واپس لوٹ آئی۔ میرا دل تو چاہ رہا تھا کہ آپا زینب کی طرف جاؤں مگر دونوں بچے سو رہے تھے۔ انہیں اکیلے چھوڑ کر جانا مناسب نہ تھا۔ لہٰذا میں بھی ان ہی کے ساتھ لیٹ گئی اور آپا زینب کے بارے میں سوچنے لگی۔

ماضی کے کئی ورق پلٹتے چلے گئے۔

تقریباً" آٹھ سال پہلے اشعر نے یہ گھر خریدا تھا۔ اس وقت میری گود میں صرف ہانیہ تھی۔ میری سسرال کا گھر چھوٹا تھا اور افراد زیادہ لہٰذا دیور کی شادی کے بعد ہم نے علیحدہ گھر لے لیا۔ جس دن اس گھر میں ہم نے سامان شفٹ کیا۔ ہمارا کھانا آپا زینب کی طرف سے آیا۔ بہت ہنس مکھ اور ملنسار خاتون تھیں وہ اظہر کی پیدائش پر میرا بہت ساتھ دیا۔ ہر روز میری خیریت دریافت کرنے کے لیے آتیں۔ تب ہی مجھے پتہ چلا کہ ان کے شوہر کے انتقال کو دو سال ہو چکے ہیں۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔ بیٹی ایف اے کی طالبہ تھی اور وہ خود ریٹائرڈ اسکول ٹیچر تھیں۔ ریٹائر ہونے پر جو رقم انہیں ملی۔ اس سے انہوں نے بیٹے کو دو میانے درجے کی کریانے کی ایک دوکان کھلوا دی اور کچھ رقم گھر کی مرمت پر اٹھ گئی۔

بیٹے کی وہ دکان اتنی تو چل رہی تھی کہ آرام سے گزر بسر ہو رہی تھی۔ میں میکے سے دور تھی اس لیے آپا زینب کو ہی اپنی سہیلی بنا لیا اور ہر چھوٹا موٹا دکھ سکھ ان سے بانٹنے لگی۔ اگر کوئی بچہ بیمار ہے تو آپا زینب کے ساتھ بچے کو بھیج کر ڈاکٹر سے دوا لے لی۔ کسی چیز کی اچانک ضرورت پڑ جائے تو آپا زینب حاضر ہیں۔ سسرال والوں کی دعوت ہے تو آپا کو گھر بلوا کر دو ڈشز بنوا لیں۔ غرض وہ میرے کام آئیں مگر انہیں مجھ سے کوئی ضرورت کبھی نہ پڑی۔ مگر یہ تو چند سال پہلے کی بات تھی جب اظہر پیدا ہوا تھا۔ اب تو وہ چھ سال کا بچہ اور نرسری کا اسٹوڈنٹ تھا۔

آپا زینب کی بیٹی فاخرہ بہت پیاری، نیک اور سلیقہ مند ہوتی تھی۔ وہ بہت اچھی آرٹسٹ بھی تھی۔ اس کی [illegible] ہمارے گھر کے کئی نمونے میں نے خود رکھے تھے۔ آپا زینب کا گھرانہ ہر طرح سے خوش تھا پھر آپا زینب نے اپنے بیٹے کی منگنی کر دی۔ وہ دور پرے کے رشتہ دار تھے۔ لڑکی پڑھی لکھی تھی۔ اچھی شکل و صورت کی مالک تھی۔ خاندان بھی اچھا تھا اور یہ رشتہ کروانے والی آپا کی سگی بہن تھی۔ لہٰذا ایک سال کے اندر اندر آپا" ساس بن گئیں۔ آپا بہت خوش تھیں کہ ایک فرض سے سبکدوش ہو گئیں۔

عرفان کی شادی کے کچھ ہی دن بعد آپا کے گھر سے چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے آپا سے پوچھا تو وہ ٹال گئیں۔ لیکن ایسی باتیں کہاں چھپتی ہیں۔ ادھر عرفان کی بیگم عرفان کے کان بھر کر میکے روانہ ہوتی، ادھر گھر میں ایک محاذ کھل جاتا۔ عرفان شکایتوں کی پٹاری کھولتا چلا جاتا اور آپا کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سمندر رواں ہو جاتا۔ وہ الزامات لگاتا اور آپا ایک لفظ تک نہ اپنی صفائی میں کہہ پاتیں۔

جب تک فاخرہ کی شادی نہ ہوئی تھی وہ کسی نہ کسی بات کا جواب دے دیتی۔ دلائل دیتی اور اپنی ماں کو بے گناہ ثابت کر دیتی مگر چند سال پہلے فاخرہ کی بھی شادی ہو گئی۔ آپا اس محاذ پر تنہا رہ گئیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے آپا کے ہاں پہلا پوتا پیدا ہوا تھا۔ چونکہ گھر کا سارا خرچ عرفان اور اس کی بیوی چلاتی تھی۔ لہٰذا آپا کے پاس ایک روپیہ نہ ہوتا۔

اس دن عرفان جب ہسپتال سے گھر آیا تو ماں کے سامنے رونے لگا۔ نعیمہ، عرفان کی دلہن کا بڑا آپریشن ہوا تھا۔ روپے کم تھے تقریباً" مزید بارہ ہزار روپے کی ضرورت تھی۔

زندگی میں پہلی بار آپا نے میرے سامنے دست سوال دراز کیا اور میں انکار نہ کر سکی۔ میں نے اپنی ساری جمع پونجی جو نو ہزار پانچ سو بیس روپے تھی ایمان داری سے آپا کے حوالے کر دی۔ باقی پیسوں کے لیے فاخرہ نے اپنی پینٹنگز جو اس نے نمائش کے لیے تیار کی تھیں تین ہزار میں اپنی ایک کلاس فیلو کو بیچیں اور یوں بارہ ہزار کی رقم عرفان کے حوالے کی تاکہ وہ نعیمہ کو چھٹی دلوا کر گھر لا سکے۔ آپا پائی پائی کے لیے بیٹے اور بہو کی محتاج ہو چکی تھیں۔

جب کچھ عرصے کے بعد آپا نے عرفان سے ان پیسوں کا مطالبہ کیا تو ایک اور جنگ شروع ہو گئی۔

"بس کریں اماں! یہ ڈرامہ بازیاں" میں کیا جانتا نہیں ہوں کہ کتنے پیسے جوڑ رکھے ہیں آپ نے یہاں میں نے رقم مانگی "وہاں" اگلے ہی دن آپ نے میرے ہاتھ میں رکھ دی۔ میں کیا اتنا غریب ہوں کہ اتنے پیسے نہ ہوں میرے پاس۔ میں نے نعیمہ کی بات مان لی اور آپ کو آزما لیا ورنہ میں بھلا تو مفت میں مارا جاتا" عرفان نے چمک کر کہا۔

"تو کیا سمجھتا ہے، میں تجھ سے رقم چھپاؤں گی۔ اپنی اولاد سے؟ ارے میں نے ساتھ والی عائشہ بیٹی سے پیسے ادھار لیے تھے، جا پوچھ لے اس سے اور کچھ پیسے

تیری بہن نے اپنی بنائی ہوئی تصویریں بیچ کر دیے ہیں۔ تو بس ساڑھے تو ہزار روپے دے ہیں اسے تو لوٹا دوں۔ فاخرہ کی تو ہے ، گھر کی بات ہے۔" آپا نے لجاجت سے کہا۔

"واہ واہ سن لو ، بڑھیا کی کوئی ایک زبان ہے کہ نہیں۔" آپا کی پڑھی لکھی بہو اپنی جہالت کا ثبوت دینے کے لیے میدان میں اتر آئی۔

"کبھی کہتی ہے ادھار لیے ہیں اور کبھی کہتی ہے بہن نے دیے ہیں۔ ارے کیسی ماں ہے۔ قیامت کی نشانی ہے قیامت کی جس بیٹے نے ساری عمر کما کر کھلایا ہے۔ اسی سے حساب کتاب۔ اسی کو نوچ کھسوٹ کر کھا رہی ہے ارے تو سگی ہے یا سوتیلی۔" نعیمہ نے آپا کی ممتا پر انگلی اٹھائی تھی۔ آپا جہاں کی تہاں بیٹھی رہ گئیں۔

"اماں! امت ذلیل کروایا کر مجھے بیوی کے سامنے بھی کیا سوچے گی وہ کیسی ماں ہے میری۔" عرفان نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا اور گھر سے باہر نکل گیا۔

آپا کی زبان جیسے گنگ ہو گئی مگر آنسوؤں کو راستہ مل گیا تھا۔

ان کے کانپتے وجود پر ایک نرم اور کمزور ہاتھ آ کر ٹھہر گیا۔ آپا نے اپنی بچی کو سینے سے لگا لیا۔ انہیں آج پتا چلا تھا کہ بہو کی کسے کہتے ہیں؟ پھر تو یہ معمول بن گیا۔ آپا خاموش رہتیں۔ نعیمہ کے جو منہ میں آتا کہے چلی جاتی۔ اس کی طرف داری کے لیے شوہر موجود تھا مگر آپا کا شوہر، سائباں او ر صحت کے بے بس نظروں سے بیٹے کو تکتے جاتیں۔ کبھی کبھار فاخرہ پلٹ کر جواب دے دیتی۔

اس معرکے کے چند روز بعد آپا نے اپنے سونے کی بالیاں بیچ دیں اور میرے پیسے مجھے لوٹا دیے۔ مجھے پتہ چلا تو ان سے بہت ناراض ہوئی مگر انہوں نے میری ایک نہ سنی۔

فاخرہ نے اپنی تصاویر کی نمائش کی جو کامیاب رہی۔ اب فاخرہ خود بھی کمانے لگی تو آپا کا ہاتھ ذرا کھلا تھا۔ آپا کی بہن نے اپنے بیٹے سہیل کے لیے فاخرہ کا رشتہ مانگا تو آپا نے ایک لمحے کی تاخیر نہ کی اور دو ماہ کے بعد فاخرہ کا نکاح طے پا گیا۔ اب جہیز کا مسئلہ سامنے تھا۔ عرفان نے ایک بھی پیسہ دینے سے انکار کر دیا مگر آپا نے بیٹی تو بیاہنی تھی۔ لہٰذا مکان کو بیچ دینے کا فیصلہ کیا گیا۔

"یہ ڈائن ہمیں اس گھر سے نکالے گی ' ارے تو نکل ' تیری بیٹی نکلے اس گھر سے ' کافر ہے تیری بیٹی ' تصویریں بناتی ہے بہت گری کرتی ہے بہت گری۔"

جس روز آپا کے گھر سے یہ آوازیں بلند ہوئیں۔ سارے محلے نے گلی میں نکل کر یہ "دلن دو مسن شو" دیکھا۔ چونکہ گھر کے دروازے بند تھے ورنہ دیکھ بھی لیتے مگر واحد میں تھی بیٹی شاید جس نے اس کا نظارہ بھی کیا۔ جی ہاں ' اسی ٹوٹی ہوئی درز سے جو 2005ء کے زلزلے کی وجہ سے بن گئی تھی اور کافی چوڑا شگاف تھا۔ مگر اس کو ٹھیک کروانے کی دونوں گھروں نے ہی ضرورت نہ سمجھی۔ عرفان بھی دوکان سے گھر آگیا اور بیوی کو چپ کروایا مگر مدہم مدہم آوازیں رات تک آتی رہیں۔ رات کے دس بجے ہوں گے جب میرے گھر کا دروازہ زور زور سے بجنے لگا۔

"خالہ جی! اشعر نے دروازہ کھولا تو آپا زینب سامنے کھڑی تھیں۔ بے حال پریشان کہ پیروں میں جوتا نہیں اور سر پر دوپٹہ نہیں۔

"اشعر بیٹا! میری فاخرہ۔" ٹوٹے پھوٹے الفاظ ساری کہانی سنا رہے تھے۔ میں آپا کے ساتھ ان کے گھر آئی۔ فاخرہ بے ہوش پڑی تھی۔ اسے گاڑی میں ڈالا۔ سوزوکی پچھلے ہفتے ہی اشعر کو آفس کی طرف سے ملی تھی۔ ہم سب ہسپتال پہنچے۔ بچوں کو میں نے ان کی پھپھو کے گھر چھوڑا فاخرہ کو نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا۔ آپا کی بہو لڑ جھگڑ کر گھر چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ عرفان اسے منانے کے لیے گیا ہوا تھا۔

قیامت جیسی وہ رات گزارنے کے بعد صبح فاخرہ کو ہوش آ گیا۔ آپا کی بہن کو جھگڑے کا پتہ چلا تو بہت پشیمان ہوئیں۔ انہوں نے جہیز لینے سے منع کر دیا۔ ہسپتال میں ہی فاخرہ اور سہیل کا نکاح ہوا۔ آپا نے اپنا گھر بیٹے کے نام کر دیا۔ اپنی ماں کی دو سونے کی چوڑیاں













بہن کر فاتحہ، آپا زینب کی اکلوتی بیٹی اور عرفان کی اکلوتی بہن رخصت ہوگئی۔

ایک سال کے بعد عرفان نے بڑا جنرل اسٹور بنا لیا۔ گھر میں پیسہ برسنے لگا مگر روز روز کے یہ لڑائی جھگڑے ختم نہ ہوئے۔ عرفان کی بیوی میکے چلی جاتی تو وہ گھر میں کچھ خرچ نہ دیتا' خود باہر سے کھانا کھاتا اور ماں کیا کھاتی ہے؟ اس بات کی کوئی فکر نہیں ہوتی۔

آپا زینب میرے گھر آکر میری ہی سلائی مشین پر میرے اور بچوں کے کپڑے سلائی کر دیتیں اور میں انہیں اس کی اجرت دیتی جسے وہ مشکل وقت میں خرچ کرتیں۔ آپا زینب بہت خوددار تھیں یا تو وہ محنت کی اجرت لیتیں یا ادھار۔ میں نے کئی بار کہا کہ میرے بچوں کو پڑھا دیا کریں مگر ٹال دیتیں۔ ایک مرتبہ میرے بہت اصرار پر کہنے لگیں۔

"میں اپنے بیٹے کو تو علم اور اچھی تربیت نہ دے سکی' کسی کو کیا سکھاؤں گی۔"

میں خاموش ہی رہ گئی۔ میں نے کئی بار آپا کی مدد کرنے کی کوشش کی مگر انہوں نے یہ کہہ کر روک دیا کہ "بیٹیوں سے لیتی اچھی نہیں لگتی۔"

ان ہی دنوں یہ بھی پتہ چلا نعیمہ کے بیٹی ہوئی تھی۔ اب تو اس کی گود میں ایک اور بیٹا آچکا تھا۔ اس کے طعنوں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ نعیمہ کے جانے کے بعد پھر شکایتوں کا دفتر کھلتا ہو گا اور ہر غلطی' ہر خطا آپا زینب کا مقدر ٹھہری ہو گی۔ میں نے آنکھ کھولی' گھڑی چار بجا رہی تھی۔ بچے اٹھ رہے تھے۔ میں نے ان کا منہ دھلوایا۔ دودھ سوڈا بنا کر پلایا اور ہوم ورک کرنے کا کہہ کر دروازے کو لاک لگا کر آپا زینب کی طرف چلی آئی۔ وہ اندر بیٹھی رو رہی تھیں۔ چار پانچ گھنٹے رونے کی وجہ سے ان کی آنکھیں سوج چکی تھیں۔ مجھے دیکھا تو وہ لپک کر میری طرف آئیں۔

"تو نے سنا عائشہ! کہتا ہے کہ میں مروں گا تو چین آئے گا تو ہی بتا عائشہ میرا کیا قصور ہے۔"

وہ میرے ساتھ لگ کر بلک بلک کر رونے لگیں تو میں نے انہیں بیڈ پر بٹھایا' آنسو پونچھے' ٹھنڈا پانی پلایا اور ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

"میں آپ سے ہمیشہ کہتی رہی ہوں۔ میں سمجھاتی ہوں عرفان کو۔ وہ بڑی بہن سمجھتا ہے مجھے' آپ کہیں تو عشرت اس سے بات کریں۔" میں نے کہا۔

"نہیں' اب اس کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولیں تو میں خاموش ہو گئی۔ عصر کی اذان کی آواز آ رہی تھی۔

میں نے انہیں اٹھایا' وضو کروایا اور خود بھی وضو کیا۔ ان کے ساتھ عصر کی نماز پڑھی۔ اپنے گھر سے کھانا لا کر انہیں کھلایا اور انہیں آرام کی تاکید کر کے گھر لوٹ آئی۔

اگلی صبح بھی وہی روٹین رہی جو روز کی تھی۔ بچے ٹیوشن سے واپسی پر ٹی وی دیکھ رہے تھے اور میں سالن بنا رہی تھی جب رونے کی آواز سے میں چونکی۔ یہ آواز عرفان کی تھی۔ میں درز کی طرف بھاگی' انہونی کا احساس مجھے بار بار ہو رہا تھا۔

آپا زینب سارے دکھوں سے نجات پا گئیں۔ انہوں نے صحیح کہا تھا۔ اب عرفان کو سمجھانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

فاخرہ بڑی سی گاڑی میں بیٹھ کر آئی۔ ملک کے مایہ ناز فیشن ڈیزائنرز میں اس کا شمار ہونے لگا تھا۔ اس کے پہلے چند ڈیزائنز نے ہی اسے شہرت کا مزہ چکھا دیا تھا۔ اس کی ماں کی دعاؤں نے اسے اس مرتبہ تک پہنچا دیا تھا۔ ادھر آپا زینب کا جنازہ اٹھا اور ادھر فاخرہ نے گھر سے باہر قدم نکالا اور پھر کبھی اس گھر کی دہلیز پر قدم نہ رکھا مگر مجھ سے اور میرے بچوں سے ملنے اکثر آتی تھی۔



جولائی کی ویسی ہی گرم دوپہر میں میں نے مسالا بھون کر گوشت ڈالا تو مجھے یاد آگیا۔ بچے آج بھی اپنی پھپھو کے گھر گئے ہوئے تھے۔ آپا زینب کو فوت ہوئے ایک سال بیت چکا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ایک سال پہلے کی ایسی ہی ایک دوپہر اپنی پوری

جزئیات کے ساتھ یاد آگئی۔ اسی اثناء میں ہمسایوں کے گھر سے آوازیں بلند ہونا شروع ہوئیں مگر یہ کیا۔ عرفان کے بجائے نعیمہ کے چیخنے کی آواز۔

میں نے آنچ ہلکی کی اور دیوار کی اس درز کی طرف بھاگی۔ عرفان کے ساتھ ایک چوبیس پچیس سال کی خوش شکل خاتون کھڑی تھی۔ لباس اور میک اپ سے ہی دلہن لگ رہی تھی۔ نعیمہ چیخ رہی تھی۔ "سوتن" کے الفاظ کے علاوہ مجھے کسی بات کی سمجھ نہیں آرہی تھی۔ نعیمہ کے گلے کی رگیں پھول رہی ہیں۔ اس کے منہ سے کف اڑ رہا تھا۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"بس بند کرو اپنی یہ بکواس' کیا ظلم ہو گیا ہے تم پر؟ ہاں بولو' ظلم تم نے کیا ہے۔ مجھ پر' میری ماں پر اور میری بہن پر۔" عرفان چنگھاڑا۔

"میں نے اپنی ماں کو فاقوں مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی' اس کے خلوص' اس کی محبت پر شک کیا' اسے دھتکارا۔ جب اسے میری ضرورت تھی میں نے اسے بے امان کر دیا۔ اسے بے سہارا چھوڑ دیا۔ اس کی خدمتوں اور محبتوں کو فراموش کر دیا۔ باپ کے انتقال پر جس چھوٹی بہن کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے میں نے اپنے دل میں ویسی ہی شفقت محسوس کی جیسی باپ' بیٹی کے لیے کرتا ہے۔ اس بہن کو فقیروں کی طرح رخصت کر دیا۔ میری وجہ سے وہ موت کی دہلیز تک جا پہنچی۔

تم مجھے پٹیاں پڑھاتی رہیں کہ وہ میرے ٹکڑوں پر پلتی ہیں اور میں بھول گیا کہ میں تو خود اس ماں کا ٹکڑا ہوں اور میری بہن اسی وجود کا دوسرا ٹکڑا۔ میری ماں نے ہمیں محبت سے جوڑ کر ایک کیا تھا اور تم نے ہمیں پھر ٹکڑوں میں بانٹ دیا۔ میری بہن میری شکل تک دیکھنا گوارا نہیں کرتی۔ میری ماں کے مرنے کے بعد اس نے میری چوکھٹ پر قدم نہیں رکھا۔ تمہاری طرف دیکھتا ہوں تو مرنے کو دل چاہتا ہے۔ ایک سال تمہیں برداشت کرنے کی میں نے بھرپور کوشش کی ہے مگر اب نہیں۔ میں اپنی ماں کے وہ آخری الفاظ نہیں بھول سکتا جو اس نے میرے ہاتھ پکڑ کر کہے تھے۔

عرفان بیٹا! رب پاک کی قسم۔ میں نے تم سے بہت محبت کی ہے پھر بھی اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کر دینا۔" اور پھر میری ماں مر گئی۔"

میری آنکھوں سے گرم گرم سیال بہنے لگا۔ عرفان بھی رو رہا تھا مگر آج نہ تو اس کے منہ سے کف اڑ رہا تھا اور نہ ہی رگیں پھول رہی تھیں۔

"یہ میری بیوی ہے۔ اب اس گھر میں یہ رہے گی۔ تم جا سکتی ہو۔" عرفان نے بے دردی سے کہا۔

"میں بیٹوں کی ماں ہوں' تم اتنی آسانی سے نہیں نکال سکتے مجھے۔" نعیمہ کی مغرور آواز ابھری۔

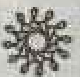
"میری ماں بھی بیٹے کی ماں تھی اور اسی جرم کی سزا بھگتی ہے اس نے۔ تم تو دو بیٹوں کی ماں ہو' تمہاری سزا تو دگنی ہونی چاہیے۔" عرفان نے کہا۔

"پاگل ہو گئے ہو تم" نعیمہ چیخی اور عرفان کا گریبان پکڑ کر اسے مارنے لگی۔

"نکل جاؤ یہاں سے ورنہ تین حرف بھیج کر دفع کر دوں گا۔"

عرفان کی دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔ نعیمہ کمرے میں چلی گئی۔ عرفان اپنی بیوی کے ساتھ آپا زینب کے کمرے میں آ گیا اور میں نے واپس کچن کی طرف دوڑ لگا دی۔

اس گھر سے اسی طرح لڑنے جھگڑنے کی آوازیں آتی ہیں' عرفان اسی طرح رگیں پھلا کر کف اڑاتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ آپا زینب کی جگہ اب نعیمہ نے لے لی ہے۔ وہ آپا زینب کی طرح آنکھوں میں آنسو بھرے خاموشی سے سنتی رہتی ہے۔



جام جم سے میرا جام سفال اچھا ہے

انسان شخصی ارتقا کے ابتدائی ادوار میں "گیلی مٹی" کی مانند ہوتے ہیں۔ جنہیں معاشرے کا "کمہار" تربیت کے "چاک" پر دھرتا ہے اور بازار حیات کی "مانگ" کو مد نظر رکھ کر اپنی نیت اور چاہت کے ہاتھوں سے ایک خاص سانچے میں ڈھالتا ہے۔ اس قالب سازی کے دوران اس کی "انگلیاں" ہر "برتن" کے بدن پر رشتوں رواجوں مذہب سیاست جذبوں خوابوں اور سرابوں کی ان گنت پیچیدہ تحریریں رقم کرتی ہیں۔

گیلی مٹی کے یہ "سانچے" حالات کے "آوے" میں ڈھلتے ہیں۔ ان مراحل سے گزرتے ہوئے ہر برتن کا "ظرف" اور "نصیب" اس کی قیمت کا تعین کرتا ہے۔ کچھ "سفال گر" کی بے توجہی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کچھ اس کے اناڑی پن کی نذر ہوتے ہیں۔ کچھ "آوے" کی "دہک" برداشت نہیں کر پاتے اور تڑخ جاتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بازار تک تو پہنچتے ہیں مگر انہیں کوئی "خریدار" میسر نہیں آتا۔ ان کا نصیب اور بازار کا اسلوب "ظرف" کا مقام طے کرتا ہے۔ گل دان اور پیک دان میں ساخت کا فرق بھلے نہ ہو مگر نصیب کا فرق ضرور ہوتا ہے۔

یہی میرے ناول کی تھیم ہے۔

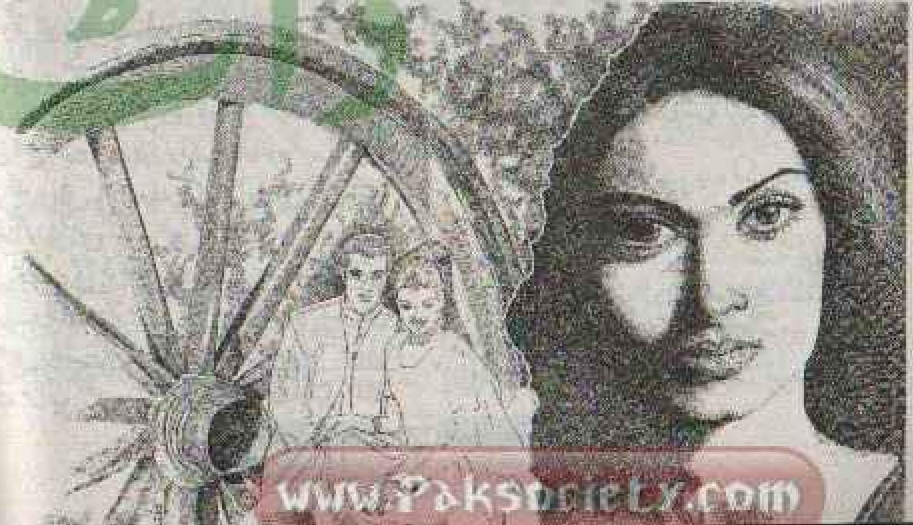
محض چند واقعات کو اپنے انداز میں آپ کے سامنے پیش کر رہی ہوں۔ کرداروں کے ساتھ انصاف کرنے کی زحمت میں نے نہیں اٹھائی کیونکہ میرا فہم و ادراک ناقص اور نامکمل ہے۔ میں یہ کام آپ پر چھوڑ رہی ہوں میں آپ کو خود سے بہتر منصف مانتی ہوں۔ میں اپنی رائے بھی نہیں دے رہی۔ صرف آپ کی رائے مانگ رہی ہوں۔ آپ اس ناول کو کسی بھی تناظر میں دیکھیں مگر اسے مٹی کے بے جان برتنوں کی کہانی مت سمجھیے گا۔

یہ جیتے جاگتے وجود رکھنے والے اور جدوجہد کرنے والے انسانوں کی داستان ہے۔

بشریٰ سعید

بشریٰ سعید

سفال گر



صوفیہ بچپن سے نامساعد حالات سے گزری ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ اس کا باپ کون ہے جبکہ اس کی ماں الا گرانٹ کے عشق میں پاگل تھی۔ ماں کے انتقال کے بعد گرانٹ نے اس کی پرورش کی ہے۔ صوفیہ کو نہ اپنے والدین سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہی مذہب سے۔ وہ پابندیوں سے آزاد زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ کلاس میں جیسکی اور کیلی آ مستقبل کے حوالے سے وہ بتاتی ہے کہ وہ غلط راستے پر چلنا چاہتی ہے۔ میل صوفیہ کے پڑوس میں رہتا ہے۔ وہ صوفیہ کا خیال رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ گرانٹ صوفیہ کو پوسٹ آفس خط ڈالنے کو دیتا ہے۔ جسے وہ ہر مرتبہ کی طرح لاپروائی سے ہوا برد کر دیتی ہے۔ کارل بیکار تھی کالج کا سب سے ہینڈسم اور فلرٹ لڑکا ہے۔ لیکن صوفیہ اس پر توجہ نہیں دیتی۔ وہ کارل کے لیے نیز ھی کھیر ثابت ہو رہی ہے۔

عمر کی پرورش حکیم بیگم کے ہاتھوں ہوئی ہے جن کا خمیر محبت اور جفاکشی سے اٹھا ہے۔ انہوں نے عمر کی گھٹی میں "اللہ" سے محبت بھردی ہے۔ حکیم بیگم کو اللہ سے عشق ہے۔ عمر کی خواہش ہے کہ بے جی (حکیم بیگم) کو اس کی ذات سے دکھ نہ پہنچے لیکن ہر مرتبہ پھر نہ کچھ غلط ہو ہی جاتا ہے۔ عمر کو حکیم بیگم نے ایک عیسائی عورت سے گود لیا تھا۔ عمر کو اپنی ماں کے بارے میں جاننے کا تجسس ہے۔ ماسٹر صاحب کا قلم اٹھانے پر حکیم بیگم عمر پر سورۃ الناس اور سورۃ الفلق پڑھ کر پھونکتی ہیں تاکہ وہ آئندہ کوئی غلط حرکت نہ کرے۔ ان کی ایک ہی بہن امریکہ میں رہتی ہے۔ شادی کے بارہ برس گزرنے کے باوجود وہ بے اولاد ہے۔ حکیم بیگم ہر وقت اس کے لیے اولاد کی دعا مانگتی ہیں۔ عمر کو بے جی کی لگن حیران رکھتی ہے۔

پرنیاں آرٹ کو پارک میں ایک اجنبی gloxinia کا پھول دے کر پرپوز کرتا ہے تو وہ ششدر رہ جاتی ہے۔ بعد میں وہ صرف اسی شناسا اجنبی سے ملنے پارک جاتی ہے۔ اس ملاقات میں پرنیاں پر کھلتا ہے اجنبی گرانٹ کو اداکاری کا جنون ہے۔ وہ اپنے آپ کو مستقبل کا عظیم اداکار سمجھتا ہے۔ وہ اپنے کردار کی ریہرسل کے لیے پارک میں موجود لڑکیوں کو پرپوز کرنے کی اداکاری کرتا ہے۔ یہ جان کر پرنیاں کو دھچکا لگتا ہے۔

گرانٹ اس سے ملاقات کا وعدہ کر کے اپنی دوست الیا مارسیلو کے ساتھ چلا جاتا ہے۔

ابراہیم چالیس کی دہائی میں اپنے تایا کے پاس امریکہ چلا گیا۔ جو وہاں فرنیچر کا کاروبار کرتے تھے۔ تایا کی بیٹی ماریہ سے شادی کر کے اس کی ساری دکان... ان کی جائیداد کا وارث بھی بن جاتا ہے۔ ماریہ کی رفاقت میں اسے اپنی خوش بختی کا احساس رہتا ہے... ماریہ کا ایک حادثے میں انتقال ہو جاتا ہے... اسپتال جلدی پہنچنے کے لیے وہ اسٹون کی قیمتی کار ادھار لیتا ہے۔ جو اس کی بد احتیاطی سے تباہ ہو جاتی ہے۔ ساتھ ہی وہ میلین کی رقم بھی آگ کی نذر ہو جاتی ہے۔ اس کی قیمت اسے اپنی تمام جائیداد اور تین انگلیاں اسٹون کے ہاتھوں کٹوا کر چکانی پڑتی ہے۔ وہ اکلوتے بیٹے احمد سمیت سڑک پر آجاتا ہے۔

احمد کی وجہ سے اسے کئی جگہ نوکری سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ ہر مرتبہ اس کا دل احمد کو ختم کرنے کو چاہتا ہے۔ آخرکار وہ کتابوں کی اپنی دکان کھول کر زندگی کی گاڑی گھسیٹنے لگتا ہے۔ اس کا رجحان مذہب کی جانب بڑھ جاتا ہے۔ جبکہ احمد کا دل تمام تر کوششوں کے باوجود اللہ کی جانب مائل ہونے سے انکاری ہے۔

احمد حتیٰ اللہ سے بھاگتا ہے۔ ابراہیم زبردستی اسے دین کی جانب لانے کی کوشش کرتا ہے۔ بالی وڈ اسٹار بننے کا خواب احمد کو بے چین رکھتا ہے۔ باپ کی سختی اور مار پیٹ اسے اور شدت سے شوق کی تکمیل کے لیے اکساتی ہیں۔ اسکول میں وہ لڑکیوں کی "پسندیدہ" ہستی ہے۔ ایک مینٹی شو کے عوض وہ کسی بھی لڑکی کو اپنا قیمتی وقت دے سکتا ہے۔ وہ اداکاروں کا زبردست نقال ہے۔ کیری گرانٹ اس کا پسندیدہ اداکار ہے۔ اپنے خواب کی تکمیل کے لیے گھر سے بھاگنے کا فیصلہ کرتا ہے مگر اس وقت جب وہ دہلیز پار قدم رکھ رہا تھا۔ ابراہیم کو فالج ہو جاتا ہے اور اس کا جسم ناکارہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ دن رات کی خدمت سے تنگ آ کر وہ ابراہیم کو مار ڈالتا ہے۔ احمد کو یقین ہے کہ اب قسمت اس پر اپنی مہربانی ضرور کرے گی۔ اس کے خواب اس وقت چکنا چور ہو جاتے ہیں جب پولیس اہلکار گرفتار کر کے اسے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔

دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر پرنیاں گرانٹ کو فون کرتی ہے تو وہ اس کا خیر مقدم کرتا ہے۔ دونوں کے درمیان دوستی پروان چڑھنے لگتی ہے۔ گرانٹ کی ساری گفتگو اداکاری کے گرد گھومتی ہے جو کہ اس کا پہلا عشق بھی ہے۔ پرنیاں گرانٹ کو متاثر کرنے کے لیے کیری گرانٹ سے متعلق معلومات اکٹھی کرتی ہے۔ دادا اسے ان مشکوک سرگرمیوں پر ٹوکتا ہے۔ کچھ ہی دنوں میں گرانٹ کے سامنے تمام اصلیت آجاتی ہے۔ وہ پرنیاں کے عجیب و غریب کی پذیرائی کرتا ہے۔ ہوٹل میں دعوت پر گرانٹ اپنی دوست الیا کو لاتا ہے تو الیا ہسپانوی زبان میں اسے "انتیا" کہتی ہے۔ پرنیاں کو الیا کی حرکتیں ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔

صوفیہ پروم نائٹ پر کارل بیکار تھی کی ساتھی بننے کی پیشکش قبول کر لیتی ہے۔ شو کے لیے ڈریس تک وہ کارل کے پیسوں سے خریدتی ہے۔ کارل اس پر تلملانے کے علاوہ کچھ نہیں کر پاتا۔ کارل صوفیہ کے ساتھ چند لمحات قربت میں بتانا چاہتا ہے جس کے لیے وہ صوفیہ کو اضافی رقم دیتا ہے۔ صوفیہ اس پیشکش کا جواب بھی مثبت دیتی ہے۔ کارل اپنے دوست کے ساتھ مل کر صوفیہ کی نازیبا ویڈیو بنانا چاہتا ہے تاکہ صوفیہ کو بلیک میل کر سکے۔

عمر کو اس کی ماں حکیم بیگم سے واپس مانگنے اٹھارہ سال بعد آجاتی ہے۔ لامحالہ حکیم بیگم کو عمر کو لوٹانا ہی پڑتا ہے۔ عمر کی ماں (آپا) عیسائی ہے اور ایک مقامی اسکول میں ٹیچر ہے۔ وہ شدومد سے عمر کو عیسائی بنانے کی کوششیں کرتی ہے لیکن عمر دین اسلام سے اپنا قلبی تعلق ختم نہیں کرتا۔ وہ مرحوم حکیم بیگم کو یاد کرتا رہتا ہے۔ آپا عمر کو اس کے حال پر چھوڑ دیتی ہے۔ آپا کے لیے شوکت صاحب کا التفات عمر کو ناگوار گزرتا ہے جو ان کے اسکول کا پرنسپل بھی ہے۔ آپا اسے غیر ضروری ڈھیل دیتی ہیں جو عمر کو گراں گزرتی ہے۔ لیکن وہ ماں سے اس کا اظہار نہیں کرتا۔

(اب آگے پڑھیے)

۳
تیسری قسط

یوٹیلٹی اسٹور سے نکل کر سڑک پر آتے ہوئے آپا یوں ساکت ہو گئی جیسے زمین نے اس کے پاؤں جکڑ لیے ہوں۔ وہ سامنے ایک ویڈیو شاپ کے دروازے کے اوپر چسپاں فلمی پوسٹر اور ان پر بنے گھورے جاتی تھی۔ مجبوراً "عمر کو پوچھنا پڑا۔ "کیا ہوا؟" وہ کچھ نہ بولی اور پوسٹروں کو دیکھتی رہی۔

"رکشہ رکواؤں یا کچھ خریدنا باقی ہے؟"

اس کی طرف سے جواب نہیں آیا۔ اسے ویڈیو شاپ کے اندر جاتے دیکھ کر عمر کو بھی تقلید کرنا پڑی تھی۔

"یہ فلم ہوگی آپ کے پاس؟"

وہ جس خستہ حال پوسٹر کی طرف اشارہ کر رہی تھی وہ ایک انگلش فلم کا تھا اور نہایت اخلاق سوز منظر پیش کر رہا تھا۔

"باجی جی! یہ فلم فیملی کے دیکھنے والی نہیں ہے۔" کاؤنٹر کے پیچھے موجود لڑکے نے قدرے رازدارانہ انداز اپناتے ہوئے اطلاع دی۔

آپا نے جیسے سنا ہی نہ ہو۔ وہ اب قریب جا کر اس پوسٹر کا بغور جائزہ لے رہی تھی۔

"میں اس فلم کا پوچھ رہی ہوں۔ یہ آپ کے اسٹاک میں ہے؟"

اس نے انگلی کی پور کو انگلی سے ٹھوکا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔ میں نے تو بتا دیا ہے آپ کو۔ ویسے آپ کو اسی ٹائپ کی فلمیں پسند ہیں تو ہمارے پاس اس سے بڑھیا آئٹم بھی دستیاب ہیں۔"

اس نے عمر کی طرف دیکھتے ہوئے نچلا لب دانتوں تلے دبایا۔ تذلیل کے احساس نے اس کی آنکھوں میں مرچیں سی بھر دیں۔

"آپ نے بتایا نہیں، میں یہ فلم خریدنا چاہتی ہوں۔"

"باجی! اس فلم میں کیا رکھا ہے۔ یہ تو کوئی آٹھ دس سال پرانی ہے۔ آپ کو اس پوری مارکیٹ میں نہیں ملے گی۔ میں آپ کو کچھ نئی۔"

"نہیں مجھے یہی چاہیے۔" وہ قطعی لہجے میں کہہ کر دکان سے نکل گئی۔

"ویسے آپ کو لازمی یہی مووی چاہیے تو ہال روڈ

سے شاید مل جائے۔ رفیع پلازہ اور زیتون پلازہ دونوں ساتھ ساتھ ہیں۔ وہاں سے ہو کر لیں۔" لڑکے نے پیچھے سے ہانک لگائی تھی۔ آپا نے رک کر سنا اور ایک دوسری ویڈیو شاپ کی طرف بڑھ گئی۔ عمر کی برداشت اب جواب دے چکی تھی۔ وہ فٹ پاتھ پر رک کر اس کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔ اسے "تقریباً" آدھا گھنٹہ وہیں ٹھہرنا پڑا۔ آپا مارکیٹ کی ہر چھوٹی بڑی ویڈیو شاپ میں وہ فلم تلاش کرتی رہی۔ اس کے لیے یہ صورت حال قطعی ناقابل فہم تھی۔ ایک گھٹیا موی کے لیے آخر وہ اس طرح ہلکان کیوں ہو رہی تھی۔ آپا نے اس کے پاس لوٹتے ہی عجلت میں رکشہ رکوایا اور بغیر کرایہ طے کیے بیٹھ گئی۔

"بی بی! کدھر چلنا ہے۔"

"ہال روڈ۔"

عمر نے بے یقینی سے اسے دیکھا تھا۔



آوازوں، رنگوں اور خوشبوؤں سے چھلکتے ہوئے آڈیٹوریم ہال میں وہ دونوں … داخل ہوئے تو کارل کی … شناساؤں کے منہ حیرت سے کھل گئے۔ صوفیہ اس سارے … پر موجود وہ آخری لڑکی تھی جسے وہ کارل کے ساتھ دیکھنے کی امید کر سکتی تھیں۔ اس نے کارل کی جانب نگاہ اٹھائی۔ وہ کچھ بجھا بجھا اور قدرے جھینپا ہوا سا لگتا تھا۔ شاید وہ اپنے فیصلے پر پچھتاوے کا شکار ہو رہا تھا۔

"اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔" صوفیہ نے سر جھٹکتے ہوئے سوچا۔ "اس پورے ہال میں سب سے خوب صورت مرد میرے ساتھ ہے اور شاید اتنی توجہ اور ایسی اہمیت مجھے اپنی زندگی میں پھر کبھی میسر نہ آئے۔ آج کی رات میری زندگی کی یادگار ترین رات ہوگی۔"

اس نے لڑکیوں کے چہروں پر کھدے حسد سے محظوظ ہونے کی کوشش کی … کر کے اپنے من سے جلد خاموشی کی صدا آگئی تھی۔ ایسا کیوں تھا؟ اگر رات تسکین تھی اور زندگی اسے اپنے حصے کی خوشیاں کشید کرنے کا موقع دے رہی تھی تو وہ خوش کیوں نہیں تھی۔ اس کے اندر کوئی امنگ کیوں نہیں جاگتی تھی۔

جب کارل نے اسے رقص کی دعوت دیتے ہوئے ہاتھ بڑھایا تو اس کا سیل فون بجنے لگا۔

"میں شرط لگاتا ہوں یہ دنیا کا سب سے کمینہ شخص ہے جو اس وقت دو پیار کرنے والوں کے بیچ حائل ہو گیا ہے۔"

کارل نے کوفت کا اظہار کیا تھا۔

اس نے ایک نظر اسکرین پر چمکتے ہندسوں کو دیکھ کر سیل فون آف کر دیا اور اپنی طرف بڑھا ہوا ہاتھ تھام کر دیگر جوڑوں کے ساتھ رقص میں شامل ہو گئی۔ اس کا خمار اب غائب ہو چکا تھا۔ وہ اپنے سیل فون پر آنے والی کال کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

کیا گرانٹ اتنی جلدی گھر واپس آگیا تھا یا اس نے اسٹوڈیو سے ہی فون کیا تھا اور اگر وہ گھر آچکا تھا تو وہ رات گئے تک باہر رہنے کا کیا جواز پیش کرے گی اور اس … اس کے ساتھ جا کر ممکن ہو گا۔ وہ قیامت کھڑی کر دیتا۔

"میرے لوٹنے سے قبل وہ سلیپنگ پلز اور شراب کے نشے میں ڈوب کر بے سدھ ہو چکا ہو گا۔"

اس نے خود کو تسلی دی اور کارل کے قدم سے قدم ملانے کی کوشش کی۔

"لیکن دروازہ تو اسے ہی کھولنا ہو گا اور وہ مجھے ڈھونڈتا ہوا یہاں آگیا تو۔"

وہ … سے بچھڑنے لگی تھی اور اس کے پاؤں الٹے سیدھے پڑ رہے تھے۔

"ضروری نہیں کہ وہ واپس ہی آیا ہو اور اگر آبھی گیا تو اسے کیسے پتا چل سکتا ہے کہ میں یہاں ہوں۔ مبیل نے … "

اس نے کارل کا ہاتھ بری طرح کچل دیا۔ وہ حواس باختہ ہو رہی تھی۔ پھر اس کے چاروں اور گونجتی

موسیقی تھم گئی۔ اس کے متحرک پاؤں بھی ساکت ہو گئے تھے۔ کیا وہ کوئی دوسرا گیت لگانے والے تھے۔ اس نے ہال میں چھائے ہوئے سکوت کے غیر فطری پن کو محسوس کیا۔

"اپنے غلیظ ہاتھ اس سے ہٹاؤ ورنہ میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔" اس نے کارل کے شانے کی اوٹ سے گرانٹ کو آتے دیکھا تھا۔ پھر صوفیہ نے اسے کارل کو گریبان سے پکڑ کر جھنجوڑتے دیکھا۔ گرانٹ منہ سے کف اڑاتے ہوئے اسے گالیاں دے رہا تھا۔

اس کی سیاہ ٹویڈ جیکٹ کھل گئی تھی۔ اس کی فرانسیسی کفوں والی سفید قمیص پھٹ کر دھجیوں میں تبدیل ہو گئی تھی۔

کارل نے اس کے منہ پر زوردار تھپڑ مارا تھا۔ وہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اس نے ہونٹوں کے گوشے سے رستے خون کو زبان سے چاٹا اور حلق کی پوری قوت سے چلایا۔

"کوئی پولیس کو بلاؤ۔ میری مدد کرو۔ پولیس کو بلاؤ۔" گرانٹ اس کے سر پر جا کھڑا ہوا اور اس کا بازو گرفت میں لے لیا۔

"ربّا! تم پاگل ہو گئی ہو؟ سب کو پھنسواؤ گی کیا۔ جیروم اور کوئی کے پاس کوکین ہے۔ خبردار پولیس کو نہ بلانا۔ یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ تم بیچ میں پڑنے کی کوشش مت کرو۔"

صوفیہ نے کسی کو تیز تیز بولتے سنا تھا۔

گرانٹ اب اسے فرش پر گھسیٹ رہا تھا۔

"تمہاری رگوں میں خون نہیں گٹر کا غلیظ پانی دوڑ رہا ہے۔ تم گناہ کرنے سے باز نہیں رہ سکتیں۔ تم بھی اپنی ماں کی طرح بدکار ہو۔"

اسے ابا کا مسخ چہرہ یاد آیا اور اس کی پیشانی پر کھدی ہوئی وہ گالی یاد آگئی۔

"تم جہنم کا ایندھن ہو صوفیہ! خدا نے جہنم تم جیسوں کے لیے ہی دہکایا ہے۔ تم جلو گی، تم قیامت تک جہنم میں جلو گی۔"

قیامت تو شاید آج ہی تھی، پھر وہ کس قیامت کی بات کر رہا تھا۔

وہ جانتی تھی کہ سب اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ لیکن وہ ان میں ان سے کسی ایک کو بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ آج کے بعد وہ ان لوگوں میں سے کسی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی ہمت نہیں کر پائے گی۔ وہ کتنا صحیح سوچ رہی تھی۔ آج کی رات حقیقت میں اس کی زندگی کی یادگار رات بن گئی تھی۔

وہ گھسٹتے ہوئے ان کے جوتوں کو دیکھنے لگی۔

سفید، نیلے، سرخ، زعفرانی، بھورے، زمردیں، سیاہ، وہاں ہر رنگ کے جوتے تھے۔

اسے آج سے پہلے کبھی اندازہ نہیں ہوا تھا کہ آڈیٹوریم ہال اتنا طویل تھا، وہ کسی طور ختم ہونے میں ہی نہ آتا تھا۔

آج بھی خدا نے اس کے ساتھ وہی کیا تھا جو وہ ہمیشہ کرتا آیا تھا۔



کمرے میں بلب کی زرد روشنی گرد ھک کے غبار کی مانند پھیلی تھی۔ اس کے چہرے کی رنگت اور اس روشنی میں حیرت انگیز ہم آہنگی تھی۔ پچھلے دو گھنٹوں سے وہ ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھی تھی اور ایک لمحے کے لیے بھی اس کی نظریں اسکرین سے جدا نہیں ہوئی تھیں۔ وہ مسلسل ایک ہی سین کو ری وائنڈ کر کے دیکھ رہی تھی۔ وہ تقریباً چار منٹ دورانیے کا ایک منظر تھا جس میں پہلے لانگ شاٹ میں کیمرہ سمندر کی بپھری ہوئی موجوں پر ڈولتی ایک لانچ دکھاتا تھا۔ چند لمحے لہروں کا تموج اور طوفانی کیفیت رجسٹر کروانے کے بعد لانچ کے اندر ایک ادھیڑ عمر مرد ایک چرخی گھماتے ہوئے نظر آتا تھا۔ چرخی سے منسلک رسی لپیٹنے کے لیے اسے بہت زور لگانا پڑ رہا تھا، اور اس کے کسرتی ہاتھوں کا

بکھر اپ لیا گیا تھا۔ پانی میں ... ہوئی رنگتی دھیرے دھیرے ابھرتی تھی پھر ایک جھماکے کے ساتھ چال میں ابھی وہ لڑکیوں کی نیم برہنہ مسخ شدہ لاشیں نظر آتی تھیں اور مرد کا چہرہ قریب سے دکھایا جاتا تھا۔ اس کی پھیلی ہوئی آنکھوں میں خوف تھا۔

جونہی اگلا سین شروع ہوا اس نے ریموٹ کنٹرول پر ری وائنڈ کے بٹن کو انگلی سے دبایا، مگر شاید سیل پوری طرح خرچ ہو چکے تھے۔ وہ اٹھ کر وی سی پی کی طرف بڑھی۔ وہ ایک بار پھر وہ منظر دیکھنا چاہتی تھی۔

آپا کے کمرے کے بند دروازے پر ابھری قوسیں گنتے گنتے عمر کی ... تھیں۔

من میں وہی پھانس تھی جس کی چبھن ایسی شدید تھی کہ سانس لینا بھی دشوار تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ چائے بنا رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ کچھ دیر وہ آپا کی طرف سے جواب کا انتظار کرتا رہا اور پھر یاد آنے پر کہ وہ غسل خانے میں ... کی تیاری کر رہی تھیں، آپا کے کمرے میں چلا آیا۔

ریسیور سے کچھ دیر تک تیز تیز سانس لینے کی آوازیں آتی رہیں، لیکن اس کی ہیلو کا جواب نہیں دیا گیا۔ ریسیور رکھ کر وہ کچن میں جانے لگا تھا کہ ایک بار پھر گھنٹی بجنے لگی۔

"ہیلو کون بول رہا ہے؟"

اس بار بھی ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے کوئی ماؤتھ پیس پر ہونٹ رکھ کر زور زور سے سانس خارج کر رہا ہو۔ خاصی دیر وہ پوچھتا رہا اور ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔ شاید فون کرنے والے کا مقصد محض تنگ کرنا تھا۔ ابھی ریسیور رکھے اسے پانچ سیکنڈ گزرے ہوں گے کہ گھنٹی پھر بجی۔ ایک دفعہ پھر وہی کارروائی دہرائی گئی تھی۔ چوتھی بار فون سننے کے لیے اسے کچن سے پلٹنا پڑا تھا۔ لیکن ابھی وہ ریسیور اٹھا نہ پایا تھا کہ آپا آگئی۔ اس نے گیلے بالوں کے گرد تولیہ لپیٹ رکھا تھا اور پانی کی بوندیں اس کے چہرے اور گردن پر لرز رہی تھیں۔ اس وقت وہ ایک نوخیز لڑکی نظر آتی تھی۔ اس کا جسم اکہرا، چہرے اور گردن کی جلد تنی ہوئی اور آنکھیں شفاف تھیں۔ اگر اس کے بالوں میں کہیں کہیں جھلکنے والی سفیدی چھپ جاتی تو اس کی عمر کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔

"میں سن لوں گی۔" اس نے ریسیور ہاتھ میں لیتے ہوئے عمر سے کہا تھا، جو اشارہ تھا کہ وہ وہاں سے چلا جائے۔

"جی شوکت صاحب! میں بزی تو نہیں تھا۔" اس کے کچن کی جانب بڑھتے قدموں کی رفتار دھیمی پڑ گئی۔

"آپ کے علاوہ یہاں فون ہی کس کا آتا ہے۔ مجھے تو اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ آپ نے خوامخواہ ہی کنکشن دلوا دیا۔"

وہ دروازے کے قریب ٹھہر گیا تھا۔ آپا دوسری طرف سے بات سنتے ہوئے اپنی پیشانی اور گردن کی پشت پر پھسلتی نمی کو پونچھ رہی تھی۔

"ایک اور وعدہ، آخر کب تک میں یہ وعدے سنتی رہوں گی۔ سال ہونے کو آیا اور بات وعدوں سے آگے نہیں بڑھی۔ انتظار کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔" اس کی آواز میں خفگی تھی۔

"کچھ کیجیے شوکت صاحب! میں اس سلسلے سے تنگ آچکی ہوں۔"

عمر کو چولہے پر دھری پتیلی یاد آئی تھی۔ وہ عجلت زدہ قدموں سے کچن میں پہنچا لیکن اسے دیر ہو چکی تھی۔ تمام چائے پتیلی کے کناروں سے ابل کر چولہے پر بہہ چکی تھی اور خالی پتیلی آگ کی لپٹوں سے جھلس رہی تھی۔

"عمر!" آپا نے اپنے کمرے سے آواز دی۔

اس کا ہاتھ جل گیا۔ پتیلی اتارتے ہوئے وہ کپڑا ہاتھ پر لپیٹنا بھول گیا تھا اور ننگے ہاتھ سے دہکتی ہوئی دھات کو چھو لیا تھا۔

"جی آپا!" اس نے جلی ہوئی انگلیاں ہونٹوں میں دبا لیں۔ "آج تم میرے ساتھ چرچ جاؤ گے اور میں

تمہارا انکار نہیں سنوں گی۔"

وہ بولتے ہوئے کچن کے دروازے تک آگئی تھی۔

"دریا میں اترو گے تو تیرنا سیکھو گے۔ کنارے پر بیٹھے سوچتے رہنے سے تمہارے اندیشے بڑھتے جائیں گے۔"

"میرے لیے وہاں کچھ نہیں ہے۔ میں نہیں جاؤں گا۔" جلن کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔

"میں تمہیں اپنی مامتا سے مجبور ہو کر نہیں لائی عمر! جہاں میں نے اتنے سال تمہارے بغیر گزار دیے، کچھ اور بھی گزار سکتی تھی۔"

اس نے آپا کے لیے اپنے دل میں کبھی کوئی محبت محسوس نہیں کی تھی، لیکن پھر بھی اس کی بات نے عمر کو بہت دکھ دیا۔

"مجھے یہ فکر مارے ڈالتا تھا کہ میں نے تمہیں جانتے بوجھتے ہوئے اندھیرے میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ ایک کرسچن بچے کو متعصب مسلمان عورت کے ہاتھوں میں سونپنے کا گناہ مجھے خداوند کبھی معاف نہیں کرے گا، لیکن میں مجبور تھی۔"

اس کی مجبوریاں کیا رہی تھیں اور وہ انہیں کیوں ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔ اب ان باتوں سے عمر کو کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ بس اتنا جانتا تھا کہ آپا کے آنے سے پہلے اس کی زندگی ایسی منتشر نہ تھی۔ وہ گہرے کہر کی طرح اس کے افق پر چھا گئی تھی اور کچھ بھی سجھائی نہ دیتا تھا۔

"میں پچھتاوے کے اس بوجھ سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ میری مدد کرو عمر! میں تمہیں اپنی آنکھوں سے جہنم کی طرف بڑھتے ہوئے کیسے دیکھ سکتی ہوں۔ تم میرے جسم کا حصہ ہو۔"

وہ خاموش رہا اور جھلسی ہوئی پتیلی کو سنک میں رکھ کر نل کھول دیا۔

"ہر کسی کو اپنی صلیب خود اٹھانی ہے۔ کوئی کسی کا بوجھ بٹا بھی کیسے سکتا ہے۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے میری تمام کوشش عبث ہے۔ ایمان سب کا مقدر نہیں ہوتا۔" اس نے ایک سرد سانس سینے کی تہہ سے کھینچ کر کچن کی پرحدت فضا کے سپرد کیا۔

"کتے کو دھنک کے رنگ کیسے دکھائے جا سکتے ہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں، کیونکہ وہ کلر بلائنڈ ہوتا ہے۔"

"اندھا ہونے سے کلر بلائنڈ ہونا بہتر ہوتا ہے آپا!"

عمر نے انگلیوں کی پوروں پر بننے والے آبلوں کو دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اب یہ سلسلہ موقوف ہو جائے گا، لیکن یہ اس کی خام خیالی تھی۔ شام کو دروازے پر دستک کا جواب دینے وہ گلی میں نکلا تو Habit (ننوں کا مخصوص لباس) میں ملبوس ایک نرم نقوش والی، سانولی ادھیڑ عمر عورت کھڑی تھی۔

"تم عمر ہو؟ میں تم سے ہی ملنے آئی ہوں۔" اس کے تصدیق کرنے پر وہ بولی۔

"میں سسٹر سوزن ہوں۔ تمہاری آنٹی کی دوست۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ تم کسی الجھن میں ہو۔ سوچا تم سے مل کر اسے دور کرنے کی کوشش کروں۔"

جانے وہ اس کی الجھن سلجھانے آئی تھی یا اسے مزید الجھانے آئی تھی۔ عمر نے بے دلی سے اسے اندر آنے کی دعوت دی تھی۔

☼ ☼ ☼

ڈاکٹر اسٹینلے والٹر انویسٹی گیشن روم میں داخل ہوا تو کھردری اور غیر آرام دہ کرسی پر بیٹھے ہوئے سیاہ فام لڑکے نے چونک کر گردن موڑی اور میز پر رکھی ہوئی بیساکھی نیچے اتار لی۔ اسٹینلے والٹر نے داغ دار بوسیدہ میز کی دوسری طرف اس کے عین سامنے کرسی سنبھالنے سے قبل اس سے ہاتھ ملایا تھا۔ اس کے مصافحہ کرنے کا انداز اس کی جسمانی طاقت کا مظہر تھا۔ اگر وہ خوف زدہ ہوتا تو اس کی گرفت اتنی مضبوط نہ ہوتی۔ اسٹینلے اسے گہری نظروں سے جانچتے ہوئے بیٹھ گیا۔ وہ بہت بدصورت تھا۔ اس کی پیشانی تنگ، آنکھیں دھنسی ہوئی، نتھنے ناک کی ہڈی سے بے حد پھیلے ہوئے اور ہونٹ جھلسے ہوئے گوشت کے دو لوتھڑے تھے۔ چکنائی زدہ گھنگھریالے بالوں سے جا بجا سر کی جلد

جھانکتی تھی۔ اس نے ایک بوقلموں زنانہ لبادہ پہن رکھا تھا جو اس کے لمبے چوڑے جثہ کے لیے نہایت تنگ تھا اور جگہ جگہ سے ادھڑا ہوا تھا۔ وہ یقیناً" کسی بیمار ذہنیت کا حامل شخص تھا۔

اسے ایک پولیس پیٹرول کار نے اس وقت چیک کیا تھا جب وہ اپنی رہائش گاہ کے قریب ایک نوجوان لڑکی کے مردہ جسم کو فٹ پاتھ سے نیچے گھسیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گشت پر تعینات آفیسرز کے دریافت کرنے پر اس نے ایک بے سروپا کہانی سنائی تھی اور قتل کی واردات سے مکمل لاتعلقی ظاہر کی تھی' جبکہ اس کی کلائی پر کھرونچوں کے تازہ نشانات تھے۔ جن سے خون بھی رس رہا تھا' جو اس بات کے گواہ تھے کہ لڑکی کی موت سے قبل بھی وہ اس کے ساتھ موجود تھا۔ ظاہری طور پر ایسی کوئی علامات نہیں تھیں' جن سے پتا چلتا کہ لڑکی کے ساتھ زیادتی کی گئی تھی۔

ڈیٹکٹو اسٹیلے والٹر چند لمحے خاموشی سے اسے گھورتا رہا اور اس دوران اپنے ذہن میں سوالات کو ترتیب دیتا رہا۔ بالآخر گلا کھنکھارتے ہوئے اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"تمہارے تعاون کے لیے میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ تم نے یہاں آنے کی درخواست پر ذرا بھی مزاحمت نہیں کی اور اپنی رضامندی سے پولیس آفیسر کے ساتھ چلے آئے۔ تمہارا رویہ قابل تعریف ہے۔"

اس نے لہجے کو دوستانہ بنانے کی حتی المقدور کوشش کی۔

"تمہارا نام؟ کیا بتایا تھا تم نے۔ میں بھی کیسا بھلکڑ ہوں۔ یہ کوئی بھولنے کی بات ہے؟" اس سوال اور ایسے بہت سے دوسرے سوالوں کے جواب وہ پہلے سے جانتا تھا۔ لیکن اس وقت انہیں پوچھنے کا مقصد مدمقابل کی جھجک دور کرنا اور اسے بولنے پر آمادہ کرنا تھا۔

"ویل۔" اس نے بیساکھی کو زور سے سینے کے ساتھ بھینچتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ تو لڑکیوں والا نام ہے۔ میں تمہارا نام پوچھ رہا ہوں۔"

"نہیں میرا نام ویل ہے' یہی میرا نام ہے۔ ویل۔ میں ویل ہوں۔" وہ ویل کی گردان کرنے لگا۔

"لیکن جہاں تک میری معلومات ہیں' یہ تمہاری چھوٹی بہن کا نام تھا جو 1992ء کے فسادات میں ہلاک ہو گئی تھی۔"

وہ خاموش رہا اور بیساکھی کو اور بھی سختی سے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔

"اگر تم برا نہ مانو تو میں تمہیں ٹوبی کریگ کہہ کر پکاروں' میرا مطلب ہے جو نام تمہارے والدین نے رکھا تھا۔"

وہ ساکت پلکوں کے ساتھ اسٹیلے کو گھورتا رہا۔

"ٹوبی کریگ! تم انتھونی جڈ کے گیراج میں کب سے کام کر رہے ہو؟"

"چار سال سے۔"

"تمہارے کام کی نوعیت کیا ہے؟"

"میں کیش رجسٹر مین ٹین کرتا ہوں۔"

"یہ تو بہت ہشیاری کا کام ہے۔ انتھونی نے تمہیں یہ ملازمت کیوں دی؟ میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ تم ذرا مختلف ہو۔"

"وہ میرا انکل ہے۔"

"تم انتھونی کے گھر میں کیوں نہیں رہتے؟ تنہا کیوں رہتے ہو؟"

"میں تنہا ہوں۔"

"ٹوبی! مجھے معلوم ہے' تم ایک قانون پسند شہری ہو اور میں دل سے تمہاری قدر کرتا ہوں۔" وہ لوکل کرمنل ڈیٹا بیس کو کھنگال چکا تھا اور ٹوبی کریگ کا کوئی سابقہ مجرمانہ ریکارڈ اسے نہیں ملا تھا' جانے اس سے قبل ٹوبی نے کوئی جرم ہی نہیں کیا تھا' یا اب تک وہ قانون کی نظروں سے بچا رہا تھا۔

بات چیت میں روانی لانے کے لیے وہ خاصی دیر غیر ضروری اور فروعی نوعیت کے سوالات پوچھتا رہا اور جب اسے محسوس ہوا کہ لوہا گرم تھا تو اس نے پہلی چوٹ کی۔

"تمہاری کلائی پر زخم کیسے آئے؟" وہ ہاتھ سے اپنی کلائی ٹٹولنے لگا تھا۔

"مجھے درد ہو رہا ہے۔"

"تم مقتولہ کو کب سے جانتے تھے؟"

وہ چپ رہا۔

"تم اسے پسند کرتے تھے؟"

اس کے ہونٹ سختی سے آپس میں پیوست تھے۔

"کیا اس نے تمہاری دل آزاری کی تھی؟"

وہ یوں ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا جیسے اسٹیلے کے چہرے سے نظریں ہٹانا اس کے اختیار میں نہ ہو۔

"تم نے اسے وہیں کیوں نہیں چھوڑ دیا۔ تم اس کی لاش کے ساتھ کیا کرنے والے تھے؟"

"تمہیں لاشیں اچھی لگتی ہیں؟ ان پر حکمرانی کرنا؟ وہ تمہارا کوئی حکم ماننے سے انکار نہیں کر سکتیں۔"

"میں چلا جاؤں؟" اس نے بے چینی سے کرسی میں پہلو بدلا۔

"چند بے ضرر سوالات کا جواب دینے میں حرج ہی کیا ہے۔ تم اپنا رویہ بدل لو تو مجھے خوشی ہوگی۔" اسٹیلے نے [illegible] لہجے میں کہا۔

اس نے کئی مشہور سیریل کلرز کے نام لیے۔ وہ ذاتی طور پر ایسے لوگوں کی تشہیر کے سخت خلاف تھا۔ کیونکہ اس کے خیال میں نوجوان لوگ الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا کے منفی رجحانات کو آسانی سے قبول کرتے تھے اور بعض اوقات جرائم میں سنسنی خیزی تلاشنے لگتے تھے۔

ٹوبی کا چہرہ بے تاثر رہا۔ یہ اندازہ لگانا بہت مشکل تھا کہ وہ انہیں جانتا تھا یا نہیں۔ چند منٹ خاموش بیٹھ کر وہ اسے دیکھتا رہا۔ اس کا مقصد ٹوبی کو سوچنے کے لیے مہلت دینا تھا۔ آخر کار اس نے ایک سرگوشی کی۔

"اس کے جوتے۔" اس نے ایک بار پھر وہ بے تکی کہانی سنانی شروع کر دی' جو وہ پہلے بھی بیان کر چکا تھا۔

مقتولہ نے ایک مہنگی برانڈ کے نئے جوتے پہن رکھے تھے اور ٹوبی کی کہانی قرمزی رنگت کے ان جوتوں کے گرد گھومتی تھی۔ اسٹیلے نے ایک طویل سانس بھری اور اٹھ کر اس کی پشت پر آگیا۔ یہ اسے ہراساں کرنے کا ایک نفسیاتی حربہ تھا۔ جب اس نے ٹوبی کے کندھوں پر ہاتھ رکھے تو وہ چہرہ اٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔

اب وہ رو رہا تھا اور اس زاویے سے اور بھی بدصورت نظر آتا تھا۔ اسٹیلے کو اس شعبے میں کام کرتے ہوئے دس برس سے اوپر ہو چکے تھے اور اسے چہرے پڑھنے میں ملکہ حاصل ہو چکا تھا۔ Suspect (مشتبہ) کی ایک چشمک سے وہ سچ جھوٹ کا پتا چلا لیا کرتا تھا۔ لیکن جانے کیا بات تھی کہ ٹوبی کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے کے سلسلے میں وہ دبدھے (تذبذب) میں پھنسا تھا۔ اس کی تمام تر بدصورتی اس سے منسوب جرم کی تفصیلات جاننے کے باوجود وہ اس کے لیے دل میں نفرت محسوس نہیں کر رہا تھا۔

وہ اسے تسلی دینے کے انداز میں اس کے کندھوں کو ہولے ہولے تھپکنے لگا۔ روتے ہوئے اس کی ناک سے رینٹھ اور منہ سے رال بہنے لگی تھی۔ ان لمحات میں وہ کیسا مکروہ دکھائی دیتا تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے اسٹیلے کو [illegible] یاد آگیا جو اس کے ساتھ [illegible] تھا۔ لیکن پھر نادانستگی میں اس کے اپنے ہی پاؤں تلے دب کر ہلاک ہو گیا تھا۔ ٹوبی نے اشارہ کر کے اسے خود سے قریب ہونے کو کہا' جیسے وہ کوئی راز کی بات بتانا چاہتا ہو۔

"ہاں بولو۔ شاباش سچ بول دو ٹوبی! یہ ہم دونوں کے لیے بہتر ہوگا۔" اسٹیلے نیچے نہیں جھکا اور اس کی کمر ہاتھ سے سہلانے لگا۔ اس کے لٹکے ہوئے سیاہی مائل ہونٹوں سے سسکاری برآمد ہوئی۔

"خدا مجھ سے نفرت کرتا ہے۔"

اسٹیلے کو اپنے جسم پر رونگٹے کھڑے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔

***

ساری فضا میں برف کے گالے سفید چنگاریوں کی مانند اڑ رہے تھے تیزی سے بہتی ہوا بھٹ میں چھپے

ورنڈے کی طرح چنگھاڑتی تھی۔ جس دن کا آغاز تو آسمان سے اترتی ملائم سفید پھواروں سے ہوا تھا' وہ اب طوفان کی آماجگاہ بن رہا تھا۔

وہ پولیس آفیسرز کی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے بری طرح کسمسا رہا تھا۔ پولیس کار اس سے چند قدم کی دوری پر تھی۔ وہ لوگ کچھ ہی لمحوں بعد اسے ہتھکڑی لگا کر اس بھیانک نظر آنے والے مشینی عفریت کے اندر دھکیلنے والے تھے اور وہ کوئی گاڑی نہ تھی۔ وہ اس کا تابوت تھا۔ جس میں بند کر کے وہ اسے گورستان لے جانے کے لیے آئے تھے۔ اس کی تمام خواہشوں کو اس کے ساتھ ہی دفن کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔

ریاست میں Minors (قانون کی نظر میں نابالغ) کے لیے کیا قوانین رائج تھے۔ وہ نہیں جانتا تھا مگر اس بات میں کوئی شک نہیں تھا کہ ابراہیم کو قتل کرنے کی پاداش میں اسے ہر اس خوشی سے محروم کر دیا جائے گا' جس کا وہ ہمیشہ سے متمنی تھا۔ وہ چند قدم اسے بالی ووڈ سے برسوں کی دوری پر لے جا رہے تھے۔ ان ہی چند لمحوں میں اسے کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔

ان میں سے ایک آفیسر اسے چھوڑ کر آگے بڑھا اور کار کے ریڈیو پر آنے والی کسی کال کا جواب دینے لگا۔ تب ہی احمد نے طے کر لیا کہ اسے کیا کرنا تھا۔ فیصلہ کرتے ہی adrenaline کی وجہ سے اس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے تھے۔ اچانک اس نے اپنے قریب موجود آفیسر کے ہولسٹر میں لگی گن پر جھپٹا مارا اور اچھل کر دور جا کھڑا ہوا۔

"چلو۔ تم دونوں گاڑی سے دور ہو جاؤ۔ اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔" اس نے ریوالور ان پر تان کر چیختے ہوئے کہا۔

وہ دونوں اس افتاد پر ہکا بکا رہ گئے تھے اور اپنی اپنی جگہ پر ساکت کھڑے تھے۔ بھاری جسامت والے نے جو گاڑی کے قریب تھا۔ سنبھلنے میں پہل کی اور اونچی آواز میں بولا۔

"دیکھو میری بات سنو۔ تم بہت بڑی غلطی کر رہے ہو اپنے لیے اور بھی پیچیدگی پیدا کر رہے ہو۔ یہ گن مجھے دے دو۔ یہ لوڈڈ ہے۔"

احمد دیکھ رہا تھا کہ اس نے اب تک ریڈیو کا مائیک ہاتھ میں دبا رکھا تھا۔

"تم اسے بند کرو۔ تم سے جو کہا ہے وہ کرو۔ کار سے دور ہٹو اور اپنی گن نکال کر میری طرف پھینکو۔" وہ بہت بدحواس ہو رہا تھا۔ بھربھری برف پر الٹے قدموں پیچھے ہٹتے ہوئے اسے ایک ٹھوکر بھی لگی تھی۔ اس کا پورا بدن ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ یہ قدم اٹھانے سے پہلے اس نے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں کوئی واضح منصوبہ بندی نہیں کی تھی اور اب چیخ چیخ کر انہیں سرنگوں ہونے کی ہدایات دیتے ہوئے وہ اپنی تمام تر ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا رہا تھا۔ اگر وہ ان دونوں کو بے بس کر کے باندھنے میں کامیاب ہو جائے اور کار کے ٹائر برسٹ کر کے ریڈیو کو بھی ناکارہ بنا ڈالے تو جب تک ان کو کوئی مدد میسر آتی۔ وہ آسانی سے قریبی اسٹیشن سے جو صرف ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ ٹرین میں سوار ہو کر یہاں سے نکل سکتا تھا۔ ان کے سوا دور دور تک کوئی ذی روح دکھائی نہ دیتا تھا اور اس خراب موسم میں کسی کا جلدی اس طرف آنا بھی بعید از قیاس تھا۔

اسے اچھی طرح احساس تھا کہ پولیس آفیسرز اس کی دھمکیوں کو سنجیدگی سے نہیں لے رہے تھے اور سمجھانے بجھانے کی آڑ میں دھیرے دھیرے اس کے قریب آ رہے تھے۔ اس نے ابھی کوئی آتشیں ہتھیار استعمال نہیں کیا تھا لہٰذا اسے اپنے نشانے کے سلسلے میں کوئی غلط فہمی نہیں تھی۔ ان دونوں کے پیروں کے بیچ برف کی طرف نال کا رخ کر کے اس نے جھجکتے ہوئے ٹریگر دبا دیا۔ عین اسی لمحے جسیم آفیسر نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ اس نے دھماکا سنا۔ جو اس کے اندازے سے کئی گنا زیادہ شدید تھا' آفیسر کے بوجھل جسم کو خود پر گرتے ہوئے محسوس کیا۔ اس کے دوسرے ساتھی کو بھاگ کر آتے اور ٹھوکر مارنے کے لیے پاؤں اٹھاتے ہوئے دیکھا جبڑے کی ہڈی پر بوٹ کی سرد ٹھوس ضرب محسوس کی۔ بازی اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ یہ بات بھی اس کی سمجھ میں آ گئی لیکن اس سارے منظر میں تازہ سرخ لہو کے چھوٹے سے تالاب کو وہ کہیں فٹ نہیں کر پایا تھا۔ اجلی سفید برف پر پھیل کر جمتا ہوا گاڑھا سرخ لہو کیسا عجیب دکھائی دیتا تھا۔

پولیس اسٹیشن کے بکنگ روم میں اسے Book کیا جا رہا تھا تو وہ خواب کی سی کیفیت میں تھا۔ اس نے ایک نظر بھی اس آدمی کا چہرہ نہیں دیکھا جس نے اس کے فنگر پرنٹس لیے تھے Mug Shots (فوٹوگراف پورٹریٹ جو کسی کو گرفتار کرنے کے بعد لی جاتی ہے) اتارتے ہوئے ایک سیاہ تختی جس پر سفید حروف میں کچھ لکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تھما دی گئی۔ زندگی میں یہ پہلی تصویر تھی' جسے کھنچنے سے پہلے اسے سنورنے کے لیے نہیں کہا گیا تھا اور وہ سوچ رہا تھا۔ Mug Shots کے لیے سنورنا ضروری ہو گا۔

[illegible] ابراہیم اس کے ارادے کا تیر نہیں بنا تھا۔ بلکہ مونا اسٹوکر کی ایک غلطی نے اس کی راہ کھولی تھی۔ مونا نے زہر کھا کر اپنی جان لینے کی کوشش کی تھی لیکن شاید زہر کا انتخاب کرنے میں اس نے کچھ بے احتیاطی برتی تھی اور اسی بنا پر سولہ گھنٹے ہسپتال میں تڑپتے رہنے کے باوجود مرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ لیکن یہ وہ غلطی نہیں تھی جس کا خمیازہ احمد کو بھگتنا پڑ رہا تھا۔ دراصل خودکشی کرنے سے قبل اس نے ایک خط فادر الیگزینڈر کے نام تحریر کیا تھا اور اسی خط سے یہ تمام سلسلہ شروع ہوا تھا۔

اس کے اٹارنی کا نام ولسن آرنو تھا اور وہ قریباً پینتالیس سال کا خوش لباس اور ذہین آدمی تھا۔ اس سے مل کر احمد کو کچھ امید بندھی کہ وہ کوئی راستہ نکال لے گا مگر دوسری ملاقات میں ہی ولسن نے اسے غلط ثابت کر دیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم زیادہ بیوقوف ہو یا زیادہ بدقسمت۔ مونا نے تم پر ریپ کا الزام لگایا تو یہ کوئی ایسی سنگین صورت حال نہیں تھی۔ اس کا طبی معائنہ بروقت نہیں ہوا' اور اتنے دن گزر جانے کے بعد تمام مادی شہادتیں ویسے ہی ضائع ہو چکی ہیں۔ کوئی عینی گواہ نہیں ہے۔ اس الزام کو ثابت کرنا قریب قریب ناممکن ہے اور مونا جس قسم کی عورت ہے۔ وہ عدالتی کارروائی کا بار برداشت ہی نہیں کر سکتی۔ ریپ کیسز میں جس طرح کے سوالات اور جرح کی جاتی ہے ویسی کمزور اعصاب والی عورتوں کے لیے اس کا تصور بھی روح فرسا ہوتا ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ میں فادر الیگزینڈر کو آؤٹ آف کورٹ سٹلمنٹ کے لیے آمادہ کر لوں گا۔ اور اگر ایسا نہ بھی ہوا اور تمہیں Convict (سزایاب) کر دیا گیا جس کا میرے تجربے کی روشنی میں بہت کم امکان ہے تو بھی پہلی بار جرم کرنے والوں کے لیے عدالت کا رویہ نرم ہوتا ہے اور پھر تم minor (نابالغ) ہو۔"

احمد اپنی نادانی اور خفت پر دل میں خود کو ملامت کر رہا تھا۔ اس نے روتے ہوئے یہ اقرار کر لیا کہ اسے ابراہیم کے قتل کے جرم میں گرفتار کیا جا رہا تھا اور اب اسے یاد آیا تھا کہ پولیس آفیسرز اسے کار میں بیٹھنے پر آمادہ کرتے ہوئے کچھ بتانے کی کوشش بھی کر رہے تھے لیکن تب وہ اتنا خوفزدہ تھا کہ کچھ سننے اور سمجھنے پر تیار ہی نہیں تھا۔ ولسن آرنو کی زبان سے نکلنے والے الفاظ اس کے اندر موہوم سی امید جگانے لگے تھے لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ولسن کی بات ابھی تمام نہیں ہوئی تھی۔

"اب یہ مونا اسٹوکر والا معاملہ تو ثانوی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ آفیسر براؤن پر گولی چلا کر تم نے اپنے لیے بڑی مشکلات پیدا کر لی ہیں۔ میں تمہیں کوئی جھوٹی تسلی دے کر غلط امید نہیں دلانا چاہتا۔ مجھے خدشہ ہے کہ تمہیں لمبے عرصے کے لیے جیل جانا ہو گا۔"

احمد نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔ وہ زیر لب۔ کچھ بولنے لگا تھا۔

"اگر تم دعا مانگ رہے ہو تو اپنے لیے نہیں براون کے لیے مانگو۔ وہ اب تک ہوش میں نہیں آیا ہے۔ اور وہ بچ بھی گیا تو شاید فیلڈورک کے قابل نہ رہے۔"

اب احمد اس کی بات بھی نہیں سن رہا تھا۔

"اب نہیں کروں گا۔ دوبارہ بھی نہیں۔ اب میں تجھے کبھی ناراض نہیں کروں گا۔ مجھے معاف کر دے ایک بار۔ مجھ سے راضی ہو جا۔ میں پھر تجھے خفا نہیں ہونے دوں گا۔" وہ سختی سے آنکھیں میچے گڑگڑا رہا تھا۔

ولسن آرنو کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی تھی۔

فادر الیگزینڈر اور مونا نے کیس کی پیروی نہیں کی تھی لیکن پیٹر براون چند ہفتے ہسپتال میں رہنے کے بعد مر گیا تھا۔ احمد کو پانچ سال کی قید کی سزا سنائی گئی جس کے اختتام پر اسے ڈیڑھ سال Probation پیریڈ بھی گزارنا تھا۔

☼ ☼ ☼

سزا کا ابتدائی حصہ اس نے ایک juvenile correctional facility میں گزارا اور بلوغت کی عمر کو پہنچنے پر اسے state prison میں منتقل کر دیا گیا۔



اس کی زندگی میں بس اتنی ہی تبدیلی آئی اور باہر کی دنیا میں تغیرات کی موجیں اٹھتی رہیں۔

خلا میں "چلنے" سے آگے بڑھ کر انسان نے چاند پر قدم رکھ دیا۔ اپالو اور نیل آرمسٹرانگ گویا Arabian Nights کے کسی محیر العقل قصے کے جزو تھے۔ ہائیڈروجن بموں اور گائیڈڈ میزائل کروزرز کا ذکر روز مرہ استعمال کی اشیاء کی طرح ہونے لگا۔

Malavi c Barbados' Gambia botswana جیسے نامانوس نام خود مختاری کا طغرہ سجا کر دنیا کے چہرے پر ابھرے۔ یہ ساٹھ کی دہائی کا دوسرا نصف تھا اور اس عرصے میں امریکیوں کے پاس بات کرنے کے لیے تین ہی موضوعات تھے۔

ویت نام جنگ، مارٹن لوتھر کنگ جونیئر اور "دی بیٹلز" ایک رات اپنے cell میں bunk پر لیٹا ہوا وہ ساتھی inmates کے ہمراہ Bien Hoa کے مقام پر امریکن میرینز اور Veit Cong دستوں کے مابین ہونے والے محاذ کے بارے میں بات کر رہا تھا تو ان میں سے کسی نے مذاق میں کہہ دیا۔

"میں کبھی کبھی یہ سوچ کر خوش ہو جاتا ہوں کہ اگر اس وقت میں یہاں نہ ہوتا تو شاید مجھے لازمی فوجی خدمات کے لیے بلایا جا چکا ہوتا اور شاید اس لمحے میں ویت نام کے جنگل میں ٹوائلٹ ڈھونڈنے کے لیے مارا مارا پھر رہا ہوتا۔ یہ جیل جہنم کی چھوٹی بہن سہی مگر پھر بھی یہاں رہنا Veit Cong کی گولی کھانے یا Pow (جنگی قیدی) بننے سے تو ہزار گنا بہتر ہے۔"

وہ لوگ ہنس رہے تھے مگر احمد بالکل چپ ہو گیا تھا۔ لازمی فوجی خدمات کا ذکر سن کر اس کو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔

پریذیڈنٹ لنڈن بی جانسن ——— جنوبی ویت نام میں امریکی دستوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ کر رہے تھے اور ہر ماہ پینتیس ہزار کے قریب امریکی نوجوانوں کو draft کیا جا رہا تھا۔ وہ خود بھی "ڈرافٹ" کی عمر کو پہنچ چکا تھا اور جیل میں نہ ہوتا تو قوی امکان تھا کہ اسے ویت نام بھجوا دیا جاتا اور [illegible] وقت سے پہلے ابراہیم سے جان چھڑانے کی کوشش ہی نہ کی ہوتی تو شاید ابراہیم اتنے ہی برس اور جی پاتا۔ پانچ چھ سال تو کیا وہ خدا کے منصوبے سے متصادم ہو رہا تھا یا خدا چاہتا ہی نہیں تھا کہ وہ ہالی ووڈ جائے۔ اس نے الجھی ہوئی سوچ کا سرا الجھا دیا۔ وہ بے جا وہم تراش رہا تھا تو یہ سب مفروضے ہی تو تھے نا۔

یہ دور جنگ کا تھا۔ بے امنی کا زمانہ تھا۔ امریکہ کئی قسم کی جنگوں میں ملوث تھا۔ کچھ محاذ سرحدوں سے باہر لڑے جا رہے تھے اور کچھ ملکی حدود کے اندر بپا تھے۔

سر فہرست ویت نام کی جنگ، جس کے خلاف امریکہ میں ملک گیر احتجاج ہو رہے تھے لیکن ان کی صدا پینٹاگون کی دیواروں سے ٹکرا کر عوام کے کانوں میں لوٹ آئی تھی۔

پھر سرد جنگ جو کئی برسوں سے امریکہ اور روس میں جاری تھی۔

ایک سول حقوق کی جنگ بھی تھی جسے مارٹن لوتھر کنگ جونیئر اور روزا پارکس ——— جیسے لوگ بنا ہتھیاروں کے لڑ رہے تھے۔

ان سب کے علاوہ نسلی فسادات کی آگ تھی جو Watts 'Milwaukee Detroit' Harlem میں بھڑکی اور بہت کچھ خاکستر کر دیا۔

اس پر آشوب دور میں بھی ہالی ووڈ نے محبت اور خوب صورتی پر سے انسانوں کا ایمان اٹھنے نہیں دیا اور دنیا کو Oliver 'Man of All Seasons' Mary Poppins 'My Fair Lady' جیسے تحفے دیے۔

☼ ☼ ☼

پرنیاں نے رائٹنگ ٹیبل پر رکھے کانچ کے ڈبے کو دیکھا اور وہ اسے پہلے سے زیادہ اچھا لگا۔ اس کی بناوٹ میں نہایت نفاست تھی۔ کانچ کی دیواریں بالکل شفاف



تھیں۔ [illegible] وہ اسے گرانٹ نے خرید کر دیا تھا۔ [illegible] عمارت میں گھس گئے تھے اندر انواع و اقسام کی اشیاء شوکیسز اور کاؤنٹرز پر زیر نمائش تھیں۔ ایک حصہ والٹ ڈزنی کی فیری ٹیلز اور کامک کریکٹرز کے لیے مختص تھا اور وہی پرنیاں کو سب سے زیادہ دلچسپ لگا تھا۔ وہاں سنڈریلا کے جوتے، سنو وائٹ کی سوتیلی ماں کا جادوئی آئینہ، لکڑی سے بنا Pinnocchio، پیٹر پین کا کاسٹیوم اور ایسی ہی بہت سی چیزیں موجود تھیں۔ اس حصے میں زیادہ تعداد بچوں کی تھی۔ پرنیاں کو ان سب چیزوں میں سے ایک شیشے کا منی ایچر صندوق بہت منفرد لگا تھا وہ دلکش پہلو تھا۔ اس کے ڈھکن کو نچلے ڈبے سے جوڑنے کے لیے سنہری کل پتیاں جڑی تھیں اور وہ باقاعدہ کھل سکتا تھا۔ اس کی شفاف چھت پر سنہری حروف میں رقم تھا۔ "سنو وائٹ جو ایک بادشاہ کی بیٹی تھی۔" اس نے سنو وائٹ کی کہانی پڑھ رکھی تھی لیکن اسے یاد نہیں تھا اس صندوقچے کا ذکر کہاں آیا تھا۔ وہ دیر تک اسے ہاتھوں میں تھامے قریب سے دیکھتی رہی تھی۔ گرانٹ نے شاید اس کی پسندیدگی محسوس کر لی تھی۔ اسے پتہ بھی نہ چلا کب اس نے خاموشی سے جا کر قیمت ادا کر دی۔

"خریدنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں تو بس ایسے ہی۔" پرنیاں نے احتجاج کیا۔ گرانٹ کی مالی حالت اس سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔

اس نے جواب میں محض مسکرا کر کندھے اچکا دیے تھے۔

"لیکن فیری ٹیل میں ایسے کسی ڈبے کا تذکرہ تو نہیں تھا۔"

"جب سنو وائٹ زہریلا سیب کھا کر ابدی نیند سو جاتی ہے تو سات بونے اسے کانچ کے تابوت میں لٹا کر جنگل میں چھوڑ آتے ہیں۔"

وہ توہم پرست نہیں تھی پھر بھی تابوت کا سن کر اسے کچھ عجیب سا محسوس ہوا تھا۔

اور اس وقت وہ اسے سامنے رکھے سوچ رہی تھی کہ گرانٹ کے اس تحفے کا کیا مصرف ہونا چاہیے۔ [illegible] وہ اٹھی اور الماری کے پٹ کھول کر کچھ تلاش کرنے لگی۔ چند ثانیے بعد اس نے کچھ چیزیں لا کر احتیاط سے رائٹنگ ٹیبل پر رکھ دیں۔ وہ سب گرانٹ کے تحائف تھے۔ پانچ باسی پھول جو اس نے مختلف مواقع پر اسے دیے تھے Gloxinia ایک زرد ڈیزی سفید Camellia سرخ جرینیم اور ایک ارغوانی سورنجان۔ وہ سب مرجھا چکے تھے۔ پتوں پر بھوری سیاہ چھتیاں پڑنے سے اصل رنگ کھو گئے تھے اور پتیاں بکھر کر ڈنٹھلوں سے جدا ہوئی جاتی تھیں۔ اس نے ان پھولوں کو ایک سفید ریشمی رومال میں لپیٹ کر اس ڈبے میں رکھ دیا۔ باقی جو اشیاء اس نے سنبھالیں، ان میں ایک لائٹر تھا جو ناکارہ ہونے پر گرانٹ نے فٹ پاتھ پر پھینک دیا تھا اور پرنیاں نے اس کے علم میں لائے بغیر اٹھا کر ہینڈ بیگ میں ڈال لیا تھا ایک استعمال شدہ

رومال جس پہ گرانٹ کے پسینے اور کلون کی ملی جلی باس تھی۔ کئی پی ہوئی سگریٹ کا ادھ جلا ٹوٹا جس میں اس کی سانسیں رچی تھیں۔ اگر اس کے پاس کوئی ذریعہ ہوتا تو وہ اپنے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو بھی محفوظ کر لیتی۔ جس پر پارک میں گرانٹ نے اپنا نام اور فون نمبر لکھا تھا اور جہاں اس کے بدن پر لمس کا پہلا چاند کھلا تھا۔

قدموں کی آہٹ سن کر اس نے دروازے کی جانب نگاہ اٹھائی اور داؤد کو اندر آنے کے لیے کہا۔

"میں اور ڈیڈی بس نکلنے ہی والے تھے۔ مجھے یاد آ گیا کہ تمہیں یہ دینا تھا۔" داؤد نے ہاتھ میں پکڑا ہوا زرد لفافہ اسے دکھایا۔

"یہ کہاں سے آیا ہے۔ کیا پاکستان سے؟"

"نہیں یہ ڈاک میں نہیں آیا۔ دروازے پر کوئی لڑکا دے گیا تھا۔ تمہارا نام لے کر۔"

"تو تم نے دیکھا نہیں اس میں کیا ہے؟" وہ چل کر داؤد کے قریب آ گئی۔

"تمہاری اجازت کے بغیر دیکھنا مجھے اچھا نہیں لگا۔ ویسے بند لفافے تجسس تو جگاتے ہیں۔ کھلنے تک ان میں بڑا اسرار ہوتا ہے۔"

"اب اسے کھول دو۔" اس نے ہنس کر کہا اور رائٹنگ ٹیبل کی دراز میں سے پیپر کٹر نکال کر اسے دیا۔

داؤد نے اس کے متبسم چہرے پر نظریں جماتے ہوئے لفافے کا بند سرا کاٹ ڈالا۔ اندر ہاتھ ڈالتے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی سن کر وہ ٹھٹکا اور لفافے کو آرام کرسی پر پھینک کر بولا۔

"ہسپتال سے میری بہت ضروری کال آنے والی تھی۔ شام کو چائے پر ملتے ہیں۔ Backgammon میں مجھ سے ہارنے کے لیے ذہنی طور پر تیار رہنا۔"

اس کے جانے کے بعد پرنیاں نے وہ لفافہ اٹھایا' وہ بالکل سادہ تھا اس پر کوئی تحریر نہ تھی اور اندر موجود کاغذوں کا پلندہ باہر کھینچ لیا۔ اسے لگا جیسے اس کے نچلے دھڑ میں جان باقی نہ رہی ہو۔ دل ایسے ڈوب کر دھڑکا تھا جیسے آخری بار دھڑک رہا ہو۔ بے جان انگلیوں سے لفافے کے مشمولات اس میں واپس ٹھونستے ہوئے وہ کرسی پر ڈھے گئی تھی۔

وہ ایک میگزین تھا اور یہ جاننے کے لیے کہ وہ کس قسم کا میگزین تھا' اسے ایک ورق بھی پلٹنے کی ضرورت نہ تھی۔ سرورق پر ایک نگاہ پڑتے ہی اسے معلوم ہو گیا تھا۔ وہ ایک پورنوگرافک رسالہ تھا۔ اور رہا اس سوال کا جواب کہ وہ اسے کیوں بھیجا گیا تھا' یہ معمہ حل کرنے کے لیے کسی راکٹ سائنٹسٹ کی مدد درکار نہ تھی۔ سرورق جن تین مادر زاد برہنہ جسموں کے رنگین عکس سے مزین تھا ان میں سے ایک جسم گرانٹ کا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ لفافہ داؤد کے ہاتھوں میں تھا اور وہ اسے دیکھنے سے چند ساعت کی دوری پر تھا۔ اگر وہ ٹیلی فون سننے نہ جاتا تو۔ اس سے آگے سوچنا اس کے اختیار میں نہ تھا۔ اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ چاچی کس وقت اندر آئی اسے بالکل خبر نہ ہو سکی۔ اس کے پکارنے پر وہ خالی خالی نظروں سے اس کا منہ تکنے لگی تھی۔

"تم ٹھیک تو ہو؟ کتنی زرد لگ رہی ہو۔ بولو کیا بات ہے۔" پرنیاں نے اس کے سوال کا جواب نہ دیا اور نظروں کے سامنے سے زہریلے سانپ کی طرح کلبلاتے ہوئے لفافے کو اٹھا کر سرعت سے قریب رکھی شیشے کی صندوقچی میں بند کر دیا۔

تب اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات نہ تھی کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی موت کو اس بلوریں تابوت میں سنبھال رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

کئی بے خواب راتیں گزارنے کے باعث اس کی آنکھیں سرخ اور سر پتھر کی مانند بوجھل ہو رہا تھا۔ اس تمام عرصے میں ایک پل کے لیے بھی وہ میگزین اس کے ذہن سے محو نہیں ہوا تھا۔ سوچ سوچ کر اس کا دماغ شل ہوا جاتا تھا۔ جب سے گرانٹ اس کی زندگی میں آیا تھا' نیند کی اس کی آنکھوں سے ویسے ہی نہیں بنتی تھی۔ پہروں اس کے تصور میں بیت جاتے تھے ہر کروٹ کے ساتھ وہ اسے یاد کرتی۔ اس کی آنکھیں اس کا چہرہ اس کی ہنسی اس کی باتیں' یہ تسلسل ٹوٹنے ہی نہ پاتا تھا۔ سونے کے لیے وقت ہی کہاں بچتا تھا اس کے پاس۔

اب اس زرد لفافے نے اس کی دنیا تہ و بالا کر دی تھی۔ وہ یہ طے کرنے سے قاصر تھی کہ اسے زیادہ صدمہ گرانٹ کے کس عمل کا تھا۔ اس میگزین کے لیے کام کرنے کا یا اس سے چھپانے کا۔ اس نے بے شمار بار ٹیلی فون پر گرانٹ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اپارٹمنٹ شاید خالی تھا۔ ہر دفعہ اسے ریکارڈ شدہ پیغام سننے کو ملتا تھا۔ تین دن سے وہ اسکول بھی نہیں گئی تھی۔ گھر میں اس نے طبیعت کی خرابی کا کہہ کر مزید سوالات کی راہ روک دی تھی' داؤد ان دنوں ایک ہفتے کی رخصت پر تھا اور اس کی وجہ سے پرنیاں کی مشکلات میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ داؤد کی جانچتی نظروں اور کریدتے ہوئے سوالات کا سامنا کرنے کی سکت اس میں ہرگز نہ تھی۔

وہ لونگ روم میں کاؤچ پر نیم دراز کشن کے ملائم ریشوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے گہری سوچ میں مستغرق تھی اور داؤد کے باتیں کرنے کی آواز سن کر چونکی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ داؤد کے ساتھ اندر آنے والے شخص کو دیکھ کر دل بے اختیار اپنی چال سے چوک گیا تھا۔ گرانٹ پہلی دفعہ اس سے ملنے کے لیے گھر آیا تھا۔ وہ بوکھلا کر کھڑی ہو گئی۔ داؤد ان دونوں کو بیٹھنے کا کہہ کر خود کچن کی طرف چلا گیا تھا۔ شاید وہ ان کے لیے کچھ پینے کو لانے گیا تھا۔ گرانٹ نے سر کے بالوں کو ایک سفید دھاریوں والے سیاہ بینڈانا سے ڈھانپ رکھا تھا اور اس کے گھنے بالوں کے نچلے سرے کانوں کی لوؤں اور گردن کے آس پاس خم کھا کر مڑ گئے تھے۔ چند دن کا بڑھا ہوا شیو سرمئی غبار کی صورت اس کے گالوں اور ٹھوڑی پر پھیلا تھا۔ دائیں کلائی میں اس نے باریک سیاہ چرمی ڈوری لپیٹ رکھی تھی۔ شاید اس نے پہلے اتنے غور سے کبھی گرانٹ کو دیکھا نہیں تھا یا شاید آج سے پہلے وہ کبھی اتنا دلکش لگا ہی نہیں تھا۔ اس لمحے سے پہلے پرنیاں اس سے ناراض تھی۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ گرانٹ کے سامنے آتے ہی اس پر برس پڑے گی۔ اسے برا بھلا کہے گی۔ اس نے ذہن میں جملے بھی ترتیب دے رکھے تھے۔

"تمہاری اخلاقی گراوٹ کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ میں تمہیں کیا سمجھتی تھی اور تم کیا نکلے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تمہاری ذات کا ایسا گھناؤنا پہلو بھی ہو سکتا ہے۔ آج کے بعد میں تمہاری شکل دیکھنے کی روادار نہیں ہوں گی۔" اگر وہ انکار کرتا تو وہ اور بھی بھڑکتی اور میگزین لا کر اس کے منہ پر مارتی۔ لیکن وہ حیران رہ گئی جب گرانٹ کو اچانک سامنے پا کر اسے ایک بھی تلخ لفظ یاد نہ آ سکا۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ وہی نو عمر لڑکوں والی بے ریا مسکراہٹ۔ اس مسکراہٹ نے پرنیاں کو لڑنے سے قبل ہی پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ کئی لمحوں تک اسے بے بسی سے دیکھتے رہنے کے بعد وہ بولی تھی۔

"تم کہاں تھے گرانٹ؟"

"یہ مت پوچھو کہ میں کہاں تھا۔ اس سوال کا جواب تو خود مجھے بھی معلوم نہیں۔ شاید زمین اور آسمان کے درمیان میں کہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"میں اتنے سالوں سے جس منزل کی تلاش میں بھٹک رہا تھا' اسے میں نے پا لیا ہے۔ میں اتنا خوش ہوں کہ کسی لغت کا کوئی لفظ میری خوشی کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ میں اسٹار بننے والا ہوں۔ نہیں بلکہ سپر اسٹار' میں نے تو ابھی سے آسکر قبول کرنے کی تقریر کی مشق بھی شروع کر دی ہے۔"

بے اختیار پرنیاں کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

"تمہیں کوئی بڑا کردار مل گیا ہے؟"

"بہت بڑا۔"

"کیا لیڈ رول؟"

"یہ سب تفصیل تو میں تمہیں کل رات کو سناؤں

گانہ جگہ کا انتخاب ابھی نہیں کیا۔ ٹیلی فون پر بتا دوں گا۔" بات کرتے ہوئے وہ خوشی سے ہاتھوں کو حرکت دے رہا تھا۔

پریناں اس کی خوشی میں کھنڈت ڈالنے کا گناہ کیسے کرتی۔ ان لمحات میں اس میگزین کا ذکر کرنا اس کے لیے ناممکن تھا۔

"آئندہ بہت سے مواقع آئیں گے۔ میں کسی مناسب وقت پر اس سے ضرور پوچھوں گی۔ شاید وہ مجبور رہا ہوگا۔ وہ کئی برسوں سے ہالی ووڈ میں جگہ بنانے کے لیے بند دروازوں سے سر ٹکرا رہا ہے۔ جانے اس نے کیسے کڑے حالات کا سامنا کیا ہوگا۔"

آج سے قبل اس نے کبھی گرانٹ کو اتنا خوش نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس موقع پر اسے دکھی نہیں کر سکتی تھی۔ اور پھر اسے شرمسار کرنے سے بھلا حاصل ہی کیا تھا۔ جو بیت چکا تھا وہ تو لوٹنے سے رہا۔ وہ میگزین اسے کسی نے بھجوایا تھا۔ اس بارے میں اس کے ذہن میں کوئی شائبہ نہ تھا اور بھیجنے والا اپنا مقصد پالیتا اسے ہرگز گوارا نہ تھا۔ گرانٹ کے لیے اس کی محبت کے سامنے اس بات کی حیثیت ایسے ہی تھی کہ جیسے خالص سونے کے بت میں ایک کیل زنگ دار تانبے کی لگادی جائے۔

داؤد مشروبات لے کر آیا اور گرانٹ سے اس کے متعلق چھوٹے چھوٹے سوالات کرنے لگا۔ اس کا انداز چبھتا ہوا تھا۔ اس نے اپنی ناپسندیدگی چھپانے کی رسمی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ اسے پریناں سے اس کا ملنے کے لیے آنا اچھا نہیں لگا تھا۔ اس کے لہجے سے ہی عیاں تھا۔ وہ انتظار کرتی رہی کہ داؤد انہیں کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ دے لیکن وہ گرانٹ کے رخصت ہونے تک وہیں جم کر بیٹھا رہا تھا۔

"تم اس ہپی کو کیسے جانتی ہو۔" دروازہ بند کرکے پلٹتے ہوئے داؤد نے پوچھا تھا۔

"وہ ہپی نہیں ہے۔"

"اچھا۔ حلیے سے تو لگ رہا تھا ضرورت سے زیادہ خوش امید ہے۔ مجھے نہیں لگتا ہالی ووڈ میں اس کا کوئی مستقبل ہے۔"

"تم نجومی کب سے ہوگئے داؤد؟"

"تمہیں اس art - shit سے ہمدردی ہے شاید۔" وہ آرٹسٹ کو بگاڑ کر بولا تھا۔

"میں تمہیں مہذب سمجھتی تھی۔ یہ کیا طریقہ ہے کسی کے بارے میں بات کرنے کا۔" اس کا ضبط جواب دینے لگا۔

"تمہیں اس کی بدحالی پر ترس آتا ہے تو چند سکے لٹانے میں کوئی حرج نہیں لیکن اپنے جذبات کی دولت ضائع کرنے کی غلطی ہرگز نہ کرنا۔"

"میری برداشت کو اتنا مت آزماؤ کہ میں تمہاری توہین کرنے پر مجبور ہو جاؤں۔" اس کی آواز میں ایسی تپش تھی کہ داؤد اسے دیکھتا رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

آسمان ایک بیکراں سیاہ غربال (چھلنی) تھا اور ستارے پارے کی چمکیلی بوندیں جو اس غربال کے بے شمار سوراخوں میں اٹکی ہوئی تھیں اور کسی بھی آن چھلک کر گرنے والی تھیں۔

خنک ہوا میں سمندر کی کھاری سانسوں کی باس تھی۔

ڈنر کے بعد وہ سانتا مونیکا بیچ پر ٹہلتے ہوئے ایک تنہا گوشے میں آنکلے تھے۔

اس کے جوتے میں گیلی ریت چلی گئی تھی اور وہ گرانٹ کے ساتھ قدم ملاتے ہوئے کچھ بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اسے رکنے کا کہے اور جوتا اتار کر ریت جھاڑ ڈالے مگر اس کی محویت توڑتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ خوش آئند مستقبل کے بارے میں بات کرتے ہوئے وہ اس قدر مگن تھا کہ پریناں چاہ کر بھی اسے ٹوک نہ سکی۔ اس بے ضرر خواہش کو دبائے وہ خاموشی سے گرانٹ کے ساتھ چلتی رہی۔

"تم صرف میری محبت نہیں ہو، تم میری اچھی قسمت ہو، جب سے تم ملی ہو میری قسمت بھی بدل

گئی ہے۔ میں بالکل مایوس ہو چکا تھا۔ گھپ اندھیرے میں تھا اور تم سے ملنے کے بعد مجھے روشنی ایسے دھنک سے ملی جس کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ تم میری روشنی ہو۔"

پریناں کے Poncho (لباس) میں نم آلود ہوا بھر گئی تھی۔ اس نے بازوؤں کو سینے کے گرد لپیٹتے ہوئے آسمان کی جانب نگاہ اٹھائی۔ خنکی کے سوا کوئی شے تھی جس نے اس پر خفیف کپکپی طاری کر دی۔

"اگر تم میری زندگی میں نہ آتیں تو میرا کیا ہوتا۔ یہ سوچتا ہوں تو مجھے یہاں گھٹن محسوس ہوتی ہے۔" اس نے چھاتی پر بائیں طرف ہاتھ رکھا۔ "میں تمہیں کبھی خود سے دور نہیں ہونے دوں گا، ورنہ میری خوش قسمتی مجھ سے جدا ہو جائے گی۔ میں اس معاملے میں اوہام پرست شخص ہوں۔"

پریناں کو جوتے کا بوجھل پن برا نہیں لگ رہا تھا۔

عظیم چھلنی کے چھیدسے پارے کی بوند چھلکی اور نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اچانک گرانٹ پہلو سے نکل کر سامنے آیا اور اسے بازوؤں کے حلقے میں بھر لیا۔

ہوا سے پھڑپھڑاتا Poncho ساکت ہو گیا۔

"ہم پوری رات کھلے آسمان تلے ساحل پر گزاریں تو کیسا ہو۔ میں تمہیں کیٹس کی شاعری سناؤں گا۔ چاندنی پریاں ٹھہر کر ہمیں دیکھیں گی۔ چاندنی پریاں نہ سہی Scuha divers تو ضرور ہی دیکھیں گے۔"

چندر جوت اس کی آنکھوں کی سیاہی میں گھل کر ایک سرد آگ دہکا رہی تھی۔ سیاہ آنکھوں کا عنکبوتی طلسم اس کے چاروں اور جال بننے لگا۔ اس گرفت سے آزاد ہونے میں وہ نیم جان ہو چلی تھی۔

"میں تمہارے ساتھ پوری رات نہیں رہ سکتی۔ آج میں ایک دوست کی برتھ ڈے پارٹی میں شرکت کا بہانہ بنا کر آئی ہوں۔" اس نے تیز ہوتے تنفس پر قابو پا کر بمشکل بتایا تھا۔

"میں سمجھتا ہوں، تم مشرقی لوگوں کے مسائل، لیکن شادی کے بعد میں تمہارا کوئی بہانہ نہیں سنوں گا۔ تم مجھ سے یوں بدکتی ہو جیسے میں تمہارا بوائے فرینڈ نہیں کوئی چھوت کی بیماری ہوں۔ تمہارا ہاتھ چھوتے ہوئے بھی مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں تم ناراض نہ ہو جاؤ۔ میں زیادہ انتظار نہیں کروں گا۔ اب ہمیں شادی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا ہوگا۔"

اس نے بارہا اپنی اور گرانٹ کی شادی کو سوچا تھا، لیکن گرانٹ کے ہونٹوں سے شادی کا تذکرہ پہلی بار سنا تھا۔

پریناں کے کنول روئی ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر گرانٹ نے اس کی پیشانی پر گرم سانسوں کی بھاپ چھوڑی۔ "مجھے لگتا ہے خدا نے تمہیں چاندنی کی مٹی سے بنایا ہے۔ کہیں تم چاند سے تو نہیں آئی ہو۔"

"میں ایلین نہیں ہوں۔"

اب وہ بھول چکی تھی کہ اس کے جوتے میں مٹھی بھر ریت تھی۔ اسے یہ بھی بھول گیا تھا کہ وہ کہاں تھی۔ وہ زمین پر تو ہرگز نہیں تھی کیونکہ زمین پر چلنے کے لیے قدم اٹھانے کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ تیر رہی تھی۔ آسمان پر ہونا یوں محال تھا کہ وہ اس کے سر سے ذرا اور پرے ان گنت ستاروں کے ساتھ پھیلا ہوا تھا۔ تو وہ کہاں تھی۔ شاید کہیں نہیں تھی۔

گرانٹ بند ہونٹوں میں کوئی انوکھی دھن گنگنا رہا تھا جو اس دنیا کی نہیں لگتی تھی۔

اچانک اسے کچھ یاد آیا اور ایسے میں کچھ بھی یاد آنا بڑے اچنبھے کی بات تھی۔

"کل ہم سب عشائے ربانی میں شامل ہونے جا رہے ہیں۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔ میں تمہیں چچا اور چاچی سے ملوانا چاہتی ہوں۔"

گرانٹ نے گنگنانا موقوف کر دیا۔

"ہرگز نہیں۔"

پریناں چونک گئی تھی۔

"تم میرے چچا اور چاچی سے نہیں ملنا چاہتے؟"

"میں ان سے ملوں گا لیکن Mass میں شامل

ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

وہ اسی گیت کو اب لفظوں کے ساتھ گا رہا تھا اور پریناں کو اس کے بول بے حس لگنے لگے تھے۔

شاید وہ کسی مصروفیت کے باعث کل چرچ جانے سے قاصر تھا یا پھر وہ پروٹسٹنٹ تھا اور کیتھولک Mass میں شرکت کرنا نہیں چاہتا تھا یا شاید وہ ان ترقی یافتہ سوچ کے مالک نوجوانوں میں سے تھا جو مذہب سے دوری کو فیشن کی ایک قسم گردانتے تھے۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو لیکن گرانٹ کا اتنی قطعیت سے منع کرنا اچھا نہیں لگا تھا۔

"تم کیوں شامل نہیں ہوئے گرانٹ؟" یہ سوال پوچھتے ہوئے جانے کیوں اسے خوف محسوس ہوا۔ وہ ایک پاؤں کو قدرے گھسیٹ کر چلنے لگی تھی۔ اسے وہ گیت اب بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"میں مسلم ہوں اس لیے میرا وہاں کیا کام۔" دور ایک تارا سر کے بل بحرالکاہل میں گرا۔

تمام تر ہوا کے باوجود اسے سانس لینے میں دقت پیش آئی تھی۔

"تم... مسلمان ہو؟ تمہارا نام...؟" فقرہ مکمل کرنے سے پہلے ہی پریناں کو اس کے ادھورے پن کا ادراک ہوا۔ صرف نام سے ہی اس نے من چاہا نتیجہ اخذ کر لیا تھا۔ وہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ یہودی، بدھ، پارسی، ناستک کچھ بھی۔

"میرا اصل نام احمد ابراہیم ہے۔ یہ تو میرا Screen name ہے۔" سانس لینے کے لیے اسے بہت جدوجہد کرنا پڑ رہی تھی۔ وہ اپنی سماعت کو جھٹلانا چاہتی تھی۔ مگر یہ اس کے بس میں نہ تھا۔

"تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟" لفظ اس کے حلق میں دم توڑ رہے تھے۔

"بس یونہی۔ کبھی ایسا موقع ہی نہیں آیا۔"

"لیکن تمہیں شروع سے پتا تھا کہ میں کرسچن ہوں۔" ریت بھرا جوتا اس کے پاؤں کو تکلیف دینے لگا تھا۔

"ہاں پتا تھا، لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"فرق پڑتا ہے، مجھے بہت فرق پڑتا ہے۔"

"سب سے اہم بات یہ ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

"اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ میں... یسوع سے محبت کرتی ہوں۔"

"تم لنگڑا رہی ہو۔ کیا پیر میں کچھ چبھ گیا ہے؟"

"میں تمہارے لیے یسوع کو نہیں چھوڑ سکتی۔ کسی قیمت پر نہیں۔"

"میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔"

"کیا تم میری خاطر کرسچن ہو جاؤ گے؟"

"تمہارے پاؤں میں واقعی تکلیف ہے۔ شاید تمہارا جوتا تمہیں کاٹ رہا ہے۔ اسے اتار کر ننگے پاؤں ریت پر چلو، تمہیں اچھا لگے گا۔ یہاں زیادہ کیکڑے نہیں ہوتے۔"

"خدا کے لیے تم مذہب تبدیل کر لو۔" وہ گھگھیا گئی۔

ایک اور ستارہ ٹوٹا اور اس کی راکھ تاریکی میں بکھر گئی۔

"Poncho کا رواج آج کل ختم ہو رہا ہے۔ ان دنوں تو صرف بچے ہی اسے پہنتے ہیں۔ یہ بات نہیں کہ تم اس میں اچھی نہیں لگ رہیں۔ تم پر تو ہر لباس اچھا ہے۔"

پریناں نے نیم تاریک فضا میں اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دھند چھانا شروع ہو گئی تھی۔

"تم میرے سوال کا جواب کیوں نہیں دیتے؟"

"کیونکہ تمہیں یہ سوال پوچھنا ہی نہیں چاہیے۔ مذہب اور مجھ میں سے تمہیں کسی ایک کو چننا پڑے تو کسے چنو گی؟"

"تم میرے ایمان کے مقابل نہیں آ سکتے۔ میں تمہارے لیے کسی کے لیے بھی یسوع کی طرف سے منہ نہیں پھیر سکتی۔" اسے اپنے ہونٹوں پر سمندری پانی کی نمکینی محسوس ہوئی۔

"تم نے کہا تھا تم میرے لیے کچھ بھی کر سکتی ہو۔"

"ہاں وہ تو ہے... لیکن۔"

"مجھے پتا ہے تم مجھ سے اتنی محبت کرتی ہو کہ دنیا کی کوئی بھی شے ہمارے درمیان نہیں آ سکتی۔"

"وہ خداوند ہے، شے نہیں۔"

"میں تمہارا انتظار کروں گا۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ تم میرے پاس نہ آؤ۔"

"انتظار کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔"

وہ ٹھہر گئی تھی۔ گیلی بوجھل ریت پاؤں کی انگلیوں اور تلوے کی کھال میں درد کی سوئیاں چبھو رہی تھی۔

وہ گرانٹ یا احمد جو بھی تھا، اس سے دور جا رہا تھا۔ پریناں نے اس کا تعاقب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اب ایک قدم اٹھانا بھی محال تھا۔

ایک اور تارا ٹوٹ کر روشنی کی جلتی لکیر میں ڈھلا اور بحرالکاہل میں غرقاب ہوا۔ اس نے کسی ایک رات میں اتنے تارے ٹوٹتے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

☼ ☼ ☼

ہالی ووڈ۔ روپہلی گیتی پر ایک ایسا خطہ تھا جہاں خوابوں کی کاشت کی جاتی تھی۔ یہاں ہر رنگ اور ہر ذوق کے خوابوں کی تجارت ہوتی تھی۔ یہی اس جگہ کا وصف تھا۔ یہاں کچھ بھی ممکن تھا۔ گلاب اگر نیلے رنگ میں نہیں پایا جاتا تو یہ باقی جہان کا مسئلہ ہو گا، یہاں نیلے گلاب بھی کھلتے تھے۔

احمد چند خوابوں کے بیج مٹھی میں دبائے اس زمین کی کوکھ سے کانچ کی فصل اگانے کی آس لیے آیا تھا۔

ایک چمکیلی گرم دوپہر میں جب وہ وائن اسٹریٹ پر بس سے اترا تو اس کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ وہ خوش تھا، یہ اسے ایک نظر دیکھ کر کوئی بھی جان سکتا تھا۔ وہ کتنا خوش تھا، یہ وہ کسی کو سمجھا نہیں سکتا تھا۔

خاصی دیر ہالی ووڈ بلیوارڈ پر گھومنے کے بعد وہ وائن اسٹریٹ پر واپس آیا اور راہ چلتے ایک لڑکے سے براؤن ڈربی ریسٹورنٹ کی سمت معلوم کی۔ قریباً چار گھنٹے قبل اس نے دو باسی Muffins کھائے تھے لیکن اسے بھوک بالکل نہیں لگ رہی تھی۔ براؤن ڈربی میں بہت سے ستارے کھانا کھانے کے لیے آتے تھے۔ اسے امید تھی کہ شاید اس وقت بھی وہ ان میں سے کسی کو دیکھ پائے۔ اسی لیے وہ سفر کی تھکان کو بھلا کر وہاں پہنچ گیا تھا۔ اسے کوئی مانوس چہرہ دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ ادھر ادھر گھومتے ہوئے دیواروں پر بنائے گئے ستاروں کے Caricatures (مبالغہ آمیز خاکے) کو دیکھنے لگا۔ مشہور تھا کہ کلارک گیبل نے یہیں پر Carole Lombard کو پروپوز کیا تھا اور آج وہ خود اسی جگہ موجود تھا اور کچھ دنوں بعد وہ باقاعدگی سے یہاں کھانا کھانے آیا کرے گا۔ اس نے دیواروں کو چھو کر خود کو یقین دلایا تھا۔ کسی کے پکارنے پر وہ مڑا۔

"کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتی ہوں؟"

وہ ایک ویٹرس تھی۔

"ہاں ضرور۔" احمد نے بیک پیک کو کندھے کے جھٹکے سے اچھال کر کمر کے درمیان میں کھسکایا اور زور سے ہنسا۔ "مجھے یہاں سے باہر نکال دو ورنہ شاید میں یہیں رہائش اختیار کر لوں۔"

☼ ☼

مورش بورڈنگ ہاؤس سہ منزلہ تھا اور اس کے ساتھ مختصر سا پاتیو بھی بنا ہوا تھا۔ عمارت پرانی اور غیر متاثر کن تھی، لیکن شام سے وہ جن چار جگہوں کو دیکھ چکا تھا، ان میں سب سے بہتر اسے یہی بورڈنگ ہاؤس لگا تھا۔

"تم نے لکھا ہے کہ یہاں سستی رہائش میسر ہے۔" اس نے جیب سے مقامی اخبار کا مڑا تڑا ورق نکال کر جھری زدہ لمبوترے چہرے والے اسمتھ ہاکنز کے سامنے پھیلایا اور انگلی رکھ کر شائع کردہ اشتہار کی نشاندہی کی۔

"آئے کہاں سے ہو؟" اس نے اخبار احمد کے ہاتھ سے لے کر ایک طرف اچھال دیا۔

"خاصی دور سے۔"

"کرتے کیا ہو؟"

"وہ بھی تو کچھ نہیں، لیکن بہت کچھ کرنے کا ارادہ ہے۔ میں دراصل فلموں میں..."

"میں سمجھ گیا۔" اسمتھ ہاکنز نے عینک اتار کر میز پر رکھ دی۔ "تمہیں کمرہ دے کر مجھے فخر محسوس ہوگا کیونکہ مستقبل قریب میں تم کوئی عظیم اور مشہور شخصیت بننے والے ہو۔ فلمی اداکار، فلم کار یا پھر شاید موسیقار۔"

"تم کو یہ اندازہ کیسے ہوا؟" اس کے طرز سے احمد بے حد محظوظ ہوا۔ "اسمتھ ہاکنز اپنی کہی ہوئی بات پر ایک روز بہت شرمسار ہوگا۔" یہ سوچ کر وہ مسکرانے لگا تھا۔

"کیونکہ تم جیسے لوگ چہرے سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔ پچھلے پچیس سالوں سے اس بورڈنگ ہاؤس میں ایسے ہی لوگ رہتے آئے ہیں۔ اس وقت بھی میرے پاس اسکرپٹ رائٹر میاں بیوی، دو باتین گلوکار اور چند ایک فلم ایکٹرز رہ رہے ہیں۔ صلاحیتوں کی ہمارے ہاں کوئی کمی نہیں۔ تمہیں یہاں رہ کر بہت اچھا لگے گا۔ ایک ہفتے کے آٹھ ڈالر۔"

"میں تو کہہ رہا ہوں کہ یہ زیادہ ہیں۔ اس میں [illegible]" ہاکنز نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ویسٹ ہالی ووڈ میں اتنی اچھی جگہ پر تمہیں اس سے سستی رہائش ملنا ممکن ہی نہیں ہے۔"

"میں چھ ڈالر دے سکتا ہوں۔"

"بے کار بحث کر رہے ہو۔ یہ بورڈنگ ہاؤس سالویشن آرمی (ایک خیراتی ادارہ) کی ملکیت نہیں ہے۔ اور ناشتا بھی اسی میں شامل ہے۔ میری بیوی بہت عمدہ پین کیکس بناتی ہے۔ تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ تم شام سے ادھر ہی منڈلاتے نظر آرہے ہو۔"

آخری جملے اس سے نہیں کہے گئے تھے۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو ستائیس اٹھائیس سال کا درمیانی قامت والا لڑکا ڈھیلے لباس میں کھڑا نظر آیا۔ اندر آتے ہوئے بھی احمد کو وہ پاٹیو میں فوارے کے پاس فرش پر بیٹھا سگریٹ پیتا ہوا دکھائی دیا تھا۔ اس نے ہاکنز کے سوال پر غور نہیں کیا اور ایک طرف پڑا ہوا احمد کا بیگ پیک اٹھالیا۔

"یہ تم نے بہت اچھا کیا۔ یہاں زیادہ سامان لانا حماقت ہے۔ ادھر سب کچھ نئے سرے سے خریدنا پڑتا ہے۔" بے تکلفی سے اس کا بازو پکڑ کر باہر چل دیا تھا۔

"میرے کسٹمر کو تم کہاں لیے جا رہے ہو؟ ہو کون تم؟ میں پچاس سینٹ کم کرتا ہوں۔" ہاکنز نے جھنجلا کر پکارا، لیکن وہ احمد کو تقریباً گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا تھا۔

"یہ کیا کر رہے ہو تم؟ پاگل ہو گیا؟" احمد نے اپنا ہاتھ چھڑا کر بیگ واپس لینا چاہا۔

"مجھے ایک روم میٹ چاہیے۔ میرا اشتہار بھی اسی اخبار میں چھپا تھا۔ لیکن شاید تم نے دیکھا نہیں۔ میں سہ پہر سے یہاں ٹھہرنے کے لیے آنے والے لوگوں کی نگرانی کر رہا تھا اور مجھے تم سب سے بہتر لگے۔ اب تمہاری بات یہاں تو بنی نہیں، لیکن میرے ساتھ جا کر تم خوش ہو جاؤ گے۔ کرایہ یہاں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔"

احمد نے ایک طویل سانس لیا۔ اس کے ساتھ جانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ آخر اس کے پاس کھونے کے لیے تھا ہی کیا۔

"لوکیشن بہت شاندار ہے۔ سارے فلم اسٹوڈیوز وہاں سے نزدیک ہیں اور تم میری کار بھی استعمال کر سکتے ہو۔

میں نے La cinega Blvd سے استعمال شدہ گاڑیوں کے ایک ڈیلر سے پچھلے ماہ ہی خریدی ہے۔ بہترین حالت میں ہے اور تمہیں یقین نہیں آئے گا صرف تین سو — بکس میں۔ شاید چوری کی ہو۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ "مذاق کر رہا ہوں۔"

وہ ایک خستہ حال Dart Swinger Dodge تھی۔ جس کی رنگت زنگ جیسی تھی یا شاید بعض جگہوں پر اسے زنگ بھی لگا ہوا تھا۔ لیمپ پوسٹ کی پیلی روشنی میں احمد کو صحیح طور پر اندازہ نہیں ہوا۔

"اوہ۔ کیا میں تمہیں اپنا نام بتانا بھول گیا ہوں۔

رائن سدرلینڈ Hells Kitchen سے۔ اب مت پوچھنا کہ اس جگہ کا نام ایسا واہیات کیوں ہے۔ ویسے مجھے ٹھیک طرح سے معلوم بھی نہیں۔ شاید کسی Cop کی شرارت ہے۔ مجھے ایسے کیوں گھور رہے ہو۔ میں ان آئرش بدمعاشوں میں سے نہیں ہوں۔ سچ بتاؤ کیا میں صورت سے گینگسٹر نظر آتا ہوں۔ جھوٹ مت بولنا۔"

وہ بہت باتونی تھا۔ اس کے بال سنہری اور ایسے ملائم تھے جیسے مکئی کے بھٹے کا رواں۔ وہ اس کی پیشانی پر بھنوؤں تک گرے ہوئے تھے۔ وہ تیز تیز بولتا اور نہایت اونچی آواز میں بولتا تھا اور مخاطب کا رد عمل جاننے کی زحمت بالکل گوارہ نہیں کرتا تھا۔

"تم ڈرائیو کرو گے؟"

"نہیں، مجھے ڈرائیو کرنا نہیں آتا۔"

"تو کوئی بات نہیں، میں تمہیں سکھادوں گا۔ یقین کرو تم نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے۔ میرے پاس ٹیلی فون کی سہولت موجود ہے۔ اور میں جانتا ہوں ابتدا میں تمہیں کسی عارضی جاب کی ضرورت ہوگی۔ اس کا بندوبست بھی میری ذمہ داری ہے۔ وہاں پچھلی طرف کی کھڑکی سے ہالی ووڈ سائن بالکل نزدیک نظر آتا ہے۔ کھانے کی بہت ساری اچھی جگہیں قریب ہیں۔ تم چالیس سینٹ میں کچھ بھی کھا سکتے ہو سوائے Caviar (ایک مہنگی ڈش) کے۔" وہ کسی رئیل اسٹیٹ بروکر جیسی چرب زبانی سے کام لے رہا تھا۔

انجن اسٹارٹ کرنے سے قبل اس نے جوتوں کے تسمے کھولے، پاؤں جوتوں سے نکال کر جرابیں اتاریں اور انہیں اسٹیرنگ وہیل کے اوپر پھیلا کر رکھ دیا۔ اس کے پیروں اور جرابوں سے سخت بدبو اٹھ رہی تھی۔

"آہ پیروں کو کچھ راحت ملی۔ بہت گھٹن ہو رہی تھی۔ گاڑی کا ایئرکنڈیشنر خراب ہے۔ تم کھڑکی کھول لو۔ خیر آج تو موسم بے حد خوشگوار ہے۔"

احمد نے حیرت سے موسم پر اس کا تبصرہ سنا۔ گرمی کی وجہ سے اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ سورج ڈھلے خاصی دیر ہو چکی تھی اور اب بھی ہوا میں ہلکی سی تپش باقی تھی۔ لیکن آج اس کا ہالی ووڈ میں پہلا دن تھا اور اسے کچھ بھی برا نہیں لگ سکتا تھا۔

راستے میں وہ ایک گیس اسٹیشن پر رکے تو رائن نے بدحواسی میں جیب پر ہاتھ مارا۔

"میں اپنا والٹ کہیں بھول آیا ہوں۔ یاد نہیں آرہا کہاں۔"

گیس اسٹیشن کے مالک نے اسے خشمگیں نظروں سے گھورا۔

"ایک ڈالر پانچ سینٹ۔"

"تمہارے پاس ہوں گے؟ میں بعد میں تمہیں لوٹا دوں گا اور اب تو یہ کار ہم دونوں ہی استعمال کیا کریں گے۔"

احمد نے خاموشی سے رقم کی ادائیگی کردی تھی۔ کچھ دیر بعد رائن نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

"میں تو مذاق کر رہا تھا۔ میرا والٹ کبھی گم ہو ہی نہیں سکتا۔ میری یادداشت بہت تیز ہے۔"

جب وہ منزل پر پہنچے تو احمد کو بھوری اینٹوں اور گھن کھائی لکڑی سے بنی بھدی عمارت کو دیکھ کر جیسی [illegible] رائن نے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولنے اور بتی جلانے کے بعد جس شے پر سب سے پہلے اس کی نظر پڑی وہ ٹیلی ویژن سیٹ کے اوپر پڑی بچے ہوئے کھانے کی پلیٹوں سے نکل کر بھاگنے والے لال بیگ تھے۔ ٹیلی ویژن چل رہا تھا اور اس پر "I dream of Jeannie" نشر ہو رہا تھا۔ کمرے کے فرش کا نصف فرسودہ کلیم سے ڈھکا تھا اور باقی ماندہ برہنہ چوبی تختوں سے جابجا کیلیں نکلی ہوئی تھیں۔ دیوار کے ساتھ کھڑکی کے نیچے ایک بیڈ تھا جس پر میلے کپڑے اور موزے بکھرے تھے۔ ٹیلی فون اسٹینڈ کے قریب فرش پر گرے ہوئے گلاسوں میں سگریٹ کی راکھ اور شراب کی تلچھٹ تھی۔ کچھ دیر میں اس پر انکشاف ہوا کہ وہ اپارٹمنٹ اس ایک کمرے اور ایک مختصر باتھ روم پر مشتمل تھا۔

"میں کہاں سوؤں گا؟"

"تب ہی پرانے فرنیچر کی دکان ہے۔ وہاں سے ایک آرام دہ سستا میٹرس ڈھونڈنے میں تمہیں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔" رائن نے اسے اطمینان دلایا تھا۔

"جب ہمیں کرائے کی بات کرلینی چاہیے۔" احمد نے اپنا سامان رکھنے کے لیے کوئی مناسب گوشہ تلاش کرتے ہوئے کہا۔

"صرف چونسٹھ Bucks ماہانہ، لیکن تم فکر نہ کرو تمہیں صرف بتیس دینا ہوں گے۔"

"لیکن مسٹر ہاکنز تو ناشتا بھی کرائے کی رقم میں دے رہے تھے۔"

"پین کیک بھی کوئی کھانے کی چیز ہے۔" رائن نے برا سا منہ بنایا۔ پہلے تو لگا کہ وہ لاپروا ہونے کی اداکاری کر رہا تھا۔ مگر اس کے ساتھ تھوڑا عرصہ بتانے کے بعد احمد پر واضح ہو گیا کہ ہر معاملے میں اس کا رویہ ایسا ہی سرسری نوعیت کا ہوتا تھا۔ وہ ایک متوسط روایتی امریکن تھا۔ فوراً جلد بے تکلف ہونے والا منہ پھٹ، غیر متعلق اور چند باتی لحاظ سے اتھلا۔

وہ کمرے کے فرش پر چادر بچھا کر سویا تھا۔ پوری رات اس نے آنکھوں میں [illegible] والی صبح کے خوش کن خیالوں نے سونے نہیں دیا اور کچھ اوپر Attic میں دوڑنے والے چوہوں کی آوازیں اسے پریشان کرتی رہیں۔

اسپرنگ فیلڈ والے اپارٹمنٹ اور رائن کے اپارٹمنٹ میں کچھ خاص فرق نہیں تھا۔ صرف اتنا کہ اسپرنگ فیلڈ والا اپارٹمنٹ ذرا سا کشادہ اور نسبتاً کم گندہ تھا۔ لیکن چند دن وہاں رہنے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ جب وہ Bel-Air یا بیورلے ہلز ——— میں اپنا گھر بنائے گا تو اس اپارٹمنٹ کا خاکہ بھی اسے بھول چکا ہوگا۔ صبح اس نے رائن سے اس کے کام کے متعلق پوچھا تو وہ بولا۔

"میرا کام موویز سے متعلق ہے۔ اگر تم بھی اسی سلسلے میں یہاں آئے ہو تو میں تمہاری بہت مدد کر سکتا ہوں۔ فلمی دنیا میں میرے بہت کانٹیکٹس ——— ہیں۔"

اس کے حالات سے کوئی بھی اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس کے روابط کس درجے کے لوگوں سے ہوں گے۔ احمد نے اس کے کام اور کانٹیکٹس ——— کے بارے میں مزید تجسس ظاہر نہیں کیا تھا۔

"تم نے کہا تھا کہ کھڑکی سے "ہالی ووڈ سائن" نظر آتا ہے۔" کھڑکی کھولنے پر جب اسے چند گرد آلود پتوں والے پیڑ اور دور تک بے ترتیبی سے بکھری ہوئی کڈھب عمارتیں نظر آئیں تو اس نے رائن کو یاد دلایا تھا۔

"ہاں وہ Binoculars (دوربین) جانے میں نے کہاں رکھ دیے ہیں۔ ویسے میری یادداشت اتنی بری تو نہیں شاید کوئی ادھار مانگ کر لے گیا ہو۔"

وہ سبز جنگلے والی ٹیرس پر گیا تو اسے دیوار پر رکھا گل صد برگ کا گملا دکھائی دیا۔ چند لمحے وہ زرد پھولوں کو دیکھتا رہا اور پھر آگے بڑھ کر ہاتھ کی ضرب سے گملے کو نیچے سڑک پر گرا دیا۔ گیندے کے پھول مایوسی اور دکھ کی علامت تھے۔ وہ انہیں ہالی ووڈ میں اپنی کھڑکی میں کیسے برداشت کر سکتا تھا۔

❁ ❁ ❁

اگلے دو ہفتوں میں اس نے ان تمام جگہوں کی سیر کی جن کے بارے میں وہ بچپن سے سنتا یا پڑھتا آیا تھا اور جنہیں پہلے اس نے صرف اسکرین پر دیکھ رکھا تھا۔ اس نے ہالی ووڈ بلیوورڈ پر ایجپشن تھیٹر اور چائنیز تھیٹر دیکھے، ہائی لینڈ ایونیو پر عظیم الجثہ "ہالی ووڈ باؤل" دیکھا۔ Griffith پارک کی روشوں پر ٹہلا۔ Melrose Avenue پر Studio Panpacific کی عمارت کے گرد چکر کاٹے۔ سن سیٹ بلیوورڈ پر گٹاروں کی بہت سی دکانیں اور Cinerama dome تھیٹر، وہ بیورلے ہلز ہوٹل گیا، جسے پام کے درختوں نے ایک نیم دائرے میں سمو رکھا تھا۔ بڑے بڑے باغات سے گھرا ہوا ایک شان دار ڈرائیو وے جو بل کھاتا ہوا مرکزی دروازے تک چلا گیا تھا۔ سن سیٹ اسٹرپ پر واقع Duddly Do-right emporium جہاں کھلونے، بھس بھرے جانوروں، ہاتھوں کے زیور، بیٹ اور کلائی کی گھڑیاں فروخت ہوتی تھیں۔ اس نے بیورلے ہلز اور Bel-Air میں فلمی ستاروں کی رہائش گاہیں بھی دیکھیں۔

وہ جہاں بھی گیا اسے پام کے درخت ملے "وائن اسٹریٹ ہو یا سن سیٹ بلیوورڈ وہ ہر جگہ تھے۔ پرشکوہ دیوتاؤں کی مانند قطار اندر قطار، روشن فراخ سڑکیں والیاں تھیں، جو ان کے قدموں میں بچھی ہوئی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے ایک اچھا فوٹو گرافر تلاش کیا اور پچاس ڈالر میں اپنا Port folio تیار کروالیا۔

ایک Haberdashery سے کچھ اچھے Out fits حاصل کیے۔ اس کے پاس بہت کم رقم تھی، لیکن ان لوازمات کے بغیر وہ ہالی ووڈ کا حصہ نہیں بن سکتا تھا۔ اسے خود کو سجا کر بہترین روپ میں پیش کرنا تھا۔ خیر رقم کوئی ایسا بڑا مسئلہ نہیں تھی۔ جونہی اس نے اپنا پہلا چیک سائن کیا اس کی وارڈروب پیرس اور لندن کے بہترین ڈیزائنر ترتیب دیا کریں گے۔

جو وقت باقی بچا اس میں وہ رائن سے ڈرائیونگ سیکھتا رہا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ براہ راست پروڈکشن کمپنیوں یا کاسٹنگ ڈائریکٹرز سے نہیں مل پائے گا۔ اس کام کے لیے اسے ایک اچھے اور نامور ایجنٹ کی ضرورت تھی۔ تخلیق کاروں اور فن کاروں کے درمیان ایجنٹوں کی حیثیت بالکل وہی تھی جو کینوس اور رنگوں کے بیچ موقلم کی ہوتی ہے۔ اس دیس میں ایجنٹ ہی تھے جو فن کار کو "ستارہ" بناتے تھے۔ Actor Screen میں دیے گئے انڈسٹری کے بہترین ایجنٹوں کی فہرست سے لیس ہو کر وہ اپنی پہلی مہم پر روانہ ہوا۔

جارج قلب کا نام اور کام کسی تعارف کا محتاج نہ تھا۔ اس نے نصف درجن سے زائد اداکاروں کو مین [illegible] بین الاقوامی شہرت والی [illegible] ایوارڈ دلانے والے [illegible] تھے۔ ایک بار وہ جس کا ہاتھ تھام لیتا اس کے لیے فلم موویز اسٹوڈیوز کے دروازے کھل جاتے۔ اس کے پاس جادو کی چھڑی تھی۔ احمد کی فہرست میں سب سے پہلا نام جارج قلب کا تھا۔

گلابی موزیک کا فرش اور ہم رنگ چرمی پوشوں سے مزین صوفے، قد آدم فرانسیسی طرز کی آرائشی کھڑکی، ساگوان کی وسیع الماری اور اس کے پہلو میں دیوار پر آویزاں William Hogarth کی پینٹنگ The bench کی نہایت عمدہ نقل، وہ آفس امارت اور خوش مذاقی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

سنہری، لچھے دار بالوں والی لڑکی، جس نے پنسل اسکرٹ پہن رکھا تھا اس پر ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر دوبارہ Daily Variety کے پرانے ایشو میں مشغول ہو گئی۔ اس کے قریب جا کر کھنکارنے پر بھی اس کا زاویہ نگاہ نہیں بدلا تھا۔ یہ احمد کے لیے پہلا دھچکا تھا۔ وہ خوب صورت تھا اور صنف مخالف کے لیے بے حد پرکشش۔ اس بارے میں اسے کسی تصدیق کی ضرورت نہیں تھی۔

"میں مسٹر قلب سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"وہ کس سلسلے میں؟"

"میں ایکٹر ہوں اور چاہتا ہوں کہ بطور ایجنٹ وہ میری نمائندگی کریں۔" Blonde کے جھکے ہوئے چہرے پر ایسی مسکراہٹ پھیلی جیسے اس نے کوئی لطیفہ سن لیا ہو یا شاید اسے میگزین میں کوئی بات ہنسنے کے قابل مل گئی تھی۔

"اپائنٹمنٹ لیا تھا؟"

"نہیں۔"

"تو اپائنٹمنٹ لے کر دوبارہ آنا۔"

"میں بہت دور سے آیا ہوں اور میرے پاس کار بھی نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے تو اپنا پورٹ فولیو اور ٹیلی فون نمبر دے جاؤ۔ میں تمہیں کال کر لوں گی۔" اس نے میگزین

سے نظر ہٹائے بنا اس کا پورٹ فولیو لے کر میز پر رکھ دیا۔

اس کے رویے سے احمد کو بالکل امید نہیں تھی کہ وہ جارج فلپ سے اس کا ذکر بھی کرے گی۔ اس برف کو پگھلانے کے لیے اسے فوراً" کچھ کرنا ہوگا۔ اس نے گلا کھنکارا اور کیری گرانٹ کی آواز میں بولا۔

"میرے ساتھ احتیاط سے پیش آؤ' میں گراں مایہ مال ہوں۔" سنہری بالوں سے ڈھکا وہ سر نہیں اٹھا۔ دوسرا دھچکا۔

"یہ کیا تھا؟"

"کیا تم نے North by North west نہیں دیکھی۔ یہ کیری گرانٹ کے کردار Roger Thornhill کا مکالمہ ہے اور شاید تم نے دھیان سے نہیں سنا۔ میں نے گرانٹ کی آواز میں ہی مکالمہ ادا کیا ہے۔ ہو بہو وہی لب و لہجہ۔"

"میں پرانی موویز نہیں دیکھتی اور کیری گرانٹ اب ماضی کا قصہ ہو چکا۔" اس بار اس نے میگزین رکھ کر پورٹ فولیو کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ اپنے پاس کو ایک [illegible] سے محروم کر رہی تھی۔

"کریڈٹس میں کچھ نہیں ہے؟" احمد نے چیخ جانا چاہا اور پھر بروقت اسے خیال آیا کہ وہ دوبارہ بگڑ سکتی ہے۔

"وہ سب میں خود مسٹر فلپ کو بتاؤں گا۔ میں روایتی انداز میں کام کرنے کا عادی نہیں ہوں۔" یہ بات کس قدر غیر موزوں تھی' اس کا اندازہ خود احمد کو بھی تھا مگر اس کے سوا اس کے پاس چارہ بھی کیا تھا۔

پہلی بھرپور نظر اس کے سراپے پر گھومی۔ برف پگھل رہی تھی۔ احمد نے دل موہ لینے والی مسکراہٹ سے ان سبز آنکھوں کو خوش آمدید کہا تھا۔

"تم نے اپنا نام تک نہیں لکھا۔ تم روایت سے کچھ زیادہ ہی روگردانی کر رہے ہو۔" اس نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا اور تب اس کی نظر دیوار پر ٹنگی فریم شدہ رنگین تصویر پر پڑی۔ وہ Charade کا پوسٹر تھا ــــ کیری گرانٹ اور آڈرے ــــ ہیپبرن۔ ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے کیسے انوکھے لگ رہے تھے۔

"میرا اسکرین نام ایڈم گرانٹ ہے۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"بہت دلچسپ نام ہے۔" ایک دفعہ پھر اسے شک گزرا کہ وہ طنز کر رہی تھی۔

"تم نے کس ایکٹنگ اسکول سے تربیت حاصل کی ہے؟"

جواب دیتے ہوئے وہ ہچکچایا تھا۔ "کسی بھی ایکٹنگ اسکول سے نہیں ــــ میں فطری اداکار ہوں' مجھ میں قدرتی ہے۔"

"براڈوے کا کوئی تجربہ؟"

"نہیں۔"

"آف براڈوے؟"

"نہیں۔"

"ٹیلی ویژن؟"

"نہیں۔"

"فلم؟"

وہ خاموش رہا۔

"تو وہ کون سے کریڈٹس ہیں جن کا ذکر تم مسٹر فلپ سے کرو گے؟" وہ اس کا پورٹ فولیو اسے لوٹا رہی تھی۔ یہ اس کے لیے جانے کا اشارہ تھا۔

"میرا ان سے ملنا بہت ضروری ہے۔ میں انہیں قائل کر لوں گا۔ مجھ پر یقین کرو۔"

"وہ شہر سے باہر گیا ہوا ہے اور اگر آفس میں ہوتا تو بھی اس سے ملنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ وہ صرف پروفیشنل ایکٹرز کی نمائندگی کرتا ہے۔" اس نے کلائی میں بندھی رولیکس زنجیر والی گھڑی میں وقت دیکھا اور نشست سے اٹھ گئی۔

"میرے لنچ کا وقت ہو گیا ہے۔ تم سے بات کر کے بہت اچھا لگا۔ وقت آسانی سے گزر گیا' شکریہ۔"

اس کے جانے کے بعد احمد کچھ دیر وہیں ساکت کھڑا رہا۔ پھر اس نے چند گہری سانسیں بھریں اور مڑ کر آفس سے باہر نکل آیا۔ اس معمولی سیکریٹری کی بددماغی

سے وہ ہمت نہیں ہارے گا۔ اگر جارج فلپ اس کا ایجنٹ نہیں بن سکتا تو خسارہ خود جارج کے حصے میں آنے والا تھا۔

اس نے ذہن میں محفوظ شدہ ناموں پر غور کرتے ہوئے دوسری ایجنسی کا انتخاب کیا اور وہاں پہنچ گیا۔ یہاں بھی اس کے ساتھ بالکل وہی سلوک ہوا جو جارج فلپ کے آفس میں کیا گیا تھا۔ وہ لوگ اس سے بات کرنے کے روادار نہ تھے۔

اگلے چند روز میں اس نے ہالی ووڈ کے تمام درجہ اول اور درجہ دوم کے ایجنٹس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی' نتائج کم و بیش ایک سے ہی تھے۔

"تمہیں یہ غلط فہمی کیسے ہو گئی کہ اتنی بڑی ایجنسی تمہیں خوش آمدید کہے گی؟"

"مسٹر کنتھر اپنی فیملی کے ساتھ جنیوا گئے ہیں۔ واپسی کے بارے میں علم نہیں۔"

"کیا تم حقیقت میں بھی اتنے ہی بے وقوف ہو' جتنے شکل سے نظر آتے ہو؟"

"تم ایک ہفتے میں پچیس دفعہ ٹیلی فون کر چکے ہو۔ تم ٹیلی فون اپنے مقبرے کے بارے میں کیوں نہیں کرتے۔"

"وہ پورٹ فولیو نہیں محض ایک فوٹو البم ہے اور تم بہت ہاٹ لگ رہے ہو۔ تم جب بھی مجھے ڈیٹ پر جانے کی دعوت دو گے میں انکار نہیں کروں گی۔"

"تم ایک Nonentity ہو۔ اس ایجنسی کے لیے تمہارے ساتھ اپنا نام جوڑنا شرمناک ہوگا۔"

"کیا سیدھے مریخ سے آ رہے ہو؟ مہذب دنیا کے رواج نہیں جانتے؟ میں بتا چکا ہوں مسٹر لی بلاڈی جونیئر میٹنگ میں ہیں اور یہ میٹنگ پورا سال جاری رہے گی۔ آئندہ ٹیلی فون کر کے اپنا قیمتی وقت برباد مت کرنا۔"

چھ ماہ میں اس نے ان تمام دروازوں پر دستک دی' جو اسے کامیابی کی راہ پر گامزن کر سکتے تھے' لیکن اس کی ہر دستک رائیگاں گئی۔ اسے ان تمام اداروں نے دھتکار دیا تھا اور اب صرف وہ ایجنٹ بچے تھے جن کے ساتھ وہ خود کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔

وہ لوگ اس کے ساتھ ایسا کر سکتے تھے۔ اس کی صلاحیتوں کو پرکھے بنا اس کے مستقبل کے بارے میں کیسے فیصلہ صادر کیا جا سکتا تھا۔

وہ جارج فلپ کے آفس میں ساتویں بار آیا تھا اور اس پر نظر پڑتے ہی ــــ بلونڈ کیتھی نے بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔

"وہ آفس میں نہیں ہے۔" اس کے دریافت کرنے سے قبل ہی کیتھی نے بتایا تھا۔

"میں اس سے ملنے نہیں آیا۔"

"تو؟"

"میرا خیال ہے کہ مجھے تم اچھی لگنے لگی ہو۔"

"دیکھو میں صرف ایک سیکریٹری ہوں۔ میں اس کے فیصلوں پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے کہ اس کے تمام کلائنٹس سپر اسٹارز ہیں۔ اس نے کبھی کسی نووارد کو۔۔۔"

"پہلی ملاقات میں تم مجھے اتنی دلکش نہیں لگی تھیں' لیکن دوسری بار اور پھر تیسری بار۔ میرے خدا! میں بیان نہیں کر سکتا۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکا۔

"تم میرے ذریعے اس تک نہیں پہنچ سکتے۔"

"تمہارے ذریعے تم تک تو پہنچ سکتا ہوں۔ کیا میں چہرے سے ایسا ہی سادہ لوح نظر آتا ہوں۔ ایک دفعہ یہاں آنے کے بعد ہی مجھ پر واضح ہو گیا تھا کہ میں قیامت کے دن تک جارج فلپ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکوں گا۔ میں صرف تمہیں دیکھنے کے لیے آتا رہا اور تمہیں جان کر خوشی ہوگی کہ میں Actors West میں enrol ہو گیا ہوں۔"

کیتھی کچھ دیر بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی اور جب بولی تو اس کا لہجہ یکسر بدلا ہوا تھا۔ "میں تمہارے لیے بہترین کیریئر کی خواہش کرتی ہوں۔ میری ذاتی رائے میں تم میں بہت اچھا اداکار بننے کی استعداد ہے۔ اب تم نے صحیح راہ کا انتخاب کیا ہے۔ Actors West ایک مایہ ناز ادارہ ہے اور ــــ

تمہاری آنکھوں کی پتلیاں کتنی بڑی ہیں بالکل سیاہ زیتون کی طرح میں نے پہلے غور ہی نہیں کیا۔"
احمد مسکرایا۔ "میں نہیں جانتا تمہیں زیتون پسند ہیں یا نہیں۔"
"اوہ میں ان کی پرستش کرتی ہوں۔"
احمد قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔
"آج رات میرے ساتھ ڈنر کرنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟"
"بہت حسین خیال ہے، لیکن اس وقت تمہیں جانا ہوگا میں تمہیں کال کروں گی۔ تمہارا ٹیلی فون نمبر میرے پاس ہے۔" "میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا۔ مسٹر فلپ کچھ اہم لوگوں کے ساتھ میٹنگ میں مصروف ہے۔ اور کچھ دیر بعد وہ فاکس اسٹوڈیو چلے جائیں گے ابھی میں اندر کافی دینے جا رہی ہوں۔"
احمد اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھا۔ "تو ٹھیک ہے میں تمہاری کال کا منتظر رہوں گا۔ تمہارے ہاں آج رات کا مطلب آج رات ہی ہوتا ہے نا۔" وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آیا مگر جانے کے بجائے وہیں راہ داری میں دروازے سے چپک کر کھڑا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے دروازہ [illegible] اندر جھانکا اور کیتھی کو وہاں موجود نہ پا کر دبے قدموں اندر داخل ہو گیا۔
جارج فلپ ایک ادھیڑ عمر دراز قد، دبلا، باریش اور قدرے گنجا شخص تھا۔ اس کے مقابل صوفے پر اس کے دو ہم عمر مرد اور ایک دلکش سراپے والی Brunette بیٹھی تھی۔ ان سب نے ایک ساتھ ہی احمد کو تیزی سے اندر گھستے دیکھا تھا۔
"میں ایک بہت باصلاحیت ایکٹر ہوں، لیکن میرے پاس کوئی ایکٹنگ کریڈٹس نہیں ہیں۔ تم مجھے ہالی ووڈ میں متعارف کرواؤ اور میں وعدہ کرتا ہوں تمہیں کبھی پچھتانا نہیں پڑے گا۔" کسی کے کچھ کہنے سے قبل ہی وہ عجلت زدہ آواز میں بولنے لگا۔
"مجھے ایک بار سن لو مجھے آزما کر دیکھ لو اور اس کے بعد کوئی فیصلہ سنانا۔"
جارج فلپ کچھ کہنے کے لیے منہ کھول رہا تھا لیکن احمد نے اسے موقع نہیں دیا۔ "پڑھنے کے لیے مجھے کوئی اسکرپٹ دینے کی بھی ضرورت نہیں۔ مجھے بے شمار فلموں کے مکالمے زبانی یاد ہیں۔"
اسے علم تھا اس کے پاس بہت کم مہلت تھی۔ جارج اسے کسی بھی لمحے آفس سے باہر نکلنے پر مجبور کر سکتا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے گہری سانس لی اور جب اس کے لبوں سے آواز برآمد ہوئی تو وہ To catch a Thief کا چور Robie John تھا۔
"میں نے چوری کو کیوں اختیار کیا۔ بہتر زندگی جینے کے لیے ان چیزوں کو پانے کے لیے جنہیں میں حاصل نہیں کر سکتا تھا اس اچھے مذاق کو اپنانے کے لیے جس سے تم اب محظوظ ہوتے ہو اور جسے ترک کرنا میرے لیے تقریباً ناممکن ہے۔"
پھر وہ رزمیہ فلم Gone with the wind کا سورما Rhett Butler بن گیا اور وہ بھورے بالوں والی لڑکی اس کی Scarlet تھی۔
"جنوب کا ایک سپاہی ہے جو تم سے محبت کرتا ہے Scarlet وہ اپنے گرد تمہاری بانہوں کو محسوس کرنا چاہتا ہے۔ تمہارے بوسوں کی یادداشتیں اپنے ساتھ جنگ میں لے جانا چاہتا ہے۔ مجھے چاہنے کے بارے میں کچھ خیال نہ کرنا۔ تم وہ عورت ہو جو ایک سپاہی کو اس کی موت کی طرف روانہ کر رہی ہے ایک حسین یاد کے ساتھ۔ Scarlet مجھے بوسہ دو، مجھے بوسہ دو ایک بار۔" وہ Brunette کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے نہایت جذب سے بول رہا تھا۔ پھر جب اس نے روپ بدلا تو وہ Itsa Wonder ful life کے George Bailey میں ڈھل گیا جو اپنی بیوی میری سے مخاطب تھا۔
"تمہاری چاہ کیا ہے۔ میری؟ تم کیا مانگتی ہو؟ تم چاند کی تمنائی ہو؟ بس کہہ ڈالو اور میں اس پر سرک پھندا ڈالوں گا اور اسے نیچے کھینچ لوں گا۔ ہاں یہ بہت

سہانا خیال ہے۔ میں تمہیں چاند دے دوں گا۔ میری اور جب تم اسے نگل لینا اور وہ سارا گھل جائے گا دیکھو اور کرنیں تمہاری انگلیوں اور تمہارے پنجوں اور تمہارے بالوں کی نوکوں سے پھوٹنے لگیں گی۔"
وہ جیسے منہ زور لہروں کی زد میں تھا۔ اسے ان چار لوگوں کی نظروں اور ان کے تاثرات کی قطعاً پروا نہ تھی۔ اسے کلاسیکی انگریزی ادب سے بھی کچھ سنانا چاہیے تھا۔ شیکسپیئر کے "رومیو اینڈ جولیٹ" کے خوب صورت الفاظ اس کے ذہن کے پردے پر مرتسم ہوئے۔
"قندیلیں شب کی بجھ گئیں اور کھلکھلاتی فجر چلی پہ دھندلے کوہ کی چوٹیوں کے بل ہے جلوہ گر۔"
جارج نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ "چپ ہو جاؤ۔ اتنا ہی بہت ہے۔"
احمد خاموش ہو کر دانتوں سے نچلا ہونٹ کچلنے لگا۔ جارج کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اس کے اندر روشنی پھیلنے لگی۔ کیا وہ اس کے ہنر کو پہچان گیا تھا؟ کیا وہ اس کا ایجنٹ بننے پر راضی ہو جائے گا۔ [illegible] بعد اسے تہہ کیا اور کاغذ احمد کی طرف بڑھا دیا۔
"اس تاریخ کو مجھے ملنا۔"
"میں تمہارا شکریہ کیسے ادا کروں۔ تم عظیم شخص ہو۔ تم میرے محسن ہو۔" لرزتے ہاتھ میں کاغذ کا پرزہ تھام کر وہ جانے کے لیے مڑا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر وہ ٹھٹکا اور گھوم کر واپس آیا۔
"یہ کیا ہے؟ تم نے پندرہ سال بعد کی تاریخ لکھی ہے اس کا کیا مطلب ہوا۔"
"اتنے عرصے تک مجھے بالکل امید نہیں کہ مجھ پر اتنا برا وقت آجائے گا کہ میں تم جیسے گھٹیا اور نقلی فنکار کی نمائندگی کرنے پر مجبور ہو جاؤں۔ تم ایک mocking bird (نقال پرندہ) سے زیادہ کچھ نہیں۔"
ٹرے میں کافی کی پیالیاں سجائے آتی ہوئی کیتھی اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی۔
"Actors West بھی تم جیسے گھٹیا لوگ چلاتے ہیں۔ وہ بھی صرف پروفیشنل ایکٹرز کو قبول کرتے ہیں کیتھی۔"
وہ اسے سختی سے ایک طرف دھکیل کر چلا گیا تھا۔
بہت دیر سے Men's room میں آئینے کے سامنے کھڑا وہ اپنے منتشر حواس قابو میں لانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اپنے پہلو میں اسے کھچڑی بالوں والا فربہی مائل مرد نظر آیا۔ وہ ان ہی دو آدمیوں میں سے ایک تھا جنہیں وہ جارج فلپ کے آفس میں دیکھ چکا تھا۔
"تم میں صلاحیت ہے۔ یہ بات شبے سے بالاتر ہے، لیکن تم ان بڑے ناموں والی ایجنسیوں میں وقت گنوانے کے بجائے نچلی صفوں سے کوشش شروع کرو۔"
اس نے کچھ غیر معروف ایجنٹوں کے نام گنوائے۔
"لیکن میں نے ان میں سے کوئی بھی نام پہلے نہیں سنا ہوا۔"
"اس کا بھی کوئی امکان نہیں کہ ان میں سے کسی نے تمہارا نام پہلے سنا ہو۔ [illegible] کوئی بھی زینہ پار کرنے کے لیے نچلے قدمچوں سے ہی آغاز کیا جاتا ہے۔"
"کیا تم میری مدد نہیں کر سکتے؟ تم کون ہو؟" اچانک خیال آنے پر اس نے امید بھرے لہجے میں پوچھا تھا۔
"نہیں۔ یہ میرے اصولوں کے خلاف ہے۔ میں کبھی کسی کی سفارش نہیں کرتا۔"
احمد نے دل میں اس کے اصولوں پر لعنت بھیجی تھی۔
"اور تمہارے لیے ایک مشورہ ہے۔ دوسروں کی نقالی کرنے کے بجائے اپنا الگ انداز اپناؤ۔ دوسروں کی تقلید میں بھاگنے سے تمہاری انفرادیت سامنے نہیں آسکے گی۔" وہ اس کا شانہ تھپتھپا کر بولا تھا۔

☼ ☼ ☼

کافی سوچ بچار کے بعد اس نے رائن سدرلینڈ سے

بات کرنے کا سوچا۔ وہ بلڈنگ کے مشترکہ کچن میں ہاٹ پلیٹ پر اپنی کیلی جرابیں رکھے انہیں سینک رہا تھا۔

"تم کہہ رہے تھے تمہارا اسلام موویز سے متعلق ہے اور تمہارے خاصے کانٹیکٹس ہیں۔"

"مجھے معلوم تھا تمہیں میری ضرورت پڑے گی اور میں صحیح وقت کا منتظر تھا۔ میں نے تمام بڑے مووی اسٹوڈیوز میں کام کیا ہے۔ تم کسی کا بھی نام لو اور وہ میری فہرست میں موجود ہوگا۔

Fox ' Columbia ' Paramount
M.G.M ' Universal"

"کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟" احمد کو یقین نہیں آیا تھا۔

"تمہاری حیرانی کی وجہ میں سمجھتا ہوں۔ تم سوچ رہے ہو گے کہ پھر میں سب لیبرٹی ... کیوں نہیں ہوں۔ میں جب بھی بتاتا ہوں لوگ ایسے ہی حیران ہو جاتے ہیں۔ حیران لوگوں کی شکل دیکھنا مجھے بڑا اچھا لگتا ہے۔" اس نے بھنووں پر گرتے ہوئے بالوں کو سر کی جنبش سے ذرا سا ہٹایا۔

"لیکن تم کیا کرتے ہو؟"

"میرا کام اس وقت ہوتا ہے جب شوٹنگ نہیں ہو رہی ہوتی۔ میں نے پچاس سے زائد فلموں میں کام کیا ہے۔ لیکن تمہیں کسی میں بھی نظر نہیں آؤں گا۔ دیکھا اور حیران ہو گئے تم۔ میں ایک Stand-in ہوں۔"

"وہ کیا ہوتا ہے؟"

"تو تم نہیں جانتے؟ ظاہر ہے تم ابھی نئے نئے یہاں آئے ہو۔ تمہیں یہاں کی زبان کیا سمجھ میں آئے گی۔ Stand-in دراصل لیڈز اور سیکنڈری لیڈز کو لائٹنگ کے طویل اور بیزار کن عمل کی کوفت سے بچانے کے لیے رکھے جاتے ہیں۔ جب ڈائریکٹر آف فوٹوگرافی سیٹ پر لائٹنگ کی دیکھ ریکھ کرتا ہے تو اصل ایکٹرز کی بجائے Stand-ins سیٹ پر موجود رہتے ہیں۔ کبھی کبھی میں مارٹن کے Body double کے طور پر بھی کام کرتا ہوں۔

وہ بہت مصروف اداکار ہے۔ اس کی وجہ سے مجھے اکثر کام مل جاتا ہے۔ لیکن تم یہ کام نہیں کر سکتے کیونکہ Stand-in کا قد، جسامت، اسکن کلر اور بالوں کی رنگت اصل ایکٹر سے مطابقت رکھتی ہوتی ہے تو ہی سیٹ کو درست طریقے سے لائٹ کیا جا سکتا ہے۔ لاطینی یا ایشین ایکٹرز تو انڈسٹری میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔"

احمد ایسا کام کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ یہ تو اپنی تذلیل کرنے کے مترادف تھا۔

"ایک اسسٹنٹ کاسٹنگ ڈائریکٹر میرا جاننے والا ہے۔ میں تمہیں اس سے ملواؤں گا۔ وہ کئی B-movies کے لیے بیک گراؤنڈ پرفارمرز (ایکسٹرا) مہیا کرتا ہے۔" رائن نے جرابوں کو ناک کے قریب لا کر سونگھا اور پھر اطمینان کا اظہار کر کے انہیں کچن کاؤنٹر پر دھری ایک ٹوکری میں رکھ دیا۔ "اس نے ایک بار مجھے باسکٹ بال میچ کے ناظر کا کردار دلوایا تھا۔ میں پورے پانچ سیکنڈ ایک جھنڈا لہراتے ہوئے دکھائی دیتا ہوں لیکن وہ کمینہ جھنڈا میرے منہ کے سامنے رہتا ہے۔"

احمد کو ایسے اوٹ پٹانگ شخص سے ملنے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ اس نے رائن کی یاوہ گوئی ان سنی کرتے ہوئے کہا تھا۔

"مجھے رات کے اوقات کی کوئی عارضی جاب دلا دو ورنہ اگلے ماہ کا کرایہ میں نہیں دے پاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ وہ کوئی مسئلہ نہیں لیکن آج رات تمہیں میری مدد کرنا ہوگی۔"

"کیسی مدد؟"

"آج گریس آرہی ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟"

"میرا مطلب ہے تم کہیں اور سو جاؤ۔"

"مثلاً" کہاں؟ کیا سڑک پر۔" اسے غصہ آنے لگا۔

"میں تمہیں سڑک پر نہیں سونے دوں گا۔ میرے پاس ہر مسئلے کا حل ہوتا ہے۔ تم میری کار میں سو سکتے

ہو۔ اور جاتے ہوئے یاد سے کشن لے کر جانا۔ پچھلی سیٹ کا ایک اسپرنگ نکلا ہوا ہے۔ وہ چبھے گا تو تمہیں اچھی نیند نہیں آسکے گی۔"

☼ ☼ ☼

داغ دار فرنیچر اور بوسیدہ دفاتر والے بچے کھچے ایجنٹوں سے رابطہ کرنے پر احمد کو خلاف توقع رد عمل کا سامنا کرنا پڑا۔ ان میں سے کوئی بھی اسے قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ وہ ٹیلی فون پر اس سے بات تک کرنے پر تیار نہیں تھے۔ بے شمار بار رد کیے جانے کے بعد وہ جن ایک دو ایجنٹس سے ملنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ ان کا رویہ ناقابل برداشت حد تک حوصلہ شکن تھا۔

"تم سے بڑے چغد سے میں آج تک نہ ملا۔ لیڈنگ رولز کا نام بھی مت لو۔ وہ لوگ کسی مختلف مٹی سے بنے ہوتے ہیں۔ تم ایکسٹرا نہیں بننا چاہتے؟ کیا تم کیا تم جان دائن اور شرلے ٹمپل سے زیادہ بڑی شے ہو۔ جب وہ ایکسٹرا کے طور پر کام کر سکتے ہیں تو تم۔" مجھے غصہ دلا رہے ہو۔"

☼ ☼ ☼

"کیا تمہارے پاس کوئی اسپیشلٹی ہے؟"

"میں سمجھا نہیں۔"

"کیا تم بیس بال کھیل سکتے ہو یا گھڑ سواری آتی ہے یا ڈانس کرنا جانتے ہو یا پھر سر کے بل چل سکتے ہو۔ کچھ بھی۔ کوئی مہارت ہے تم میں۔"

"لیکن اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"ایکسٹرا بننے کے لیے کسی نہ کسی اسپیشلٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بغیر تم کو کوئی بھی فلم میں ہائر نہیں کرے گا۔"

"میں ایکسٹرا کے طور پر کام نہیں کروں گا۔ اگر مجھے لیڈ نہیں مل سکتی تو میں کریکٹر رول کے لیے۔"

"احمقوں کی جنت میں رہنا چھوڑ دو۔ زیادہ سے زیادہ میں تمہیں کسی ٹیلی وژن سوپ میں Bit Part دلوا سکتا ہوں۔ Bit Player کے پاس بولنے کے لیے کم

اور کم از کم ایک لائن ہوتی ہے جبکہ ایکسٹرا کو کوئی مکالمہ نہیں دیا جاتا۔"

☼ ☼ ☼

اسٹوڈیو کے Gaurd's Gate پر موجود گارڈ نے اسے کار روکنے کا اشارہ کیا تھا۔

"میں اندر جانا چاہتا ہوں۔"

"مجھے اس میں کوئی شک نہیں لیکن تم کس سے ملو گے؟ اپنا تعارف کرواؤ۔"

"میں ایڈم گرانٹ ہوں اور میں۔" وہ تذبذب کا شکار ہوا۔ اسے کسی کے ساتھ ملاقات کا بہانہ بنانا چاہیے تھا۔ کسی اسٹوڈیو ہیڈ کا نام لے کسی ڈائریکٹر یا پھر کسی پروڈیوسر کا۔ اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد گارڈ کو ایک نام بتا دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ گارڈ اس کے جھوٹ کو بھانپ کر اسے اندر جانے کی اجازت دے دے گا۔ لیکن وہ روسٹر کھول کر اس کے اوراق پلٹنے لگا تھا۔ احمد کے حلق سے ایک سرد آہ نکل گئی۔ اس روسٹر میں نام لکھوانا جیسے اعزاز کی بات تھی۔ گارڈ کا جھکا ہوا سر اٹھنے سے پہلے ہی وہ وہاں سے لوٹ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

Burbank میں آڈیشن کا اشتہار مقامی اخبار میں شائع ہوا تھا۔ یہ ایک بڑے ادارے کی طرف سے منعقد کیا جا رہا تھا۔ انہیں ایکٹنگ کے شائق لڑکے لڑکیوں کی ضرورت تھی۔ احمد صبح سات بجے ہی وہاں پہنچ گیا تھا حالانکہ آڈیشن دس بجے شروع ہونے والے تھے وہ چاہتا تھا کہ کسی بھی دوسرے امیدوار سے قبل وہاں پہنچ جائے۔

باقی آئندہ شمارے میں

نیا سال موسم نہیں ہے

نیا سال موسم نہیں ہے
ہوائیں چلیں گی
تو سب کچھ بدل جائے گا خود بخود ہی
نیا سال موسم نہیں ہے
کہ جب پھول شاخوں پہ کھلنے لگیں گے
تو ہم یہ کہیں گے
بہار آگئی ہے
نیا سال پچھواڑے کی دھوپ ہے
جو گزر جائے گا اور خبر بھی نہ ہوگی
نیا سال ہے شاخ پہ بیٹھا پنچھی
اڑان اپنی بھر جائے گا اور خبر بھی نہ ہوگی
خوشی کا یا غم کا ہو آنسو
نیا سال آنسو سے زیادہ قیمتی ہے
بکھر جائے گا اور خبر بھی نہ ہوگی

حسن عباسی

ربِ ارنی

زمیں کی تہوں سے کھلے آسماں تک
کیسا دھواں ہے
ہیولے ہیں، پرچھائیاں ہیں، گماں ہیں
توہم کی گہری سیاہ وادیاں ہیں
سوالات کا سرمئی سلسلہ ہے
تذبذب کا مٹیالا دریا رواں ہے
ہر اک سمت اک زرد رو بے یقینی کا گہرا
تسلط ہے
دلِ بے اماں ہے
پکڑ میں نہ آتا ہوا آسماں ہے
سمجھ میں نہ آتی ہوئی داستاں ہے
مرے واسطے جو سجائی گئی تھی
وہ دنیا کہاں ہے؟

حمیدہ شاہین



ادب نے دل کے تقاضے اٹھائے ہیں کیا کیا
ہوس نے شوق کے پہلو دبائے ہیں کیا کیا

پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے
اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا

بلند ہو تو کھلے تجھ پہ زور پستی کا
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

خوشی میں اپنے قدم چوم لوں تو زیبا ہے
وہ لغزشوں پہ مری مسکرائے ہیں کیا کیا

خدا ہی جانے یگانہ میں کون ہوں کیا ہوں
خود اپنی ذات پہ شک دل میں آئے ہیں کیا کیا

یگانہ چنگیزی

مری داستانِ حسرت وہ سنا سنا کے روئے
مرے آزمانے والے مجھے آزما کے روئے

کوئی ایسا اہلِ دل ہو کہ فسانۂ محبت
میں اسے سنا کے روؤں، وہ مجھے سنا کے روئے

مری آرزو کی دنیا، دلِ ناتواں کی حسرت
جسے کھو کے شادماں تھے، اسے آج پا کے روئے

تری بے وفائیوں پر، تری کج ادائیوں پر
کبھی سر جھکا کے روئے، کبھی منہ چھپا کے روئے

جو سنائی انجمن میں شبِ غم کی آپ بیتی
کئی رو کے مسکرائے، کئی مسکرا کے روئے

سیف الدین سیف

شگفتہ جاہ

رنگ رنگ پھول

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

سیدنا عبداللہؓ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بال کی کھال نکالنے والے تباہ ہوئے (یعنی بے فائدہ موشگافی کرنے والے حد سے زیادہ بڑھنے والے اور تعصب کرنے والے)" تین بار یہی فرمایا۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں،

- آواز بلند نہ کرنا، نظریں جھکائے رکھنا اور میانہ طریقے سے چلنا ایمان کی بہترین نشانی ہے۔
- جس نے خود کو کم کر دکھایا اس کا ذکر سنور گیا۔
- مومن وہ ہے جو خوشحالی میں شکر، مصیبت میں صبر اور کشائش میں خوف رکھتا ہے۔

گل پری مرزا۔ لاہور

شکر گزاری،

نئے اداکار جاوید صدیقی نے ہدایت کار عادل خان سے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

"سر! اس اسٹیج ڈرامے "ضمیر کی آواز" میں آپ نے میرے ساتھ بڑی ناانصافی کی ہے۔ مجھے پہلے ہی ایکٹ میں بڑی بے دردی سے مروا دیا۔"

ہدایت کار عادل خان نے اطمینان سے جواب دیا۔

"تمہیں تو صدیقی صاحب میرا شکر گزار ہونا چاہیے میں نے تو تمہارے حق میں بہتر کیا ہے۔ اگر میں تمہیں آخری ایکٹ تک کام کرنے دیتا تو تماشائی ہی تمہیں خود مار دیتے۔"

ثمرہ اقرا۔ کراچی

بہتر لوگ،

ایک خوبصورت دل ہزار خوبصورت چہروں سے بہتر ہوتا ہے۔ لہٰذا بہتر لوگ منتخب کریں جن کے پاس خوبصورت دل ہیں نا کہ خوبصورت چہرے۔

(شیکسپیئر)

صائمہ سلیم شہزادہ۔ کراچی

موتیوں جیسے لفظ،

- آدمی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ ہوتے ہیں کہ اگر انہیں اللہ تعالیٰ مل جائے تو سوال کریں گے کہ یہ چیز دے اور وہ چیز دے۔ دوسرے وہ ہوتے ہیں جن کو اگر اللہ مل جائے تو عرض کرتے ہیں کہ حکم فرمائیں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ بس آپ حکم ماننے والوں میں سے بن جائیں۔ (واصف علی واصف)
- انسان اپنے آپ میں تبدیلی پیدا کرنے کے لیے دوسروں پر تنقید زیادہ کرتا ہے اور خود میں تبدیلی نہیں۔ (اشفاق احمد)
- اگر کوئی احمق تجھ سے کہے کہ روح بھی جسم کے ساتھ فنا ہو جاتی ہے تو اس کی جہالت پر ترس کھا اور اسے بتا کہ پھول پتی پتی ہو کے ختم ہو جاتا ہے لیکن بیج ہمیشہ باقی رہتا ہے اور ہماری نظروں کے سامنے جاوداں زندگی کے اسرار منکشف کرتا ہے۔ (خلیل جبران)

سیدہ نسبت زہرا۔ کہروڑ پکا

نئے سال کی دعا،

خدا کرے نیا سال تیرے
دامن میں
وہ سارے پھول کھلا دے
کہ جن کی خوشبو سے
پھر سے خیال میں شمعیں
جلا کر رکھی تھیں

(پروین شاکر)

نسبت گیلانی۔ کہروڑ پکا

جواب،

ایک پولیس انسپکٹر کے یہاں اس کا ہمسایہ لنگڑاتے ہوئے اس کے پاس آیا اور شکایت کرنے لگا۔

"انسپکٹر صاحب! پڑوسی ٹھیکے دار صاحب کے کتے نے ہم لوگوں کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اس روز میرے لڑکے کو کاٹ کھایا تھا اور آج میری ٹانگ پکڑ لی۔"

انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ کتا شاید آپ لوگوں کا دشمن ہو گیا ہے۔ مجھ پر تو کبھی بھونکا تک نہیں۔"

ہمسائے نے جل کر کہا۔

"آپ پولیس آفیسر جو ٹھہرے۔ ڈرتا ہوگا کہ کہیں پلٹ کر آپ اسے کاٹ نہ لیں۔"

شبنم شمشاد۔ سرجان

حقیقت،

پاؤں گیلے کیے بغیر سمندر تو پار کیا جا سکتا ہے مگر آنسو بہائے بغیر زندگی نہیں گزاری جا سکتی۔

(مستنصر حسین تارڑ)

خدیجہ سلیم۔ کراچی

صحت یابی،

ذہنی امراض کے اسپتال سے ایک مریض کو رخصت کرتے وقت ڈاکٹر نے کہا۔

"آپ ہمارے علاج سے صحت یاب ہو گئے۔ امید ہے اب تو آپ آسانی سے ہمارا بل ادا کر دیں گے۔"

مریض نے شاہانہ انداز میں کہا۔ "کیوں نہیں، کیوں نہیں اگر ہم نے تمہارا چند لاکھ کا بل ادا نہ کیا تو ہمیں شہنشاہ اکبر کون سمجھے گا۔"

آسیہ جاوید۔ علی پور چٹھہ

روشن حرف وہ سارے،

- ہم خدا کو نہ آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں نہ کشف سے۔ اس کے متعلق واحد ذریعہ الہام ہے۔ (حضرت مجدد الف ثانیؒ)
- مومن کو گناہ یوں نظر آتے ہیں گویا ایک پہاڑ آہستہ آہستہ نیچے آ رہا ہے جو اسے پیس کر رکھ دے گا۔ (امام احمد بن حنبلؒ)
- سب سے بڑی دولت زبان ذاکر، دل شاکر اور تن فرماں بردار ہو۔ (امام غزالیؒ)

صبا سلیم۔ ٹنڈو جان محمد

عادت،

- عظیم انگریز نقاد اور لغت نویس ڈاکٹر جانسن کبھی کبھی اپنے بعض ملاقاتیوں سے بچنے کے لیے درخت پر چڑھ کر پتوں میں چھپ جاتا تھا۔ مگر یہی شخص جب اپنے دوستوں کی محفل میں شرکت کرتا، محفلیں طویل ترین ہو جاتیں اور بسا اوقات جانسن ایک نشست میں چائے کی بیسیوں پیالیاں پی لیتا تھا۔
- مشہور مصنف ایڈگر ایلن پو ناولوں کے لیے اپنے مضامین گلابی کاغذ پر، اپنی شاعری پیلے کاغذ پر اور اپنے ناول نیلے کاغذ پر لکھتا تھا۔
- مختصر افسانے کا بانی ایڈگر ایلن پو لکھتے وقت اکثر اپنی بلی کو اپنے کندھے پر بٹھا لیتا تھا۔

ندا فضہ۔ کراچی

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں،

- فقر یہ ہے کہ اگر دونوں جہان اس کے ترازو کے پلڑے میں ڈال دیے جائیں تو اس کا وزن مچھر کے پر سے کم نکلے گا۔ (حضرت علی ہجویریؒ)
- جو دنیا کو محبت و پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے اس کے دل سے فقر و زہد کے نور نکال لیے جاتے ہیں۔ (حضرت شیخ فتح موصلیؒ)
- مرد سیرت سے ہے نہ کہ صورت سے۔ (حضرت ابوالقاسم جنیدؒ)

- دل آنکھ کے تابع ہے، آنکھ کے بگڑنے کے بعد دل کی حفاظت مشکل ہے اور دل کے بگڑ جانے کے بعد شرم گاہ کی حفاظت مشکل تر ہے۔

(حضرت مجدد الف ثانیؒ)

- علم ایک ایسا بادل ہے جس سے رحمت ہی رحمت برستی ہے۔

(مولانا محمد علی جوہر)

- لوگوں کی نیکیوں کو ظاہر کرنا چاہیے اور برائیوں سے چشم پوشی لازم ہے۔

(حضرت امام غزالیؒ)

شمیم صدر الدین رحمانی۔ صفدر آباد

اچھی باتیں

- خواب ضرور دیکھیے لیکن اتنا یاد رکھیں کہ حقیقت کو آپ کے خوابوں سے کوئی سروکار نہیں۔
- محبت کرو، مگر رشتوں کی تخصیص کیے بغیر۔
- دوسروں پر انحصار کر کے آپ خود اپنی زندگی تباہ کرتے ہیں۔
- کچھ لوگ گھروں کی طرح ہوتے ہیں۔ جو چاہے کتنے دور چلے جائیں دل ان کی دہلیز میں سمٹ جانے کو بے تاب رہتا ہے۔
- محبت جن کے ساتھ ہوتی ہے وہ کبھی تنہا نہیں ہوتے۔ کبھی محبت انہیں تنہا نہیں ہونے دیتی۔
- جو لوگ آپ سے اختلاف رکھتے ہیں، ان کے بارے میں پریشان نہ ہوں۔ پریشان تو ان لوگوں کے بارے میں ہوں جو آپ سے اختلاف رکھتے ہیں لیکن ان میں یہ بتانے کی جرأت نہیں ہوتی۔

سیدہ نسبت گیلانی۔ کبیر والا

راہ کے دیپ

- جو بات آپ کے بس میں نہیں ہے اس میں دخل نہ دیں۔ جو بات بس میں ہے وہاں جواب دہی پوری کریں تو سکون مل جائے گا۔
- قبولِ دعا کے لیے یکسوئی، احساس بے چارگی اور اضطراب ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی بدکاروں کی دعا بھی قبول ہو جاتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو غم زدہ دل کی بے تابی دعا بھی پسند ہے۔
- کچھ خوابوں کو پانے کے لیے کچھ خوابوں سے دستبردار بھی ہونا پڑتا ہے۔
- جب تم کسی کو نظرانداز کرو اور وہ تمہیں اس کا بدلہ وفا سے دے تو جان لو کہ وہ تم سے خود سے بھی زیادہ اور سچی محبت کرتا ہے۔

گڑیا شاہ۔ کبیر والا

کچھ باتیں ہیں اچھی

- آخر میں ہمیں اپنے دشمنوں کے الفاظ یاد نہیں رہتے بلکہ اپنے دوستوں کی خاموشی یاد رہتی ہے۔
- دوست کون ہوتا ہے؟ وہ ایک ایسا فرد ہوتا ہے جس کے ساتھ آپ اپنے اصلی رنگ میں نمایاں ہونے کی ہمت کر سکتے ہیں۔
- اپنی بات کی وضاحت کبھی مت کرنا، تمہارے دوستوں کو اس کی ضرورت نہ ہوگی اور تمہارے دشمن اس پر یقین نہیں کریں گے۔
- زندگی کا اچھا اصول ہے کہ دوستانہ تعلقات استعمال کرو مگر دوستوں کا استعمال مت کرو۔
- دوست کے گھر کی طرف جانے والا راستہ کبھی طویل نہیں ہوتا۔

میرب۔ چونڈہ

محنت کوشی

محنت کوشی کی زندگی اور آسائشوں سے کنارہ کشی ہی انسان کو مرد بناتی ہے جو انسان اپنی ضرورتیں محدود کر لیتا ہے وہ پھر دنیا کی کسی چیز سے خوفزدہ نہیں ہوتا کیونکہ یہ انسان کی ضرورتیں ہی ہیں جو اسے دوسروں کا دستِ نگر بننے پر مجبور کرتی ہیں۔ اسے کمزور اور بزدل بناتی ہیں۔ اہلِ دانش کے لیے اس میں سوچ کے بڑے پہلو ہیں۔ کاش ہم اتنی سی بات کو سمجھ سکیں۔

(مسرت جبیں)

شبنم برنالہ۔ برنالہ

انتخاب: خواتین

خواتین کی ڈائری

صبا طارق کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر نئے سال کے حوالے سے میر نیازی کی یہ نظم آپ سب کے لیے۔

نیا سال

نیا سال آیا ہے
ویران صحنوں کی نیلی چھتوں سے ابھرتا
خیابان و دشت و جبل کی شکستہ خموشی میں
برفیلی سیٹی بجاتا
وہ سب یاد ہیں
آج خود شناسوں کی خاموشیاں
اس کے قدموں کی آہٹ لیے
گزر گیا ہوں ہر سائبانوں میں نوحہ کناں ہیں
در آتی ہے شب کو دریچوں در زدوں سے
پُرشور جھونکوں کی بے مہر ٹھنڈک
بروقت زدہ پاتیوں پر پرندے
کناروں پر ایستادہ پیڑوں کی نمناک شاخوں کی
جانب اڑے جا رہے ہیں
مکیں آنگنوں میں، چھتوں پر
دھڑکتے دلوں میں ہزاروں خیالوں کی شمعیں جلائے
دبے پاؤں آتے ہوئے سالوں کو دیکھتے ہیں

سیدہ نسبت زہرا کی ڈائری سے

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ زندگی ہمارے اپنوں کو ہم سے جدا کر دیتی ہے۔ تقدیر کے فیصلے اٹل، تو اس طویل سرد و گرم میں گزرنے والے خوشبو کی مانند مجھے ہماری زندگی کو روشن کرنے والی یادیں، اور بیتے پل بہت یاد آئیں تو دل کو سمجھانا کہ یہ سب گزر جانے گا۔ "یہ سال بھی آخر بیت گیا" میں امجد اسلام امجد نے اپنے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی ہے۔ آپ بھی پڑھیے۔

یہ سال بھی آخر بیت گیا
کچھ تمہیں، یادیں، خواب لیے
چند کلیاں، چند گلاب لیے
کچھ انگڑائیاں پُرتاب لیے
کچھ اجلے دن کالی راتیں
کچھ سچے دکھ جھوٹی باتیں
کچھ بیتی رُتیں، کچھ برساتیں
کسی یادِ عزیز کا دُکھ پیارا
کسی چھت پر امیدوں کا تارا
جس پر ہنستا تھا جگ سارا
اس شاعر نے جو حرف لکھے
اس میں تیری یاد کے سائے تھے
وہ لوگ بھی آخر لوٹ گئے
جو صدیوں پار سے آئے تھے
ان ہنستے بستے لوگوں نے
میرے سارے دکھ اپنائے تھے
پھر ہم نے یاد کی مٹی میں
زخمی لمحے دفنائے تھے

خالدہ جیلانی

میری بیاض سے

ہما شکیل ______ بوریوالا

ہم بے کسوں کی بزم میں آئے گا اور کون
آ بیٹھی ہے گردشِ دوراں کبھی کبھی

عرفانہ شکیل ______ بوریوالا

زندگی کے دیوانو سوچو کر یاد رکھو
عشق کس سلیقے سے زندگی بدلتا ہے

صائمہ سعید ______ لاہور

ترے رحم و کرم کا ہم کو اندازہ ہے لیکن
تری مخلوق کو ہر دم پریشانی میں دیکھا ہے
شعورِ ذات نے شہزاد کیا کیا رنگ دکھلائے
مگر جو نقش دل پر ہے وہ نادانی میں دیکھا ہے

یسریٰ فاطمہ ______ کراچی

جانے کس سوچ میں آ بیٹھا ہے آج رما ہے
روز ایک روز مری عمر میں ہنستا ہنستا
چلتے چلتے کہیں رک جاتی ہے دنیا اک پل
چاند ہنستا، یہ ہوا ہنستی، یہ صحرا ہنستا

ریحانہ کاشف ______ راولپنڈی

وہ جو اپنی جان سے گزر گئے، انہیں کیا خبر ہے کہ شہر میں
کسی جاں نثار کا ذکر کیا، کوئی سوگوار بھی اب نہیں

آسیہ صدیقی ______ سکھر

بعد مدت اس کی دعوت پر جو اس کے گھر گیا
پھر اسی گھر میں ملاقاتیں بہت اچھی لگیں
ہم بساطِ عشق پر کب ہارتے ہارے مگر
جان کر کھائی ہوئی ماتیں بہت اچھی لگیں

ندا قمر ______ کراچی

وہ یاد آئے تو اپنا وجود ہی نہ ملے
نہ یاد آئے تو مجھ کو تھکن زیادہ ہو

ہے جستجو مجھے اک ایسے شخص کی یارو
جو خوش مزاج بھی ہو اور دل کا سادہ بھی

سارہ نوید ______ کراچی

جینے والے جی ہی لیں گے
اب نہ ملو گے، اچھی بات
پانی کا تو بہنا ہے
آگ لگاتی ہے برسات

نور العین ______ کراچی

یوں تو اے بزمِ جہاں دلکش تھے ہنگامے ترے
اک ذرا افسردگی تیرے تماشاؤں میں تھی

کنول فرخ ______ کراچی

دیر میں عمر دل کے جو تم کو نہ جھکنے دیے
توفیقِ الٰہی سے، کچھ ایسی انا مانگو

سحر خان ______ کوئٹہ

اے عشق آ کر پھر سے نیا تجربہ کریں
دل بھولنے لگا ہے پرانی کہانیاں

مریم رانا ______ ٹنڈو جان محمد

اپنے بالوں کی سفیدی پہ سہم جاتا ہوں
زندگی اب تری رفتار سے ڈر لگتا ہے

فائزہ جبیں ______ بوریوالا

تری تلاش میں جب بھی ہم نکلتے ہیں
اک اجنبی کی طرح راستے بدلتے ہیں

شبنم شمشاد ______ بہزمان

تا عمر مجھے چھیڑیں گے بہت چاند ندی اور پھول
آیا نہ مرا دوست اگر اب کے برس بھی

سوہنا ساجد ______ روحی ولی کابل

اس نے راہ دیکھی ہو گی اس سال بھی مگر
میں نے کارڈ نہ بھیجا یہ میری خطا ہے
تجھ کو دیکھ پائے یہ اپنے نصیب ورنہ
سال کا پہلا سورج تیرے شہر میں دیکھا ہے

شہلا تبانی ______ ساہیوال

بہت حفاظت سے رکھا ہے جان چراغوں کو
بجھتے بجھتے بھی ہواؤں سے الجھ پڑتے ہیں
دیکھ فرعون کے لہجے میں بات نہ کر
ہم تو پاگل ہیں خداؤں سے الجھ پڑتے ہیں

فرزانہ شاہ ______ لاہور

تمہارے بعد جانے کیا ہوا دل کو
کسی سے ربط بڑھانے کا حوصلہ نہ ہوا

نوشین اقبال نوشی ______ گاؤں بدو مرجان

میرے ساتھ تم بھی دعا کرو یوں کسی کے حق میں برا نہ ہو
کہیں اور ہو نہ یہ حادثہ کوئی راستے میں جدا نہ ہو
سرِ شام ٹھہری ہوئی زمیں جہاں آسماں ہے جھکا ہوا
اسی موڑ پر مرے واسطے وہ چراغ لے کے کھڑا نہ ہو

حافظ اکبر ______ ڈگری گھنڈ

گئے سالوں کی صورت کٹ گیا یہ سال بھی آخر
عذابوں کے سوا گزرے برس میں کچھ نہیں رکھا

ثریا شاہ ______ کہروڑ پکا

ہر سمت کو پھیل رہی ہے محبت کی زمین
دریا میرے اظہار کا کس سمت کو جائے
ابر آلود نئے سال کی دہلیز پہ بیٹھے
تجھ کو ترے ماضی کا کوئی خواب سنائے

رملہ شاہ ______ میانوالی

میں اکثر اس لیے لوگوں سے جا کر خود نہیں ملتا
وہ ہی بے کار کی باتیں، وہ ہی بے کار کے قصے

شازیہ رانا ______ دیپالپور

اس کی یادوں میں گزرا یہ سال جیسا ہے
بتا اے گردشِ دوراں یہ حال کیسا ہے
میں اپنے ضبط کی ہر حد کو چھو رہی ہوں بتا
میرے فراق میں اب تیرا حال کیسا ہے



خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

رخسار سلیم۔۔۔ بالکوٹ

خواتین ڈائجسٹ ملا مگر دل افسردہ ہوا۔ عنیقہ محمد کی کوئی تحریر نہیں تھی عنیقہ زبردست رائٹر ہیں ان کے پلاٹ کمال کے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے شدت سے دل ان کی تحریروں کا منتظر ہوتا ہے۔ نفیسہ ناز کا "سیلاب گریہ" سبق آموز افسانے کو نکھار نہ سکا۔ پہلا قدم زبردست تحریر تھی۔ جبکہ سدرہ جی زبردست لکھ رہی ہیں۔ ناول کو ناول کا جا رہا ہے۔ بشریٰ سعید نے جو پیراگراف لکھا اس کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ بشریٰ سعید کم لکھتی ہیں مگر کمال کا لکھتی ہیں۔

ج: پیاری رخسار! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کو مایوسی ہوئی۔ ان شاء اللہ آئندہ شعاع اور خواتین میں عنیقہ کی تحریریں ضرور شائع ہوں گی۔

نمرہ احمد کی تحریر بھی آپ جلد پڑھ سکیں گی۔ وہ آج کل لکھ رہی ہیں۔

بشریٰ سعید اور دیگر مصنفین تک آپ کی تعریف و تنقید ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

شائستہ اکبر۔۔۔ ڈگری کالج گڈو

آپ سب کو نئے سال کی بہت بہت مبارک باد! اللہ کرے یہ سال ہمارے پاکستان کے لیے بہت سی خوشیاں لائے آمین!

دسمبر کا ٹائٹل دیکھ کر خوشگوار احساس ہوا۔ ماڈل کے بال بہت اچھے لگے۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باتوں سے فیض یاب ہو کر نبیلہ عزیز کے ناول "شرط" پر پہنچے جیسے ہی ناول شروع کیا آگے پڑھ کر لگا موضوع تو وہی پرانا ہے۔ پر ہر بار جو ہم سوچتے ہیں وہ ہی نہیں ہوتا کہ اینڈ ہیپی ہو جائے۔ جاگیردار ہو مجھے پسند ہے مگر خان کا یہ انداز کچھ خاص نہ لگا کہ ناول وہ محبت کا دم بھرتا اور اب ... تھا کہ محبت مر نہیں سکتی پر اس ناول کو پڑھ کر لگا کہ ہر بار ایسا نہیں ہوتا۔ محبت مر بھی سکتی ہے اور سچی بات یہ ہے کہ واقعی محبت مر رہی ہے۔

نایاب جیلانی اس بار اپنی "سایہ اور سائبان" میں پرفیکٹ رہیں۔ بشریٰ سعید کو میں پہلی بار پڑھ رہی ہوں اور اس ناول کی تھیم بہت پسند آئی ہے اور نام بھی "سفال گر" اچھا لگا ہے۔ شیریں ملک کے ناولٹ "خوش بخت" نے دل خوش کر دیا ہے۔ عمر عباس جیسے نودار لوگ مجھے بے حد پسند ہیں۔ افسانے سب ہی زبردست تھے۔ سلسلے وار ناول پرفیکٹ ہیں۔ "چراغ آخر شب" میں عثمان میری بہن کا فیورٹ کردار ہے۔

ج: شائستہ! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کے کالج کا نام صحیح شائع نہ ہو سکا۔ شائستہ! محبت مر نہیں رہی ہے۔ محبت آج بھی زندہ ہے لیکن جو لوگ محبت کو مذاق بناتے ہیں۔ انہیں معاف نہیں کیا جا سکتا۔

زیست نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ صرف ایک شرط جیتنے کے لیے اس نے خود کو اور مکرم خان کے جذبات کو داؤ پر لگا دیا۔

شمیم صمد روبین رحمانی۔۔۔ صفدر آباد

میری طرف سے تمام ٹیم کو اسلامی اور نیا سال مبارک۔ ایک سال اور گزر گیا اللہ کرے نیا سال سب کے لیے خوشیاں ہی خوشیاں لے کر آئے (آمین)

"کرن کرن روشنی" بہت ہی اچھی احادیث ہوتی ہیں۔

ٹائٹل کے بارے میں تو یہی کہوں گی کہ "خواتین" کی خواتین ہوتی ہی زبردست ہیں۔ بابر خان سے بھی باتیں اچھی لگیں تھیں۔ مجھے انٹرویو پڑھنے میں بڑا مزا آتا ہے ... سے ملاقات ہوئی۔ بہت ہی عمدہ سوچ کی مالک ہیں ایسے لوگوں کے انٹرویو بہت اچھے لگتے ہیں اور ہاں جس دن شاہین رشید کا انٹرویو آئے گا تو ... کے صفحے زیادہ ... گی۔

آرزو کسی کے نصیب میں ... لکھا ہے تو وہ اس کو ملی ہی رہتا ہے چاہے حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔

خوش بخت اچھی کہانی تھی، 'پہلا قدم' 'طاق میں رکھی کہانی' 'شرط اور اک دعا ٹھہر گئی' اور "سفال گر" اس کی قسط بھی بہترین تھی۔

ج: شمیم جی! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

صغرا بگھیو۔۔۔ شہدادپور

میں پہلے بھی "خواتین" میں شامل رہی ہوں۔ صغرا شورو کے نام سے۔ مگر پھر شادی ہو گئی زندگی میں تبدیلی آگئی۔ پھر خواتین سے تعلق بس پڑھنے کی حد تک رہ گیا۔ اور جب نمرہ احمد کی "پہلی راجپوتانی کی ملکہ" پڑھا تو دل کیا کہ "بھو کیا جائے" میاں جی سے کہا ایک خط لکھنے کا لفافہ لائیے گا۔ تو کہنے لگے "بیگم آج کے ای میل اور فیکس کے زمانے میں آپ لفافہ منگوا رہی ہیں۔" تب مجبور ہو کر ای میل کرنا سیکھا مگر مزہ نہیں آیا۔ خط لکھنے کا اپنا مزہ ہے۔

سب سے پہلے شروعات نایاب جیلانی سے کی۔ "آج کا ابھرتا ستارہ" "سایہ اور سائبان" کہانی کی شروعات تو کافی جان دار تھی مگر بیچ میں آپ نے سب جلد جلد سمیٹ لیا۔ جھٹ سے افرا اخرم کی دلہن بن گئی۔ کافی بور سیٹ ہوئی۔ پلاٹ بھی کافی پرانا تھا۔

دسمبر کے شمارے میں بیسٹ رہیں نبیلہ عزیز۔ ویل ڈن، ویل ڈن، ویل ڈن، اینڈ ویل ڈن میری طرف سے بہت بہت مبارک باد۔ مجھے زیست بہت اچھی لگی۔

مکرم آخر اپنی اصلیت پہ آ ہی گیا۔ یہ کیوں ہوتا ہے؟ ہم کتنے بھی پڑھ لکھ کر اپ ٹو ڈیٹ کیوں نہ ہو جائیں مگر اپنی اصلیت کو نہیں بھولتے۔ زیست تین سال اس کے ساتھ رہی۔ اس کو اس میں کوئی "کچھ" تبدیلی نظر نہیں آئی۔ میری ایک گزارش ہے کہ ناول کا دوسرا حصہ لکھا جائے جس میں مکرم زیست کو ... سے معافی مانگے۔

... خواہش ۔۔۔ راشدہ رفعت کی ایک عمدہ تحریر تھی۔ (اک دعا ٹھہر گئی) بس سو سو تھی۔

(سیلاب گریہ) پڑھ کر بھی مزہ نہیں آیا۔ میری اک گزارش ہے ادارے سے بھی اور مصنفات سے بھی ایسی اسٹوریز مت شائع کیا کریں۔ ٹی وی دیکھو اخبار دیکھو ہر جگہ سیلاب، بم دھماکے اور ڈاکٹر عافیہ جیسے ہزاروں قصے پلیز ڈائجسٹ کو ان سب سے دور رکھیں۔

ہمارے مذہب میں کافی ایسی باتیں ہیں جن کو ہم نہیں جانتے یا شاید جانتے بھی ہیں تو عمل نہیں کرتے بس معلومات کی حد تک ہمارے مذہب پہ لکھیں۔

"طاق میں رکھی کہانی" اچھی تھی۔ مجھے احسن کا کردار بہت اچھا لگا "پہلا قدم" بھی تعریف کے لائق تھی۔

خوش بخت میں نفیسہ پھوپھو بہت پسند آئیں۔ کہانی بھی پڑھنے لائق تھی۔

ج: عفرا جی! ہماری جانب سے شادی کی مبارک باد قبول کیجئے اللہ تعالیٰ آپ کو خوش و خرم رکھے۔ آمین۔

آپ نے صحیح کہا خط لکھنے اور پڑھنے میں جو مزہ آتا ہے وہ ای میل میں نہیں آتا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ بہت بڑی سہولت ہے۔

حالات حاضرہ پر تو عموماً کوئی چھوٹا سا افسانہ ہی ہوتا ہے۔ مکمل ناول اور ناولٹ وغیرہ عموماً موضوعات پر ہوتے ہیں۔

آپ کی تنقید و تبصرہ متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

امبر بنت شوکت ۔۔۔ ڈیرہ غازی خان

مجھے نہیں یاد کہ میں نے کب سے ڈائجسٹ پڑھنا شروع کیا، جیسے ہی شعور کو پہنچی تو اپنے ارد گرد ڈائجسٹ ہی دیکھے امی بہنیں کزنز سب ہی اس کی شوقین تھیں سو یہ شوق مجھ میں بھی منتقل ہو گیا۔ دسمبر کا شمارہ بہت اچھا لگا اور مجھے تو یہ میری پرتھ ڈے کا گفٹ لگا "کرن کرن روشنی" مجھے بہت پسند ہے اور ڈائجسٹ ہاتھ میں آتے ہی میں کرن کرن روشنی پڑھتی ہوں۔

سب کے خط لکھنے کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے اور میرے بھی خط لکھنے کی ایک وجہ ہے اور وہ ہے رخسانہ نگار عدنان، رخسانہ جی آپ مجھے بے حد پسند ہیں اور آپ کی تحریریں ان کا تو کوئی جواب نہیں "محبت خواب سفر" ایک یاد رہ جانے والی تحریر ہے۔ رخسانہ جی! آپ کو نہیں پتہ مجھے آپ سے ملنے کا کتنا شوق ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ پلیز اسی طرح ہمارے لیے لکھتی رہیے گا۔

افسانے سارے اچھے تھے مگر مجھے شاہین ملک صاحبہ کا افسانہ پسند نہیں آیا۔ اس بار میں فیصلہ نہ کر سکی کہ مکمل ناول کس کا زبردست تھا۔ نبیلہ عزیز کا یا نایاب جیلانی کا بہر حال میری طرف سے آپ دونوں کو مبارک باد۔

ج: پیاری امبر! رخسانہ نگار ہمیں بھی بہت پسند ہیں۔ ان کی کردار نگاری اور تحریر کی روانی قابل تعریف ہے۔ زیادہ لکھنے کے باوجود ان کی تحریریں اور کردار بہت متنوع ہوتے ہیں اور کہیں بھی یکسانیت محسوس نہیں ہوتی۔

صبا طارق ۔۔۔ گوجرانوالہ

میرے اس دفعہ خط لکھنے کی وجہ صرف بشریٰ سعید ہیں۔ سفال گر بہت ہی زبردست کہانی ہے۔ بشریٰ سعید اب اتنے طویل عرصے کے بعد آئی ہیں اور چھا گئی ہیں۔ شرط اور سایہ اور سائبان ناول دونوں ہی رائٹرز نے بہت خوب صورت طریقے سے لکھے ہیں۔ شیریں ملک بھی اپنی ایک اچھی کہانی کے ساتھ تشریف لائیں۔ سارا رسالہ ہی اس دفعہ بہت اچھا تھا۔ حرا قریشی اور راشدہ رفعت نے افسانے اچھے لکھے۔ مریم عزیز آپ کب آ رہی ہیں ایک زبردست سا ناول لے کر۔ فرحت اشتیاق صاحبہ آپ کہاں غائب ہو گئی ہیں "ہم سفر" کی طرح اچھا کوئی ناول لے کر آئیں۔

ج: صبا! اشعاع کی بزم میں خوش آمدید اور دعا ہیں۔ مریم عزیز کا ناول ان شاء اللہ آئندہ ماہ پڑھ سکیں گی۔ فرحت اشتیاق بھی ناول لکھ رہی ہیں دعا کریں جلد مکمل ہو جائے۔

سیرا یا نوندیم ۔۔۔ اسلام آباد

اس دفعہ جس ناول نے میری روح کو ہلا ڈالا۔ وہ تھا نبیلہ عزیز کا مکمل ناول "شرط" میرے خیال میں محبت اتنی بڑی سزا نہیں دیتی۔ وہ تو محبوب کی خامیوں کو اس کی ادا سمجھتی ہے۔ بشریٰ سعید کا "سفال گر" بہت اچھا جا رہا ہے۔ نایاب جیلانی کا "سایہ اور سائبان" بہت دلفریب انداز میں لکھا گیا۔ جس میں معاشرے کی صحیح عکاسی کی گئی۔ "ہزاروں خواہشیں" راشدہ رفعت کی اچھوتی کہانی تھی۔ سب افسانے بہترین تھے اور سلسلے وار ناول بھی خوب تھے۔

ج: سیرا جی! زندگی مذاق نہیں ہوتی اور ایسے بھیانک مذاق کرتے ہوئے دوسرے کے بارے میں بھی سوچ لینا چاہیے۔ زیست نے صرف ایک شرط جیتنے کے لیے مکرم سے جھوٹی محبت کا جو کھیل رچایا تھا تو کیا اس سے مکرم کا دل نہیں ٹوٹا؟ زیست کو اس کے کیے کی سزا ملنی ہی تھی۔ ویسے بھی لڑکیوں کو اس طرح کے معاملات میں بہت محتاط رہنا چاہیے۔ کسی کے جذبات سے کھیلنا کسی طور درست نہیں کہا جا سکتا۔

سائرہ پرواکرن ۔۔۔ کوٹ چھٹہ

دسمبر کا "خواتین" کچھ لیٹ ملا ٹائٹل گرل اچھی لگی۔ خاص کر اس کی ڈریسنگ!

ثنا بچہ سے ملاقات بے حد اچھی رہی۔ مجھے ثنا بچہ کا بات کرنے کا اسٹائل بہت پسند ہے پھر "محبت خواب سفر" میں چھلانگ لگائی یہ ناول ایک ہی جگہ پر آ کر رک گیا۔ دائم نے عزہ سے شادی سے انکار کر کے ہمارے دلوں کو بے حد اداس کر دیا۔ پھر اپنی پیاری نبیلہ آپی کا ناول "شرط" پڑھا۔ شروع میں سے انتہا انٹرسٹنگ تھا۔ زیست نے اپنی فرینڈز کے کہنے پر مکرم خان آفریدی سے جو شرط لگائی تھی۔ اس کی زیست کو اتنی بڑی سزا نہیں ملنی چاہیے تھی۔ نبیلہ آپی! آپ نے بہت رلایا مجھے!

"سایہ اور سائبان" نایاب جیلانی نے بھی بہت فنٹاسٹک ناول لکھا۔ نایاب آپی آپ کے پاس اتنی پیاری پیاری کہانیوں کے آئیڈیاز کہاں سے آتے ہیں۔ آپ اور آپی نبیلہ عزیز کی اسٹوریز کی تو میں دیوانی ہوں!

"سفال گر" ابھی بے حد الجھا ہوا پیچیدہ ناولٹ ہے مگر پڑھتے ہوئے بہت مزہ آتا ہے!

"اک دعا ٹھہر گئی" "سدرۃ المنتہٰی" کا افسانہ بھی بیسٹ تھا۔ سدرۃ المنتہٰی آپ سے ایک بات پوچھنا تھی کہ کیا آپ میری فرینڈ سدرہ اسلم فرام کہروڑ پکا ہو جو سدرۃ المنتہٰی کے نام سے اسٹوریز لکھتی ہے پلیز ضرور بتانا۔

ج: سائرہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ سدرۃ المنتہٰی کا تعلق ننکانہ محمد خان سے ہے۔ وہ آپ کی کہروڑ پکا والی دوست نہیں ہیں۔

مسز عامر نور ۔۔۔ حیدر آباد

مکمل ناول "شرط" زبردست تھا اینڈ ہٹ کے تھا لیکن مکرم کو زیست کو معاف کر دینا چاہیے کہ وہ اپنے کیے پر شرمندہ تھی۔ "سفال گر" بہترین کاوش ہے۔ اس میں سب سے اچھا کردار حکیم بیگم کا لگا پر نیاں بہت منفرد سا نام ہے "پہلا قدم" بھی زبردست تھا واقعی اگر ہم سوچنے کے بجائے چھوٹے پیمانے پر ہی کوئی اچھا کام شروع کریں تو بہت جلد اس ملک کے حالات سدھر سکتے ہیں۔ "سایہ اور سائبان" سو سو تھی لیکن اینڈ اچھا تھا۔ "سیلاب گریہ" بیچ کا کچھ حصہ سر سے گزر گیا میری سب سے موسٹ فیورٹ "محبت خواب سفر" اب تو اس کا اینڈ کر دیں جبکہ تمام کردار واضح ہو چلے ہیں۔ اس بار موسم کے پکوان ساری ہی تراکیب بہترین تھیں۔

ج: مکرم نے زیست کو معاف کر کے ہی اس کے ساتھ یہ سلوک کیا ورنہ وہ دوسری شادی بھی کر سکتا

دعائے مغفرت

آپ کی پسندیدہ مصنفہ عنیزہ سید کی والدہ محترمہ سیدہ زہرا منظور قضائے الٰہی سے وفات پا گئی ہیں۔ عنیزہ سید کے لیے یہ بہت بڑا سانحہ ہے۔ دکھ کی اس گھڑی میں ہم برابر کے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور اہل و عیال کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین

قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

تھا۔ اس طرح زیست کو سوکن کا عذاب بھی جھیلنا پڑتا۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کا شکریہ۔

سورتھ سائنڈ۔ روحل والی گاؤں

دسمبر کا خواتین خلاف توقع 9 تاریخ کو مل گیا۔ کرن روشنی سے فیض یاب ہو کر سب سے پہلے پڑھا نبیلہ عزیز کا ناول "شرط" بہت بہت اچھی کاوش تھی۔ نبیلہ جی مگر تشنگی رہی، تین سال بہت بڑا عرصہ ہوتا ہے مکرم آفریدی نے زیست کو اتنی سزا دی پھر بھی معاف نہیں کیا حالانکہ وہ محبت کا دعوے دار تھا بہرحال اچھی تحریر تھی اور دوسرا مکمل ناول نایاب جیلانی کا بالکل بھی اچھا نہ لگا۔ معذرت کے ساتھ کوئی بھی دوست اپنے دوست کے ساتھ اتنا برا نہیں کر سکتا۔ افسانے سارے اچھے تھے ناولٹ بشریٰ سعید نے اس بار بھی قسط بہت اچھی لکھی اور شیریں ملک کا ہلکا پھلکا اچھا ناولٹ تھا شیریں ہم "بیٹیاں پھول ہوتی ہیں" جیسی تحریر کے منتظر ہیں اور سلسلے وار کہانیوں میں اب میری دلچسپی ختم ہو گئی ہے۔

ج: پیاری سورتھ "بیٹیاں پھول ہوتی ہیں" ناولٹ شیریں حیدر نے لکھا تھا۔ شیریں ملک اور شیریں حیدر دونوں الگ شخصیات ہیں۔

دوست بے شک دوست کے ساتھ اتنا برا نہیں کر سکتا لیکن وہ دوستی کہاں تھی مہ جبانے غرض کے لیے ایک تعلق استوار کیا تھا۔

نبیلہ عزیز کے ناولٹ میں مکرم آفریدی نے زیست کو اس لیے سزا دی کہ اس کی انا کو ٹھیس پہنچی تھی۔ یوں بھی شدت کی محبت جب نفرت میں بدلتی ہے تو نفرت بھی شدید ہوتی ہے۔ سہیل ہمیر کے انٹرویو کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے۔

مریم نور۔ ڈسکہ

"سفال گر" کی دوسری قسط پڑھی۔ زبردست گی۔ "خوش بخت" بھی اچھا ناولٹ تھا۔ افسانوں میں زبردست تحریر سدرہ کی تھی۔ "اک دعا ٹھہر گئی" میں سدرہ صاحبہ نے پختگی سے لکھا۔ "پہلا قدم" حرا قریشی کا مجھے اتنا متاثر نہ کر سکا۔ مگر نایاب جیلانی کے سایہ اور سائبان نے مجھے کافی متاثر کیا۔ نومبر کے شمارے میں عنیقہ محمد کی کہانی قربانی ایک زبردست تحریر تھی۔ عنیقہ محمد کے پلاٹ عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ کسی سے مناسبت نہیں رکھتے۔ میں نے عنیقہ محمد کے تین افسانے پڑھے ہیں۔ تینوں میں ان کی تحریریں مختلف نظر آتی ہیں۔ اس لیے میری عنیقہ محمد سے گزارش ہے کہ ناولٹ لکھیں آپ کی کہانیاں زبردست اور دل کو چھو جانے والی ہوتی ہیں۔

ج: پیاری مریم! عنیقہ محمد بیگ کا ایک ناولٹ شعاع میں شائع ہو چکا ہے۔ آئندہ ماہ خواتین ڈائجسٹ میں ان کا ناولٹ شامل کریں گے۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔



سرورق کی شخصیت

ڈریس بائی	موسیٰ رضا
ماڈل	زارا گل
میک اپ	روز بیوٹی پارلر

ہمارا ملک اس وقت شدید بحران کا شکار ہے۔ ہمارے سیاست دان اپنے ملک کے لیے مخلص نظر نہیں آتے مہنگائی کے طوفان نے عام لوگوں کو زندگی کی بنیادی سہولتوں سے محروم کر دیا ہے لیکن حکمرانوں کی شاہ خرچیاں کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہیں۔ بلکہ ان میں بتدریج اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ آئے دن نئے ٹیکس لگا کر عوام کو خودکشی پر مجبور کیا جا رہا ہے۔

حکمرانوں کے پاس تو ملک کو بحران سے نکالنے کا کوئی حل نہیں ہے اور نہ ہی وہ مخلص ہیں۔ لیکن کیا عوام اور معروف شخصیات کے پاس اس کا کوئی حل ہے؟ آیئے ذرا معلوم تو کریں سوال یہ ہے کہ۔

(1) کن قوانین کو نافذ کر کے ملک کو بحران سے نکالا جا سکتا ہے؟

کیا یہ ہو سکتا ہے؟

شاہین رشید

فضیلہ قیصر

قوانین بنانا تو بہت آسان ہے۔ لیکن ان کو نافذ کر کے ان پر عمل درآمد کرانا بہت مشکل ہے۔ سعودی عرب کی مثال دیں گی۔ وہ صرف قوانین بناتے نہیں بلکہ اس پر عمل بھی کرواتے ہیں۔ سعودی بادشاہ کی



سب سے اچھی بات مجھے یہ لگتی ہے کہ انہوں نے یہ قانون بنایا ہے کہ گورنمنٹ کے علاوہ کوئی فتویٰ نہیں دے گا۔ جو دے گا اسے سزا ملے گی جبکہ ہمارے یہاں کوئی بھی کچھ کہہ دیتا ہے جس کی وجہ سے لوگوں کے ذہن خراب ہو جاتے ہیں کہ کیا ٹھیک ہے کیا غلط ہے اور یہ کہ سیاست دانوں کو ٹی وی کے پروگراموں میں بحث و مباحثہ کرنے پر پابندی لگائی جائے جو کرپشن کر رہا ہو اسے پکڑ کر جوتے ماریں۔ یہ سارے کام بہت مشکل ہیں مگر ملک اسی طرح بحران سے نکل سکتا ہے۔ کرپشن ختم ہو جائے تو مالی بحران تو خود بخود ختم ہو جائے گا۔

دانش سعید ایف ایم 107

وہ سیاسی پارٹیاں جو ملک میں انتشار پھیلا رہی ہیں ان پر پابندی لگا دینی چاہیے ان پر یہ سختی کرنی چاہیے کہ یہ اپنا وقت کالم کالج میں لگائیں ادھر ادھر کی باتیں نہ کریں اگر ایسا نہیں کر سکتی تو ان پر پابندی لگا دی جائے۔ جو ادارے پاکستان کے امیج کو خراب کر رہے ہیں اور غلط قسم کی بیان بازی کر رہے ہیں ان پر بھی

پابندی لگادی جائے۔ ایسا کرنا اگرچہ مشکل ہوگا لیکن ملک میں امن و سکون تو ہو جائے گا۔

مصطفیٰ چوہدری (4 مین شو فیم)

مہنگائی کم کریں۔ کیونکہ مہنگائی کی وجہ سے ہی لوگ جرائم کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ جب لوگوں کو پیٹ بھر کے کھانا ملے گا تو جرائم میں کافی حد تک کمی آجائے گی۔ غریب کے لیے روزگار کے مواقع فراہم کیے جائیں۔ سڑکوں پر بھیک مانگتے بچوں کو دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے ان کو تعلیم کی سہولیات مہیا کی جائیں اور بچوں کے ذریعے سے بھیک مانگنے پر پابندی عائد کی جائے۔ ایک بات اور بھی ہے کہ جو قوانین بنائیں پھر ان پر سختی سے عمل در آمد بھی کیا جائے۔

کنول نفیس

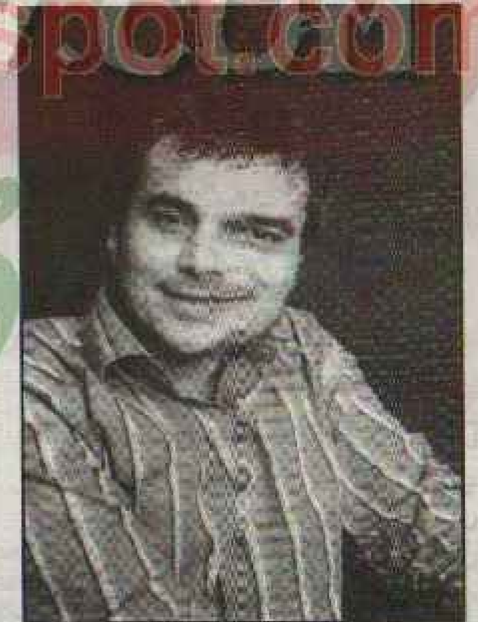
فیوڈل سسٹم کو ختم ہونا چاہیے۔ اس سسٹم نے ملک کو ترقی کرنے سے روکا ہوا ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اس سسٹم پر ہی پابندی لگا دینی چاہیے اسی طرح ہمارے ملک میں دوسرے اخراجات کا بجٹ تو بہت بڑا ہوتا ہے لیکن تعلیمی بجٹ انتہائی کم ہوتا ہے۔ کسی بھی ملک کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ تعلیم کا فقدان ہوتا ہے اس لیے اس ملک میں تعلیم کو لازمی قرار دے دینا چاہیے۔

فیصل علی خان ایف ایم 100

پولیس کے محکمے کو ٹھیک کردیں۔ اس محکمے میں بہت کرپشن ہے۔ بہت سے جرائم اس محکمے کی وجہ سے ہوتے ہیں اگر اس محکمے کو ٹھیک کر دیں اور ان پر سخت قوانین نافذ کردیں کہ اگر انہوں نے بھی کوئی غلط کام کیا تو بچ نہیں پائیں گے تو میں سمجھتا ہوں کہ ملک بحران سے نکل سکتا ہے۔ ویسے تو ہمارے یہاں آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ مگر یہ ایک ایسا محکمہ ہے جس کا تعلق ہر خاص و عام سے ہے۔

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ (Dentist)

دیکھیں جی قوانین تو بہت بعد کی بات ہے۔ اگر انسان خود ٹھیک ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ملک بحران کا شکار ہو۔ ملک بحران کا شکار اسی وقت ہوتا ہے جب بندہ خود خراب ہوتا ہے۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ صرف میرے ٹھیک ہونے سے کیا ہوتا ہے تو یہ غلط بات ہے۔ فرد کسی بھی پروفیشن سے تعلق رکھتا ہو اپنی کارکردگی سب سے اچھی رکھنی ہے۔ ہمیں سب کے لیے مثال بننا ہے تو کوئی وجہ ہی نہیں کہ ملک ترقی نہ کرے۔



ایمن طارق (آرٹسٹ)

تمام قوانین کو ایک طرف رکھیں۔ صرف اور صرف اگر میڈیا فعال ہو جائے تو سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے۔ میڈیا میں الیکٹرونک میڈیا تو ہے ہی اس کے علاوہ اسٹیج ڈراموں کے ذریعے سے بھی بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ان کے ذریعے سے اہم پیغام دیے جا سکتے ہیں۔ شعور دیے جا سکتے ہیں۔ سوچنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ آرٹسٹوں کی ایک یونین ہونی چاہیے ان کے قوانین ہونے چاہئیں ان قوانین کے تحت نئی جنریشن کو شعور دینے کی ضرورت ہے۔ انہیں ایڈریس کرنے کی ضرورت ہے۔

سلیم جاوید (گلوکار)

لاء اینڈ آرڈر ٹھیک ہو جائے تو سب ٹھیک ہو جائے گا لوگوں کو عدل و انصاف ملنے لگ جائے تو سب بہتر ہو جائے گا۔ عدالتیں ایمانداری کے ساتھ اور تیزی کے ساتھ اپنا کام کریں۔ اور جلدی جلدی لوگوں کو انصاف ملے تو ملک بحران سے نکل سکتا ہے۔

اظفر علی

ہمارا ملک بے شمار مسائل سے دوچار ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ لوگوں میں سمجھ بوجھ کا فقدان ہے، جو جہاں کہتا ہے وہیں پہ چل پڑتے ہیں یہ سوچے سمجھے بغیر کہ یہ راستہ ہمارے لیے فائدہ مند ہے یا نہیں ملک کو بحران سے نکالنے کے لیے قوانین تو سارے حق میں ہیں مگر ان پر عمل در آمد بھی تو ہو۔ بہرحال آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر ملک میں پولی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ زیادہ سے زیادہ بنا دیے جائیں تو بہت سے نوجوان اس ادارے سے ہنر مند شہری بن کے نکلیں گے اور ہنر مند کہیں بھی ہو وہ بھوکا نہیں رہ سکتا۔ ہمارے ملک میں سب سے بڑا مسئلہ تعلیم اور روزگار کا ہے اگر اس کے لیے اچھی پلاننگ کرلی جائے تو پھر ملک بڑی آسانی کے ساتھ بحران سے نکل سکتا ہے۔



وصی شاہ

پاکستان کے بیشتر قوانین بہت شان دار ہیں اور ہماری تہذیب و ثقافت کے عین مطابق بھی ہیں۔ مگر مسئلہ قوانین کا نہیں ہے بلکہ ان پر عمل در آمد کا ہے۔ اگر ان قوانین پر عمل در آمد ہو جائے تو ملک بحران سے نکل سکتا ہے۔

نوید صدیقی (آرٹسٹ)

بہت ہی آسان بات ہے۔ اگر تعلیم کے معیار کو بلند کر دیا جائے ایک جیسا ہی نظام تعلیم ہو تو بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے والے چاہے اتنے قابل ہوں یا نہ ہوں لیکن وہ اپنی انگریزی زبان کی وجہ سے ہر میدان میں کامیاب سمجھا جاتا ہے اسے جاب بھی آسانی سے مل جاتی ہے تو اگر ایک جیسا نظام تعلیم ہو گا تو پھر غریبوں کے بچے بھی فر فر انگریزی بول کر اچھی نوکریاں حاصل کر لیں گے اور اچھی تعلیم حاصل کر کے ہر میدان میں اپنے آپ کو منوا کر ملک کے لیے ایک کار آمد پرزہ ثابت ہوں گے۔ دوسری بات ہے کہ پولیس ڈیپارٹمنٹ کو بھی سدھار دیا جائے تو بھی ملک بحران سے نکل سکتا ہے۔

ڈاکٹر سیدہ شاہین فاطمہ (Dentist)

قوانین کو تو آپ ایک طرف رکھیں۔ کیونکہ قوانین تو سب بنے ہوتے ہیں اصل بات تو یہ ہے کہ اگر ہمارے سیاست دان جن میں ہمارے لیڈرز ہمارے حکمران اور ہمارے عوامی نمائندے جو ہمارے ووٹوں سے قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں جا کر بیٹھ

جاتے ہیں اگر خود غرضی کا مظاہرہ نہ کریں اور اس ملک کو اپنا گھر سمجھ کر اس کے لیے کام کریں تو بحران کا شکار ہی نہ ہو ہمارا پیارا ملک ابھی بھی وقت ان کے ہاتھ میں ہے اگر یہ سنبھل جائیں تو سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے۔

یاسر نواز

ہمارے ملک کو۔ بحران سے عدالتیں نکال سکتی ہیں۔ اگر ہر انسان کو انصاف ملنے لگے تو سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے میں آپ کو ایک مثال دیتا ہوں۔ گھر میں والدین ہوتے ہیں اور ان کا کنٹرول گھر پر ہوتا ہے۔ بچوں کو والدین کا خوف ہوتا ہے کہ اگر کوئی غلط کام کیا تو سزا ملے گی۔ چونکہ مجرموں کو سزا نہیں ملتی۔ اس لیے عوام بگڑ گئی ہے اسے پتہ ہے ہم کچھ بھی کر لیں ہم پر آنچ نہیں آسکتی عوام بہت بگڑ گئے ہیں اور ان کو صرف عدالتوں کا انصاف ہی ٹھیک کر سکتا ہے۔

اظفر رحمٰن

بہت سوچ میں ڈال دیا آپ نے۔ اگر ملک کے حالات دیکھیں تو اس کو ٹھیک کرنے کے لیے فوری طور پر جو باتیں ذہن میں آئی ہیں ان میں ایک تو یہ کہ انڈین چینلز اور خاص طور پر انڈیا کے واہیات چینلز



کو فوری طور پر بند ہونے چاہئیں کیونکہ نئی نسل کو بگاڑنے میں یہ بہت بڑا کردار ادا کر رہے ہیں۔ پھر ہمارے ملک میں تعلیم کی بہت کمی ہے۔ کم سے کم میٹرک تک تعلیم مفت ہونی چاہیے پھر یہ کہ کم عمر بچوں سے مزدوری نہ کرائی جائے ہمارے ملک میں چائلڈ لیبر کا قانون ہے مگر اس پر کوئی عمل نہیں کرتا۔

ٹیپو شریف

کسی ایک یا دو قوانین کے نافذ کرنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ آج آپ ٹریفک کا قانون نافذ کر دیں تو کسی دوسرے شعبے میں مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ تمام قوانین جو آئین میں موجود ہیں جو کاغذوں پہ موجود ہیں جن کو نافذ کرنے کے لیے ہم بڑے بڑے اجلاس بلاتے ہیں ان کو اگر حقیقت میں نافذ کر دیا جائے تو ملک بحران سے

نکل سکتا ہے۔

احمد کامران (ڈائریکٹر)

اتنے بڑے ملک اور اتنی بڑی آبادی کے ملک کو بحران سے راتوں رات تو نہیں نکالا جا سکتا۔ لیکن اگر بتدریج کوشش کی جائے تو کامیابی حاصل ہو ہی جاتی ہے۔ قوانین کو چھوڑیئے اگر احتساب کا سسٹم رائج کر دیں اور ہر چھوٹے بڑے امیر غریب صدر وزیر اعظم ہر شخص کا بلا امتیاز احتساب کیا جائے تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ بڑی حد تک ہم بحران سے نکل سکتے ہیں۔

جگن کاظم

ملک کے حالات بہت برے ہیں اس کا اب بحران سے نکلنا بہت مشکل ہے قوانین نافذ کرنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ بس اگر ہمارے حکمران خود کو اور اپنی کابینہ کو راہ راست پر لے آئیں تو سب کچھ خود بخود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ صرف حکمرانوں کے مخلص ہونے کی دیر ہے۔ ملک سے دہشت گردی بھی ختم ہو جائے گی اور مہنگائی بھی۔



خواتین ڈائجسٹ میں قارئین کی شرکت کے لیے ہم اس ماہ سے کچن کے حوالے سے ایک نیا سلسلہ شروع کررہے ہیں سوالات یہ ہیں۔

کھانا پکاتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟ پسند ناپسند' غذائیت' گھر والوں کی صحت۔

گھر میں اچانک مہمان آگئے ہیں کھانے کا وقت ہے۔ کسی ایسی ڈش کی ترکیب بتائیں جو فوری تیار کرکے تواضع کرسکیں۔

کچن عورت کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے' آپ کچن کی صفائی کے لیے کیا خصوصی اہتمام کرتی ہیں؟

صبح کا ناشتہ ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ آپ ناشتے میں کیا بناتی ہیں؟ ایسی خصوصی چیز کی ترکیب جو آپ اچھی بناتی ہیں۔

گھر سے باہر کھانا کھانا فیشن بنتا جارہا ہے' آپ مہینے میں کتنی بار باہر کھانا کھانے جاتی ہیں؟ (1) جب کوئی لے جائے (2) کسی کی سالگرہ پہ (3) یا کسی خوشی کے موقع پر۔

کھانا پکانے کے لیے ڈش کا انتخاب کرتے ہوئے موسم کو مدنظر رکھتی ہیں؟

اچھا پکانے کے لیے کتنی محنت کی قائل ہیں؟

کچن کی کوئی ٹپ جو دینا چاہیں؟

ان سوالات کے جواب بھیج کر آپ بھی اس سلسلہ میں شرکت کرسکتی ہیں' ساتھ ایک عدد تصویر بھی بھجوائیں۔ تصویر ضروری نہیں ہے۔

آپ کا باورچی خانہ

شہلا فیصل

1۔ کھانا پکاتے وقت صرف اور صرف غذائیت اور گھر والوں کی صحت کا خیال رکھتی ہوں' جہاں تک بات پسند ناپسند کی ہے تو ماشاء اللہ فیملی اتنی بڑی ہے کہ پسند ناپسند کا ہوش نہیں رہتا (جوائنٹ فیملی سسٹم ہے) جو بھی پکا دیا جائے پسند بن جاتا ہے (الحمدللہ)

2۔ چونکہ یہاں گاؤں سسٹم ہے تو مہمان اچانک ہی آتے ہیں اور بہت کثرت سے آتے ہیں۔ کباب تو لازمی فریز کیے ہوتے ہیں۔ دودھ' دہی وافر مقدار میں ہوتا ہے اور مرغی وہ بھی دیسی مرغی گھر کی ہی ہوتی ہے تو کسی بھی چیز کے لیے بازار کی طرف دوڑ نہیں لگانی پڑتی۔ جب تک مہمان لسی چائے سے شغل فرماتے ہیں جھٹ پٹ چکن تیار ہوجاتا ہے۔ ترکیب حاضر ہے۔

اجزا :

چکن	1کلو
ہری مرچ	حسب ضرورت (پسی ہوئی)
دہی	3کپ
ہرا دھنیا	1گٹھی
لہسن اورک پیسٹ	کھانے کا 1چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
سفید زیرہ	1کھانے کا چمچہ (بھنا ہوا)
کالی مرچ	1کھانے کا چمچہ (بھنی ہوئی)
کالی مرچ (پسی ہوئی)	1چائے کا چمچہ
تیل	1کپ

ترکیب :

چکن میں دہی نمک اور لہسن اورک کا پیسٹ لگا کر رکھ دیں۔ ہرا دھنیا اور ہری مرچیں پیس لیں۔ ایک دیگچی میں تیل ڈال کر چکن ڈال کر پکائیں جب پانی خشک ہونے لگے تو ہرا مسالا ڈال کر چکن کا پانی خشک کرلیں۔ پھر چکن کو 5منٹ تک بھون لیں۔ اب آدھا کپ پانی ڈالیں۔ بھنی ہوئی کالی مرچ بھنا ہوا سفید زیرہ اور پسی ہوئی کالی مرچ ڈال کر دس منٹ دم پر رکھ دیں۔

بس جی آدھے گھنٹے میں چکن تیار ساتھ میں تندور کی روٹیاں اور فلیور ڈ سویاں جو کہ 15منٹ میں تیار ہوجاتی ہیں' یہاں دیہات میں جو بھی دال' ساگ پکا ہوا ہو وہی مہمانوں کو پیش کردیا جاتا ہے۔

3۔ کچن کی صفائی تو ہفتہ وار ہی ہوتی ہے۔ ویسے تو روزانہ ساتھ کے ساتھ ہی صفائی کردیتی ہوں کھانا پکانے کے بعد تفصیلی صفائی ہفتہ بعد کرتی ہوں۔ جب چار' پانچ فیملیز ساتھ رہتی ہوں تو کچن میں عمل دخل بہت زیادہ ہوتا ہے۔ زیادہ دھیان سے کام کرنا پڑتا ہے۔

4۔ یہاں صبح کا ناشتہ تو لازمی ہے [illegible] سے ناشتہ کرتے ہیں۔ [illegible] صحن [illegible] دیسی انڈوں سے زیادہ تر رات کے سالن اور پراٹھے سے ناشتہ کرتے ہیں' اتوار کو خصوصی اہتمام ہوتا ہے۔ چنوں کا سالن اور مکھڈی حلوے کے ساتھ دیسی گھی کے پراٹھے کسی دعوت کا منظر پیش کرتے ہیں۔

مکھڈی حلوہ

اجزا :

سوجی	1کلو
دودھ	حسب ضرورت
چینی	ایک پاؤ
پانی	حسب ضرورت
گھی	3پاؤ

بادام' پستہ کی ہوائیاں حسب پسند

ترکیب :

سوجی کو دودھ میں گھنٹہ بھر پہلے بھگودیں۔ گھی گرم کرکے چینی کی چاشنی تیار کریں براؤن ہونے پہ سوجی ڈال دیں اور ہلاتی جائیں بھنے لگے۔ جب سوجی صحیح خستہ اور ہلکی براؤن ہوجائے تو' بادام' پستے کی ہوائیاں اوپر ڈال دیں مزے کا حلوہ تیار ہے۔

5۔ روز ہی کھانا باہر کھاتے ہیں۔ (مذاق کررہی ہوں) باہر صحن میں کھاتے ہیں۔ یہاں فی الحال کوئی رواج نہیں کھانا باہر کھانے کا۔ گھر پر ہی پکا کر ہر خوشی سلیبریٹ کرلیتے ہیں۔

6۔ جی ہاں ضرور موسم کو مدنظر رکھتی ہوں۔ ساون کے موسم میں پکوڑے اور شدید سردی میں گرم گرم کافی ہی اچھی لگتی ہے' باقی ہر موسم کی سبزیاں یہاں گھروں میں ہی لگائی جاتی ہیں۔

7۔ اچھا پکانے کے لیے پہلے بہت محنت کی قائل تھی' [illegible] ہر مسالا الگ سے [illegible] پیستا' ہر ہانڈی کو اچھی [illegible] مطلب [illegible] کرتی ہوں کھانا پکانے کے معاملے میں اب چونکہ دور جدید ہے تو بس جلدی جلدی پکانے کی ہی ہوتی ہے۔ مطلب کچن سے بھاگنے کی۔ (مذاق کررہی ہوں۔)

8۔ چونکہ یہاں چاول بہت زیادہ کھائے جاتے ہیں تو چاولوں کو کیڑے سے بچانے کے لیے ان میں نمک ملا کر رکھ دیا جائے تو کیڑا نہیں لگتا پرانے ہو کر چاول اچھے پکتے ہیں اور چپکتے بھی نہیں۔

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

چکن کارن سوپ

ضروری اجزا:

مرغی	ایک کلو
(بوٹیاں ابال کر چھوٹے ریشے کرلیں)	
پسی ہوئی سفید مرچ	چائے کا ایک چمچہ
کارن فلور	کھانے کے تین چمچے
مکئی کے دانے	ایک چھوٹا ٹن
چکن کیوب ملا ہوا میدہ	کھانے کا ایک چمچہ
تِل کا تیل	چند قطرے
یخنی	تین پیالی
(ایک پیالی یخنی الگ رکھ لیں)	
چینی	چائے کا ایک چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
انڈے	دو عدد
تیل	کھانے کے دو چمچے

ترکیب:

ایک بڑی پتیلی میں یخنی اور مکئی کے دانے ڈال کر ہلکی آنچ پر پکنے دیں۔ جب ابال آجائے تو میدہ، چینی، سفید مرچ اور مرغی کے ریشے ڈال دیں، چمچہ ہلاتی رہیں۔ جب سب اجزا ایک جان ہو جائیں تو تِل کا تیل ڈال دیں۔ انڈوں کو ہلکا سا پھینٹ کر رکھ لیں۔ جب سوپ پینے کے لیے تیار کرنا ہو تو کارن فلور ایک پیالی میں گھول کر ڈال دیں۔ چمچہ مستقل چلاتی رہیں۔ پتیلی چولہے سے اتار کر دو سے تین منٹ بعد انڈوں کو پھینٹ کر ڈال دیں۔ جلدی جلدی چمچہ ہلائیں اور چولہے پر دوبارہ رکھ دیں۔ تھوڑی دیر پکا کر اتار لیں اور پیش کرنے سے قبل تِل کا تیل ڈال کر گرم پینے کے لیے پیش کریں۔

ہاٹ اینڈ ساور سوپ

ضروری اجزا:



چکن یخنی	تین گلاس
(ایک پیالی یخنی الگ رکھ لیں)	
چکن کی چھوٹی بوٹیاں	ایک پیالی
ہری پیاز کے پتے (باریک کٹے ہوئے)	ایک پیالی
بند گوبھی (لمبی باریک کٹی ہوئی)	ایک پیالی
سویا سوس	کھانے کے تین چمچے
چکن کیوب ملا ہوا میدہ	کھانے کا ایک چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
انڈا	ایک عدد
تل کا تیل	چند قطرے
کارن فلور	کھانے کے دو چمچے
گاجر	دو عدد (باریک کٹی ہوئی)
شملہ مرچ	دو عدد (باریک کٹی ہوئی)
سفید سرکہ	کھانے کے دو چمچے
کالی مرچ (پسی ہوئی)	چائے کا آدھا چمچہ
چینی	چائے کا ایک چمچہ
چلی ساس	چائے کا ایک چمچہ
تیل	کھانے کے تین چمچے
پسی ہوئی سفید مرچ	چائے کا آدھا چمچہ

ترکیب :

ایک پتیلی میں تیار کی ہوئی یخنی ڈال کر ساتھ میں سویا سوس، سرکہ، میدہ، چلی سوس، نمک، چینی، سفید مرچ اور ساری سبزیاں ڈال کر ہلکی آنچ میں پکنے دیں۔ جب ابال آجائے تو چکن کی بوٹیاں ڈال دیں اور مزید پانچ منٹ تک پکائیں پھر یخنی میں کارن فلور گھول کر ڈال دیں اور لکڑی کا چمچ چلاتی رہیں، جب سوپ گاڑھا ہونے لگے تو انڈا ڈال دیں۔ تل کا تیل اور پیاز کے پتے ڈال کر گرم گرم پینے کے لیے پیش کریں۔

آلو اور پنیر کا سوپ

ضروری اجزا :

آلو	دو عدد (درمیانے سائز کے)
پیاز (کٹی ہوئی)	آدھی مٹھی
نمک	حسب ذائقہ
پانی	آدھی پیالی
دودھ	دو پیالی
آٹا	کھانے کا ایک چمچہ
کالی مرچ	چائے کا ایک چوتھائی چمچہ
پنیر	ایک پیالی
دھنیے کے پتے	چند پتے

آلو اور پیاز چھیل لیں، انہیں ٹکڑے کرکے ابال لیں اور بعد میں ان دونوں کا بھرتہ بنالیں۔ آدھی پیالی دودھ لیں، آٹا اس میں ڈال کر اچھی طرح ملائیں۔ باقی بچا ہوا دودھ آلو کے بھرتے میں ڈال دیں۔ ایک کڑاہی میں اس مرکب کو پکائیں۔ چمچہ ہلاتی رہیں اتنا کہ بلبلے بننے لگیں تب کالی مرچ اور نمک اس میں شامل کرلیں۔ اچھی طرح پک جائے تو اتار لیں۔ دھنیے کے پتے سجا کر پیش کریں۔

ٹماٹو کارن سوپ

ٹماٹر	ایک کلو
مکھن	دو اونس
لال مرچ (پسی ہوئی)	چائے کا ایک چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
کارن فلور	کھانے کے تین چمچے
کارن کاب	ایک عدد

ٹماٹر دھو کر چار پیالی پانی اور نمک ڈال کر ابال لیں۔ جب گل جائے تو چھلکے اتار کر چھان لیں، کسی برتن میں مکھن ڈال کر گرم کریں اور کارن فلور ڈال کر تھوڑا بھونیں اس میں ٹماٹر کا عرق ڈال دیں، کارن فلور بھی ڈال دیں پھر لال مرچ ڈالیں۔ سوپ گاڑھا ہوجائے تو دھیمی آنچ پر رکھ دیں۔ پیش کرنے سے پہلے چاہیں تو کریم ڈال کر چمچے سے اچھی طرح ملائیں۔ مزے دار گرم گرم ٹماٹو کارن سوپ تیار ہے۔

خبریں وغیرہ

غزل ثوبان



خواتین ڈائجسٹ گروپ کے ایڈیٹر عامر محمود صدر پاکستان جناب آصف علی زرداری سے شہید بے نظیر بھٹو ایوارڈ وصول کررہے ہیں۔

شہید بے نظیر بھٹو ایوارڈ

پچھلے دنوں ایک پروقار تقریب میں جو ایوان صدر میں منعقد کی گئی تھی۔ صدر آصف علی زرداری نے خواتین ڈائجسٹ کے عامر محمود (سیکریٹری جنرل کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز) کو انسانی حقوق کا شہید بے نظیر بھٹو ایوارڈ دیا گیا۔

یہ ایوارڈ ملک میں انسانی حقوق کے لیے سرگرم مختلف شعبہ جات کی معروف شخصیات کو دیے گئے۔ ان میں سینئر صحافی منو بھائی معروف شاعر ناصر زیدی، محترمہ کشور ناہید اور مشہور گلوکار ابرار الحق شامل ہیں۔

دوستی

دلیپ کمار کو برصغیر کا لیجنڈری اداکار تسلیم کیا جاتا ہے جن کے ساتھ کام کرنے کی خواہش اپنے دور کی ہر اداکارہ کو تھی۔ لیکن ان ہی میں مالا سنہا بھی تھیں جنہوں نے سیکنڈ لیڈ ہونے کے باعث دلیپ کمار کے ساتھ کام کرنے سے انکار کردیا۔ تاہم دلیپ کمار کی پرستار یہاں کی اداکارائیں ہی نہیں ہالی وڈ میں بھی ان کی اداکاری کے ڈنکے بجے۔ مشہور اطالوی اداکارہ صوفیہ لورین بھی دلیپ کمار کی مداح ہیں۔ 1961ء میں فلم



"گنگا جمنا" میں دلیپ کمار کی بے مثل اداکاری کے بعد ان کی دوستی پروان چڑھی۔ جو گزشتہ پچاس سال سے بدستور قائم ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ دلیپ کمار کی 88 ویں سالگرہ پر صوفیہ لورین نے ممبئی آکر دلیپ کمار سے ملاقات کا عندیہ دیا ہے۔ ممکن ہے آگے چل کر اس سے شوبز کی دنیا میں نئے رابطے استوار ہوں۔
(دوستی ہو تو ایسی)

تصحیح

گزشتہ ماہ ایک خبر میں سہوا" عدیل ہاشمی کو سلیمہ ہاشمی اور شعیب ہاشمی کا بیٹا لکھ دیا گیا۔ عدیل ہاشمی، فیض احمد فیض کی بیٹی منیزہ ہاشمی اور عمیر ہاشمی کے صاحبزادے ہیں۔

کچھ ادھر ادھر سے

☆ پارلیمنٹ میں ڈرون حملوں کے خلاف قرارداد پاس کیے جانے کے چند ہی ہفتوں بعد صدر زرداری نے ڈرون حملوں کی حمایت کی۔ صدر زرداری نے امریکیوں سے کہا القاعدہ کے سینئرز کو مارو۔ شہریوں کی ہلاکتوں سے آپ امریکیوں کو پریشانی ہوتی ہے مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ (وکی لیکس کا انکشاف)

☆ ملک کی 60 فیصد صنعت اور زراعت پنجاب میں ہے جو گیس بند، بجلی بند یلغار کے باعث تباہ ہو رہی ہے۔ اندازہ ہے کہ پنجاب کو تباہ کرنے کی یہ منجیدہ کوشش مزید کچھ عرصہ جاری رہے گی۔ انتقام کے جوش میں یہ نہیں دیکھا کہ پنجاب کو برباد کرنے کی اس پالیسی کے نتیجے میں باقی تین صوبوں کو بھی سخت نقصان پہنچے گا۔ (وغیرہ وغیرہ عبداللہ طارق سہیل)

☆ ستم ظریفی یہ دیکھیے کہ جو کام میں نے کیا۔ جس کی وجہ سے مشرف اور اس کے ساتھی وقت کے بجائے سر اٹھانے اور سیدھا چلنے کے قابل ہوئے انہوں نے جو کچھ میرے ساتھ کیا اسے احسان فراموشی ہی کہہ سکتے ہیں اگر جناب بھٹو، غلام اسحاق خان، جنرل ضیاء الحق اور محترمہ بے نظیر بھٹو ایٹمی پروگرام کو چلنے نہ دیتے اور جناب میاں نواز شریف صاحب جرأت اور حب الوطنی کا مظاہرہ نہ کرتے تو ہم سب ایل کے ایڈوانی کے حکم پر سر جھکاتے اور خواہش کے مطابق گردنیں جھکا کر اور ادب سے اس کے سامنے لرزتے ہوتے۔ (ڈاکٹر عبدالقدیر خان)

☆ دنیا کی سب سے بڑی سیکولر جمہوریت میں بھارت میں 19 کروڑ مسلمان تعفن زدہ غلیظ علاقوں میں غربت و افلاس میں رہنے پر مجبور ہوئے۔ ان کی حالت ان شودروں سے بدتر ہے جنہیں ہندو مذہب میں ذلیل ترین سمجھا جاتا ہے۔ اسی سیکولر جمہوریت میں "ہندو کنٹرولا" بی جے پی کی صورت میں جیت کر آتا ہے۔ (اوریا مقبول جان)

☆ این آر او کیا تھا۔ تمہاری کرپشن معاف اور حکومت بھی تمہاری، صدارت میری۔ اب اتنے صاف اور سادہ ترتیب والے معاملے کو الٹ کر کے دکھایا جا رہا ہے۔ یہ تاریخ سے دھوکا ہے اور قوم کو بے وقوف سمجھنے کی احمقانہ کوشش۔ (وغیرہ وغیرہ عبداللہ طارق سہیل)

☆

باتیں کتابوں کی

سائرہ غلام نبی

کتاب۔۔۔ مجھے نوید صبح بہار دے
مصنف۔۔۔ طیبہ ہاشمی
ناشر۔۔۔ علم و عرفان
قیمت۔۔۔ 180

حال ہی میں طیبہ ہاشمی کے ناولٹ کا مجموعہ "مجھے نوید صبح بہار دے" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ پہلی نظر میں یہ مجموعہ ایک ناول لگا اور اس کے مطالعے سے پتہ چلا کہ یہ ایک ناولٹ ہے اور اس کے علاوہ دو مزید ناولٹ ہیں۔ آج کل طباعت کی سہولت کی بنا پر کتاب بہت عجلت میں شائع کی جا رہی ہیں۔ کتاب کے شائع ہونے سے قبل جو محنت کی جانا چاہیے وہ مفقود ہے۔ اس میں مصنف کا قصور نہیں ہے پبلشر صرف مالی فوائد پیش نظر رکھتے ہیں اور مصنف کے ادبی امیج کو زک پہنچاتے ہیں۔ یوں تو طیبہ ہاشمی نے اپنے طور محنت کی ہے اور ان کہانیوں کو تحریر کر کے اپنی تخلیقی صلاحیت کو منوانا چاہا ہے۔

خیر! اب ہم آتے ہیں طیبہ ہاشمی کے ان ناولٹوں کی طرف جنہیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مصنفہ باشعور دردمند اور حساس دل کی مالک ہیں۔ وہ سنجیدگی اور دور داری سے قلم اٹھاتی ہیں۔ قدرے گمبھیر معاملات کو موضوع بناتی ہیں کہ اس مجموعے کا پہلا ناولٹ جو کتاب کا عنوان بھی ہے کشمیر کی آزادی کے پس منظر میں تحریر کیا گیا ہے۔ وہاں کے لوگ اپنی ان فضاؤں سے شفاف آسمان سے اور سرسبز وادی سے عشق کرتے ہیں۔ اپنی دھرتی سے دشمن کی بالادستی ختم کرنے کا عزم رکھتے ہیں اور دشمن کی ریشہ دوانیوں کے باوجود سرگرم ہیں اور اپنے لہو سے روشنی پھیلا رہے ہیں باوجود اس کے زندگی جاری و ساری ہے اور اس وادی میں رومان کی کلیاں بھی چٹک رہی ہیں "آرزوؤں کے کنول بھی کھل رہے ہیں۔"

اس کہانی کا مرکزی کردار آمنہ ہے۔ جو صحافت سے وابستہ ہے۔ ڈی سی ابھیجیت ورما ہندو ہے۔ وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اس رومان کے پس منظر میں کشمیر کی آزادی کی جدوجہد کو طیبہ ہاشمی نے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے اور ایک مسلمان لڑکی کو جس کردار کا مظاہرہ کرنا چاہیے "آمنہ نے اس کردار کو بخوبی نبھایا ہے کہ ابھیجیت ورما نہ صرف اس سے متاثر ہوتا ہے۔ بلکہ وہ اس کے مذہب سے بھی متاثر ہوتا ہے۔

کتاب۔۔۔ ماں پیاری ماں
مصنف۔۔۔ شیخ یونس علی فوز
ناشر۔۔۔ نسل نو پبلی کیشنز ملتان
قیمت۔۔۔ 300 روپے

شیخ یونس علی فوز ابھرتے ہوئے شاعر ہیں۔ غالبا" اس مجموعے سے قبل ان کے کئی اور شاعری کے مجموعے طبع ہو چکے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب "ماں پیاری ماں" کے عنوان سے طبع کروایا ہے دیکھا گیا ہے کہ اوائل عمری میں شاعری کا دائرہ محبت کے گرد ہی بنتا ہے اور شاعر اسی خصوصی رنگ میں اپنے جذبوں کا اظہار کرتے ہیں۔ ہجر و فراق کے مسائل ان کو جکڑے رکھتے ہیں۔ مگر خوشی کی بات ہے کہ شیخ یونس علی فوز نے اپنی محبت کا مرکز اپنی ماں کو بنایا ہے اور ماں کی محبت کے حوالے سے اپنی شاعری کا رنگ نمایاں کیا ہے شیخ یونس علی فوز کی ماں اس دنیا میں نہیں ہیں۔ وہ اس محترم ہستی کی جدائی کا کرب سہتے ہیں انہیں یاد کرتے ہیں۔ ان کی آنکھ سے ٹپکتا آنسو شعر میں ڈھل جاتا ہے اور ان ہی آنسوؤں کی جھلکی اس مجموعے میں ملتی ہے۔ کچھ اشعار دیکھیے۔

کیسی ہے یہ ماں کی جدائی
نوحہ کناں ہے ساری خدائی
کاش کسی کی ماں نہ بچھڑے
بڑی کٹھن ہے ماں کی جدائی

☆

جانیں

ہمارے ہاں آج کل اکثر لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ مجھے ڈپریشن ہو رہا ہے' جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا ہو رہا ہے تو بتا نہیں پاتے۔ دراصل ڈپریشن کا مطلب ہے افسردگی' پژمردگی یا بددلی۔ لوگ یا تو اس کا علاج ہی نہیں کرتے یا پھر ڈاکٹر کے پاس جا کر صحیح صورت حال نہیں بیان کر پاتے۔

سب سے پہلے تو یہ بات دیکھنے کی ہے کہ آپ کو کب سے ڈپریشن ہے' یعنی آپ کی افسردگی یا بددلی کب سے پرورش پا رہی ہے۔ ہو سکتا ہے مہینوں سے ایسا ہو رہا ہو۔ آپ اندازہ کریں کہ بیماری کی مدت کتنی ہے؟ اگر بیماری کی مدت طویل ہے تو اس پر چند گھنٹوں میں قابو نہیں پایا جا سکتا۔

ڈپریشن (افسردگی' پژمردگی اور بددلی) ایک بیماری ہے۔ جتنے دن تک آپ اسے پالتے رہے ہیں' اسی حساب سے اس کا علاج ہوتا ہے۔ بیماری کی جڑیں جتنی گہری ہوں گی۔ اتنا ہی وقت علاج میں لگے گا' بعض صورتوں میں تین' چار دن یا ہفتہ دس دن بھی لگ سکتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ افسردگی کے مریض بیماری سے چھٹکارا پانے کے لیے بے تاب ہوتے ہیں' ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ چند ہی گھنٹوں میں مکمل طور پر صحت یاب ہو جائیں۔ پہلے تو یہ ضروری ہے کہ افسردگی پیدا کرنے والے حالات یا واقعات کا پتا لگایا جائے' ان کا جائزہ لیا جائے۔ سب سے پہلے تو آپ اپنے آپ سے دریافت کریں۔

۱۔ آپ کی افسردگی کا احساس کیا ہے؟
۲۔ کیا اس کے ساتھ افسردہ خیالات بھی ہیں؟
۳۔ کیا ہو رہا تھا جب آپ نے پہلی مرتبہ اس کے بارے میں سوچا؟
۴۔ کیا اب بھی حالات وہی ہیں جیسے کہ پہلے موقع پر تھے؟

جب آپ کسی نتیجے پر پہنچ جائیں یعنی اس بات کی نشان دہی ہو جائے تو پھر جائزہ لیں۔

۱۔ کیا آپ اپنے آپ کو کمتر سمجھتے ہیں؟
۲۔ کیا آپ کو محرومی کا احساس ہے؟
۳۔ کیا آپ اپنے اوپر تنقید کرتے ہیں؟
۴۔ کیا آپ مسائل میں گھرے ہوئے ہیں اور فرائض پورے نہیں کر پا رہے۔

ڈپریشن کا شکار افراد اپنا جائزہ لینے کے بعد مندرجہ ذیل پر عمل کریں تو فوری فائدہ ہو سکتا ہے۔ اور بتدریج مکمل طور پر صحت یاب ہو سکتے ہیں۔

۱۔ اپنی دلچسپیاں بڑھالیں اور دلچسپیوں کا انداز بدل دیں۔
۲۔ اچھی کتابیں پڑھیں۔ سیرت طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالعہ کریں۔
۳۔ لوگوں سے میل ملاقات کریں' ان کے دکھ سکھ میں شریک ہوں۔
۴۔ حالات اجازت دیتے ہوں تو نئے کپڑے بنوائیں اور پہن کر باہر نکلیں۔
۵۔ مختلف انداز کے کھانے کھائیں اور باغبانی یا کوئی مشقت کا کام کریں۔
۶۔ صبح جلد اٹھیں اور سیر کریں۔

ل۔ن' سکھر

اچھی بہن! جو حالات آپ نے لکھے ہیں ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے اور آپ کی والدہ نے کتنے مشکل حالات کا سامنا کیا اور کیسی زندگی گزاری ہے۔

آپ نے تفصیل سے خط لکھا' تحریر میں روانی ہے۔ خواتین کے بیشتر سلسلوں میں بھی آپ کا نام شامل ہوتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ذہین اور سمجھ دار ہیں۔ یہ اچھی بات ہے کہ تمام تر نامساعد حالات اور آپ کے والد کی غیر ذمہ داری کے باوجود آپ کی والدہ نے آپ کو تعلیم دلائی ہے۔ یہ فیصلہ بالکل درست ہے کہ فی الحال آپ نانا کے گھر میں رہنا چاہتی ہیں جب تک آمدنی کا کوئی معقول اور مستقل ذریعہ نہ ہو گھر چھوڑنا دانش مندی نہیں ہے۔ لیکن اب آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں۔ آپ دو تین سال میں تعلیم مکمل کر لیں گی پھر ان شاء اللہ اچھی جاب بھی مل جائے گی۔

آپ نے اپنی والدہ کی جو کیفیت لکھی ہے۔ وہ بیماری نہیں بلکہ حالات کے دباؤ کی وجہ سے وہ ایسی ہو گئی ہیں اگر ڈاکٹر کے مشورے سے انہیں سکون آور دوائیں دی جائیں تو وہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔ اس طرح گھر میں بحث و تکرار بھی نہیں ہو گی اور آپ سکون سے پڑھ سکیں گی۔

S۔ شہزادی

آپ کی دوست کو ڈاکٹر سے مشورہ کی ضرورت ہے۔ کچھ عرصہ دوائیں استعمال کرنے سے یہ تکلیف دور ہو جائے گی کبھی کبھی جسمانی طور پر کچھ اجزا کی کمی سے مختلف شکایات پیدا ہو جاتی ہیں جو مناسب دواؤں کے استعمال سے ختم ہو جاتی ہیں۔ اگر آپ کے شہر میں کوئی سائیکاٹرسٹ ہو تو اس سے علاج کرائیں۔

زیبا' نو لاہور

پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ نے مرگی کو اپنے ذہن پر سوار کر لیا ہے۔ مرگی ایسی بیماری نہیں ہے جو ذہن پر کوئی اثرات ڈالے اس کا دورہ صرف چند سیکنڈ کا ہوتا ہے اور اس دورہ سے ذہن پر کوئی اثرات نہیں ہوتے نہ ہی اس سے اعصاب کمزور ہوتے ہیں ایسے بہت سے لوگ ہیں جو مرگی کے مریض ہیں۔ لیکن وہ نارمل انداز میں اپنے روز مرہ کے کام انجام دیتے ہیں۔ ذہین ہیں' اعلا تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ڈاکٹر' انجینئر بنتے ہیں۔ تین سال کی عمر میں جب آپ اس بیماری کا شکار ہوئیں تو یا تو صحیح علاج نہ ہو سکا یا پھر لاعلمی کی بنا پر آپ نے اسے بہت بڑی بیماری تصور کر لیا۔ نتیجہ یہ کہ آپ کی تعلیم نامکمل رہ گئی۔ اب آپ اپنی بہن کے گھر رہتی ہیں جہاں آپ کو شکایت ہے کہ بہن بھائیوں کا رویہ آپ کے ساتھ اچھا نہیں ہے۔ اس بات کو سوچ سوچ کر آپ اپنا ذہن مزید خراب کر رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نماز میں بھول جاتی ہیں۔ وضو کرتے ہوئے شک ہوتا ہے۔

جہاں تک وضو میں شک کا سوال ہے اس کے لیے آپ ایک بار یکسوئی سے وضو کر لیں اس کے بعد جتنا بھی شک ہو دوبارہ نہ کریں۔

بہن کے گھر میں رہنا آپ کی مجبوری ہے۔ اس لیے جیسے بھی حالات ہوں۔ سمجھوتا کرنا پڑے گا اور جب سمجھوتا کرنا ہی ٹھہرا تو بہتر ہے خوشی خوشی کریں۔ خوش رہنے کی کوشش کریں تاکہ آپ کی صحت متاثر نہ ہو۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوگوں کا رویہ اتنا خراب نہیں ہوتا۔ جتنا ہم اسے خراب سمجھ لیتے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ آپ کسی سے کوئی توقع نہ رکھیں' جب توقعات ٹوٹتی ہیں تو زیادہ دکھ ہوتا ہے۔

بیوٹی بکس

فرحین شمع......نوشہرو صدر

س: موسم سرما میرے لیے مصیبت بن کر آتا ہے۔ پیر بری طرح پھٹنے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی ان سے خون بھی رسنے لگتا ہے۔ کتنا بھی رگڑ رگڑ کر صابن سے دھولوں پیر میلے ہی نظر آتے ہیں۔ چہرے اور ہاتھوں کی جلد بھی کھردری ہو جاتی ہے۔ چہرے کا رنگ بھی سنولا جاتا ہے جبکہ میرا رنگ اچھا خاصا صاف ہے۔ بالوں کی خشکی کے لیے کچھ بھی بتائیں؟

ج: جن لوگوں کی جلد حساس ہوتی ہے وہ موسم کے اثرات زیادہ قبول کرتی ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے سردی کا موسم خاصا تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ایسی تدابیر کی جائیں کہ جلد موسمی اثرات سے محفوظ رہے۔

پاؤں کی جلد جب خشک ہونا شروع ہوتی ہے تو سب سے پہلے ایڑی میں گہرے کٹ تو نمودار ہونے لگتے ہیں، کبھی کبھی جلد میں انفیکشن بھی ہو جاتا ہے۔ جس کے بعد علاج کرانا ضروری ہو جاتا ہے۔

اس کے لیے ضروری ہے کہ پاؤں میں اچھا موسچرائزر باقاعدگی سے لگایا جائے اور موسم سرما میں موزوں کا استعمال کیا جائے۔ بہت زیادہ صابن اور پانی کے استعمال سے گریز کیا جائے کیونکہ یہ پاؤں کی مزید خشکی کا سبب بنتا ہے۔

سونے سے قبل پاؤں اچھی جھانویں سے رگڑ کر دھولیں اور پھر موسچرائزر لگا کر موزے پہن لیں۔

اگر آپ بازار سے موسچرائزر خرید سکتی ہیں تو خرید لیں لیکن کچھ گھریلو نسخوں سے بھی آپ کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ یہ طریقے آسان بھی ہیں اور بے حد مفید بھی۔

گلیسرین — چار چمچے
لیموں کا عرق — ایک عدد
پھٹکری پسی ہوئی — دو چٹکی

ان کو اچھی طرح ملالیں اور دن میں تین بار پیروں پر لگائیں۔ رات کو تین گلاس نیم گرم پانی میں ایک چمچہ نمک اور ایک چمچہ سرسوں کا تیل ملالیں۔ دس منٹ تک دونوں پیر اس میں رکھیں۔ اب جھانویں سے اچھی طرح رگڑ کر صاف کرلیں۔ پھر تولیے سے پیر خشک کر کے گلیسرین کا آمیزہ لگائیں۔ پھر سوتی موزے پہن کر سو جائیں۔ صبح پاؤں دھولیں۔ کچھ دنوں میں پیر صاف ہو جائیں گے۔

ایڑیاں پھٹنے سے بچانے کے لیے رات سونے سے پہلے بکری کا گھی یا دودھ مل لیں۔

ہاتھوں پر لگانے کے لیے

گلاب کا عرق — ایک کپ
گلیسرین — دو چمچ

ان کو ملا کر محلول بنالیں۔ ایک شیشی میں ڈال کر کچن میں رکھ لیں جب کام کاج سے فارغ ہوں تو ہاتھوں پر لگالیں۔ ہاتھوں کی جلد نرم و ملائم ہو جائے گی۔

چہرے پر دودھ اور گلاب کا عرق برابر مقدار میں لے کر دن میں تین بار لگائیں۔ ایک چمچ دودھ میں دو عدد بادام باریک پیس کر اسے چہرے پر لگائیں۔ اس سے آپ کا چہرہ شاداب رہے گا۔

چہرے پر رات سونے سے پہلے کولڈ کریم سے مساج کریں۔ اگر کولڈ کریم نہ ہو تو ایک چمچہ بالائی میں ایک لیموں کا عرق ملا کر کریم بنالیں اور رات کو سونے سے پہلے چہرے پر لگائیں۔

بالوں میں خشکی کے لیے دو چمچے دہی میں دو چمچے سرسوں کا تیل ملا کر نہانے سے آدھا گھنٹہ قبل سر میں خوب اچھی طرح ملیں۔ پھر نیم گرم پانی سے دھولیں۔ خشکی دور ہو جائے گی۔

موسم سرما میں بالوں میں سرسوں کا یا ناریل کا تیل باقاعدگی سے لگائیں تاکہ آپ کے بال خشک نہ ہوں۔

